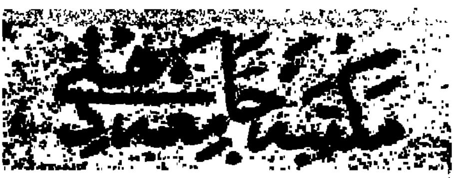


چند ادبی کتابیں

باقیات بجنوری۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے [illegible] کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۱۲/

نقوش سلیمانی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی ہندوستانی زبان و ادب پر تقاریر و خطبوں کا مجموعہ

قیمت مجلد تین روپے (۳/) ۔ غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

مضامین رشید۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ادبی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۲/

خنداں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مزاحیہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ۔ " " ۱۲/

روح تہذیب۔ خواجہ غلام السیدین نے فلسفۂ تعلیم کے مرکزی مسئلہ تہذیب کی ماہیت اور

حقیقت سے بحث کی ہے۔ قیمت ۱/

قتیل اور غالب۔ سید اسد علی انوری صاحب نے قتیل و غالب کے تاریخی جھگڑے

کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ قیمت ۱/

مرآۃ الشعر۔ پروفیسر مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی

شاعری سے بحث کی ہے۔ قیمت مجلد تین روپے (۳/)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۶ - نمبر ۱ | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۔ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

کو

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین اور دوسرے مشہور اداروں کی مطبوعات کی ایجنسی حاصل ہے۔ اس لیے مکتبہ سے ہر موضوع کی کتابیں اصلی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اردو اکادمی** کی ممبری قبول فرمائیے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے۔

سنہ ۱۹۴۱ء

بعض قوموں کا خیال ہو کہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ ہر اچھے برے کام کی تنظیم بھی ہونا چاہیے چنانچہ وہ جوش اور غصے، خلوص اور ریاکاری، رعایت اور زبردستی، دوستی اور دغابازی، ہر صورت کے لیے پروگرام بنالیتی ہیں اور جنگ کا نقشہ تیار ہو جاتا ہو تو صلح کی گفتگو شروع کرتی ہیں۔ یہ طریقہ مہذب لوگوں کو بہت ناگوار معلوم ہوتا ہو اس لیے ایسے اعتراضات کرنے اور الزام لگانے کا ایک پروگرام بھی بنایا جاتا ہو جو ہر کارروائی کو حق بجانب ثابت کرتا ہو۔ اخلاق کو انسان کے کاموں میں کوئی دخل نہیں ہوتا، اور زندگی کی ہر موجودہ صورت اصولاً اتنی بری مان لی جاتی کہ اسے بگاڑنے کا حق ہر شخص یا ہر جماعت کو دیا جا سکتا تو پروگرام کی حیثیت پروگرام تعریف یا تنقید کی جا سکتی۔ لیکن انسان کو بہت سی چیزیں عزیز ہوتی ہیں جنہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا اور اسے یہ سوچ کر ذرا بھی تسلی نہیں ہوتی کہ ان کو مٹانے کا ایک مکمل پروگرام بن گیا ہو۔ دوسری طرف یہ بھی کوئی نہ کہے گا جو صورت حال اچھی اور مفید ہو اسے قائم رکھنے کا کوئی انتظام اور اگر وہ خطرے میں ہو تو اس کی حفاظت کی مناسب تدبیریں نہ کرنا چاہییں۔

__جرمنی کا پروگرام__ | جرمنی نے دنیا کو فتح کرنے کا مقصد نظر کے سامنے رکھ کر سیاست اور جنگ کا ایک مفصل پروگرام بنایا ہو۔ اس کا پہلا حصہ یہ تھا کہ یورپ کی جرمن آبادی کو جرمن ریاست کے ماتحت لایا جائے اور اس سلسلے میں مخالف قوتوں کو آزمایا جائے۔ دوسرا حصہ یا دائرہ عمل یہ تھا کہ یورپ پر تسلط حاصل کیا جائے۔ تیسرا دائرہ عمل دنیا کے ان حصوں پر قبضہ کرنا تھا جو یورپ پر تسلط قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں۔ پروگرام کے ان حصوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جا چکی ہو لیکن ان میں حسب منشا کامیابی ہونے پر ایک اور زیادہ وسیع پروگرام مرتب ہوگا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی کو ساری دنیا کا مرکز بنایا جائے۔ پروگرام کے پہلے حصے کی تکمیل سنہ ۱۹۳۸ء تک ہو چکی تھی۔ پولینڈ پر جو حملہ کیا گیا وہ دوسرے حصے کی ابتدا تھی اور یہ اس سال مکمل ہو جاتا اگر جرمنی کو روس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہوتی۔ پروگرام کا تیسرا حصہ جس میں مغربی اور شمالی افریقہ بحر روم

اور مشرق قریب کے ممالک پر غالباً خلیج فارس تک قبضہ کرنا داخل ہے۔ شروع کیا جا چکا ہے۔ کریٹ اور لیبیا کی جنگوں کو اور اس سمجھوتے کو جو نومبر میں گورنگ اور مارشل پیتین کے درمیان فرانس کی افریقی نوآبادیوں کے متعلق ہوا ہے اسی میں شامل سمجھنا چاہیے۔ پروگرام کے ان تینوں حصوں کے درمیان صلح کی ایک تحریک بھی رکھی گئی تھی۔ غالباً پروگرام بنانے والوں کو امید تھی کہ فوجی کارروائیوں کی طرح صلح کی تحریکیں بھی کامیاب ہوں گی اور اگر پوری صلح نہ ہوئی تب بھی مخالفوں کی نیت ڈانواڈول ہو جائے گی اور اس سے سیاست اور جنگ کے مقاصد حاصل کرنے میں کچھ نہ کچھ مدد ملے گی۔ پروگرام کے ان تمام حصوں کو حسب ضرورت کم یا زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ پہلے ہر ہٹلر کا دل ان جرمنوں کی ہمدردی میں تڑپ رہا تھا جو دوسری ریاستوں کے ماتحت تھے اور وہ قسمیں کھاتے تھے کہ جرمن قوم کی یہ آرزو کہ وہ ساری کی ساری ایک جرمن ریاست کے ماتحت ہو پوری ہو جائے تو وہ اور کوئی مطالبہ نہ کریں گے۔ اس کے بعد ان کی نیند اس وجہ سے حرام ہو گئی کہ جرمنی پر ایک طرف سے روس اور دوسری طرف سے فرانس کا حملہ ایک ہی وقت میں ہو سکتا تھا۔ اب وہ اس یورپ کو جس نے ان کی غلامی منظور کر لی ہے امن اور آزادی عطا کرنا چاہتے ہیں اور ان قوموں پر اپنا غصہ اتارتے ہیں جن کی ضد لڑائی کو بند نہیں ہونے دیتی۔

جنوب مشرقی یورپ اور مشرقی بحر روم

سنہ ۱۹۴۰ء کے وسط تک ہر ہٹلر فرانس سے فارغ ہو گئے تھے۔ ناروے سے لے کر پرتگال تک شمال مغربی اور مغربی یورپ کے ساحل کو محفوظ کر لیا اور پھر انھوں نے جنوب مشرقی یورپ میں اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں رومانیہ کا بہت بڑا حصہ روس، ہنگری اور بلغاریہ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا اور باقی ملک پر جرمن ماہروں اور سپہ سالاروں کی حکومت ہو گئی۔ فرانس سے جنگ بند کرنے کی شرطیں طے کرتے وقت ہر ہٹلر نے مسولینی اور اٹلی کے مطالبوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا تھا۔ جنوب مغربی یورپ تب بھی انھوں نے من مانی کارروائیاں کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسولینی کو مفت مال ملنے کی امید نہیں رہی اور آخر اکتوبر میں اٹلی نے یونان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ سال کے دوران میں اٹلی کی ایک بڑی فوج مصر اور لیبیا کی سرحد پر آکر ڈٹ گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اٹلی کا بھی کوئی پروگرام ہے جس پر اب عمل کیا جائے گا۔ لیکن اٹلی نے دونوں طرف منہ کی کھائی۔ یونانیوں نے البانیہ

میں اس کی فوجوں کو متواتر شکستیں دیں اور مصر کی برطانوی فوج ایک ہلّے میں بن غازی تک پہنچ گئی اور اٹلی کی فوج کے بڑے حصے کو گرفتار کر کے اس کے سارے نفیس سامان پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے شاید اٹلی کو موقع دیا تھا کہ اپنے بل بوتے سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہو کرے۔ ممکن ہے ترکوں کا رویہ بدل جاتا اگر وہ دیکھتے کہ جرمنی اٹلی کی سیاست کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ اس لیے جرمنی نے اٹلی کی ذرا بھی مدد نہ کی اور اس کی ناکامیوں سے حکومت کی جو ہوا خیزی ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی خفیہ پولیس، اپنے ماہر اور اپنی فوج اٹلی میں مسلط کر دی۔ ادھر مشرقی افریقہ میں برطانیہ نے اٹلی کی تمام نوآبادیاں خالی کرا لیں۔

سنہ ۱۹۴۱ء شروع ہوا تو جرمنی کے پروگرام کے لیے میدان صاف تھا۔ یوگوسلاویہ سے کہا گیا کہ فاشست اتحاد میں شامل ہو جائے اور جب وہاں کی حکومت میں انقلاب ہو گیا اور جرمنی کا مطالبہ منظور ہونے کا امکان نہیں رہا تو جرمنی نے اعلان جنگ کا تکلف برتے بغیر یوگوسلاویہ اور یونان دونوں پر حملہ کر دیا ۶ اپریل۔ اس کے ایک دن بعد برطانیہ نے یونان میں اپنی فوج اتاری۔ برطانیہ نے یونان کو مدد پہنچانے کا وعدہ اس وقت کیا تھا جب اٹلی نے اس کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ شروع نومبر ۱۹۴۰ء میں برطانیہ نے جزیرہ کریٹ پر احتیاطاً قبضہ بھی کر لیا تھا لیکن جو فوج یونان کی مدد کے لیے بھیجی گئی تھی وہ یوگوسلاویہ اور یونان کی کمزوری کے سبب سے جرمن فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ یوگوسلاویہ پر جرمنی نے تین طرف سے اتنا سخت حملہ کیا کہ یوگوسلاویہ فوج اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی اور اسے منتشر کر کے جرمن فوجیں وار دار اور ستروما کی وادیوں سے یونان میں داخل ہو گئیں۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ یونانی کوئی ایک محاذ قایم نہ کر سکے۔ ان کی فوج کا ایک حصہ جو وادی ستروما کی طرف جرمنوں کا رستہ روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا گھیر لیا گیا اور دشمن نے سالونیکا پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی فوج کی دشمن سے پہلی جھڑپ درہ موناستیر میں ہوئی، اور اس کے بعد جرمن اپنی تعداد کے زور سے برطانوی فوجوں کو پیچھے ہٹاتے رہے۔ اگر اس وقت وہ یونانی فوج جو البانیہ میں تھی پیچھے ہٹ کر مقدونیا کو چھوڑ کر برطانوی فوج سے مل جاتی اور شمالی یونان میں ایک محاذ قایم کر لیا جاتا جو لمبائی میں کم اور گہرائی میں زیادہ ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جرمن سیلاب روک نہ لیا جاتا لیکن یونان کی یہ فوج گھیر لی گئی اور اس نے ہتھیار ڈال دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی فوج کا بایاں بازو مارا جا سکتا تھا اس کے علاو

مستقل محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ اس لیے برطانوی فوجیں واپس بلالی گئیں (۲۴ اپریل
یکم مئی)

اس جنگ کی مختصر مدت کے اندر جرمنی نے بحر ایجین کے تمام جزیروں پر قبضہ کرلیا تھا اور برطانوی فوج کو یونان چھوڑے بیس دن نہیں ہوئے تھے کہ کریٹ پر ہوائی حملہ ہوا اور پھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بڑی تعداد میں فوج اتاری گئی۔ بارہ دن تک اس جزیرے میں گھمسان کی لڑائی ہوئی اور آخر میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ برطانوی فوج وہاں سے ہٹالی جائے (۲۰ مئی - یکم جون)

برطانیہ نے جو فوج یونان بھیجی تھی وہ بڑی حد تک وہی تھی جس نے لیبیا فتح کیا تھا۔ شروع فروری میں وہ اُدھر سے فارغ ہوئی تھی اور اس کے بعد اسے یونان پہنچانے کا انتظام کیا گیا۔ اسی دوران میں جرمنی نے صقلیہ اور طونس کی طرف سے ایک زبردست فوج لیبیا میں اتار دی۔ برطانوی سپہ سالاروں کا یہ منشا نہ تھا کہ بن غازی یا شمالی لیبیا پر مستقل قبضہ رکھیں اور اس کے لیے ان کے پاس سامان اور آدمی بھی نہ تھے۔ اس لیے جو تھوڑی سی فوج لیبیا میں تھی وہ مصری مورچوں پر واپس آگئی۔ اور اٹلی سے جو مورچے چھینے گئے تھے ان میں سے صرف طبروق میں ایک محافظ فوج چھوڑی گئی۔ لیبیا کا ریگستان اس قابل نہیں ہو کہ اس کے لیے سپاہی اور سامان جنگ کی قربانی کی جائے۔ برطانیہ نے اٹلی کی فوج کو اس لیے بھگا دیا تھا کہ وہ مکھی کی طرح مصر پر آکر بیٹھ گئی تھی۔ غالباً افریقہ میں جنگ کرنا جرمنی کے پروگرام یا یوں کہیئے کہ پروگرام کے دوسرے حصے میں جس پر عمل کیا جارہا تھا شامل نہیں تھا لیکن اگر برطانوی فوجیں طونس کی سرحد تک پہنچ جاتیں تو اس سے جرمنی کی آئندہ سیاست یعنی پروگرام کے تیسرے حصے پر بہت برا اثر پڑسکتا تھا۔ اس سال کے آخر میں فرانس اور جرمنی کے درمیان وہ سمجھوتا ہوگیا جس کی عرصے سے کوشش جاری تھی اور نومبر کے آخر میں ایک زبردست معرکے کے بعد جرمن فوجیں بتدریج مغرب کی طرف ہٹنے لگیں۔ ممکن ہو وہ لیبیا کو خالی کر دیں اور طونس ہی میں اپنے قدم جمائیں جو اٹلی سے بہت قریب ہو اور جہاں فوج اور سامان جنگ پہنچانا بہت آسان ہوگا۔

جرمنی اور روس | جرمنی اور روس کی صلح بھی بڑی بات تھی اور جنگ بھی بڑی بات ہو۔ ان کے درمیان صلح ہوجانے کے معنی یہ تھے کہ جرمنی آزادی سے مغربی یورپ کی قوموں سے جنگ کرسکتا ہو اور ہر ہٹلر یہ سمجھتے تھے

کہ ان کے درمیان جنگ ہونے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مغربی یورپ کی قومیں جرمنی سے صلح کر لیں گی۔ اسی خیال سے ہٹلر کے نائب ہس مئی میں برطانیہ پہنچے لیکن جو کچھ وہ کہہ سکتے تھے اس کے باوجود برطانیہ اور امریکہ کا رویہ نہیں بدلا اور ۲۲ جون کو جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ لوگوں کو عادت ہے کہ جب لڑائی ہو تو اس کے اسباب پوچھیں اور جرمنی نے اعلان جنگ کیا تو اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہٹلر نے یہ غلط فہمی پیدا کرنا چاہی کہ روس نے درہ دانیال کا مطالبہ کیا تھا اور جرمنی کو دغا دینے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن اس کا منشا ترکوں کو روس سے الگ رکھنا تھا اور غالباً اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں۔ جرمنی نے یورپ پر تسلط حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے اور یہ ارادہ صرف لڑ کر ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ مشرق میں روس اور مغرب میں فرانس سے ایک ہی وقت میں لڑنا پڑے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں اسے روس سے دوستی کا معاہدہ کرنے کا موقع مل گیا اور سنہ ۱۹۴۰ء میں اس نے فرانس کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا۔ برطانیہ اور فرانس نے ذرا بھی ڈھیل دی ہوتی تو ممکن تھا کہ روس سے پہلے جنگ ہو جاتی اور فرانس سے بعد کو ہوتی بہر حال دونوں طرف جنگ کرنا جرمنی کے پروگرام میں تھا اور جب مغربی اور جنوب مشرقی یورپ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تو روس پر حملہ کر دیا گیا۔ غالباً اس حملے کا کوئی فوری سبب نہیں تھا۔

اس جنگ کو جس لحاظ سے بھی دیکھیے دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار رہے گی۔ اس سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر اور اس شدت کے ساتھ کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے اور نہ شاید رسد کے مسائل کبھی اتنے مشکل ہوئے ہوں گے۔ جنگ شروع ہونے کے مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد جرمن سپہ سالاروں کو معلوم ہو گیا کہ لڑائی کا وہ طریقہ جو فرانس میں کامیاب ہوا تھا روس میں کارآمد نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ملک بہت بڑا تھا۔ شہر بہت دور دور تھے اور فوج کی طرح عام آبادی بھی اس پر تلی ہوئی تھی کہ کبھی ہار نہ مانے۔ فرانس میں جب جرمن ٹینک فرانسیسی فوج کے پیچھے پہنچ گئے تو تمام آبادی اور فوج میں وحشت اور مایوسی کی ایک وبا پھیل گئی جس نے جرمنی کا کام بہت آسان کر دیا۔ روس میں یہ کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگرچہ جرمن فوجیں برابر بڑھتی رہیں۔ روسی فوج کے جو حصے جرمن ٹینکوں اور پیادہ فوج کے درمیان گھر جاتے وہ ہتھیار ڈال دینے کے بجائے جان کے بدلے جان لیتے اور اس طرح جرمن ٹینک جن کا کام یہ تھا کہ روسی فوج میں گھس کر اس کے پیچھے پہنچ جائیں رسد کا انتظام درہم برہم کر دیں اور روسی فوج

کو پسپا ہو کر نیا محاذ قایم کرنے کا موقع نہ دیں۔ پیادہ فوج سے بہت دور نکل جاتے اور ان کے درمیان اتحاد عمل، جو اس طریقے کی کامیابی کے لیے لازمی ہو قایم نہ رہتا۔ ٹینکوں کا بہت کچھ نقصان اٹھانے کے بعد جرمن سپہ سالاروں نے پھر پرانا طریقہ اختیار کیا مگر اس کے ساتھ اس علاقہ میں جس پر ان کا قبضہ ہوتا رسد پہنچانے کے لیے ریلیں اور سڑکیں بناتے جاتے۔ جرمن لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ روس کا محاصرہ کر لیا جائے اور جو روسی فوجیں جنگ کے میدانوں سے سلامت بچ نکلیں انہیں لینن گراڈ، ماسکو اور جنوبی روس کے کسی مرکزی مقام پر گھیر لیا جائے۔ اس وقت تک جب کہ سردی کی شدت نے لڑائی جاری رکھنا محال کر دیا تھا لینن گراڈ کا پورا محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ ماسکو تین طرف سے گھر گیا تھا اور جنوبی روس میں جرمن فوجیں روسٹوف تک پہنچ گئی تھیں۔ سردی کی شدت کے باوجود روسی فوجیں مقامی طور پر لڑتی رہیں اور آخر سال تک ان کے جگہ جگہ پر پیش قدمی کرنے اور جرمن فوجوں کو پیچھے ہٹانے کی خبریں آتی رہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جرمنی نے لینن گراڈ، ماسکو اور ٹگن روگ سے مغرب کی طرف کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا ہو۔ روس کی بھاری صنعت کے مرکز زیادہ تر اسی علاقے میں ہیں اور یہیں کی زرعی پیداوار سے روس کا کام چلتا ہو۔ دوسری طرف جرمنوں کے لیے یہ بہت الجھن اور کسی قدر نقصان کی بات ہو کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود روس کی فوجی طاقت کو زائل نہ کر سکے اور ان کا نہ لینن گراڈ پر قبضہ ہو سکا نہ ماسکو پر۔ روسٹوف سے انہیں پسپا ہونا پڑا اور اس طرح شمالی ایران اور قفقاز کی طرف سے جو مدد روس کو بھیجی جا رہی ہو اس کا رستہ نہیں روکا جا سکا اور قفقاز کا تیل بھی ان کے ہاتھ نہ آیا لیکن اس جنگ کے حساب کتاب کو ابھی بند نہ سمجھنا چاہیئے۔

عراق، شام اور ایران پر برطانیہ کا تسلط | وسط اپریل میں جب جنوب مشرقی یورپ میں میدان کارزار گرم تھا، برطانیہ کو عراق کے معاملات میں مداخلت کرنے اور ملک پر تسلط حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ شروع مہینے میں وہاں راشد عالی نے جو وزیر اعظم رہ چکے تھے فوج کی مدد سے حکومت پر قبضہ کیا اور ان کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس معاہدے کی پابندی نہیں کریں گے جس میں عراق اور برطانیہ کے حقوق اور فرائض معین کیے گئے ہیں۔ ۱۱ اپریل کو برطانیہ کی ایک فوج بصرہ پہنچی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ عراق میں برطانیہ کے جو فوجی مرکز ہیں ان کے درمیان رستہ صاف رکھے۔ راشد عالی نے فوج کے آنے پر تو اعتراض نہیں کیا لیکن ۲ مئی کو بغداد کے قریب

ایک ہوائی مرکز پر عراقی فوج نے حملہ کر دیا۔ یہ کارروائی ایسی تھی کہ جس سے راشد عالی کی سیاست کے بھید کھل گئے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ راشد عالی نے جرمنی سے مدد مانگی اور جب مدد نہیں ملی تو عراق سے بھاگ کر ایران چلے گئے۔ برطانیہ نے امیر عبداللہ کو دوبارہ ریجنٹ بنا دیا اور عراق کا ہنگامہ ختم ہو گیا۔

یہاں جو کچھ ہوا تھا صرف ایک حد تک جرمن سازشوں کا نتیجہ تھا۔ شام میں فرانسیسی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ جرمنی کا آلۂ کار بننا چاہتی ہے اس نے جرمنی کو اپنے ہوائی اسٹیشن استعمال کرنے کی اجازت دیدی تھی کہ وہ ادھر سے عراق جا سکیں، جرمنی کے بہت سے ہوائی جہاز اور ماہر شام پہنچ گئے تھے اور ان دونوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وسط مئی میں برطانیہ نے آزاد فرانسیسی حکومت کے مشورہ سے شام پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا۔ برطانوی اور آزاد فرانسیسی فوجیں شروع جون میں شام کے اندر داخل ہوئیں اور قریب ایک مہینے میں پورے ملک پر قبضہ ہو گیا۔ ۱۵ر جولائی کو ایک معاہدہ ہو گیا جس میں سب کی عزت اور سب کے حق کا یکساں طور پر لحاظ رکھا گیا اور اس کا اندیشہ نہ رہا کہ جرمنی فرانسیسی حکومت کی نیازمندی سے فائدہ اٹھا کر شام میں فساد برپا کرے گا۔

عراق و شام ہی جرمن سازشوں کا مرکز نہیں تھے۔ ایران میں بھی جرمنوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں سے بعض پرانے سرکاری ملازم تھے اور بہت سے جنگ شروع ہونے کے بعد بھی آئے تھے۔ برطانیہ اور روس دونوں کے لیے لازمی تھا کہ اس طرف سے اطمینان حاصل کریں اور جب رضا سے گفتگو کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو روس اور برطانیہ نے متفقہ طور پر کارروائی کرنا مصلحت سمجھا۔ ۲۵ر اگست کو شمال سے روسی اور جنوب سے برطانوی فوجیں ایران میں داخل ہوئیں، فوج نے کہیں کہیں پر مخالفت کی مگر رضا شاہ نے دو دن کے اندر صلح کی درخواست کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضا کی حکومت سے ایرانی بہت ناخوش تھے کیونکہ برطانیہ سے صلح ہوتے ہی رضا شاہ حکومت سے دست بردار ہو گئے۔

<u>خلاصہ</u> | سیاست اور جنگ کی ان وارداتوں کو اس پروگرام کی روشنی میں دیکھیے جو جرمنی نے بنایا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ جرمنی نے پروگرام کے دوسرے حصے کو پورا کر لیا ہوتا اگر روس اتنے استقلال سے مقابلہ نہ کرتا۔ اب جرمنی کے لیے اس حصے کی تکمیل باقی ہے۔ اگلے سال پر چھوڑ دی گئی ہے لیکن مسلسل جنگوں میں جرمنی کے اتنے آدمی

اور اتنا سامان کھپا دیا گیا ہو کہ وہ اس کام کو نہ کر سکے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔ روس کے استقلال کا ساتھ برطانیہ کا استقلال بھی ایسی رکاوٹ ہو جو جرمنی کو ایک نہ ایک دن بالکل عاجز کر دے گا۔ برطانیہ جرمنی کے پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل میں اس طرح مخل ہو کہ وہ جرمنی پر ہوائی حملے کر رہا ہوا اور روس کو مدد پہنچ رہا ہو لیکن برطانیہ سے اصل مقابلہ پروگرام کے تیسرے حصے میں ہوگا جب جرمنی اس کی کوشش کرے گا کہ بحر روم کے جنوبی ساحل اور مشرق قریب کے ممالک پر تسلط حاصل کرتے۔ اس جنگ کے محاذ جبرالٹر، مالٹا، مصر، فلسطین شام، عراق، ایران میں ہوں گے اور ان محاذوں پر برطانیہ نے اپنے آپ کو ہر طرح سے محفوظ اور مقابلے کے لیے تیار کر لیا ہو ان محاذوں پر جرمنی کے لیے لڑنا ضروری ہو کیونکہ بحر روم یورپ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہاں پر جرمنی کی شکست یقینی ہو اگر جنگ کا سامان اسی رفتار سے تیار کیا جاتا اور ہر طرف بھیجا جاتا رہا جیسے کہ اب ہو رہا ہو۔

برطانیہ اور امریکہ | یورپ کی ہر لڑائی پر امریکہ کے رویئے کا بہت اثر پڑتا ہو اس لیے کہ یہاں کے کارخانے اور کارپردازی، دولت اور اسے صرف کرنے اور بڑھانے کی خواہش ایسی ہو کہ جسے اس کا سہارا ملے اس کا پلہ بھاری ہو جاتا ہو۔ برطانیہ کو جنگ شروع ہونے سے پہلے بھی پریزیڈنٹ روزولٹ کی ہمدردی حاصل تھی جنگ شروع ہونے کے بعد برطانیہ کو ہر قسم کا خام اور تیار کیا ہوا مال امریکہ سے ملتا رہا اور جب برطانیہ نے نقد قیمت ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی تو پریزیڈنٹ روزولٹ نے ادھار اور پٹے کا قانون پیش کرایا جسے فروری ۱۹۴۱ء میں کانگریس نے منظور کر لیا۔ قانون کی تجویز پیش کرنے سے پہلے ادائگی کی ایک اور صورت بھی اختیار کی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ برطانیہ نے مغربی بحر اٹلانٹک کے مورچے اور بندرگاہیں جن پر اس کا قبضہ تھا ۹۹ سال کے لیے امریکہ کے حوالے کر دیے۔ یہ صرف لین دین کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ مغربی اٹلانٹک میں پہرہ دینا امریکہ کے بیڑے کے ذمہ ہو گیا اور برطانیہ کے بہت سے جنگی جہاز ملک کی حفاظت اور تجارتی جہازوں کی نگہبانی کے لیے خالی ہو گئے۔ اس کے علاوہ مورچوں کے بدلے برطانیہ کو بہت سے ڈسٹرائر بھی مل گئے جن کی اسے سخت ضرورت تھی۔ ادھار اور پٹے کے قانون کے ساتھ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان اتحاد عمل بڑھنا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر آئس لینڈ اور گرین لینڈ پر قبضہ کیا اور

تجارتی جہازوں کی آمد و رفت کے لیئے ایک رستہ سا بن گیا کہ جس پر مسلسل پہرہ رہتا اور جہاں دشمن کا پہنچنا مشکل تھا۔ اسی رستے پر چھاپے مارنے کے لیے جرمنی کا جہاز بسمارک بھیجا گیا تھا جو ایک بڑے معرکے کے بعد ڈبو دیا گیا۔

پریذیڈنٹ روزولٹ خود برطانیہ کی ہر طرح مدد کرنا چاہتے تھے۔ امریکہ اور برطانیہ کے اخلاقی اتحاد کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے بحر اٹلانٹک میں مسٹر چرچل سے ملاقات کی لیکن ان کے لیے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ امریکہ کے قانون غیر جانبداری کی وجہ سے امریکہ کے تجارتی جہاز مشرقی بحر اٹلانٹک میں ایک خاص حد کے آگے جا نہیں سکتے تھے۔ گرین لینڈ اور آئس لینڈ پر قبضہ کیا گیا اور امریکہ کے جہاز وہاں تک جانے لگے تو جرمن آبدوزوں نے ان کو ڈبونا شروع کر دیا۔ اس کے جواب میں پریذیڈنٹ روزولٹ نے امریکہ کے تجارتی جہازوں کو توپیں رکھنے اور آبدوزوں سے بچنے کے لیے ان پر گولہ باری کرنے کی اجازت دیدی لیکن صلح اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق آخری فیصلہ کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ جہازوں اور آبدوزوں کے کپتانوں کو دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے کچھ دن پر بار رہنے کے بعد یہ ہنگامہ دب گیا۔ پھر بھی پریذیڈنٹ روزولٹ نے قانون غیر جانبداری میں ایسی ترمیم کرالی کہ جرمن آبدوز امریکہ کے تجارتی جہازوں کا شکار نہ کر سکے اور تجارتی جہاز جنگی جہازوں کی نگہبانی میں برطانیہ تک جا سکیں۔

جاپان، امریکہ اور برطانیہ | یورپ میں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی جاپان نے چین کے آباد اور زرخیز علاقے پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس قبضے کی وجہ سے وہ تمام ناگوار صورتیں پیدا ہوتی رہیں گی جو کہ غیروں کی حکومت کے ساتھ لازمی ہیں اور ایسا کوئی بڑا فائدہ حاصل نہ ہوگا جس کی خاطر زبردستی کی جاتی ہے اور بدنامی گوارا کی جاتی ہے۔ دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ جن کی مدد سے چین کی قومی حکومت لڑائی جاری رکھ سکی تھی۔ دونوں یہ دیکھ رہے تھے کہ جاپان انھیں چین سے بے دخل کر رہا ہے اور کسی قسم کے سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ایک عرصے تک کشیدگی رہی جو آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، کانگریس نے بحر الکاہل کے جزیروں کی مورچہ بندی اور ایسی بندرگاہوں کی تیاری کے لیے بہت بڑی رقم منظور کی جو جنگ کے بحری مرکزوں کا کام دے سکیں۔ پریذیڈنٹ روزولٹ نے اس معاہدے کو جس کے ماتحت امریکہ اور جاپان کے درمیان تجارت

ہو رہی تھی منسوخ کرنے کا نوٹس دیا اور چھ مہینے بعد جنوری ۱۹۴۰ء میں یہ منسوخ ہو گیا۔ برطانیہ اور جاپان کے درمیان تجارت خود ہی کم ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۱ء کے وسط میں جاپان نے فرانسیسی ہندچینی کی بندرگاہوں اور ریلوے لائنوں پر قبضہ کیا اور وہاں فوج اور سامان جنگ جمع کرنے لگا تو امریکہ اور برطانیہ کو یقین ہو گیا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا پر تسلط حاصل کرنا چاہتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ جاپان نے ڈچ مشرقی ہند کی حکومت سے اسی انداز سے گفتگو شروع کی جو اس نے ہندچینی میں اختیار کی تھی۔ جاپان کی ان کارروائیوں کے جواب میں پریزیڈنٹ روزولٹ نے جاپان کے ہاتھ پٹرول اور لوہے کا سامان بھیجنے کی ممانعت کر دی۔ برطانیہ اور امریکہ میں اس وقت تک ایسا اشتراک عمل ہو گیا تھا کہ جو ایک کرتا وہی دوسرا بھی کرتا۔ برطانیہ نے بھی جاپان کے ساتھ تجارت بند کر دی اور پھر روپیہ کا لین دین بھی روک دیا۔ تجارتی بائی کاٹ کی یہ حالت قائم نہیں رہ سکتی تھی خصوصاً جب فرانسیسی ہندچینی کی جاپانی فوجوں کے مقابلے میں برطانیہ نے مجبوراً ملایا اور برما میں فوجیں بھیجیں اور اس بیڑے میں اضافہ کیا جو سنگاپور میں رہتا تھا۔ جاپان نے امریکہ سے گفتگو شروع کی جس کے متعلق وضاحت سے ابھی تک کچھ معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی گفتگو کے دوران میں جاپان کی حکومت بدلی، جنرل ٹوجو وزیر اعظم ہوئے اور امریکہ سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے یہ بھی طے کر لیا گیا کہ جنگ کی جائے گی۔ ۷؍ دسمبر کی صبح کو جاپان کے ہوائی جہازوں نے جزائر فلپائن اور ہوائی پر بمباری کی اور اسی کے ساتھ ہانگ کانگ اور سنگاپور پر حملے ہوئے اور شمال مشرقی ملایا میں ایک جاپانی فوج اتار دی گئی۔ اعلان جنگ کی کارروائی ضمنی تھی۔ جاپان کی تائید جرمنی اور اٹلی نے بھی امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح فاشسٹ ملک ایک طرف اور جمہوری ایک طرف ہو گئے اور وہ جنگ جو اب تک اصل یورپی تھی واقعی عالمگیر ہو گئی۔

مشرقی دنیا کی جنگ | امریکہ اور جاپان کے درمیان فاصلہ اتنا ہے کہ ان کے لیے ایک دوسرے سے جم کر لڑنا بہت مشکل ہے اور امریکہ نے اس خیال سے کہ جاپان کو اعتراض ہوگا، بحرالکاہل کے ان جزیروں کی جو جاپان کے نسبتاً قریب ہیں جیسا کہ چاہیے تھا مورچہ بندی بھی نہیں کی۔ جاپان نے جنگ شروع کرتے وقت یہ ارادہ کیا کہ امریکہ کے لیے محاذ قائم کرنے کی کوئی صورت ہی نہ رکھے اور اسی وجہ سے جزائر ہوائی، ویک، مڈوے، گوئیم اور

فلپائن پر حملے کرکے وہاں کے بندرگاہوں کو مٹا دینے کی کوشش کی تھی اس لیے کہ امریکہ جنگ کے لیے تیار ہو سکے لیکن جاپان کا اصل محاذ جزیرہ نما ملایا میں ہوگا۔ اس کے جنوب میں سنگاپور کا مورچہ ہے، شمال میں برہما۔ جاپانیوں کے قدم یہاں جم گئے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ایک طرف وہ سنگاپور کا محاصرہ کر سکیں گے جس پر خالی بحری اور ہوائی حملے کرنا بے سود ہوگا اور دوسری طرف برہما میں بھی بڑھ سکیں گے۔ لیکن یہ سب وہ امکانات ہیں جو پروگراموں میں رکھے جاتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ جنگ کے لیے تیار تھے لیکن خاص اس وقت جب جاپانیوں نے پہلے وار کئے وہ تیار نہ تھے مگر یہ جنگ ایسی نہیں ہے کہ ایک دو وار کرنے سے اس کا فیصلہ ہو جائے اب جو یہ شروع ہو گئی ہے تو جاری بھی رہے گی اور جاپان کے لیے بڑے اندیشے کی بات یہ ہے کہ جاری رہے اور چند ابتدائی کامیابیوں کے سوا ان کے کچھ ہاتھ نہ لگے۔

محمد مجیب بی۔اے (آکسن)

رفتار تعلیم ۱۹۴۰ء

ہندوستان میں تعلیم کا مسئلہ عمل سے زیادہ ہنوز بحث و گفتگو کا مسئلہ ہے۔ خود ہندوستان کی بدنصیبی کہیے یا ہندوستانی کیریکٹر کی کمزوری کہ یہاں کام اکثر غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے یا نام و نمود کی دلدادگی اور ذاتی اغراض بعض لوگوں کو ایسی ذمہ داریاں اپنے سر لینے پر مجبور کرتی ہے جنھیں پورا کرنے کی ان میں اہلیت نہیں ہوتی۔ ہمارے ہندوستان میں تعلیمی ترقی تو درکنار یہاں یہ بنیادی بات ہی قطعی طور پر طے نہیں ہوئی ہے کہ بالآخر ہماری تعلیم کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے۔ ایسا فی الحقیقت ہے کیوں؟ اس کی وجہ کچھ وہی ہے جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ نصب العین سامنے رکھ کر ہی اس کی حصول یابی کے ذرائع سوچے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جب اس بنیادی بات پر بھی ہندوستانیوں کی ایک رائے نہیں تو اس کے ذرائع کی نوعیت میں کیا کچھ اختلاف نہ ہوگا لیکن یہاں اس اختلاف سے بحث کرنے کے بجائے بہتر یہ ہوگا کہ آپ کے سامنے زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں پیش کر دی جائیں جن پر عمل کیا جانا شروع ہو چکا ہے یا جنھیں کم از کم تجویز کا جامہ پہنا دیا گیا ہے اور جو یقیناً ہمیں کسی نہ کسی وقت ایک صحیح تعلیمی نصب العین کی طرف لے جائیں گی۔

ہندوستان میں سترہ یونیورسٹیاں ہیں اور اس وقت ایک لاکھ سے کچھ زائد طلبا ان میں زیر تعلیم ہیں یہ تعداد ملک کی آبادی کو دیکھتے ہوئے کسی شمار میں لائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ پھر بھی آج بے روزگاری جس قدر تعلیم یافتہ طبقے میں ہے اتنی ہاتھ سے کام کرنے والے طبقے میں نہیں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کی حیات و بقا سے تعلق رکھنے والوں کو بھی یہ تکلیف دہ احساس ہو چلا ہے۔ چنانچہ ختم ہونے والے سال کے بعض کنووکیشن کے خطبوں میں اعلیٰ تعلیم کو زمانہ کی ضرورتوں کا احساس دلانے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ اسی قسم کے احساس کا نتیجہ ہے کہ بمبئی یونیورسٹی نے اپنے یہاں لازمی فوجی تعلیم شروع کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آگرہ یونیورسٹی نے یہ طے کیا ہے کہ جب تک اس کے طالب علم ملیٹری سائنس کے کچھ ایک مقررہ تعداد میں نہ سنیں اس وقت تک انھیں امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ امسال

ہی الہ آباد یونیورسٹی نے ملٹری سائنس کو باضابطہ طور پر اپنے یہاں نصاب کا ایک مستقل مضمون قرار دیا ہے۔ کچھ اسی قسم کی کوششیں لکھنؤ اور بنارس یونیورسٹیوں میں بھی جاری ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں ایک اور قابل غور سوال مادری زبان کا تھا۔ غیر زبان کے ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان ہونے سے ہندوستانی طلبا کے راستے میں جو دشواریاں تھیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ثانوی تعلیم میں مادری زبان کو جو حق ملنا چاہئے تھا وہ مل گیا۔ اعلیٰ تعلیم میں مادری زبان کو ذریعہ امتحان بنانے کا اقدام لکھنؤ یونیورسٹی سے ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء سے بی اے، بی ایس سی، اور بی کام کے امتحانات میں طلبا کو مادری زبان میں جوابات لکھنے کی اجازت ہوگی۔ ۱۹ دسمبر کو لکھنؤ میں پہلی انگلش کانفرنس میں بھی یہ تذکرہ چھیڑا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں نے فیصلہ وہی کیا جو اس قسم کے لوگوں کو کرنا چاہیے تھا یعنی جب تک مادری زبان میں خاطر خواہ ادب تیار نہ ہو جائے۔ اس وقت تک ذریعہ تعلیم انگریزی ہی رہے۔ یہ فیصلہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی شخص سے کہیں کہ تم پہلے تیرنا سیکھ لو اس کے بعد تمھیں پانی میں اترنے کی اجازت ہوگی۔ ادب کی تیاری کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی ضرورت پیدا کرنا پہلی چیز ہے۔ اور ضرورت پیدا کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم اور ذریعہ امتحان بنا دیا جائے اسی سلسلے میں حکومت کے مرکزی تعلیمی بورڈ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اصطلاحات کے ترجمے کے سوال پر اپنی جنوری کی نشست میں غور کیا تھا اور ہمیں خوشی ہے کہ مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے اس اقدام سے متاثر ہو کر جنوبی ہند کے بعض صوبوں نے یہ کام نہایت سرگرمی سے شروع کر دیا ہے۔

وقت کی آواز پر اعلیٰ تعلیم کے ناخداؤں نے بھی صنعت و حرفت کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے۔ گزشتہ سال انھیں ایام میں (دسمبر ۲۷۔ ۳۰) سولھویں کل ہند تعلیمی کانفرنس کے موقع پر سر شاہ محمد سلیمان مرحوم نے اعلیٰ تعلیم میں ریسرچ کی کمی کی طرف اشارہ کیا تھا شکر ہے کہ اس کمی کا احساس تو ہوا۔ اور ہندوستان میں بھی اگرچہ دیر سہی، ایک علمی اور صنعتی ریسرچ بورڈ بنا تو سہی لیکن اس کام کے لیے صرف پانچ لاکھ روپے کی سرکاری منظوری کس قدر ناکافی ہے۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ انگلستان میں یہ بورڈ ۱۹۱۶ء میں قایم کیا جا چکا تھا اور اب اس کی سرکاری منظوری ایک کروڑ روپیہ سالانہ ہے۔ کناڈا جس کی آبادی صرف سوا کروڑ ہے۔

نیشنل ریسرچ کاؤنسل پر تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ ہر سال صرف کرتا ہو لیکن ہندوستان نہ انگلستان ہو نہ کناڈا ہندوستان ہندوستان ہو۔

اعلیٰ تعلیم میں جدید رجحانات اور تنظیم و تعمیر کے سلسلے پر ان سفارشات سے بہت کچھ روشنی پڑتی ہے جو یو۔ پی گورنمنٹ کی قایم کردہ تنظیمی کمیٹی نے پیش کی ہیں۔ اس کمیٹی کا خیال ہو کہ جلد از جلد اعلیٰ تعلیم کو صوبے میں زندگی کے ہر شعبہ کی ضروریات پوری کرنے کا اہل بن جانا چاہیئے اور حرفتی تعلیم کی عام سفارش کے ساتھ ساتھ شعبہ فنون لطیفہ اور شعبہ تعلیم میں اضافوں کی تجویز کی ہو۔ کانپور میں صنعتی اور حرفتی تعلیم کی تنظیم کے لیے ایک نئی یونیورسٹی کھولنے کا مشورہ بھی سفارش میں شامل ہو۔ یونیورسٹیوں کے باہمی مراسم میں خوشگواری پیدا کرنے کے لیے اس بات کی سفارش کی گئی ہو کہ ایک یونیورسٹی کے ریسرچ اور پوسٹ گریجویٹ طلبا کو دوسری یونیورسٹی میں لکچر سننے اور کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ "ہندوستانی" کا ایک پرچہ ڈگری کورس میں اُن طلباء کے لیے داخل کر دینا چاہیے جو ثانوی تعلیم میں ہندوستانی سے بے بہرہ رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں بھی ہندوستانی ایک لازمی مضمون ہونا چاہیے۔

یہ سفارشات یو۔ پی میں یونیورسٹیوں کی تنظیم کے متعلق ہیں۔ لیکن کیا اچھا ہوا گر اور صوبے بھی اس طرف توجہ کریں۔ کل ہند انٹر یونیورسٹی بورڈ کی بعض سفارشات بھی قابل ذکر ہیں۔ میڈیکل کالج کے طلبا کے لیے خاص طور پر اپنے تجربے کے اضافہ کے لیے ملک کے دوسرے میڈیکل کالجوں میں تعلیم کے بقیہ مدارج طے کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہو۔ اسی کے ساتھ بعض مقامات پر قانون کے کلاسوں میں صرف انٹرمیڈیٹ پاس کیے ہوئے طلبا کو داخلہ دینے کی مخالفت کی گئی ہو۔ بورڈ نے خواتین کے لیے ان کی صنفی خصوصیات کے اعتبار سے گھریلو سائنس، موسیقی اور فنون لطیفہ کی قسم کے مضامین پر زور دیا ہو۔ اور اس طرح عام نصاب کے علاوہ اقتصادیات، سیاست، امور عامہ، تنقید، تاریخ اور نفسیات وغیرہ مضامین میں ڈگری اور ڈپلوما دینے کی سفارش کی ہو۔ یونیورسٹی کے دائرہ عمل میں تعلیم بالغان وغیرہ کی قسم کی سماجی خدمت کو بھی شامل کرنے کا مشورہ دیا ہو اور سب سے زیادہ دلچسپ تجویز ایک یونیورسٹی کے استادوں کے دوسری یونیورسٹی میں تبادلے کی ہو تاکہ ہر یونیورسٹی کے طلبا ملک کے بہترین دماغوں کی سعی و کاوش سے براہ راست فائدہ اٹھا سکیں۔

طلبا کو تاریخی اور صنعتی مقامات پر بھیجنے اور مباحثوں اور کھیلوں میں بآسانی حصہ لے سکنے کے لئے ریلوے پر خاص رعایتی ٹکٹوں کا مطالبہ بھی اپنی جگہ بہت مستحسن ہے۔

اعلیٰ تعلیم چند گنے چنے لوگوں کا سوال ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اہم سوال ثانوی اور ابتدائی تعلیم کا ہے۔ ثانوی تعلیم کے متعلق بھی ابھی کوئی بات نہ ایسی طے پائی ہے اور نہ ہوئی ہے جسے ترقی کے لفظ سے معنون کیا جائے موجودہ ثانوی تعلیم کے نظام میں کچھ اس نقص کا احساس کیا جانے لگا تھا کہ ہمارا موجودہ دسواں درجہ اسکول لیونگ کلاس بھی ہے اور میٹریکولیشن کلاس بھی۔ اس مسئلہ پر مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ نے بھی گزشتہ سال جنوری میں غور کیا تھا لیکن ابھی تک کوئی عملی صورت سامنے نہیں آئی ہے۔ وقت کے تقاضوں کی گونج بعض مدارس میں ضرور سنائی دیتی ہے۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ لہذا صوبہ بہار کے ثانوی مدرسوں میں فوجی تعلیم جاری ہونے کی اسکیم زیر غور تھی۔ ناگپور کے بعض اسکولوں میں رائفل کلب بھی کھولے گئے ہیں بمبئی کی حکومت نے ہندوستانی مدارس میں صنعتی تعلیم کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے چھ ہائی اسکولوں کو زراعتی اور حرفتی ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ملک میں ان طلبا کے حرفتی تعلیم کے انتظام کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے جو ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ حکومت نے وقتی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں جنگی مستری مہیا کرنے کی غرض سے کافی حرفتی تعلیم کے مرکز قایم کر دیے ہیں۔ ان مرکزوں میں سب سے نیا مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا "ٹکنکل کالج" ہے۔ اس نوع کے انتظامات کی سب سے شاندار صورت دہلی "پولی ٹکنک" ہے۔ پولی ٹکنک کے چار شعبے ہیں۔ ایک ٹکنکل ہائی اسکول۔ دوسرا پیشوں کا شعبہ۔ تیسرا پیشوں کے استادوں کے لیے ٹریننگ کالج اور چوتھا جنگی مستریوں کا شعبہ۔ ٹکنکل ہائی اسکول مروجہ ہائی اسکول کے متوازی ہے۔ اس میں ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے لڑکوں کا داخلہ ہوتا ہے۔ ان کے پڑھنے لکھنے کی تعلیم عملی کام کے ساتھ ہی ہوگی جس کو بہر اعتبار فوقیت رہے گی۔ اس کی اونچی جماعتوں میں ۱۴ سال کی عمر میں ایک امتحان کے بعد داخلہ ہو سکے گا۔ چوتھے اور پانچویں سال میں ۷۵ فیصدی کام پیشہ کا کام ہوگا۔ حکومت کی کوششوں سے الگ بعض ریاستوں میں بھی صنعتی تعلیم کے لیے انتظامات جاری ہیں ان میں سے پہلا نمبر ریاست حیدرآباد کا ہے۔ ریاست رامپور گو بہت چھوٹی سی ریاست بھی

لیکن اپنے موجودہ سکریٹری تعلیمات کے خلوص و محنت کے باعث نمونہ کا تعلیمی کام کر رہی ہے۔ دوسری تعلیمی ترقیوں کے ساتھ یہاں بھی سال رواں میں ایک مختصر گر منظم طریق پر ایک صنعتی اسکول کھلنے والا تھا جس میں آٹھویں درجہ کے پچیس اچھے طلبا کو معقول وظیفہ دے کر داخل کرنے کی تجویز تھی اور پارچہ بافی چمڑہ سازی وغیرہ قسم کی چار صنعتیں داخل نصاب ہونا قرار پائی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈرائنگ حساب اور عام سائنس میں معقول تعلیم دینے کی تجویز بھی تھی۔

لیکن یہ چند مساعی ایسی نہیں ہیں جنھیں بہت زیادہ اہمیت دی جا سکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی کوئی صحیح تعمیری کام قابل ذکر پیمانے پر شروع ہی نہیں ہوا ہے۔ ثانوی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ پورے ہندوستان کی فضا میں اتنی بھی تو اہمیت نہیں رکھتا جیسے تاریکی کی ایک پوری کائنات میں کسی دور دراز تارے کی ایک ہلکی ہوئی کرن۔ عنقریب ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں میرٹھ میں کچھ لوگ تعلیم پر بات چیت کرنے کے لیے اکٹھا ہوں گے۔

مروجہ ابتدائی تعلیم کی داستان کسی خاص ذکر کے قابل نہیں ہے۔ بنگال میں ایک مستقل پنج سالہ پروگرام تیار ہوا ہے۔ احمد آباد نے ابتدائی مدرسوں میں بچے بچیوں کی تعلیم ایک ہی ساتھ کر دی ہے۔ بمبئی میں بچت کے خیال سے اسکول جانے کی عمر ۵ سال کی بجائے ۶ سال کر دی گئی ہے اور ۳۰ بچوں کی جماعت کے بجائے ۴۰ بچوں کی جماعت بننے کا حکم دیا ہے۔ سندھ میں لازمی ابتدائی تعلیم کی اسکیم زیر غور ہے اور تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں موسیقی لازمی کر دی گئی ہے۔ بعض جگہ ایک استاد والے ابتدائی مدرسوں کو دو استاد والا بنا دیا گیا ہے اور بس۔

فی الحقیقت ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ہمارا سب سے قیمتی تجربہ بنیادی قومی تعلیم کا تجربہ ہے۔ بنیادی قومی تعلیم کے لیے ختم ہونے والا سال ایک بدشگونی کے ساتھ شروع ہوا تھا یعنی یکم مارچ سے اڑیسہ کی حکومت نے اپنے پندرہ بنیادی مدرسوں اور ایک ٹریننگ اسکول کو بند کر دینے کا اعلان کر دیا۔ یہ چیز تکلیف دہ بھی تھی اور باعث مسرت بھی۔ تکلیف دہ اس لیے کہ جس تجربہ کو مشکل سے سات ماہ ہوئے تھے اس کے بالکل بیکار ہونے کا فیصلہ اڑیسہ کی حکومت نے اس قدر عجلت میں کیا جس کی مثال رکھنے والے لوگوں

کی حکومت سے امید نہیں ہو سکتی تھی اور باعث مسرت اس لیے کہ ایک صحیح چیز جس قدر جلد غلط ہاتھوں سے نکل آئے اچھا ہی ہے۔ ایک طرف اڑیسہ کی حکومت کا یہ اعتراض ہے کہ ہم مدرسوں کو کتائی گھر بنانا نہیں چاہتے اور دوسری طرف بنیادی تعلیم کو شکل و صورت دینے والے کے یہ الفاظ ہیں کہ چرخہ وہ لیا جائے جو ماحول کی زندگی میں ایک اہم مرکز ہو اور جو اپنے اندر زیادہ سے زیادہ تعلیمی اہمیت رکھتا ہو۔ اب اگر اڑیسہ کے مدرسے سچ مچ کتائی گھر (جنھیں شاید اڑیسہ والے بہت ذلیل سمجھتے ہیں) بن بھی جاتے تو قصور کس کا تھا بنیادی تعلیم کا یا اڑیسہ میں اسے جاری کرنے والوں کا؟ لیکن اڑیسہ میں یہ تجربہ حکومت کی حمایت کے بغیر بھی جاری ہے۔ محترمہ آشا دیوی (ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی معاون معتمد) کچھ مہینے اُدھر اڑیسہ کے ان بنیادی مدرسوں کے معائنہ کرنے کے لیے گئی تھیں جو اب نجی طور پر چلائے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اس کام میں پورے چھ دن صرف کیے۔ ان سات بنیادی مدرسوں کے لیے جو ہنوز جاری ہیں آشا دیوی صاحبہ نے ایک مرکزی اقامت گاہ، ایک کتب خانہ اور ایک معمل بنانا تجویز کیا ہے۔ تجربے کو جاری رکھنے کے لیے ہندوستانی تعلیمی سنگھ ہر ممکن مالی اور اخلاقی امداد کے لیے تیار ہے۔

صوبہ بہار میں یہ تجربہ اپنی پوری قوت کے ساتھ جاری ہے اور اس پر پورے سات سال صرف کیے جائیں گے یہاں تجربہ بیتیا تھانہ ضلع چمپارن میں ہو رہا ہے اور اس علاقہ کے پورے ۲۷ مدرسوں کا معائنہ اوائل مئی میں بہت چھان بین کے ساتھ کیا گیا تھا اور سچ تعلیم کے جتنے اچھے نتائج ممکن ہو سکتے ہیں — ہنرمندی، ضبط، ذہانت، اچھی عادتیں، تحقیق و شوق، سماجی اور طبعی ماحول سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت، اشتراک کا جذبہ وغیرہ سب ہی خصوصیات ان مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں میں دیکھی گئیں۔

یو۔ پی میں بھی یہ اسکیم حکومت کے ہاتھوں جاری ہے۔ پاول پرائس صاحب کی کوشش سے دیہات کے مدرسوں کے لیے ایک نمونے کی عمارت بن کر تیار ہوئی ہے۔ اس عمارت میں بچوں کے لیے ہر ضروری آرام ہوگا۔ اس عمارت کی لاگت صرف دو سو پچاس روپے آتی ہے۔ کشمیر میں بھی یہی بنیادی تعلیم رائج کی گئی ہے اور اس کا تجربہ بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور بچے بہت ذوق و شوق سے اس میں حصہ لے رہے ہیں۔

سی پی میں گو یہ تجربہ ہو ا حکومت کے ہاتھ میں لیکن اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ مسٹر آریہ نایکم سکریٹری ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے جو حال ہی میں شائع کی گئی ہے۔

"یکم مئی ۱۹۴۹ء کو سرکار نے ڈسٹرک کاؤنسل کے تیس پرائمری مدرسوں کا پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا........ لیکن حالت کچھ ایسی تھی کہ مدرسوں میں دستکاری کا سامان اگست تک نہ پہنچ سکا۔ تقریباً تین مہینہ تک بنیادی تعلیم کا نصاب بغیر کسی دستکاری کے پڑھایا گیا..... پورے پانچ مہینے تک ان استادوں کو تنخواہ ملی ہی نہیں جن کو سرکار نے ڈسٹرکٹ کاؤنسل سے اپنے ماتحت لے لیا تھا۔"

واقعات اور حالات کی یہ صورت دیکھ کر ممکن ہے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اور تعلیم کا کام کرنے والے کچھ مایوس ہوں لیکن حکومت اور تعلیم کے رشتے پر ایک تعلیمی بات پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے وہ الفاظ کافی ہوں گے جو انھوں نے ۱۱ اپریل کو بنیادی قومی تعلیم کی دوسری کانفرنس میں اپنے خطبہ میں کہے تھے۔

"..... بنیادی تعلیم کا کام ہے کس کا کام، حکومت کا یا نجی آدمیوں اور اداروں کا؟.........! میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے....... مگر بعض ریاستوں کی نیو اخلاق پر ہوتی ہے اور بعض کی نہیں ہوتی ...... بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ کام نہ پہنچے تو اچھا ہے۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ نہیں...... اگر ہمیں بھروسہ ہے کہ بنیادی تعلیم کا کام ہماری قوم کے لیے ضروری کام ہے تو ہمیں بیٹھے بیٹھے ریاست کا منہ تکنا نہ چاہیے....... ابھی سے اچھی ریاست بھی تو اپنے ایک اشارہ سے وہ چشمے نہیں بہا سکتی جس کے سوت پہلے سے رستے نہ ہوں۔ اس لیے اس کام کو تو چلانا ہی ہے اور اس طرح چلانا ہے کہ جب کوئی حکومت بنیادی تعلیم کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہے تو وہ یہ نہ کہہ سکے کہ ہم جانتے نہیں کہ یہ کام کیسے ہوگا اور ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

اور یہی نہیں جب حکومتیں اس کام کو سنبھال لیں اور اسے ہماری منشا کے موافق ہی چلائیں تو کیا اس وقت ہمارا کام ختم ہو جائے گا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں...... غیر سرکاری لوگوں پر کام کا بوجھ آج بھی اور کل بھی رہے گا......"

اسی خطبے میں آگے چل کر ڈاکٹر صاحب موصوف نے تعلیمی کام کی نوعیت واضح کر کے ان لوگوں کو پشیمان کیا ہے جو تعلیم میں ہاتھ کے کام کو گناہ سمجھتے ہیں۔

"ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے...... لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں ہے۔ ہنرمند چور بھی ہوتے ہیں ہنرمند دھوکے بھی دیتے ہیں ...... تعلیم کا ذریعہ تو وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت میں کیا جائے جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو...... کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجہ پر راضی نہیں ہوتا کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام دل لگی نہیں۔ کام کھیل نہیں۔ کام کام ہے۔ با مقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ پھر اس میں جو پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے کام عبادت ہے لیکن ریاضت اور عبادت میں بھی تو لوگ خود غرض ہو جاتے ہیں۔ اپنی جنت پکی کر لی دوسرے سے کیا مطلب۔ کام کا سچا مدرسہ اگر صحیح تعلیم کی جگہ ہے تو کام کو کبھی اکیلے کی خود غرضی نہیں بننے دیتا۔ بلکہ سارا مدرسہ کام کا مدرسہ ایک کام میں لگی ہوئی جماعت بن جاتا ہے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور سب کے کام ہی سے سب کا کام پورا ہوتا ہے...... اور پھر کام کا مدرسہ اس پر بھی راضی نہیں ہو جاتا کہ بچوں نے کام سے اپنی تربیت کر لی۔ کام سے اس کے بچے ایک سماج سی بن گئے اور اس کے فرض اور ذمہ داریاں جاننے اور سمجھنے ہی نہیں بلکہ برتنے اور اٹھانے بھی لگے بلکہ کام کا اچھا مدرسہ اس مدرسے کی سماج کو بھی کسی اونچے مقصد کا خادم بناتا ہے تاکہ کہیں یہ نہ ہو کہ بچے اکیلوں کی خود غرضی سے تو بچ جائیں مگر اس سے بچ کر سماجی خود غرضی کی دلدل میں پھنس جائیں۔"

آگے چل کر اس ہمارے رہنما نے ان لوگوں کو بھی ایک لمحہ کے لیے دعوت غور وفکر دی ہے جو بنیادی تعلیم کو برا جانتے ہیں۔

"......شاید آپ کو بنیادی تعلیم کے اس نصاب میں جو ایک نئی کمیٹی نے بنایا تھا کچھ باتیں نہ بھائی ہوں گی...... مگر نصاب بنیادی تعلیم کی اسکیم نہیں۔ نصاب اصول نہیں۔ نصاب ایسا نہیں کہ بدلا نہ جا سکے .... شاید آپ اس تجویز کو اس وجہ سے ناپسند کرتے ہوں کہ جنھوں نے اسے بنایا آپ کو وہ لوگ پسند نہیں لیکن ابھی اور ٹھیک بات تو اچھوں کا کھویا ہوا مال ہے۔ جہاں بھی ہو وہ اسے اٹھا لیتے ہیں۔ اس بات سے آپ کیوں اپنے فیصلہ پر اثر پڑنے دیں کہ پہلے یہ تجویز کس نے بنائی تھی اور کہاں بنائی اور کن لوگوں نے پہلے اسے مانا ہے۔ ناموں کی نہ پرستش ہی کرنی چاہیئے نہ ناموں سے یوں بھڑکنا چاہیے۔"

تعلیمی کام کی نوعیت کے متعلق کچھ یہی چیز ڈاکٹر صاحب موصوف نے سترہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں تعلیمی نمائش کا افتتاح کرتے وقت فرمایا تھا۔ لیکن ایک ڈاکٹر ذاکر حسین کس کس کو سمجھائیں اور کہاں کہاں جا کر ان باتوں کو کہیں۔ ملک کے ہر پڑھے لکھے آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مسئلے پر سوچے اور اگر خود سوچ کر اپنے خیالات کو اچھے الفاظ میں ظاہر نہ کر سکتا ہو تو ڈاکٹر موصوف کے یہ الفاظ زبانی یاد کرلے اور جہاں اسے موقع ملے ـــــ دوستوں کے مجمع میں، ریل کے ڈبے میں، سینما میں وقفے کے دوران میں ـــــ لوگوں تک یہ پیغام پہنچاتا رہے۔ کسی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے عوام کی ہم خیالی بڑی چیز ہے اور یہ چیز کوئی مشکل نہیں اگر ہر تعلیم یافتہ اپنے حلقۂ اثر میں اپنا فرض انجام دے۔

* بنیادی تعلیم میں سات سال کی عمر سے تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے لیکن تعلیم کی اس سے پہلے بھی ایک منزل آتی ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والوں نے ابھی اس مسئلہ کو اس لیے نہیں چھیڑا تھا کہ کام بہت ہے اور کام کرنے والے تھوڑے اس لیے انھوں نے اتنا کام تجویز کیا جو ہو سکتا تھا لیکن ہماری سترہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں صدارت کرنے مشہور وائس چانسلر جناب امرناتھ جھا صاحب نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں نرسری اسکولوں کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن میرے خیال میں نرسری اسکولوں کی ضرورت

ہندوستان میں پوری قوم کی ضرورت نہیں۔ یہ ضرورت زیادہ سے زیادہ ۲۰ فی صدی ہندوستانیوں کی ہوگی۔ ہمیں نرسری اسکولوں سے زیادہ ایسے مدرسوں کی ضرورت ہے جہاں بچے پیدا کرنے والے والدین کو یہ سکھایا جائے کہ بچوں کو پالا کس طرح جاتا ہے۔ اس چیز کو فی الحقیقت تعلیم بالغان کا جزو ہونا چاہیے اس کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں آرٹ کی تعلیم پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔ کچھ تعلیم بالغان کا ذکر ہے اور کچھ مذہبی تعلیم اور شیعہ انٹر کالج اور دہرم سماج ہائی اسکول کی نوع کے اداروں کا۔ ان تمام عنوانات پر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی ادبی قدر و قیمت تو زیادہ ہے لیکن تعلیم کا وہ کام کرنے والے جن کے سامنے آسمان کی بادشاہت کے بجائے ہر وقت وہ خطۂ خارجس رہتا ہے جسے ہندوستان کہتے ہیں ان باتوں میں بہت کم عملی اشارہ پائیں گے۔ "تعلیم بالغان کا مقصد ہر قسم کے بالغوں کی تعلیم کو زندگی کی عمر تک جاری رکھنا ہونا چاہیے اور وہ اگر کسان کے لیے ہو تو یونیورسٹی کے گریجویٹ کے لیے بھی ہو۔" یہ نصب العین تو بہت اچھا ہے لیکن اتنا بلند ہے کہ جہاں ہم اس وقت کھڑے ہوئے ہیں وہاں سے اس کی طرف اچکنے کی کوشش کی تو شاید پیروں تلے کی زمین بھی ہاتھ سے جائے۔ یہاں مسئلہ تیس کروڑ مرد اور عورتوں کو اپنا نام لکھنا سکھانا ہے انھیں ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ خریدنے کا سلیقہ سکھانا ہے اور انھیں جھونپڑی میں سی ایک ڈھنگ سے رہنے کی ترغیب دینی ہے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کا یہ ارشاد اس ضمن میں کس قدر بامعنی ہے کہ ہمارے تعلیم بالغان کے مرکزوں کو ہمارے بالغوں کے لیے وجہ کشش بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اور باتیں ہیں جن پر یہاں تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مدرس کو بھی اچھا بننے کی تلقین فرمائی گئی ہے لیکن مدرس کا اچھا بننا ایک پورے سماج کی اچھائی پر منحصر ہے یہ بات نہ معلوم کیوں فراموش کر دی گئی۔ اونچی اونچی تنخواہیں پانے والے کیا جانیں۔ یہ تو کچھ مدرس ہی سمجھ سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اپنے کا اچھا رہنا حقیقتاً کتنا دشوار ہے۔ کیا ہمارا موجودہ مدرسہ ہمارے اچھے مدرس کے لیے "جادا کی وادی موت" سے کم ہے؟

اصل میں اس سترہویں کل ہند تعلیمی کانفرنس میں جو کچھ ہوا وہ ان تلخ حقیقتوں سے بہت کچھ ہٹ کر جو آج ملک اور قوم کے سامنے ہیں۔ اور کس قدر ہٹ کر ہوا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس کانفرنس کا خطبہ صدارت پڑھیے۔ خواہ نرسری اسکول کا ذکر ہو یا آرٹ کی تعلیم کا۔ بالغوں کی تعلیم کا مسئلہ ہو، مدرسوں میں نئے

تعلیم کا سب میں بڑا ذہنیت جھلکتی ہے۔ ہندوستان میں آج جامعی تعلیم کا سوال نہیں ہے۔ ہمارا تعلیمی مسئلہ عوام کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

فی الحقیقت ہم لوگوں کی سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ ہم کہکشاں کے رومان سے متاثر ہو کر اس پگ ڈنڈی کو بھول جاتے ہیں جس کی گرد ہمارے جوتوں پر اٹی ہوئی ہے اور واقعات کو دیکھ کر صورت بہتر بنانے کی تدبیر سے زیادہ ان خوبصورت الفاظ کی رو میں بہنے لگتے ہیں جو دوسرے لوگ ہم تک کتابوں کے ذریعہ پہنچاتے ہیں اور لوگ بھی وہ لوگ ہم سے جن کے خیالات جدا، حالات جدا۔

یہاں تک پہنچ کر مجھے تعلیم بالغان کے سلسلے میں آپ کو پھر کچھ پیچھے لے جانا ہے — تعلیم بالغان کا چرچا ابھی جاری ہے دلی۔ یو۔ پی۔ بمبئی اور پنجاب میں یہ کام خاص اہتمام سے جاری ہے۔ ریاست کشمیر نے اپنے تمام ناخواندہ ملازمین کو ایک سال میں خواندہ بنانے کا اعلان کیا تھا۔ میسور میں بھی یہ کام پوری سرگرمی سے جاری رہا اور اس میں یونیورسٹی کے طلبا کی خدمات قابل ستایش ہیں۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں ۲۴ جماعتوں نے مختلف مرکزوں پر کام کیا۔ ضروری نقشوں، کاغذ اور پنسلوں وغیرہ کا انتظام ریاست کی طرف سے تھا۔ ان مساعی کا نتیجہ یہ ہے کہ امسال میسور میں خواندہ مردوں کی تعداد ۲۰ فی صدی ہے اور خواندہ عورتوں کی تعداد ۵ فی صدی ہے۔ ریاست رامپور میں بھی یہ خدمت بہت منظم صورت میں جاری ہے گزشتہ تعلیمی سال کے چند مہینوں میں تعلیم بالغان کے مرکزوں پر اکسٹھ ہزار کی حاضری تھی۔ امسال یہ تعداد بڑھ گئی ہوگی جس کے لیے محکمہ تعلیمات رامپور قابل مبارکباد ہے۔ اس سلسلے کی سب سے دلچسپ کوشش بہار میں ہوئی ہے۔ جمال پور ورک شاپ میں گردونواح سے تقریباً چھ ہزار مزدور روز جمال پور پہنچتے ہیں۔ ان مزدوروں کا آنے جانے کا سفر قریب دو گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خیال سے کہ

کیوں خموشی میں کٹے لمحۂ بربادیٔ دل

اتنی فرصت میں مرتب نئی دنیا نہ کریں

مسٹر احمد علی عالم انسپکٹر مدارس نے ایک اسکیم تیار کر کے ریلوے افسران کے پاس بھیجی ہے۔ اسکیم کے مطابق ان مزدوروں کو ان کے سفر کے دوران میں نہ صرف لکھنا پڑھنا سکھایا جائے گا بلکہ ان کو اُن کے پیشے

سے متعلق ایسی معلومات بھی بہم پہنچائی جائیں گی جو انھیں اور اچھا کاریگر بنا سکیں تعلیم بالغان کے سلسلے میں یہ مساعی کچھ زیادہ نتیجہ رس نہیں ہیں نئی مردم شماری کے اعداد و شمار آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ اس میں خواندہ لوگوں کی تعداد میں صرف تین چار فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ کاش ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے EACH ONE TEACH ONE والی رائے پر کام کرتے۔ جہاں تک تعلیم بالغان کے سلسلے میں ادب کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے اس سلسلے میں جامعہ ملیہ میں خاصا کام ہو رہا ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی نے اندھوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا تجربہ شروع کیا ہے۔ اس کام کے لیے ایک خاص آلہ (BRAILLE) کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ آلے جنگ کی وجہ سے یورپ سے نہیں منگائے جا سکے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی نے اپنا تجربہ جاری رکھنے کے لیے خود اپنے ہاں میں پچاس ایسے آلے بنا لیے ہیں۔ بمبئی نے آنکھیں رکھنے والوں اور زیادہ اچھی طرح تعلیم دینے کے لیے کچھ فلم تیار کیے ہیں۔ انھیں فلموں کو ماحول کے مطابق بنا کر سی۔ پی میں بھی استعمال کیا جائے گا۔

بہرحال یہ سال تعلیمی لحاظ سے کچھ نہ کچھ بیداری کا تو ضرور رہا ہے لیکن عمل تقریباً مفقود رہا اور کہا نہیں جا سکتا کہ کب تک مفقود رہے گا۔ خدا کرے نیا سال بہتر حالات پیش کرے۔

فضل الدین اثر ایم اے

اُردو ادب ۱۹۴۱ء میں

اس سال یورپ میں بڑی خوفناک لڑائیاں ہوئی ہیں اور جنگ کے شعلے اب مشرق میں بھی بھڑکنے لگے ہیں۔ دنیا چھوٹی بھی ہو گئی ہے اور پھیل بھی گئی ہے۔ اب کسی ملک کا مسئلہ صرف اسی ملک کا نہیں رہا ساری دنیا کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ زلزلہ کسی جگہ آئے اس کی دھمک ساری دنیا میں محسوس ہوتی ہے۔ ابھی تک ہندوستان والے دور سے تماشا دیکھ رہے تھے اب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ ان کے دروازے تک آگئی۔ کچھ گھبراہٹ پھر کچھ تسلی کچھ سکون، کچھ ہیجان، کچھ پریشانی مگر پھر یہ اطمینان کہ ابھی بڑے دن دور ہیں کچھ نامعلوم سا خوف، کچھ نامعلوم سی امید یہی اب تک ہماری کل کائنات ہے۔ اور ادب تو ہماری ہی زندگی کا آئینہ ہے گزشتہ چند سال سے اس میں بڑی تیزی سے بعض نئی باتیں آگئی ہیں۔ ذہنی اعتبار سے ہم کچھ آگے بڑھے ہیں۔ بڑھے کیا ہیں حالات نے واقعات نے آگے دھکیل دیا ہے مگر ہمارا دل پیچھے ہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے ادب میں کچھ اس تیزی سے نئے اثرات آگئے ہیں جیسے ایک ساتھ گرمی پڑنے سے بہت سے پھل پک تو جائیں مگر ان میں اچھی طرح رس نہ آیا ہو۔ شیرینی میں تلخی ملی ہوئی ہے۔ ہماری فطرت بچوں کی سی، ہماری امیدیں جوانوں کی سی مگر ہمارے عمل بوڑھوں کے سے ہیں۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہو گی۔ مگر ماضی کے سارے بوجھ کو لے کر مستقبل کی چڑھائی چڑھنا اور اس بوجھ سے ایک ایک چیز کو بادل ناخواستہ پھینکتے جانا اور پھر اس کی طرف حسرت سے دیکھتے بھی جانا۔ کچھ آگے بڑھنا کچھ ٹھہر جانا، اس پر تعجب کرنا کہ جب ہمارے بزرگوں کو کوئی جہاد ہی طے نہ کرنا پڑی تو ہم پر یہ مصیبت کیوں نازل ہو۔ پھر کچھ ہمت کر کے تیز قدم بڑھانا مگر اس تیزی کی وجہ سے جلد تھک جانا محض استعارہ نہیں ہماری زندگی کی بہت واضح تمثیل ہے۔

جنگ کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوئی ہیں ان میں کاغذ کی روز افزوں گرانی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سعدی نے لکھا کہ دمشق میں ایسا قحط پڑا تھا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے تھے۔ ہمارے یہاں بھی کاغذ کے قحط کی وجہ سے اظہار عشق پر اثر پڑا ہے۔ مگر اردو کی ترقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اچھے اچھے نئے رسالے

بجائے خود مکمل ہیں اور ابھی اچھی کتابیں برابر شائع ہو رہی ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں ایک مختصر سی فہرست ہے اس میں زیادہ تر ادبی کتابیں ہیں یہ فہرست مکمل نہیں ہے ۔ ۔ تک سب کتابیں چاہنے والے کتابوں پر اشاعت کا سال نہ چاہیں اور پرانی کتابیں پھر ریویو کرنے کیلئے بھیجیں۔ سال بھر کی مطبوعات کا جائزہ لینا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ شکر ہے بعض ادارے اب اپنی کتابوں پر اشاعت کے سال بھی چھاپنے لگے ہیں۔

اس سال کی کتابوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اب بھی ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ اب بھی دوسرے اور تیسرے درجے کے شاعروں کا ایک ٹڈی دل رسالوں، اخباروں اور آئے دن مشاعروں کے ذریعہ سے اپنے افکار کی نمائش کرتا رہتا ہے۔ ہر شاعر کو یہ ارمان ضرور رہتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے ایک مجموعہ بھی چھوڑ جائے یا مجموعوں کی کثرت سے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کر دے۔ جس نوجوان کے کلام کی ذرا شہرت ہوئی اور رسالناموں کے لیے کلام کی فرمائش ہونے لگی۔ اس کا ایک مجموعہ احباب کے اصرار سے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے علاوہ بعض اچھے شاعروں کے بھی مجموعے شائع ہو ہی جاتے ہیں۔ اس سال جو مجموعے شایع ہوئے ہیں تین قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ مجموعے آتے ہیں جو قدیم شاعروں کے ہیں۔ ان میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات ہر طرح اہم ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اسی کے دیوان میں ردیف وار ترتیب بھی ہے۔ قصیدوں اور غزلوں کی کثرت بھی۔ اس کا کلام ہر صنف سخن میں ہے اور اس سے غیر معمولی فنی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نے ہر موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور دراصل نظیر سے بہت پہلے مرقع نگاری، ہندوستانی ماحول، الم و درد، میلے ٹھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کلیات کا ایک صاف ستھرا اڈیشن شایع کر کے اردو ادب پر ایک احسان کیا ہے۔ عبدالقادر سروری نے کلیات سراج بڑی صحت سے مرتب کیا ہے۔ سراج بہت بلند پایہ شاعر ہے۔ ولی کی عظمت نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔ دہلی کے شاعر جب تتلا تتلا کر ریختہ کہہ رہے تھے اس وقت سراج بڑی بلند فضاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔ ولی کے وقت تک ہندی اور عجمی نقطۂ نظر کا توازن ملتا ہے۔ سراج نے عجمی نقطۂ نظر کو اور بھی ترقی دی۔ ان دو مجموعوں کے علاوہ طوطی نامہ اور قصۂ بے نظیر قدیم دکنی ادب کے غیر فانی کارنامے ہیں۔ ان کی اشاعت سے دکنی کارنامہ اور بھی وقیع ہو جاتا ہے۔ دراصل گزشتہ چند سالوں میں دکن کے اتنے شہ پارے روشنی میں

آئے ہیں اور معلومات کا اتنا اہم ذخیرہ ہمارے ہاتھ آگیا ہو کہ اردو کے قدیم ادب اور دوسرے پائے کی ابتدائی کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ ضرورت ہو کہ دکن میں اردو کی داستان تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ تنقیدی نقطۂ نظر سے پھر سے لکھی جائے۔ اس میں بہت سے نئے بت بنیں گے اور بہت سے پرانے بت ٹوٹیں گے۔

نول کشور پریس سے جناب آسی لکھنوی کی نگرانی میں کلیات میر کا ایک نیا اڈیشن شایع ہوا ہے پچھلے اڈیشن میں اس قدر غلطیاں تھیں اور اس کی ظاہری حیثیت ایسی گئی گزری تھی کہ ایک حسین مگر بدقوارہ عورت کا تصور ہوتا تھا۔ اس اڈیشن میں فورٹ ولیم والے نسخے سے خاص طور پر مدد لی گئی ہو اور اگرچہ اب بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں اور تنقیدی حصہ در اصل تبرک ہی ہو۔ مگر پھر بھی میر کے مطالعہ کے لیے یہ اڈیشن دوسرے نسخوں سے زیادہ مفید ہوگا

ابھی تک ہمارے نقادوں نے انتخابات کی طرف پوری توجہ نہیں کی ہو۔ قدما کو جو فرصت اور اطمینان میسر تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے شعرا نے بڑے بڑے دفتر چھوڑے ہیں۔ ان میں اچھے شعر بھی ہیں اور پست اور مبتذل اشعار بھی۔ ہر شخص کو نہ اتنا مقدور ہو نہ اتنی فرصت کہ اساتذہ کے سارے کلام کا مطالعہ کرے۔ اس لیے انتخابات کی صورت میں قدما کا کلام نشر کرنا زیادہ مناسب ہو۔ میر کے دو انتخاب موجود ہیں اور مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ اور انتخاب دونوں آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں" مگر حق تو یہ ہو کہ حق ادا نہ ہوا۔ اس سال کے دوران میں داغ کے دو انتخاب شایع ہوئے ہیں۔ ایک منتخب داغ کے نام سے آپ کے شاگرد مولانا احسن مارہروی مرحوم کا ہو۔ یہ انتخاب کا انتخاب ہو اور دیوان کا دیوان۔ پہلے حصے میں صرف وہ اشعار ہیں جو علت و اضافت سے خالی ہیں۔ دوسرے حصے میں ہر طرح کے اچھے اشعار ہیں۔ دوسرا نذیر نیازی کا ہو "بہار داغ" کے نام سے۔ دونوں کا تنقیدی حصہ بہت اچھا نہیں۔ مولانا احسن مرحوم نے تو یہ کیا ہو کہ دوسرے نقادوں کی رائے نقل کرنے پر اکتفا کی ہو۔ نذیر نیازی نے جو کچھ لکھا ہو وہ بہت ناکافی ہو۔ مگر یہ دونوں کتابیں داغ کے شائقین کے لیے بہت مفید ہیں۔

اگست ۱۹۴۱ء میں اس دور کے مشہور غزل گو شاعر فانی بدایونی کا انتقال ہوا۔ سیماب نے ٹھیک کہا تھا" غالب وقت و میر ثانی مرد" قدیم رنگ کے پرستاروں میں اس وقت فانی جس بلندی پر تھے

وہاں بہت سے لوگوں کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا یہ نہ تھا کہ فانی اپنے گرد و پیش نہ دیکھتے ہوں مگر انہیں تو ہر طرف ایک ہی چیز نظر آتی تھی وہ شب ہجر کے پرستار اور یاسیات کے امام اس لیے تھے کہ ان کی دنیا شب ہجر اور یاس ہی کا دوسرا نام بن گئی تھی۔ غالب کی فکر اور میر کا احساس اس زمانے میں صرف فانی نے پایا تھا۔ آخر میں وہ میر کے اور بھی قریب ہو گئے تھے اور وجدانیات فانی میں جو ایک چھوٹا سا مجموعہ ان کے کلام ہے اور جو ان کے مرنے سے چند ماہ پہلے شایع ہوا تھا میر کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے۔

فانی کے اس مجموعہ کے علاوہ مشہور شعرا میں سے سیاب کا بھی ایک مجموعہ سازو آہنگ کے نام سے نکلا ہے۔ سیاب غزل بھی اچھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ ان کے یہاں پختگی فن بھی ہے اور پاکیزگی ذوق بھی، وہ ان شعرا میں سے ہیں جو چلے تھے پرانے رنگ کی غزلوں سے، مگر جو زمانے کا رنگ دیکھ کر نئے رنگ کی نظمیں بھی لکھنے لگے ہیں۔ وہ بہت لکھتے ہیں اور بے تکان لکھتے ہیں۔ اور شاید انھیں احساس نہیں کہ اس بسیار گوئی کی وجہ سے کہیں کہیں وہ سپاٹ ہو جاتے ہیں۔ اختر انصاری کے قطعات کا ایک مجموعہ آبگینے کے نام سے نکلا ہے۔ آختر ہمارے نوجوان شعرا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ وہ لوگوں کے کہنے سننے سے وہ نہیں بن جاتے جو لوگ انھیں بنانا چاہتے ہیں وہ وہی رہتے ہیں جو ان کا دل انھیں بناتا ہے۔ وہ حسن کے پجاری اور نور و نغمہ کے شیدائی ہیں اور چاندنی کی ٹھلی اور لطیف روشنی کے گیت گاتے ہیں۔ ہماری اردو شاعری میں تخلیقی جذبہ بہت کچھ ضایع ہوتا ہے نیز نظم خیالات کا ایک جنگل ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وار بھرپور نہیں ہوتا اور اثر آفرینی مکمل نہیں ہو پاتی۔ قطعات میں خصوصاً دو شعر کے قطعوں میں ایک ہی خیال یا ایک ہی جذبہ دو سرے الفاظ میں ایک ہی وار ہوتا ہے۔ مگر اس کا اثر ذہن پر فوراً ہوتا ہے۔ اختر نے اس بات کو سمجھا بھی ہے اور برتا بھی۔

اقبال کے بال جبریل کا دوسرا اڈیشن بھی اس سال نکلا ہے۔ اردو میں یہ بھی غنیمت ہے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی مقبولیت میں ابھی کوئی کمی نہیں آئی اور ابھی کچھ عرصے تک ہمارے بڑے سے بڑے مفکر اور لطیف سے لطیف فن کار کے لیے اقبال کے کلام کی کشش باقی رہے گی۔ اسرار و رموز کا بھی ایک نیا اڈیشن نکلا ہے اور ایک صاحب نے تو اس کی شرح بھی لکھی ہے اور وہ بھی منظوم۔ ان کو چاہیئے تھا کہ کم از کم اقبال ہی سے سبق لیتے۔ سنائی کے قصیدے کی بحر میں کچھ اشعار لکھتے لکھتے، اقبال نے سنائی کے ادب کی وجہ سے

خواہش نہ کی مگر طارق صاحب اسرار و رموز کی منظوم شرح سے کسی طرح باز نہ آئے۔

اقبال کے بعد ہمارے انقلابی شعرا میں جوشؔ کا نام لیا جاتا ہے۔ اقبال بہت بڑے مفکر بھی تھے اور بہت بڑے شاعر بھی۔ جوشؔ کے یہاں فکر کا عنصر بہت کم ہے۔ وہ تو سرتا پا جذبہ اور احساس ہیں ان کی منظر نگاری ان کی تشبیہیں، ان کی طنز، ان کی خمریات بہت کامیاب ہیں۔ ان کی انقلابی نظموں میں بھی ایک جوش اور ولولہ ہے۔ اگرچہ ان میں وہ فنی بلندی توازن نہیں جو جذبات کے ساتھ خیال کی دنیا کو بھی بیدار کرسکے وہ تو صرف انقلاب کے نقیب ہیں یہ احساس ان کی نئی کتاب آیات و نغمات کو دیکھ کر اور بھی شدید ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ ان کی پرواز اب ایک منزل پر جاکر رک گئی ہے۔ دراصل حرف و حکایت سے آیات و نغمات پست درجہ پر ہے جوشؔ نے اس دور کے بعض احساسات کی ترجمانی ضرور کی ہے مگر ان کے خیالات ایک بھول بھلیاں ہیں وہ خدا سے بیزار ہیں اور شاید اس بیزاری کو 'جدیدیت' کے لیے اسی قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر نظم میں اس کی طرف اشارہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے مگر ایک کارساز ذہن کے بھی قائل ہیں اور بدر وحنین کی بھی یاد دلاتے رہتے ہیں ان کا ایک شعر ان کی موجودہ حالت کا آئینہ ہے ؎

زباں ساکت ہے لیکن ترزبانی اب بھی ہوتی ہے
لب خاموش سے جادو بیانی اب بھی ہوتی ہے

جوشؔ کے کلام میں نئے خیالات ملتے ہیں ان کا فارم نیا نہیں ہے مسلسل غزلیں لکھنے کی کوشش انھوں نے ضرور کی تھی۔ مگر وہ بظاہر کامیاب نہیں ہوتی۔ اب میں دو ایسے شاعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کو اپنے اظہار خیال کے لیے نئے سانچے بنانے پڑے ہیں یا کم از کم موجودہ سانچوں میں ترمیم کرنی پڑی ہے۔ دونوں نوجوان شاعر ہیں اور دونوں پنجاب کے اور دونوں کا کلام ادب کے ہر طالب علم کو غور سے اور ہمدردی سے پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر غور سے اور ہمدردی سے نہ پڑھا گیا تو ممکن ہے کہ اس کی خوبی کا احساس ہی نہ ہو۔ ایک فیضؔ کا مجموعہ نقش فریادی ہے۔ دوسرا راشدؔ کا ماورا۔ دونوں مغربی ادب سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ دونوں کے سوچنے کا طریقہ اور اظہار خیال کا طریقہ مغربی ہے۔ دونوں نے محض ایشیائی تشبیہوں کے بجائے کائناتی یا آفاقی تشبیہیں بھی برتی ہیں۔ دونوں نے ابھی ابتدا کی ہے۔ انھیں اب جاکر شعر کہنا آیا ہے۔ دونوں کا مستقبل بظاہر شاندار معلوم ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اگر ان کا جذبہ حقیقی ہے تو آگے بڑھتے چلے جائیں گے

ورنہ جذبات کی دلدل میں گم ہو جائیں گے۔ پھر ان میں فرق بھی ہے۔ فیض کی نظموں میں فارم بالکل نیا نہیں اس میں صرف ادل بدل ہے۔ راشد نے آخر آخر میں بے قافیہ نظم لکھنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی ہے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ راشد کے یہاں لذتیت زیادہ ہے اور فیض کے یہاں خیال آفرینی زیادہ۔ فیض کی تنہائی، موضوع سخن، چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز، اور راشد کی خودکشی، اتفاقات، بے کراں رات کے سناٹے میں، بہت اچھی نظمیں ہیں۔

ابھی چند شعراء کا ذکر باقی ہے۔ نغمۂ زندگی ایک ایسے شخص کا کلام ہے جس کے ذوق سلیم کو آئی، سی، ایس کی گمراہیاں بھی مجروح نہ کر سکیں۔ اس کے کلام میں بلا کی سادگی ہے ایسی سادگی کہ کہیں کہیں اس میں شعریت معلوم ہی نہیں ہوتی۔ مگر اس کے خلوص، اس کی گہرائی اور اس کی صداقت کی وجہ سے اچھے اچھے اشعار بھی کافی ملتے ہیں۔ آکسفورڈ والی نظم کامیاب ہے۔ فضلی کا یہ مجموعہ ذرا قبل از وقت معلوم ہوتا ہے مگر اس میں دلچسپی کا کافی سامان ہے۔ ماہر القادری بھی نوجوان شعرا میں کافی شہرت رکھتے ہیں ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں اچھی ہوتی ہیں مگر وہ غزلوں میں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ انہیں زبان پر قدرت ہے اور ان کی طبیعت میں شوخی اور رنگینی بھی ملتی ہے۔ محسوسات ماہر ایک دلکش مجموعہ ہے۔ احسان کی تفسیر فطرت کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ۱۹۴۲ء میں شایع ہوئی۔ اس میں شاعر ایک کامیاب مصور، ایک حساس فن کار اور ایک دردمند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ احسان نے جو دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے وہی بیان کیا ہے اس کی شاعری میں صداقت ہے اور اسی وجہ سے حسن بھی مگر ابھی اسے بلاغت کا مزا معلوم نہیں ہوا۔ اس کی بعض نظموں میں صرف یہ خامی ہے کہ وہ ذرا طویل معلوم ہوتی ہیں۔

غزل اب بھی مقبول ہے اور شاید اس کی مقبولیت قایم رہے کیونکہ اس میں ہمارے ایشیائی مذاق کی کوئی چیز ضرور ملتی ہے۔ غزل کو ہمارے چوٹی کے شعرا نے ہر قسم کے مضامین پر قادر کر دیا ہے۔ مگر نظموں کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان نظموں میں بہت سوں کے اعصاب پر ابھی عورت سوار ہے۔ یہ بات ایک خاص عمر میں ایسی بری بھی نہیں ہے۔ مگر ایک نیا لہجہ، ایک نئی زبان، ایک نیا پیرایۂ بیان ضرور آہستہ آہستہ وجود میں آ رہا ہے۔ محبوب کے آغوش میں بھی اب لذت نہیں رہی۔ کسی چیز کی کمی کا احساس ہو چلا ہے یہی اس بات کی پہچان ہے کہ ہماری

شاعری ہمارے دور کی روح کو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جو لوگ شاعری کو محض سلانے یا رلانے کے لیے ایک آلہ سمجھتے تھے انھیں ضرور مایوسی ہوگی۔ اب تو غزل میں بھی فانی کی بے پناہ واقعیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور نظم تو اس لحاظ سے اور بھی آگے ہے۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ماضی کی صحیح تاریخ مرتب کرنے اور اس میں ایک واضح نقطہ نظر مقرر کرنے کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ یہاں ہمیں تاریخ کی کتابوں پر تبصرہ نہیں کرنا ہے مگر جن کتابوں کی ادبی اہمیت بھی ہے ان کا ذکر ضروری ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے کارناموں پر بارہا روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ مگر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی تھی جس میں ان کی مذہبی اور علمی تاریخ مرتب کی جائے۔ شیخ محمد اکرام مرتب غالب نامہ نے آب کوثر اور موج کوثر کے نام سے دو جلدوں میں ایک قابل قدر تاریخ لکھی ہے۔ اس میں مشرقی اور مغربی دونوں ذرائع سے مدد لی گئی ہے اور عام طور پر اس کی تنقید منصفانہ اور معتدل ہے۔ پہلی جلد میں مسلمانوں کی آمد سے انیسویں صدی تک تبصرہ ہے۔ یہ حصہ لازمی طور سے تاریخی زیادہ ہے تنقیدی کم، دوسرے حصے میں انیسویں صدی کی ابتدا سے اس وقت تک جو خاص خاص مذہبی، علمی اور ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں دو باتیں خاص طور پر اہم ہیں اول تو مصنف نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ انیسویں صدی مسلمانوں کی پستی کا دور نہیں کہی جا سکتی۔ سیاسی اعتبار سے مسلمان پستی میں تھے مگر مذہبی نقطۂ نظر سے انھوں نے بعض اہم کارنامے انجام دیے تھے۔ دوسرے فاضل مولف نے جامعہ ملیہ کو علی گڑھ تحریک کے مخالف نہیں بلکہ اس کا دست راست اور معاون بتایا ہے۔ ان دونوں باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف محض سطحی اور اوپری نظر نہیں رکھتا۔ حالات اور واقعات کا غایر مطالعہ کرتا ہے۔ آثار جمال الدین افغانی ایک اور اچھی کتاب ہے جو قابل ذکر ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اسے بڑی محنت اور تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ جمال الدین افغانی کے نام سے لوگوں کو عقیدت تو بہت ہے مگر وہ محض جذباتی طور سے ان سے متاثر ہوتے ہیں کم لوگوں نے قاضی عبدالغفار کی طرح ان کی زندگی کے حالات معلوم کرنے اور ان کے بنیادی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ورنہ قاضی صاحب کے اس قول کی صداقت واضح ہو جاتی کہ آج بھی اگر شیخ زندہ ہوتے تو مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اسلامی اخوت سے وطنیت کے جدید تخیل کو ہرگز خارج نہ سمجھتے۔

حیات محمد قلی قطب شاہ اور حیات مومن دونوں ڈاکٹر زور نے لکھی ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں اور حیات مومن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو شاعری کے لیے جو وقت ملتا تھا وہ مومن جیسے وزیر کے حسن انتظام کی وجہ سے. غالب کے دوسرے اڈیشن میں غلام رسول مہر نے بہت سی ضروری باتوں کا اضافہ کیا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی کی وجہ سے کتاب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مولانا نے بعض بالکل نئی باتیں لکھی ہیں مثلاً غالب کی قید کے وجوہ اور حالی کا مرزا سے اس قدر ناراض ہو جانا کہ سوانح عمری لکھنے کا ارادہ ترک کر دینا۔ پہلی بات تو قرین قیاس معلوم ہوتی ہے مگر دوسری ابھی ثبوت کی محتاج ہے۔ بہر حال غالب کے حالات کے متعلق مہر کی کتاب اب کافی مستند ہے اور عرشی اکرام اور مالک رام کی تحقیق کو بھی اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بزم اکبر کے نام سے اکبر کے حالات قمرالدین احمد نے لکھے ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے اکبر کی ابتدائی زندگی پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور ان کے بعض غیر مطبوعہ اشعار بھی اس میں مل جاتے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں لکھنے والے کو اپنی شخصیت نمایاں کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے اور ساری توجہ ہیرو پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔ اکبر کے متعلق ابھی ایک اچھی کتاب کی ضرورت باقی ہے اور طالب اور قمرالدین کی کوشش کے بعد اس کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

گورکی کی آپ بیتی، یادِ رفتگاں کیا خوب آدمی تھا اور مولانا محمد علی کے سفر یورپ سے بعض مشہور شخصیتوں کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لیے یہ قابل قدر ہیں۔

اقبال کا مطالعہ از نذیر نیازی تعلیمات اقبال از مولانا سلیم چشتی اور اقبال اور قرآن کے نام ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے متعلق کتابوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے: نذیر نیازی اور سلیم چشتی دونوں عرصے تک اقبال کے ساتھ رہے ہیں اس لیے ان کی کتابیں توجہ اور غور سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ اقبال اور قرآن کے نام سے جو کتاب لکھی گئی ہے اس میں مصنف یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ اقبال کی تعلیمات کا سرچشمہ دراصل قرآن کریم ہے مگر کتاب تنقیدی نقطۂ نظر سے زیادہ مفید نہیں۔ ابھی تک شاعر اقبال پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی ہے، فلسفی، حکیم اور لیڈر اور مجدد پر زور زیادہ ہے۔ کاش کوئی اقبال کی شاعرانہ عظمت کو بھی

اچھی طرح اجاگر کرے۔ اقبال چاہے آپ در رنگ شاعری سے کتنے ہی بیزار ہوں اُن کے کلام میں تازگی اور ابدیت دراصل اسی وجہ سے ہے۔

اقبال پر تنقیدوں کے علاوہ بھی اردو میں تنقید کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے ادیبوں اور شاعروں پر اچھے اچھے تنقیدی مضامین رسالوں میں آئے دن نکلتے ہیں۔ یہ تنقید محض مغرب کے اصولوں کی نقل نہیں ہوتی اب اس میں توازن اور سنجیدگی بھی آچلی ہے۔ اب تنقید محض اشعار نقل کر دینے کا بہانہ نہیں رہی۔ اس کے اصول متعین ہو رہے ہیں، اس کے مبادیات تلاش کیے جا رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی تنقید کے فن کے متعلق کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں محض مغربی تنقید کے اصول آنکھ بند کر کے نقل نہ کر دیے گئے ہوں۔ حالی اور شبلی پر ابھی تک ہم کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں مگر اس دوران میں جو تحقیق ہوئی ہے اس سے اردو کی ایک مفصل تاریخ مرتب کرنے کا کام آسان ہو گیا ہے چنانچہ پروفیسر حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو کے نام سے اُردو نثر کی ایک مفصل تاریخ لکھدی ہے اور اس میں ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کے آغاز تک نثر کے ارتقار پر نظر ڈالی ہے۔ اگر نام سے قطع نظر کی جائے جس میں صرف یہ خوبی ہے کہ تاریخی ہے تو یہ بہت اچھی کتاب ہے اور اس وقت تک اردو نثر کے متعلق جتنی کتابیں ہیں ان سب سے مستند، جامع اور مفصل ہے۔ اس کے سامنے سہا اور عسکری اور احسن کی کتابیں محض طفلانہ کوششیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ دکن کے ادب کے متعلق تمام معلومات آجائیں اور اردو کی ابتدا کے سلسلہ میں جتنے نظریے ہیں سب کا علم طالب علم کو ہو سکے۔ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب محض مشاہیر کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ بہت سے دوسرے درجے کے غیر معروف مصنفوں کا بھی ذکر ہے خصوصاً انیسویں صدی کے نثاروں کا تذکرہ بہت مفید ہے۔ اس سے یہ خیال اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ فورٹ ولیم کالج اور سرسید کے درمیان کے زمانہ کو تاریکی کا دور کہتے تھے وہ کس قدر غلطی پر تھے۔ ساڑھے آٹھ سو صفحے کی کتاب میں نمونے بھی بکثرت ہیں اور تنقیدی حصہ بھی کافی ہے اور اگرچہ فاضل مولف کے بعض اشاروں سے اتفاق کرنا مشکل ہے اور بعض باتوں کے بارے میں ان کی معلومات کافی نہیں ہیں مگر پھر بھی انھوں نے یہ کتاب لکھ کر اردو نثر کی ایک نہایت اہم تاریخ مرتب کر دی ہے جو پچھلی تمام کتابوں سے ہر طرح افضل ہے۔

انجمن ترقی اردو ہر سال بہت سی اچھی کتابیں شایع کرتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں گارساں دتاسی کے تمہیدی خطبات کا ترجمہ اور پروفیسر مجیب کا روسی ادب تاریخ و تنقید ادب کے سلسلہ میں اچھے اضافے ہیں۔ روسی ادب کے علاوہ ایران بعہد ساسانیاں جس کا ترجمہ ڈاکٹر اقبال (لاہور) نے کیا ہے۔ عربوں سے پہلے ایران کی تاریخ پر بہت اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ ضرورت ہے کہ جس طرح فارسی، عربی اور روسی ادب کے متعلق ہماری معلومات بہت کافی ہیں اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور جاپانی ادب کے مستند تذکرے اردو میں مرتب کیے جائیں۔

خاص ادب و انشا میں بھی بعض اضافے ہوئے ہیں۔ اسی سال محشرِ خیال کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے۔ سجاد انصاری اردو کے مضمون نگاروں میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے خیالات، ان کا انداز بیان سب دلچسپ ہیں۔ سجاد نوجوان مرگئے ورنہ ہم ادب لطیف کے اس فلسفی کو شاید اور بھی بلند درجہ پر دیکھتے اس اڈیشن میں خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک ڈرامہ روزِ جزا بھی شامل ہے۔ رعنائی خیال، شوخیٔ بیان، جراتِ فکر زورِ بیان کے لحاظ سے محشرِ خیال کے بہت سے مضامین اردو ادب میں یادگار رہیں گے۔ شیطان کا انتقام (اشک (عثمانیہ) کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس کا اعتراف نہیں کیا اور ممکن ہے کہ انھیں خبر ہی نہ ہو مگر شیطان کے کردار کو ایک دلچسپ طریقہ سے سب سے پہلے سجاد انصاری نے پیش کیا تھا۔ اس میں اس دور کی سراسیمگی اور انتشار کا بہت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مسرت سے محرومی واقعی دنیا کی بہت بڑی لعنت ہے جو اس دور پر مسلط ہے۔ جزیرۂ سخن وراں غلام عباس کی تصنیف ہے۔ اردو میں یہ ایک نئی چیز ہے اگرچہ انگریزی میں اس قسم کے مضامین بہت ملتے ہیں۔ غلام عباس صاحب نے شعرا کی ایک جنت کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ اور بعض قدیم شعرا کا خاکہ بڑے مزے سے اڑایا ہے۔ آزاد کے بقائے دوام کے دربار کو لوگ بھول رہے تھے۔ جزیرۂ سخن وراں نے اس کی یاد تازہ کردی۔

غالب کے خطوط کی مقبولیت ابھی کم نہیں ہوئی۔ منشی مہیش پرشاد نے بڑی تلاش اور محنت سے غالب کے تمام خطوط کو جمع کیا ہے اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اس پر نظرِ ثانی کی ہے۔ ابھی پہلی جلد شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ طالب علم کو خطوط کے تمام پچھلے مجموعوں سے بے نیاز کرسکتا ہے۔

ان میں خطوط تاریخی ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں اور خط کی تاریخ حتی الامکان درج کی گئی ہے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ غالب کے نادر خطوط لکھنؤ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔

شاعری کے بعد اگر ادب کی صنف میں ترقی ہوئی ہے تو افسانوں میں۔ اگرچہ اب ناول بھی لکھے جاتے ہیں مگر پریم چند کے بعد ابھی تک کوئی اچھا ناولسٹ پیدا نہیں ہوا۔ جو دو چار افسانہ نویس ناول لکھتے ہیں ان کی کوششیں سرسبز نہیں ہو پاتیں۔ مگر حال ہی میں افسانہ نگاری میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ طویل افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ افسانہ نگاری نے پریم چند کے بعد بھی کافی ترقی کی ہے۔ اگرچہ پریم چند کے پایہ کا افسانہ نویس کوئی نہیں کہا جا سکتا۔ مگر پریم چند سے اچھے افسانے بہت سے لوگوں نے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں جو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ترقی پسندی ہے۔ کچھ لوگ اس کے نام سے چڑتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اس کا مفہوم پوری طرح معلوم نہیں۔ کچھ اس کا نام سنتے ہی اشتراکیت کا تصور کرنے لگتے ہیں۔ مگر درحقیقت گزشتہ چھ سات سال سے ہمارے افسانوں میں یہ نیا رنگ ملتا ضرور ہے اور خود پریم چند آخر دور میں اس سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی یا نئے ادب پر تبصرہ کرنے کا یہ موقع نہیں مگر اس کے اثر سے ہمارے افسانوں میں محض ے وشاہدہ کے علاوہ حقیقت پسندی، کائنات کا مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، سماجی اثرات اور مختلف طبقوں خصوصاً نچلے طبقہ کی زندگی کا عکس آگیا ہے۔ چونکہ اس کو پڑھ کر سکون نہیں ہوتا بلکہ طبیعت میں ایک خلش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعض سمجھتے ہیں کہ یہ افسانے نہیں وعظ ہیں چونکہ اس میں نفسیاتی تجزیہ کی پرخلوص کوشش ملتی ہے۔ اس لیے لوگ اسے عریاں سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس میں مزدوروں اور قلیوں کی زندگی کی تصویریں بھی ملتی ہیں اس لیے لوگ اسے اشتراکی پروپیگنڈا کہتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ افسانوں میں یہ چیز یونہی نہیں آئی، حالات کے تقاضے سے آئی ہے اور بعض لوگ چاہے کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ رہنے کے لیے آئی ہے اس میں نقالی بھی ہے کہیں کہیں قصہ پن بالکل نہیں ہے کہیں عریاں نگاری محض جنسی جذبات کی تسکین کے لیے ہے مگر بحیثیت مجموعی یہ صحیح نہیں۔ ہمارے افسانے لکھنے والے بیشتر نوجوان ہیں ابھی ان کی ترقی کی بہت امیدیں ہیں۔ ان میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری اختر انصاری اچھے لکھنے والے ہیں۔ ان کا کام ابھی شروع ہوا ہے۔ نئے زاویے سے افسانوں نظموں کا ایک

مجموعہ ہے جو کرشن چندر نے مرتب کیا ہے۔ یہ انگلستان کے (NEW WRITING) کے طرز پر نکالا گیا ہے۔ اس سے نئے ادب کا تاریخی ارتقا تو سمجھ میں نہیں آتا مگر نئے ادب کا ایک حیات بخش تصور ضرور ہو جاتا ہے۔ اس میں بہت سے نئے نام ہیں اور پرانے نام اچھے بھی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے مجموعے تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر نکالے جائیں۔ اس میں بیدی، حیات اللہ انصاری اور منٹو کے افسانے خاص طور پر کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔

مغربی افسانوں سے دلچسپی تو جنگ کے بعد سے شروع ہو گئی تھی مگر حال میں ایشیائی افسانوں سے بھی کچھ انس پیدا ہوا ہے۔ ان میں چین کے ادب، وہاں کے ادبی نقطۂ نظر، وہاں کی شاعری اور افسانوں پر رسالوں میں مضمون نکلنے لگے ہیں۔ زندہ چین کے نام سے تمنائی نے وہاں کے کچھ افسانوں کا ترجمہ کیا ہے اور چین کے خاص ادیبوں کے متعلق نوٹ بھی لکھے ہیں۔ یہ کتاب دراصل بعض چینی ادیبوں کا تعارف ہے۔ اس سے کم از کم یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو ابھی بہت کچھ چین سے بھی سیکھنا ہے۔

منٹو کے قلم سے امسال دو کتابیں نکلی ہیں۔ منٹو کے افسانے اور آمد — دوسری کتاب چنداں اہم نہیں مگر منٹو کے افسانے میں بعض بہت اچھے افسانے ملتے ہیں ان میں آپ کو بعض جگہ عریانی نظر آئے گی مگر یہاں وہ عریانی نہیں جو جنسی میلان کی غماز ہے بلکہ اس میں فن کار کی باریک بیں نظر کا عکس ملتا ہے۔ اسلم کی کتاب خار و گل، صالحہ عابد حسین کا نقش اول، مرزا ادیب کی دنیائے آرزو بھی قابل ذکر کتابیں ہیں۔

اس سال عظیم بیگ چغتائی کا انتقال ہوا۔ ان کی آخری کتاب جو امسال نکلی پھریری ہے۔ چغتائی ادھر کئی سال سے دق کے موذی مرض میں گرفتار رہتے تھے۔ مگر ان کے اندر کوئی نامعلوم قوت ان سے برابر کچھ نہ کچھ لکھواتی رہتی تھی۔ پھریری میں کچھ تاریخی اور کچھ مزاحیہ افسانے ہیں۔ ان میں چغتائی کی قوتوں کا شباب نہیں ملتا بلکہ مریض ناتواں کا سنبھالا ہے۔ چغتائی نے بہت کچھ لکھا اور بہت جلد لکھا۔ اس جلدی کی وجہ سے وہ فن کی بلندیاں طے نہ کر سکے، مگر ان کا ہنسنا ہنسانا محض تفریحی نہیں تھا اس کی تہہ میں ایک گہرا اور سنجیدہ مقصد بھی تھا چغتائی بھی ہمارے تمدنی نقادوں میں سے تھے۔ کچھ لوگوں کو چغتائی کی سی عورتیں کہیں ملتی نہیں۔ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ انھوں نے عورتیں نہیں دیکھیں۔

مغربی ناولوں اور افسانوں کے ترجمے برابر شائع ہو رہے ہیں۔ دھرتی ماتا کے علاوہ بیٹے بھی مشہور امریکن

مصنف پرل بک کا ترجمہ ہو۔ تالستائی کا نام ہمارے لیے نیا نہیں مگر ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ضرور نیا ہی۔

مختصر افسانوں کے ساتھ اب مختصر ڈراموں کا رواج بھی ہو چلا ہی۔ ہمارے رسالوں میں اب چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی نظر آنے لگے ہیں۔ اپندر ناتھ اشک کا پاپی کتابی صورت میں شایع ہو کر مقبول ہوا ہی۔ ریڈیو کی وجہ سے اس چیز کو خاص مدد ملی ہی۔

آخر میں مجھے بعض خاص تراجم کا ذکر کرنا ہی۔ ترجموں کا سلسلہ برابر جاری ہی اور اس کی وجہ سے ہمارے ادب میں برابر اضافہ ہو رہا ہی۔ نتشے کی مشہور کتاب بقول زرتشت براہ راست جرمنی سے اور الف لیلہ براہ راست عربی سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض مضامین کا ترجمہ آنند نرائن ملا نے مضامین نہرو کے نام سے کیا ہی۔ پنڈت جی انگریزی کے بہت اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں اور اس کا اعتراف ایچ۔ جی۔ ویلز نے بھی کیا ہی۔ ان کے ان مضامین سے ان لوگوں کو اور بھی مدد ملے گی جو اردو میں ان کی آپ بیتی کا ترجمہ پڑھ چکے ہیں۔

انگریزی میں بھی اردو کے متعلق بعض کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے دو کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک عبداللہ انور بیگ کی کتاب غالب کے حالات اور ان کی شاعری سے متعلق ہی۔ یہ کتاب اس لحاظ سے مفید ہی کہ غالب کے متعلق اس قدر مفصل کوئی اور کتاب موجود نہ تھی۔ خود لطیف کی کتاب مختصر اور ایک لحاظ سے گمراہ کن ہی۔ مگر اس میں اشعار کا ترجمہ اچھا نہیں ہی۔ اور بعض جگہ تو مطلب بالکل خبط ہو گیا ہی۔ دوسری کتاب ڈاکٹر زین العابدین احمد نے مرتب کی ہی۔ ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلہ پر ہندوستان کے تمام مشہور لوگوں سے مضامین لکھوائے گئے ہیں اور ان سے اس مسئلہ کی اہمیت، دشواری اور پیچیدگی، سب کا راز معلوم ہوتا ہی۔ اردو کے حامیوں نے تو جو کچھ کہا ہی صاف صاف، مگر ہندی کے حامی بات پردے پردے میں کہتے ہیں وہ سنسکرت کی آمیزش اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس طرح نئی ہندی کا جواز ہو سکے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر تاراچند مولوی عبدالحق مہاتما گاندھی سمپورنانند اور امرناتھ جھا کے مضامین غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ یہ کتاب کتابستان الہ آباد نے شایع کی ہی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سعید الظفر نے ایک کتاب انگریزی میں اور شایع کی ہی جو بالغوں کو اردو پڑھانے کے قاعدے کی تشریح کرتی ہی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اردو کے

حامی نہ صرف ادب کی ترقی کی طرف متوجہ ہیں۔ انھیں اپنی زبان کو بڑھانے، پھیلانے اور مقبول بنانے کی بھی فکر ہو رہی ہے۔

اس سال حیدرآباد میں اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا کام شروع ہوا ہے۔ یہ بہت ضروری اور مفید کام ہے مگر بڑا مشکل اور صبر آزما۔ یہ بہت وقت بھی چاہتا ہے۔ اب تک اس کا جو نمونہ شائع ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے شایان شان تحقیق نہیں ہو رہی ہے۔ کتاب العلم ایک اور مفید کتاب ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ مختلف موضوعوں پر اہم معلومات یکجا ہو سکیں مگر اس میں اصطلاحات بہت مشکل ہیں اور زبان کو بھی سادہ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ زباندانی اور دستور الاصلاح بھی مفید کتابیں ہیں پہلی کتاب میں صحیح اردو لکھنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ دوسری میں سیماب صاحب نے اساتذہ کی اصلاحوں کے متعلق ضروری معلومات یکجا کر دی ہیں

سادگی، اصلیت اور جوش حالی کے نزدیک شاعری کے لیے ضروری چیزیں ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب میں یہ باتیں اب زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہیں مشکل الفاظ اور پیچیدہ اسالیب کے خلاف ردعمل ہو رہا ہے۔ گرد و پیش کے حالات کا اثر بھی ہے ——— اور عام طور پر ایک واضح نقطۂ نظر کی تلاش بھی ہو رہی ہے۔ بہت سے نئے رسالے نکلے ہیں۔ پرانے رسالوں نے اپنے خاص نمبر بھی نکالے ہیں۔ بعض رسالوں نے اپنا ایک خاص رنگ بھی بنا لیا ہے۔ نئے رسالوں میں معاصر پٹنہ، نئی زندگی الہ آباد اور کتاب لاہور قابل قدر ہیں۔ غرض امسال کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے اردو زبان اور اردو ادب کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

ضمیمہ

۱. کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ	مرتبہ ڈاکٹر زور	۲. کلیات سراج	مرتبہ عبدالقادر سروری
۳. طوطی نامہ	غواصی	۴. قصۂ بے نظیر	....
۵. کلیات میر	مرتبہ آسی	۶. منتخب داغ	مرتبہ احسن مارہروی
۷. بہار داغ	،، نذیر نیازی	۸. وجدانیات	فانی بدایونی۔

۹۔ آیات ونغمات — جوش ملیح آبادی
۱۰۔ ساز وآہنگ — سیماب اکبرآبادی
۱۱۔ آبگینے — اختر انصاری
۱۲۔ ماورا — ن م راشد
۱۳۔ نقش فریادی — فیض احمد فیض
۱۴۔ گل ونغمہ (نیا اڈیشن) — عظیم الدین احمد
۱۵۔ تفسیر فطرت — احسان دانش
۱۶۔ انوار — علی اختر
۱۷۔ موج طہور — بہزاد لکھنوی
۱۸۔ نغمۂ زندگی — فضلی
۱۹۔ فردوس تخیل — ز خ ش
۲۰۔ محسوسات ماہر — ماہر القادری
۲۱۔ میرے نغمے — سلام مچھلی شہری
۲۲۔ گل دل — علی عباس
۲۳۔ شعرستان — (انتخاب)
۲۴۔ پریت کے گیت — (انتخاب) الطاف مشہدی
۲۵۔ پھولوں کی ڈالی۔ (انتخاب) مجذوب
۲۶۔ بال جبریل (نیا اڈیشن) علامہ اقبال
۲۷۔ حیات محمد قلی قطب شاہ — ڈاکٹر زور
۲۸۔ حیات محمد مومن — ڈاکٹر زور
۲۹۔ غالب (دوسرا اڈیشن) — غلام رسول مہر
۳۰۔ بزم اکبر — قمر الدین احمد
۳۱۔ آثار جمال الدین افغانی۔ قاضی عبدالغفار
گورکی کی آپ بیتی — مترجمہ اختر حسین
۳۳۔ آب کوثر — شیخ محمد اکرام
۳۴۔ موج کوثر — شیخ محمد اکرام
۳۵۔ مولانا محمد علی کے سفر یورپ۔ محمد سرور
۳۶۔ کیا خوب آدمی تھا — ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس
۳۷۔ یادرفتگاں — خواجہ عبدالمجید
۳۸۔ داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری
۳۹۔ تمہیدی خطبات — گارساں دی تاسی
۴۰۔ ہماری زبان — ڈاکٹر مولوی عبدالحق
۴۱۔ افادی ادب — اختر انصاری
یادِ چکبست — انڈین پریس
۴۳۔ مطالعہ اقبال — نذیر نیازی
۴۴۔ تعلیمات اقبال — سلیم چشتی
۴۵۔ روسی ادب — محمد مجیب
۴۶۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ ڈاکٹر اقبال
۴۷۔ ادبی تاثرات — ڈاکٹر زور
۴۸۔ شرح درد — خواجہ محمد شفیع
۴۹۔ شرح اسرار خودی — یوسف سلیم چشتی
۵۰۔ کاروان ادب — فیروز اینڈ سنز

۵۱۔ تفسیر خودی (منظوم) طارق

۵۲۔ فلسفۂ خودی (منظوم) طارق

۵۳۔ محشر خیال سجاد انصاری

۵۴۔ شیطان کا انتقام اشک (عثمانیہ)

۵۵۔ جزیرۂ سخن وراں غلام عباس

۵۶۔ خطوط غالب مہیش پرشاد

۵۷۔ مکتوبات شاد ڈاکٹر زور

۵۸۔ نئے زاویے (نئے ادب کا مجموعہ) مرتبہ کرشن چندر

۵۹۔ منٹو کے افسانے سعادت حسن منٹو

۶۰۔ آمر سعادت حسن منٹو

۶۱۔ پاپی (ڈرامے) اپندر ناتھ اشک

۶۲۔ زندہ جبین (افسانے) تمنائی

۶۳۔ خار و گل (افسانے) ایم اسلم

۶۴۔ شرم گناہ (افسانے) ایم اسلم

۶۵۔ کسلا (ناول) مترجمہ مہدی علی خاں۔

۶۶۔ پھریری (افسانے) عظیم بیگ چغتائی

۶۷۔ بیٹے (ناول) ۔ احسان علی شاہ

۶۸۔ ٹالسٹائی کے افسانے مترجمہ اکرام قمر

۶۹۔ دنیائے آرزو (افسانے)۔ مرزا ادیب

۷۰۔ نقش اول (افسانے) صالحہ عابد حسین

۷۱۔ مزاحیہ ڈرامے مترجمہ خلیل احمد

۷۲۔ تقدیر و تدبیر (افسانے) میکش

۷۳۔ ساز شکستہ (ناول) رشید اختر ندوی

۷۴۔ کتاب العلم لاہور ......

۷۵۔ زباندانی فضل الٰہی عارف

۷۶۔ دستور الاصلاح سیماب اکبرآبادی

۷۷۔ مضامین نہرو مترجمہ ملا آنند نرائن ملا

۷۸۔ فلسفۂ برگسان ....

۷۹۔ بقول زرتشت مترجمہ ڈاکٹر منظور احمد

۸۰۔ الف لیلہ ولیلہ مترجمہ ڈاکٹر منظور احمد

۸۱۔ انتظام کتب خانہ سید بشیر الدین

۸۲۔ شمع حرم مرتبہ مہدی علی خاں

1- GHALIB A. ANWAR BEG

2- URDU FOR ADULTS DR. SAEEDUZZAFER

3- THE PROBLEM OF A NATIONAL LANGUAGE FOR INDIA Z. A. AHMED.

آل احمد سرور ایم۔ اے

ہندوستان کی آبادی سنہ ۱۹۴۱ء

ہندوستان میں آبادی اور اس کے متعلق دوسری معلومات مردم شماری کے موقع پر جمع کی جاتی ہیں اس مرتبہ مردم شماری تو ہوگئی اور معلومات بھی فراہم کرلی گئیں لیکن حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں نے جنگ کے مصارف کی زیادتی کی وجہ سے اس کام میں بڑی تخفیف کردی۔ اس لیے اس مرتبہ تفصیل جدولیں نقشے اور مفصل رپورٹیں شائع نہیں ہوں گی۔ ان مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کے متعلق کوئی جامع اور تنقیدی مضمون لکھنا بہت دشوار ہے۔ البتہ حکومت نے چند مختصر اعداد شائع کردیے ہیں اور چونکہ ان سے زیادہ اشاعت کی امید نہیں لہذا ان ہی کو بحث و مباحثہ اور تنقید کی بنیاد قرار دینا پڑتا ہے۔

ہر سوسائٹی میں دولت کی فراوانی کا انحصار جن عاملوں پر ہے ان میں سے ایک خود حضرت انسان ہیں، کیونکہ ان ہی کی بدولت وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ کرکے ملک کی دولت میں اضافہ کیا جاتا ہے لیکن واضح رہنا چاہیئے کہ محض انسانوں کی زیادتی کسی ملک کے معاشی معیار کو بلند کرنے کی تنہا ذمہ دار نہیں ہے۔ چنانچہ ایک طرف اگر ایسے ملک نظر آتے ہیں جہاں وسائل قدرت کی افراط ہے مگر انسانوں کی کمی کی وجہ سے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جارہا تو دوسری طرف ایسے ملک بھی ہیں جہاں آبادی کی کثرت کے باوجود خوشحالی اور مرفہ الحالی کا معیار پست ہے۔ بہرحال اس استثنا کو چھوڑ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے آبادی میں اضافہ مفید ہے لیکن جو دولت پیدا کی جاتی ہے وہ انسانوں ہی میں تقسیم ہوتی ہے اور آبادی جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر دولت زیادہ درکار ہوگی یا پیدا شدہ دولت کی مقدار اگر کم ہے تو ہر شخص کے حصے میں دولت کی مقدار کم آئے گی۔ گویا تقسیم دولت کے لحاظ سے آبادی کا کم رہنا ہی مفید ہے۔ بظاہر یہ دو متضاد باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت بھی ممکن ہے جہاں آبادی نہ اتنی زیادہ ہو کہ دولت کا تناسب فی کس بہت کم ہوجائے اور نہ آبادی اتنی کم ہو کہ قلت کی وجہ سے وسائل قدرت سے پورا پورا استفادہ نہ کیا جاسکے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے آبادی کا بڑھنا یا گھٹنا دونوں مضر ہیں اور اسی کو کسی

ملک کی حقیقی آبادی کہا جاسکتا ہے۔

اب کسی خاص ملک کے اعداد و شمار کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آبادی زیادہ ہے یا کم بلکہ اس کے لیے بہت سی دوسری چیزوں پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے یہ کہ اس ملک کا رقبہ کیا ہے۔ اس کی آب ہوا، موسمی خصوصیات کیسی ہیں۔ وہاں کی زمین کا کیا حال ہے، وہاں کی پیداوار، معدنیات، آبشار، دریا، پہاڑ، میدان اور دوسرے جغرافی حالات کا کیا حال ہے۔ اس کے علاوہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہاں کی آبادی کن حصوں میں گنجان ہے۔ ملک کی عام صحت کا معیار کیا ہے، لوگوں کا معیار زندگی بلند ہے یا نہیں، عمروں کا اوسط کیا ہے، شرح پیدائش زیادہ ہے یا شرح اموات، مردوں کی تعداد زیادہ ہے یا عورتوں کی، آبادی کن پیشوں میں مصروف ہے۔ مختلف پیشوں میں اجرتیں کیا ہیں، ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ کارکردگی کا حال کیا ہے۔ آبادی دیہات میں زیادہ رہتی ہے یا شہروں میں۔ آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے یا تخفیف۔ اگر اضافہ ہو رہا ہے تو ملک کے اندرونی ذرائع معاش میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں اور کیا آبادی کو نقل وطن کی سہولتیں حاصل ہیں، اور کیا دوسرے ملکوں کے لوگ وہاں آسکتے ہیں۔ ان مختلف اسباب پر نظر ڈالنے کے بعد قطعی طور پر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کسی ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے یا کم اگر آبادی کم ہے تو مختلف طریقوں سے اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور اگر زیادہ ہے تو چند طریقوں سے اس میں کمی کی جاسکتی ہے۔

عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں علمائے یورپ و یونان کو اس کا احساس ہو چکا تھا کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہوتا ہے اسی رفتار سے اشیائے خورد و نوش میں اضافہ نہیں ہوتا۔ سب سے پہلے اس خیال کو رابرٹ مالتس نے منظم شکل میں پیش کر کے ساری دنیا میں ایک ہلچل ڈال دی مگر یہ کوئی نیا خیال نہ تھا اور ہر ملک کے مفکروں نے اپنی اپنی استعداد اور لیاقت کے مطابق اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ ہندوستان کے مشہور شاعر اُستاد ذوقؔ نے جو معاشیات کے اصولوں سے بالکل ناواقف تھے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

توڑا کمر شاخ کو کثرت نے ثمر کی　　　دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے

آبادی اور ضروریات زندگی میں عدم تناسب کی وجہ سے گوناگوں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثلاً اس کی وجہ سے معیارِ زندگی پست ہو جاتا ہے اور بہت سی ضرورتوں سے انسان کو دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ قومی صحت برباد ہو جاتی ہے۔ توانائی اور جانداری کم ہو جاتی ہے جس سے ایک جانب اس کی کارکردگی کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور دوسری جانب امراض اور بیماریوں کی قوت مدافعت کمزور ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف امراض کی کثرت میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ معمولی معمولی بیماریاں بھی وباؤں کی طرح پھیلتی ہیں جو ایک بڑی تعداد کو اپنا لقمہ بناتی ہیں اور اس سے بڑی تعداد کو ایڑیاں رگڑنے کے لیے دنیا میں چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے، فرقہ وارانہ مناقشات اور طبقہ واری فسادات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ زرخیز اور شاداب زمینوں کی قلت ہی اقوام کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کریں۔ ان کو مسئلۂ افلاس کے بنیادی اسباب کہا جاتا ہے۔ اور یہی خوفناک پیشین گوئیوں سے تعبیر کی جاتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانے میں حالات میں بڑی تبدیلی ہو گئی ہے۔ سیاسی امن و امان نسبتاً اور مقابلۃً بڑھ گیا ہے۔ راستے کے خطرے اب تجارتِ خارجہ میں رخنہ انداز نہیں ہوتے۔ مشینوں اور کارخانوں کی وجہ سے مال بڑی مقدار میں اور بہت کم وقت میں تیار ہونے لگا ہے۔ آمد و رفت اور نقل و حمل کے ذرایعوں میں جو انقلاب ہوا تو ساری دنیا ایک بازار بن گئی۔ ان باتوں سے مسئلہ آبادی میں بعض تبدیلیاں ہو گئی ہیں مثلاً آج کسی ملک کے لیے عام حالات میں یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام خوردنی اشیاء اپنے ہاں پیدا کرے بلکہ وہ یہ چیزیں دوسرے ملکوں سے بھی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس معاوضہ میں دوسرے قسم کی دولت یا خدمات ہوں جن کو فریق ثانی قبول کر لینے کے لیے تیار ہو۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت یورپ کے اکثر ملک بالکل صنعتی ملکوں میں تبدیل ہو گئے اور وہ اپنی کثیر آبادی کے لیے دوسرے ملکوں سے زرعی پیداواریں منگوا کر اپنی آبادی کو زندہ رکھتے ہیں یا بعض ملک معاشی اور سیاسی خدمات انجام دے کر دوسرے ملکوں سے پیداواریں حاصل کر لیتے ہیں لیکن جن کے پاس نہ تو درآمد کرنے کے لیے مال ہو اور نہ معاوضہ میں پیش کرنے کیلیے خدمات تو وہاں بدترین افلاس کا پایا جانا ضروری ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کسی ملک کی آبادی میں اضافہ یا کمی بذاتِ خود نہ اچھا ہے اور نہ برا بلکہ یہ واقعات اور حالات پر منحصر ہے۔ لہٰذا ان مبادیات کو بیان کرنے کے بعد ہم ہندوستان کی آبادی پر نظر ڈالیں گے اور

دیکھیں گے کہ ہندوستان کثیرالآبادی ہے یا نہیں۔

گزشتہ ۷۰ سال میں ہندوستان کی جو آبادی رہی اور جو اضافہ ہوا وہ حسب ذیل ہے۔

سال	آبادی (کروڑوں میں)	اضافہ آبادی فیصدی
سنہ ۱۸۸۱ء	۲۵½ کروڑ	۲۳٫۲
سنہ ۱۸۹۱ء	۲۸¾ "	۱۳٫۲
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۹½ "	۲٫۵
سنہ ۱۹۱۱ء	۳۱½ "	۷٫۱
سنہ ۱۹۲۱ء	۳۱¾ "	۱٫۲
سنہ ۱۹۳۱ء (مع برما)	۳۵¼ "	۱۰٫۶
سنہ ۱۹۳۱ء (علاوہ برما)	۳۳¾ "	۰
سنہ ۱۹۴۱ء	۳۸¾ "	۱۵٫۰

اس نقشہ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ اضافہ سنہ ۱۸۸۱ء میں ہوا لیکن در اصل اس کو حقیقی اضافہ سمجھنا اس لیے صحیح نہیں کہ اس سے پہلے یعنی سنہ ۱۸۷۱ء میں جو اعداد فراہم کیے گئے تھے ان میں کسی خاص اصول یا ضابطہ کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تھا۔ گویا سنہ ۱۸۸۱ء کے اعداد صحت سے زیادہ قریب ہیں سنہ ۱۹۰۱ء کے کے اضافہ کے متعلق بھی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی البتہ سنہ ۱۹۳۱ء اور سنہ ۱۹۴۱ء کے اضافے قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہاں رقبہ میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا مگر آبادی میں ۱۰ اور ۱۵ فیصدی اضافہ ہو گیا جو ایک لحاظ سے کسی طرح بھی لائق تعریف و تحسین نہیں۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں ہندوستان میں مجموعی حیثیت سے ۱۵ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ برطانوی صوبوں میں مجموعی اضافہ کی رفتار ۱۵٫۲ فی صدی اور ریاستوں اور ایجنسیوں میں اضافہ ۱۴٫۳ فیصد رہا۔ بڑے صوبوں میں پنجاب اور بنگال میں علی الترتیب ۲۰٫۲ اور ۲۰٫۳ اضافہ ہوا۔ بنگال کا یہ اضافہ اس لیے بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ ہندوستان کا سب سے زیادہ گنجان صوبہ ہے گزشتہ مردم شماری میں اس کی گنجانی ۶۱۶ افراد

فی مربع میل تھی۔ اس مرتبہ یہ ۷۳۵ تک پہنچ گئی چھوٹے صوبوں میں سب سے زیادہ اضافہ دہلی میں ہوا جہاں اضافہ کی رفتار ۱،۴۴ فی صدی رہی۔ مگر یہ اضافہ اس لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس مقام کی زیادہ تر آبادی شہری ہے۔ دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے۔ تجارت کی بڑی منڈی ہے کئی ریلوں کا جنکشن ہے اس لیے یہ اضافہ کچھ زیادہ خطرناک نہیں۔ ریاستوں میں سب سے زیادہ اضافہ ٹراونکور میں ہوا ہے۔ یہ ریاست بھی پہلے ہی سے گنجان ہے۔ گزشتہ مردم شماری میں اس کی گنجانی ۶۶۸ اشخاص تھی اور اس مرتبہ ۷۹۵ ہو گئی۔ اس مرتبہ سارے ہندوستان میں صرف بلوچستان کی ریاستوں میں آبادی میں کمی واقع ہوئی ہے۔

ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ گنجان ہے اس کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے جب اپنے ملک کا مقابلہ کرتے ہیں تو بڑا فرق نظر آتا ہے۔ عام طور پر ہندوستان کا مقابلہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے کیا جاتا ہے جو وسعت اور رقبہ میں ہمارے صوبوں کے برابر ہیں۔ لہٰذا یہ مقابلی اعداد صحیح نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان ایک نیم براعظم ہے اس لیے اس کا مقابلہ ایسے ہی دوسرے نیم براعظموں سے کرنا چاہیے۔ ذیل میں اسی طرح گنجانی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

نام ملک یا براعظم	رقبہ	آبادی کی گنجانی فی مربع میل
چین	۴۰ لاکھ مربع میل	۸۰
یورپ	۳۷ "	۱۲۷
برازیل	۳۲ "	۱۲
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۳۰ "	۴۱
ہندوستان	۱۹ "	۲۴۲

اس جدول پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کس قدر گنجان ہے۔ اسی طرح ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کا مقابلہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے کیا جائے تو ہندوستان کی کثیر آبادی اور واضح ہو جاتی ہے۔

نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل	نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل
انگلستان و ویلز	۵۰۵	جاپان	۴۳۷

نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل	نام ملک یا صوبہ	تعداد افراد فی مربع میل
جرمنی	۳۶۴	اطالیہ	۳۴۴
فرانس	۱۹۷	بنگال	۷۳۵
صوبجات متحدہ	۴۹۱	ٹراونکور	۷۹۸
کوچین	۹۶۱		

اس گنجانی کے باوجود جب ہم ملک کے پیشوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حالت اور زیادہ خراب نظر آتی ہے۔ ہمارے یہاں کے آبادی کے بڑے حصہ کا پیشہ زراعت ہے اور عام حالات میں یہ پیشہ اب نفع بخش نہیں رہا۔ لوگ اس میں اس لیے مشغول نہیں ہیں کہ دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں یہاں زیادہ فائدہ ہے بلکہ مجبوری سے مصروف ہیں کیونکہ ان کے سامنے کوئی اور پیشہ ہی نہیں ہے، اس ملک کی معاشی حالت کبھی اچھی نہیں ہو سکتی جو محض زراعت پر منحصر ہو اور زراعت بھی فرسودہ اور قدیم طریقوں سے کی جاتی ہو۔ ہندوستان کی معاشی زندگی کو بنانے اور بگاڑنے والی چیزیں بارش کی کمی یا زیادتی، خشک سالی، طوفان، آندھی، ٹڈی دَل اور دوسرے کیڑے کوڑے ہیں جب کسی سال فصلیں خراب ہو جاتی ہیں تو نہ صرف کاشتکار متاثر ہوتے ہیں بلکہ حکومت کا مالیہ، ریلیں، تجارت، لین دین، مشترکہ کاروبار اور انجمنیں، غرضکہ ساری چیزوں پر اثر پڑتا ہے گویا ہمارے ملک کی معاشی زندگی غیر مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک متزلزل شے کسی مستحکم اور پائدار عمارت کی بنیاد نہیں ہو سکتی ان حالات میں اور زیادہ مایوسی اس لیے بھی ہو جاتی ہے کہ آبادی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ رقبۂ کاشت میں اس تناسب سے اضافہ کے بجائے کمی ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۱۵ء میں زراعت پیشہ آبادی ½ ۱۵ کروڑ اور رقبہ کاشت ۲۰ کروڑ ایکڑ تھا۔ ۱۹۳۱ء میں زرعی آبادی ۱۶ کروڑ اور رقبہ کاشت ¾ ۲۲ ایکڑ تھا۔ اس مرتبہ زرعی آبادی کا اندازہ ۲۴ کروڑ رہا اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں رقبہ زیر کاشت ¾ ۲۳ ایکڑ تھا یعنی ایک کاشتکار کے حصہ میں ایک ایکڑ کے قریب زمین آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایکڑ زمین کسی طرح بھی معاشی کھیت نہیں ہو سکتی

زراعت کو چھوڑ کر جب ہم ہندوستان پر مجموعی نظر ڈالتے ہیں تو حالات میں کچھ تبدیلی نہیں ہوتی یعنی ہمارے یہاں فی کس آمدنی کا اوسط بہت کم ہے اگرچہ اب تک ہندوستانیوں کی صحیح آمدنی کا اندازہ

نہیں ہوسکا مگر جو کچھ کوششیں ہوئیں ان سے جو نتائج نکلے وہ حسب ذیل ہیں۔

تخمین	تخمینی سال	آمدنی فی کس سالانہ
دادا بھائی نارو جی	۱۸۷۰ء	۲۰ روپے
لارڈ کرزن	۱۹۰۰ء	۳۰ "
فنڈلے شیراز	۱۹۱۱ء	۵۰ "
پروفیسر کے ٹی شاہ	۱۹۲۱ء	۴۶ "
سائمن کمیشن	۱۹۲۸ء	۱۱۰ "
مختلف اشخاص	۱۹۳۲-۳۳ء	۱۲۰ "

اس وقت بھی فی کس آمدنی کا اندازہ ۶۰ روپے سے ۱۴۰ روپے سالانہ تک ہے۔ اس میں بڑے بڑے کروڑ پتی لکھ پتی اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی اس اوسط سے بہت زیادہ ہے اس طرح عام اوسط میں اور تخفیف ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی آبادی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر دیہات میں رہتی ہے چنانچہ ہندوستان کو دیہاتوں کا براعظم کہا جاتا ہے یہاں ۷ لاکھ کے قریب دیہات ہیں اور ہمارے یہاں ۹۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ حالانکہ دوسرے ملکوں میں شہری آبادی کی کثرت دکھائی دیتی ہے مثلاً انگلستان میں ۸۰، امریکہ میں ۵۲، فرانس میں ۴۹ اور جرمنی میں ۶۴ فی صدی آبادی شہری ہے۔ شہری اور دیہی آبادی کی اس غیر مساویانہ تقسیم کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ملک کی معاشی حالت ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے تہذیب و ترقی ہمیشہ شہروں سے شروع ہوتی ہے صنعتی ترقی کے مرکز شہر ہی ہوتے ہیں تعلیم و تمدن اور دوسری مفید اور تعمیری تحریکات یہیں سے شروع ہوتی ہیں اور پھر ملک کے اندرونی حصوں میں پہنچتی ہیں۔ اس مرتبہ آبادی کے جو اعداد شائع ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مرکزی شہروں میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے اور نئے نئے شہر بھی پیدا ہو گئے ہیں مگر اس میں موجودہ جنگ کا بھی بڑا دخل ہے اور اگر اس جزو کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی ہندوستان میں شہری آبادی کے اضافہ کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ نئی نئی صنعتوں، کاروباروں اور نئے شہروں کے وجود سے

پوری ہو سکتی ہے۔

ملک کی بڑھتی ترقی میں تعلیم کا بڑا حصہ ہوتا ہے مگر ہندوستان میں تعلیم کی بڑی کمی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ پڑھے لکھوں کی تعداد ۴ کروڑ اور ۲۷ لاکھ معلوم ہوئی ہے مردم شماری کے قانون میں پڑھے لکھے کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ آدمی جو کسی زبان میں بھی ایک معمولی خط لکھ پڑھ سکتا ہے لکھا پڑھا ہے۔ اس معمولی معیار کے باوجود ہندوستان میں صرف ۱۳ فی صدی آدمی لکھے پڑھے ہیں۔ پھر اس تعداد کا بڑا حصہ شہروں میں رہتا ہے۔ چنانچہ مردم شماری کے موقع پر اس عجیب و غریب بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اکثر ہزار آبادی کے دیہات ایسے ہیں جہاں کوئی لکھا پڑھا موجود نہیں اس حقیقت کے باوجود کہ ہندوستان میں تعلیم کی اتنی کمی ہے ہمارے یہاں تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد کافی ہے۔ یہ دراصل ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کا تجزیہ اس مختصر مضمون میں نہیں کیا جا سکتا

کسی ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے نئے نئے ذرائع معاش تلاش کرنے کا ایک طریقہ ترک وطن خارجی ہے نوآبادیات اسی اصول کے تحت بسائی جاتی ہیں۔ مگر ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد نہیں ہے۔ لہذا نوآبادی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو دوسرے ملکوں میں کھپائے چنانچہ ہندوستانیوں کی بڑی تعداد جنوبی اور مشرقی افریقہ، لنکا، برما، ملایا اور کم تعداد جزائر فجی اور جزائر غرب الہند میں آباد ہے اور کچھ دنوں پہلے تک ہندوستانی یہاں آزادانہ طور پر جا کر بس سکتے تھے۔ چنانچہ ان علاقوں میں جا بسے، ربر کے غیر مہارت رکھنے والے مزدوروں سے لے کر مالدار کاروباری تاجروں تک ہر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ مگر اب ہندوستانیوں کے ترک وطن پر نہ صرف پابندیاں لگا دی گئی ہیں بلکہ وہاں کے آبادکاروں کو مقامی قوانین اور نسل و رنگ کے امتیاز اور غیر مساوی حقوق اور نامنصفانہ سلوک کی بدولت بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ہندوستانیوں کی بڑی تعداد ان مقامات سے واپس آ رہی ہے۔ اگرچہ ہندوستان جیسے وسیع اور پرآبادکار ملک کے لیے اس سالانہ ترک وطن خارجی کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی، مگر اب رہا سہا راستہ بھی رک گیا اور ہندوستان کو اپنے بیٹوں کو خود ہی پالنا ہوگا۔

ہندوستان میں شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں زیادہ ہیں اور شرح بقا بہت ادنیٰ ہے شرح

پیدائش کی زیادتی ہمارے لیے زیادہ خوش کن اس لیے نہیں ہوسکتی کہ شرح اموات بھی بڑھی ہوئی ہو بہتر یہ ہوتا ہو کہ کم بچے پیدا ہوں اور زیادہ زندہ رہیں اور کثرت پیدائش سے جو نقصان ہوتے ہیں ان سے ملک محفوظ ہے جو بچے زندہ رہتے ہیں ان میں بھی ناتواں کمزور، روگی اور ناکارہ بچوں کی تعداد کافی ہوتی ہو۔ ایسے بچوں میں معمولی معمولی بیماریوں کی مدافعت کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی چنانچہ بہت کم لوگ عمر طبعی کو پہنچتے ہیں اور اسی لحاظ سے ہندوستان میں اوسط عمر بھی دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم ہو۔ چنانچہ چند ملکوں میں عمروں کے اوسط حسب ذیل ہیں۔

نام ملک	مرد کی اوسط عمر	عورت کی اوسط عمر
سوئیڈن	۵۶ سال	۵۳ سال
انگلستان	۵۶ "	۶۰ "
جاپان	۴۳ "	۴۳ "
ہندوستان	۲۳ "	۲۷ "

آبادی کو کم کرنے والے وہ موانعات جو انسانوں کو دنیا میں آنے سے روکتے ہیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں مثلاً تعلیم کی سخت کمی ہو۔ حالانکہ تعلیم کی عمومیت سے آبادی میں کمی ہوسکتی ہو۔ علم الحیات کا یہ مسئلہ طے ہوچکا ہو کہ جیسے جیسے انسان کی دماغی قوتیں ترقی کرتی ہیں ویسے ویسے اس کی قوت تولید کم ہوتی جارہی ہو۔ عورتوں کی تعلیم اور عملی زندگی میں ان کی جدوجہد بھی آبادی کو روکتی ہو۔ مثلاً ہمارے یہاں تعلیم بہت کم ہو۔ عورتیں خود کفیل نہیں پھر ملک کا عام معیار زندگی بہت ادنیٰ ہو اور بڑے کنبہ کو پالنا دشوار نہیں پھر شادیاں جلد کی جاتی ہیں شادی کے بعد ضبط سے کام نہیں لیا جاتا۔ افلاس اور تنگ دستی کی وجہ سے مصنوعی طریقوں پر کاربند نہیں ہوسکتے۔ بلکہ یہی چیز اضافہ پیدائش کی تحریک بن جاتی ہو جب مفلس طبقہ کے سامنے افلاس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں رہتی تو متواتر مایوسی اس کے اخلاق کو بھی خراب کردیتی ہو۔ چنانچہ مستقبل کا لحاظ کیے بغیر آبادی خوب بڑھتی ہو۔ اور چونکہ ایسے طبقوں میں امیری کم ہوتی ہیں اور یہاں عورتوں اور بچوں کو کمانے کے موقعے بھی ہوتے ہیں لہذا اضافہ آمدنی کی خاطر تعداد میں اضافہ

کیا جاتا ہے مگر وہ لوگ یہ اصول نہیں سمجھتے کہ اعلیٰ اجرتیں صرف اسی وقت برقرار رہ سکتی ہیں جبکہ کام کرنے والوں کی تعداد ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو۔

جب کسی ملک میں آبادی بڑھنے لگتی ہے تو لوگوں کی عام صحت اور توانائی کم ہونے لگتی ہے۔ ان کی قوت کارکردگی گھٹنے لگتی ہے اور معیار زندگی پست ہونے لگتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ آمدنی کی مزید تخفیف کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اور ملک میں افلاس عام ہونے لگتا ہے۔ اسی کی بدولت فرقہ واری جھگڑے اور مذہبی منافقات پیدا ہوتے ہیں اور جرائم میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ اضافہ کی ایک صورت عام بیروزگاری کی شکل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت موجودہ جنگ نے حالات میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ جنگ کے نئے نئے کاروبار کھل گئے ہیں۔ پرانے کاروباروں میں کام کا وقت بڑھ گیا ہے، رات کو بھی کام ہونے لگا ہے۔ نئی نئی فوجوں کے لیے سپاہی، کارخانوں کے لیے میکانک، اسپتالوں اور فوجی کیمپوں کے لیے ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور نرسوں کی بھرتی ہو رہی ہے۔ اس لیے بے روزگاری میں بڑی حد تک کمی ہو گئی ہے۔ مگر یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جنگ ایک عارضی چیز ہے اور ملک کی آبادی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا عارضی چہل پہل اور رونق سے متاثر ہو کر اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کثیر نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ہر ہندوستانی محب وطن اور ہر سمجھدار، ذی فہم انسان کا فرض ہے کہ وہ قانونی، اخلاقی اور شخصی تدابیر کو اختیار کر کے اور ان کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کر کے ملک کی آبادی کے اضافے کو روکے اور اس طرح ملک کی ایک حقیقی اور تعمیری خدمت انجام دے جس کے لیے آنے والی نسلیں اس کی ممنون رہیں گی۔

(حکومت نے جو مختصر اعداد و شمار یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو چھاپے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ تمام اعداد کے آگے تین صفر بڑھا کر پڑھیے)

	آبادی ۱۹۴۱ء	آبادی ۱۹۳۱ء	کمی و اضافہ فیصدی	خواندگی ۱۹۴۱ء
کل ہندوستان	۳۸۸,۸۰۰	۳۳۸,۱۱۹	+۱۵	۴۷,۳۲۲,۷
صوبے	۲۹۵,۸۲۷	۲۵۶,۷۵۵	+۱۵,۲	۳۷,۰۱۶,۲

مقامات	آبادی سنہ ۱۹۲۱ء	آبادی سنہ ۱۹۳۱ء	کمی و اضافہ فیصدی	خواندگی سنہ ۱۹۳۱ء
۱۔ مدراس	۴۲٬۳۲۲	۴۴٬۲۰۵	+۱۱٫۶	۲٬۰۴۲۰٫۹
۲۔ بمبئی	۲۰٬۸۵۸	۱۶٬۹۹۲	+۱۵٫۹	۲٬۰۶۷٫۸
۳۔ بنگال	۴۰٬۳۱۴	۵۰٬۱۱۴	+۲۰٫۳	۹٬۰۷۳۰٫۴
۴۔ صوبہ متحدہ	۵۵٬۰۲۱	۴۸٬۴۰۹	+۱۳٫۹	۴٬۹۵۳٫۵
آگرہ	۴۰٬۹۰۹	۳۵٬۹۱۴	+۱۵٫۱	۳٬۰۷۳۱٫۸
اودھ	۲۸٬۱۱۴	۱۲٬۷۹۵	+۱۰٫۴	۹۲۱٫۵
۵۔ پنجاب	۲۸٬۴۱۹	۲۳٬۵۸۱	+۲۰٫۴	۳٬۶۶۵٫۷
۶۔ بہار	۳۶٬۳۴۰	۳۲٬۳۷۱	+۱۲٫۳	۳٬۳۳۹٫۷
بہار	۲۸٬۸۲۴	۲۵٬۷۲۹	+۱۲	۲٬۶۸۵٫۸
چھوٹا ناگپور	۷٬۵۱۶	۹٬۶۴۲	+۱۳٫۱	۶۵۳٫۹
۷۔ صوبہ متوسط و برار	۱۶٬۸۲۲	۱۵٬۳۲۳	+۹٫۸	۱٬۹۰۹٫۷
صوبہ متوسط	۱۳٬۲۲۰	۱۱٬۸۸۱	+۱۱٫۳	۱٬۳۵۲٫۸
برار	۳٬۶۰۲	۲٬۴۴۲	+۴٫۶	۵۵۶٫۹
۸۔ آسام	۱۰٬۲۰۵	۸٬۶۲۳	+۸٫۲	۱۷۴٫۳
۹۔ صوبہ سرحد	۳٬۰۳۸	۲٬۴۲۵	+۲۵٫۲	۲۲۳٫۹
۱۰۔ اڑیسہ	۸٬۷۲۹	۸٬۰۲۶	+۸٫۸	۹۴۸٫۲
۱۱۔ سندھ	۴٬۵۳۷	۳٬۸۸۷	+۱۶٫۷	۴۷۳٫۸
۱۲۔ اجمیر میواڑ	۵۸۴	۵۰۷	۱۵٫۱	۷۹٫۰
۱۳۔ جزائر انڈمن اور نکوبار	۳۴	۲۹	۱۵٫۵	۶٫۴
جزائر انڈمن	۲۱	۱۹	۱۱٫۸	-

مقامات	آبادی ۱۹۴۱ء	آبادی ۱۹۳۱ء	کمی و اضافہ فیصدی	خواندگی ۱۹۴۱ء
جزائر نکوبار	۱۳	۱۰	+۲۲٫۵	—
۱۴- بلوچستان	۵۰۲	۴۶۴	+۸٫۲	۵۲٫۳
۱۵- کُرگ	۱۶۹	۱۶۳	+۳٫۳	۳۴٫۶
۱۶- دہلی-	۹۱۷	۶۳۶	+۴۴٫۱	۲۳۵٫۷
ریاستیں اور ایجنسیاں	۹۲،۹۷۳	۸۱،۳۱۷	+۱۴٫۳	۱۰،۳۰۹٫۵
۱۷- ریاستہائے آسام	۷۲۵	۶۲۶	+۱۵٫۹	۵۷٫۴
۱۸- ریاستہائے بلوچستان	۳۵۶	۴۰۵	-۱۲٫۱	۸٫۱
۱۹- ریاست بڑودہ	۲،۸۵۵	۲،۴۴۸	+۱۶٫۶	۶۵۶٫۸
۲۰- ریاستہائے بنگال	۲،۱۴۲	۱،۸۶۳	+۱۴٫۹	۱۲۷٫۵
۲۱- ایجنسی وسط ہند	۷،۵۰۲	۶،۶۴۸	+۱۲٫۸	۵۲۵٫۴
۲۲- ریاستہائے چھتیس گڑھ	۴،۰۵۴	۳،۵۸۴	+۱۴٫۲	۱۵۷٫۶
۲۳- ریاست کوچین	۱،۴۲۳	۱،۲۰۵	+۱۸٫۱	۵۰۴٫۱
۲۴- ریاستہائے دکن و کولہاپور	۲،۷۸۶	۲،۴۵۸	+۱۳٫۴	۲۹۶٫۸
۲۵- ریاستہائے گجرات	۱،۴۵۷	۱،۲۶۵	+۱۵٫۲	۱۱۹٫۲
۲۶- ریاست گوالیار	۳،۹۹۲	۳،۵۲۳	+۱۳٫۳	۲۹۶٫۸
۲۷- ریاست حیدرآباد	۱۶،۱۸۴	۱۴،۴۳۶	+۱۲٫۱	۱،۱۱۱٫۲
۲۸- ریاست کشمیر	۴،۰۲۱	۳،۶۴۶	+۱۰٫۳	۲۶۴٫۲
کشمیر	۳،۹۴۵	۳،۵۸۲	+۱۰٫۱	۲۶۳٫۰
گلگت میں سرحدی علاقے	۷۶	۶۴	+۱۸٫۲	۱٫۴
۲۹- ریاستہائے مدراس	۴۹۹	۴۵۳	+۰٫۰	۶۶٫۱

مقامات	آبادی سنہ ۱۹۴۱ء	آبادی سنہ ۱۹۳۱ء	کمی و اضافہ فیصدی	خواندگی سنہ ۱۹۴۱ء
۳۰۔ ریاست میسور	۷,۳۲۹	۶,۵۵۷	+۱۱٫۸	۸۹۶٫۴
۳۱۔ صوبہ سرحد (ایجنسیاں اور قبائلی علاقے)	۲,۳۷۸	۲,۲۵۹	+۵٫۳	۱۹٫۲
۳۲۔ ریاستہائے اڑیسہ	۳,۰۲۵	۲,۶۸۳	+۱۲٫۷	۲۶۸٫۹
۳۳۔ ریاستہائے پنجاب	۵,۴۵۹	۴,۴۹۷	+۲۱٫۴	۳۳۴٫۸
۳۴۔ کوہستانی ریاستیں (پنجاب)	۱,۰۹۴	۹۹۰	+۱۰٫۵	۸۰٫۸
۳۵۔ راجپوتانہ ایجنسی	۱۳,۶۷۰	۱۱,۵۷۱	+۱۸٫۱	۷۷۲٫۵
۳۶۔ ریاست سکم	۱۲۲	۱۱۰	+۱۰٫۹	۵٫۹
۳۷۔ ریاست ٹراونکور	۶,۰۷۰	۵,۰۹۶	+۱۹٫۱	۲,۸۹۳٫۴
۳۸۔ ریاستہائے صوبہ متحدہ (رامپور و بنارس)	۹۲۸	۸۵۶	+۸٫۴	۵۷٫۶
۳۹۔ ایجنسی ریاستہائے ہند مغربی	۴,۹۰۱	۴,۲۲۲	+۱۶٫۱	۷۱۷٫۲

مندرجہ بالا اعداد و شمار اکثر قطعی اعداد و شمار ہیں سوائے چند ایسے مقامات کے اعداد و شمار کے جہاں شمار کنندگی ہنوز جاری ہے۔ لیکن ان سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

خواندگی سنہ ۱۹۴۱ء کے اعداد و شمار سر دست شمار کنندوں کی فہرست سے لیے گئے ہیں۔ جنگ کے باعث برطانوی ہند میں خواندگی کے اعداد و شمار سے متعلق گوشوارہ تیار نہیں کیے جائیں گے۔ بعض بڑی ریاستوں میں یہ گوشوارے تیار کر کے ضرور شائع کیے جائیں گے (ف-۱۰۱)

محمد احمد سبزواری ایم۔اے

روسی وسائل

ان کی پرانی اور نئی جائے وقوع

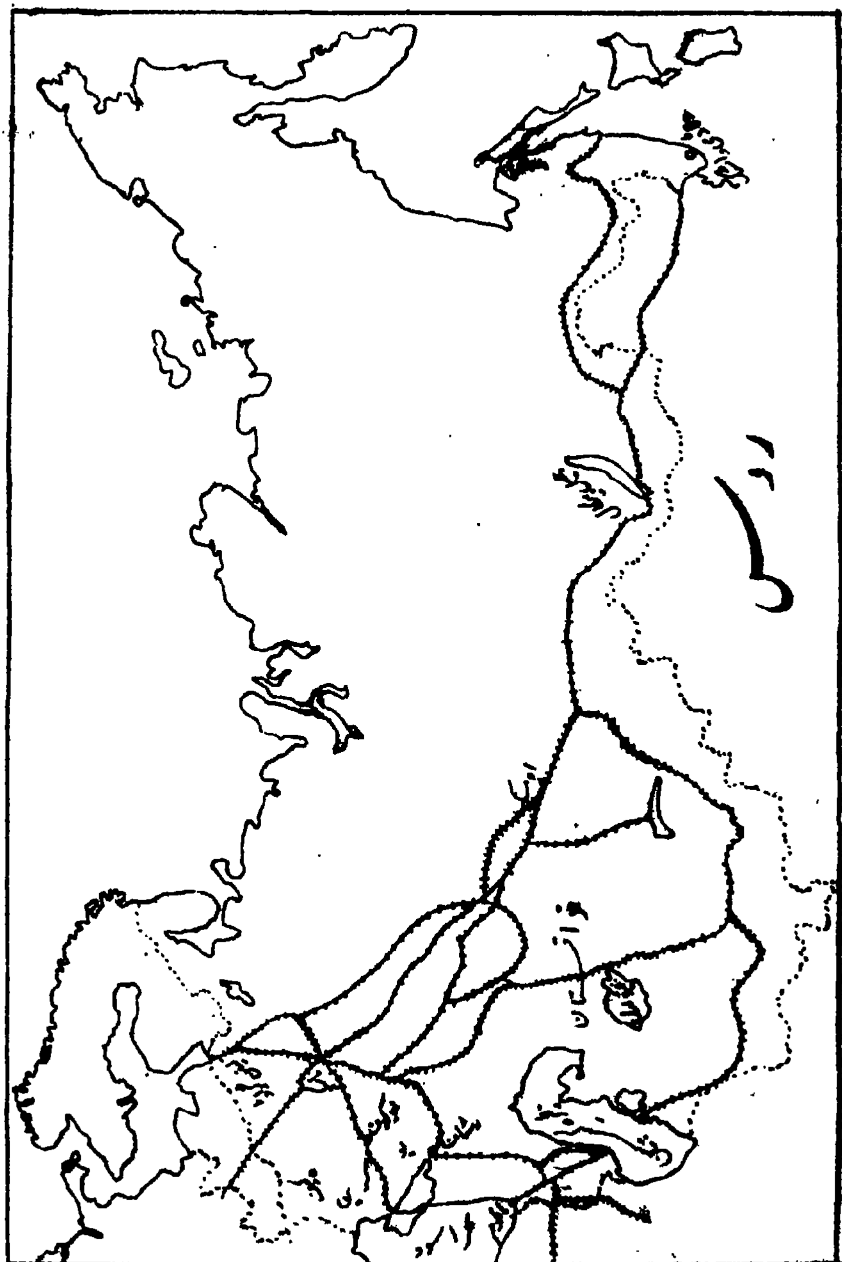
روسی وسائل اور صنعت سازی جرمنی نے روس پر حقیقتاً اس لیے حملہ کیا ہے کہ وہاں کے محکمۂ جنگ اور عوام کے لیے اس ملک کے بے پناہ وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے جو بحر بالٹک اور کیسپین سے لیکر بحر الکاہل تک اور جنوبی ایشیا کی کوہستانی سرحد سے چین تک ۸٬۰۹۵٬۷۲۸ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ درحقیقت اس کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ لوہا سب سے زیادہ پیدا کرنے والے ملکوں میں روس ریاستہائے متحدہ کے درجہ پر ہے اور مینگنیز، گیہوں، چقندر کی شکر، رائی، جو، السی، سن اور جئی کی پیداوار کے لحاظ سے دنیا میں اس کا درجہ اوّل ہے اور بہت سی ضروریات مہیا کرنے میں بھی اس کا اہم حصہ ہے۔ مگر ہمیں اس کے رقبے کی وسعت اور آبادی کے تناسب کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے (اس مضمون کے آخر میں اعداد و شمار دیکھیے) گزشتہ بیس سال تک روس والوں نے ملک کو جو ابھی تک صرف زراعتی رہا تھا موجودہ طرز کا صنعتی اور کاروباری بنانے میں بہت سختیاں سہیں۔ یہ کام دولت کی بربادی اور طویل جنگ، انقلاب اور ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اور مشکل ہو گیا۔ اس کے علاوہ باہر کا سرمایہ نہیں مل سکا اور نئی صنعتوں کی ترویج اور پرانی صنعتوں کی تنظیم ملک کے استعمال سے اور جو کچھ بچا کھچا مال باہر بھیجا جا سکتا تھا ان سب کی بچت سے کی جاتی تھی۔ زراعت کو صنعت سازی میں تبدیل کرنا محض مزدوروں اور کام کرنے والوں کے بدلنے سے ممکن نہیں۔ پھر سرمایہ صنعت و حرفت میں بہت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اور سرمایہ جمع کیے بغیر یہ تبدیلی ممکن نہیں جس پیمانے پر یہ تبدیلی ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان دیہاتی آبادی گھٹ گئی اور شہری آبادی دوسو فی صدی سے زیادہ یعنی دو کروڑ ۶۰ لاکھ اور پانچ کروڑ ۶ لاکھ کے درمیان بڑھی، پیداوار ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۱ء تک کے زمانے میں بہت گھٹ گئی۔ اسے اشیاء خوردنی

کے دو گنے مطالبے کا سامان کرنا پڑا، اور جو اشیا بنائی گئیں وہ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک چودہ کروڑ ساٹھ لاکھ سے سترہ کروڑ تک بڑھ گئیں اور انھیں اس صنعت کے لیے بھی مال فراہم کرنا تھا جو جنگ کے بعد مغربی اضلاع میں پھیلی ہوئی تھی اور جسے جنگ اور انقلاب سے بہت نقصان ہوا تھا نیز انھیں مشرق میں بہت سے صنعت ساز مرکز قایم کرنا تھے

یہ واقعات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دنیا کے اس بہت بڑے گیہوں پیدا کرنے والے ملک میں سنہ ۱۹۳۰ء تک روٹی کے لیے پروانے کیوں دیے جاتے تھے اور یہ بھی کہ وہ چیزیں جو روس میں بہت زیادہ بنائی جاتی ہیں۔ وہ باہر بھیجنے کے لیے بہت کم کیوں بچتی ہیں۔

یہ امر بحث طلب ہو کہ وہ نصب العین جو روس نے حاصل کرنا چاہا تھا وہ ملک کا بہترین مفاد تھا یا نہیں۔ مگر اس کے چلانے میں جو چیز محرک تھی وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہو۔ آج کل خود کفالتی کا اصول باوجود دقتوں کے مسلمہ ہو چکا ہو۔ اس ضروری سامان میں جو روس ایں باہر سے لایا جاتا ہو بہت سا کچا مال جس میں ربر، تانبا اور دوسری اہم دھاتیں اور مشین اور اس کے پرزے ہیں شامل ہو اور وہ سامان جو برآمد کے لیے کافی مقدار میں بچ رہتا ہو (بہ ترتیب قیمت) عمارتی لکڑی، گیہوں، دوسری اشیا خوردنی (جس میں شکر بھی شامل ہی) تیل، سمور، روئی اور مینگنیز ہیں۔ اس میں عمارتی لکڑی سب سے زیادہ اہم ہو۔ نئے کنوؤں کے کھدنے کے باوجود تیل کم بچنے لگا ہو کیونکہ زراعتی مشینوں، ملوں اور رسل و رسائل میں اس کا بہت خرچ ہو، روس کوئلے اور لوہے کے معاملے میں کسی کا محتاج نہیں جن دوسری دھاتوں کی ملک میں ضرورت ہوتی ہو ان میں ۷۰ فی صدی المونیم، ۵۰ فی صدی تانبا، ۹۹ فی صدی جستہ، ۷۷ فی صدی سیسا اور ۲۰ فی صدی دوسری دھاتیں وہیں مل جاتی ہیں۔ مینگنیز زیادہ بچ رہتا ہو۔ ان دھاتوں کی بھی بہت سی کانیں ہیں لیکن انھیں ابھی کھودا نہیں گیا۔

روئی پہلے باہر سے بہت آتی تھی لیکن اب اس کی کاشت روسی وسط ایشیا یعنی روسی ترکستان، آذربائیجان اور یوکرین میں کی جاتی ہو۔ ترکستان میں جب نہریں مکمل ہو جائیں گی تب اس کی کاشت اور بڑھ جائے گی۔ گرم ممالک کی پیداواریں مثلاً چائے سرحدی قفقاز سے لائی جاتی ہو۔ عام طور



سے کیمیاوی ربر سے کام لیا جاتا ہے اب ایک مناسب جگہ منتخب کر کے وہاں مشین لگائی جانے والی ہے جس سے اچھا مصنوعی ربر تیار کیے جانے کی امید ہے مشینیں بہت زیادہ باہر سے آتی ہیں مگر بہت سی چیزیں تیار بھی کی جاتی ہیں۔ مثلاً ٹریکٹر، زراعتی مشینیں اور موٹریں باہر سے آنا بند ہوگئیں حالانکہ ۱۹۲۷ء میں باہر کی مشینیں استعمال کرنے والے فارموں نے پانچ لاکھ ٹریکٹر، ۰۰۰،۱۰۰ فصل کاٹنے والی مشینیں اور ۰۰۰،۲۱۰ لاریاں استعمال کی گئی تھیں۔ برقی طاقت میں وسیع اضافہ کر کے صنعت سازی کو بہت زیادہ ترقی دی گئی ہے۔ باوجود تمام کوششوں کے اب بھی نصف برقی آلات باہر سے آتے ہیں ۱۹۲۰ء میں ۹۰ فی صدی ٹربائن باہر سے آتے تھے ۱۹۳۶ء میں ۹۰ فی صدی روس ہی میں بنائے گئے۔

مگر صنعت و حرفت کی ترقی ہی پر کام ختم نہیں ہوگیا۔ جرمنی کے دوبارہ مسلح ہونے اور یورپ اور مشرق بعید کی سیاسی فضا میں عام ابتری کا تقاضا یہ تھا کہ سوویٹ حکومت کو بھی مسلح کرنے کی زبردست کوشش کی جائے ۱۹۴۲ء میں مدافعتی کارروائی کے لیے ۱۰ ارب روبل مقرر کیے گئے جو جملہ اخراجات کا ایک تہائی ہے یہ امید کی جاتی تھی کہ اب خرید نے والوں کے لیے مال میں جو قلت عرصے سے چلی آرہی تھی اسے پورا کیا جاسکے گا مگر جنگ کے لیے سامان بننے لگا اور اسے پھر ملتوی کر دینا پڑا۔ اس کے علاوہ مغربی یورپی روس کے اہم حصوں میں صنعت سازی کے اجتماع سے خطرات پیدا ہوتے تھے۔ دوسری طرف مشرق بعید میں لشکر کیلیے سامان رسد پہنچانا ضروری ہے اور اس کی وجہ سے ٹرانس سائبرین ریلوے لائن پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا ہے جو ماسکو سے واڈیواسٹک پانچ ہزار میل پھیلی ہوئی ہے ان تمام وجوہ سے فوجی اور جنگی نقطۂ نظر سے یہ لازمی ہوگیا کہ تجارت اور صنعت و حرفت کے اہم مرکز مشرق کی طرف ہٹ کر قایم کیے جائیں تاکہ مغربی یورپ کے بمباروں اور فوجی حملے کی زد سے دور رہ سکیں۔

۱۹۳۳ء کے پہلے سے اس پر عمل کیا جانے لگا اور کچا مال جو کچھ بچتا اسے اس میں کھپایا جاتا یہ صنعتی اصلاح روس جیسے وسیع ملک میں جہاں رسل و رسائل کم ہوں خاص طور سے ضروری ہے۔ صنعت و حرفت کے نئے مرکز وہیں قایم کیے گئے جن کے اطراف سے کچا مال آسانی سے حاصل کیا جاسکے صنعت سازی کی مرکزیت قایم رکھنے کی وجہ سے مزدوروں کی اس جگہ فراہمی اور ان کے لیے کھانے اور دیگر سامان کی ضرورت

ہوئی۔ اس صنعت سازی کی ضرورت کے یہ معنی ہوئے کہ مال خریدنے والوں کی ضروریات کو اس قدر نہیں پورا کیا جا سکا جتنی امید کی جاتی تھی اور اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ روزمرہ کی ضروریات کی چیزوں کی بھی کمی پڑتی ہے۔

صنعت و حرفت کی جگہوں کی دوبارہ ترتیب بہت پیچیدہ مسئلہ تھا اور اس وقت جبکہ دور دراز فاصلے اور آب و ہوا کے فرق کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ ان صفحوں میں نکاسی کی وسعت اور اس کے بڑھنے کے امکانات کی تشریح کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بعض صنعت ساز علاقوں میں گزشتہ دس پندرہ سال میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے بحث کی گئی ہے۔

پرانے صنعتی علاقوں میں لینن گراڈ اور اس کے مضافات تھے۔ جہاں انجینیری دہاتوں کے کارخانے کپڑے کی ملیں، جہاز سازی اور دوسری صنعتیں تھیں۔ ماسکو اور اس کے اطراف کے اضلاع میں کپڑا بننے کے اہم مرکز (خاص طور پر آیوانوو وانسک پر) تھے اور کئی ہلکی مشینوں کے کارخانے بھی تھے۔ یوکرین، وادی نیپرا اور وادی ڈونیر کوئلے لوہے اور پانی سے حاصل کی جانے والی برقی طاقت سے مالامال ہیں اور ابھی تک صنعت سازی کے اہم ترین مرکز ہیں تھے بگارکی اور دریائے والگا کے کنارے جو دیگر پرانے مرکز تھے وہ بھی ضمنی حیثیت رکھتے تھے۔ دریائے والگا اور اس کے درمیان کا حصہ جس کا جنوبی حصہ کھدائی کے سلسلے میں تیل کے نئے چشموں کے نکل آنے کی وجہ سے "باکوئے ثانی" کہلاتا ہے، میں بھی صنعتی مرکز ہیں جنھیں حال میں ترقی دی گئی ہے اور کوزنیر کا علاقہ جو مغربی سائبیریا میں ہے اور جو ٹرانس سائبیرین ریلوے پر واقع ہے اور وسط ایشیا کا کچھ حصہ اور روسی مشرق بعید کے اور تازہ صنعتی علاقے بھی اس ترقی میں شامل ہیں۔ اس ترقی اور بہت سے لوگوں کے نقل مکان کا مطلب یہ تھا کہ روسی قوت کا مرکز مشرق کی طرف بڑھے۔ اس طرز عمل سے ایسے ہی اہم نتائج پیدا ہوں گے جو آخری انیسویں صدی میں سائبیریا کے بسانے سے پیدا ہوئے تھے۔

مفصل نقشے میں سارا روس دکھایا گیا ہے اور خاص صنعتی مرکزوں کے نقشے الگ پیش کیے گئے ہیں مختلف علاقوں کی نسبتی صنعتی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد شمار سے ہو سکتا ہے پہلی مثال برقی قوت کی تقسیم کی ہے خود لینن نے صنعتی ترقی کے لیے برقی قوت کی فراہمی پر بہت زور دیا تھا۔ بجلی کے بڑے بڑے

بجلی گھر پہلے خاص صنعتی مرکزوں میں بنائے گئے ۱۹۳۵ء تک مختلف صنعتی علاقوں میں کام دینے والی قوت کی تقسیم کا یہ تناسب تھا

برقی قوت پیدا کرنے والے علاقے	ان علاقوں کی تقسیم فی صدی
ماسکو	۳۱/۷ فی صدی
لینن گراڈ	۱۶/۹ "
یوکرین	۳۳/۲ "
یورال	۱۱/۸ "
علاقہ قفقاز	۷/۱ "

کوئلے کی صنعت کا تناسب یہ تھا۔

۱۹۳۵ء میں کوئلے کی تقسیم

علاقہ	فی صدی	علاقہ	فی صدی
ڈن باس	۶۰/۳	مشرق بعید	۳/۷
مغربی سائبیریا	۱۴/۴	مشرقی سائبیریا	۴/۰
قزاقستان	۳/۳	ترکستان	/۷
ماسکو	۹/۱	قفقاز	/۳
یورال	۶/۴	دوسرے علاقے	/۸

کوئلہ فراہم کرنے کے نئے علاقے قایم ہوجانے کے باوجود کوئلہ کی کان کا اب تک اوسطاً ۴۴ مربع میل تک رقبہ ہو سکا ہے۔

تیل کے لیے دوسری جگہوں پر نئے علاقے دریافت ہوچکے ہیں۔ مگر ابھی تک علاقہ قفقاز نوے فیصدی تیل فراہم کرتا ہے ۱۹۳۳ء میں فی صدی تناسب یہ تھا۔

تیل۔ اس کی مقدار اور علاقوں کا کل فراہمی میں ۱۹۳۵ء کا تناسب

علاقے	میٹری ہزار ٹن	تناسب فیصدی
آذربائیجان و جارجیا	۲۲،۱۱۹	۷۳/۶
گروزنی	۲،۶۵۷	۸/۸
میکوپ	۲،۱۶۱	۷/۲
داغستان	۱۸۲	/۶
ایمبا اور اکیتو بنسک	۹۴۹	۲/۱
سخالین	۶۸۱	۲/۲
والگا اور یورال	۱،۲۹۲	۴/۳
ترکستان (وسط ایشیا)	۶۶۰	۲/۲
میزان کل	۳۰،۰۴۱	۱۰۰/۰

یہ توقع کی جاتی تھی کہ ۱۹۴۲ء تک چار کروڑ ساڑھے آٹھ لاکھ ٹن تیل نکالا جاسکے گا جس میں سے والگا اور یورال کے علاقوں سے ۷،۱۴ فی صدی نکل سکے گا۔

کچے لوہے، فولاد اور پختہ فولاد کا ۱۹۳۷ء میں یہ تناسب تھا۔

علاقہ	کچا لوہا	فولاد	پختہ فولاد
یورال	۱۸	۲۰	۲۱
جنوبی روس (جس میں یوکرین بھی ہے)	۶۳	۵۳	۵۲
سائبیریا	۱۰	۹	۹
وسط روس (ماسکو اور ٹولا کے گرد کے علاقے)	۸	۱۸	۱۷

گذشتہ دس سالوں میں ان تمام علاقوں میں دھاتیں کثرت سے نکلیں لیکن ان میں سب سے نمایاں اضافہ وسط یورپی روس اور مشرقی سائبیریا کے کزباس کے علاقے نے کیا۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپی روس کے پرانے مرکزوں نے اپنی عظمت برقرار رکھی

ROLLED STEEL   PIG IRON

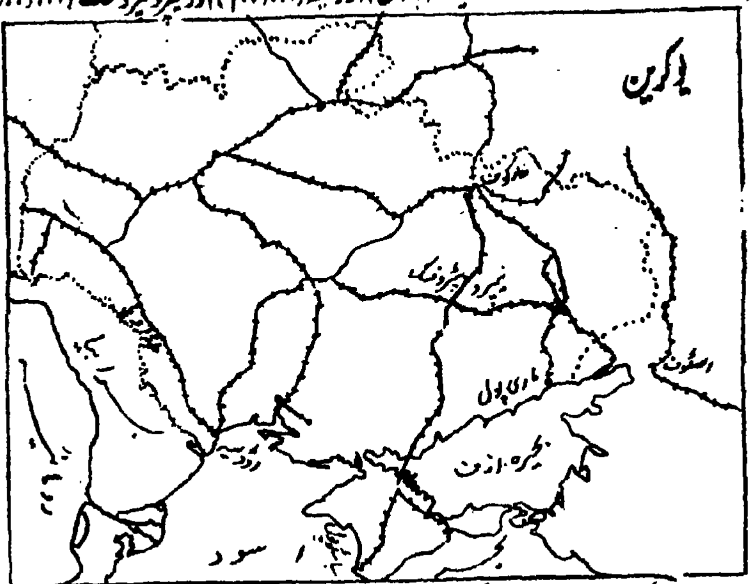
ہے لیکن اب دوسرا نمبر ماسکو سے نوسو میل یورال کے پہاڑوں کا اور اس کے نوسو میل اور دور مشرقی سائبریا کا نووسبرسک کا علاقہ ہوگیا ہے۔ اور مشرق بعید یعنی ولاڈی واسٹک میں بھی روس کے اہم مفاد کے تحفظ کے لیے صنعتیں اچھے پیمانے پر قایم ہیں۔ مغربی صنعتی مرکزوں کا نقصان بہت زبردست دھکا پہنچائے گا۔ مگر تب بھی یورال اور سائبریا میں صنعت سازی کے کافی مرکز باقی رہ جاتے ہیں۔

۲۔ پرانے صنعتی مرکز: گو مشرق کی طرف ہٹ کر اہم صنعتی مرکز قایم کرنے کی کوششیں کامیاب ہوچکی ہیں لیکن مال تیار کرنے اور صنعت سازی میں اب بھی مغربی یورپی روس کے پرانے مرکز بڑھے ہوئے ہیں۔ یورال اور سائبریا میں بڑے بڑے شہر آباد کیے جاچکے ہیں پھر بھی روس میں کوئی شہر ماسکو (۴۰ لاکھ) لینن گراڈ (۳۰ لاکھ) اور خارکوف کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مشینیں بنانے میں ان کا درجہ اول ہے۔ اور نازک نفیس اوزار بنانے کی تو بس وہی جگہیں ہیں۔ ماسکو برقی مشینوں، اوزاروں اور وسیع پیمانے پر موٹریں بنانے کا خاص مرکز ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کپڑا بنانے اور عوام کے لیے دیگر سامان بنانے کا کام بھی بہت سے کارخانے کر رہے ہیں۔ لینن گراڈ میں جہاز سازی ہوتی ہے۔ عام انجینیری کی مشینیں بنائی جاتی ہیں۔ اور ربر بنانے کے بھی کارخانے ہیں۔ تولا جس کی آبادی ۲۰۴،۲۷۲،۴ ہے سامان جنگ اور انجینیری کی مشینیں بنانے کا پرانا مرکز ہے۔ خارکوف میں کئی طرح کی بھاری مشینیں بنانے کے کارخانے ہیں۔

ان جگہوں پر بے حد مزدوران صنعتوں سے واقف اور پرانے کار آزمودہ ہیں۔ اس بات کی کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ روس کا سامان جنگ ان جگہوں سے کس قدر مہیا ہوتا تھا مگر خیال ہے کہ کافی سامان فراہم کیا جاتا ہوگا۔

مغربی یورپی روس میں دوسرا اہم صنعتی علاقہ یوکرینی سوویٹ اشتراکی جمہوریہ (.........) ہے۔ دو سال ہوئے جنوبی بودینا اور پولش یوکرین اس میں شامل کر دیے گئے تھے اور مولداویا اس سے علیحدہ کردیا گیا تھا اس سے اس کا رقبہ ۲۰۲،۴۷،۲ مربع میل اور آبادی تین کروڑ ایک لاکھ ہوگئی تھی اس طرح یہ علاقہ گو سارے روس کے رقبہ کا دو فی صدی تھا۔ مگر اس کی آبادی کا تناسب ۱۸،۲ فی صدی تھا۔ اس کی زراعتی زمین جو سیاہ مٹی والے علاقے سے تعلق رکھتی تھی سارے زراعتی رقبے کا ۱۷،۸ فی صدی تھی۔ یوکرین کے چار بڑے شہر

کیونے اور خارکوف (۸۰۰،۰۰۰ سے زیادہ آبادی) اوڈیسہ (۶۰۰،۰۰۰) اور نیپرو پیٹروسک (۵۰۰،۰۰۰) روس



کے بڑے بڑے گیارہ شہروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ روسٹوف۔آن۔ڈون جو اس علاقہ کے باہر کنارے پر واقع ہے ابھی تک صنعتی مشینیں خوب پیدا کرتا رہا ہے۔ اس علاقے کا سارے روس کی پیداوار کا ۱۹۴۰ء میں یہ تناسب تھا۔

سارے روس کی پیداوار میں یوکرین کا تناسب فی صدی۔

کوئلہ	۶۰٫۰ (۱۹۳۸)	زراعتی مشینیں	۷۰٫۰
کچا لوہا	۶۱٫۶	مینگنیز	۳۴٫۹
پکا لوہا	۶۳٫۰	الومنیم	۷۲٫۱
رولڈ دھاتیں	۴۷٫۸	مشین سازی	۲۰٫۰
شکر	۶۸٫۰	رنگ	۳۳٫۰
غلہ	۲۲٫۷ (۱۹۳۸)	سپر فاسفیٹ	۴۰٫۰
سورج مکھی کے بیج	۲۰٫۰	سوڈا	۸۰٫۰

جب مشرق کی طرف اور مرکز قایم کیے جائیں گے تب یہ تناسب کچھ کم ہو جائے گا۔ دریائے نیپر کے مغرب میں کریو آئی راگ اضلاع کی لوہے کی کانیں ہیں نیکو پول میں مینگنیز کے ذخیرے اور ڈیلا نیکولین اور خیرسن کی بندرگاہیں اور جہاز بنانے کے مرکز ہیں۔ دریائے نیپر کے کنارے دھاتوں کا سامان بنانے والے تین شہر نیپرو ڈزرنسک، نیپرو پٹروسک اور زاپوروازہے ہیں۔ آخر الذکر میں فولاد کا کام ہوتا ہے۔ اس دریا کے مشرقی کنارے پر ڈنباس کی کوئلے کی کانیں ہیں جہاں بہت سے صنعتی مرکز ہیں جن میں خارکوف جہاں ٹریکٹر ٹربائن وغیرہ ڈھلتے ہیں روس کی بھاری مشینیں بنانے والا خاص مرکز ہو بحیرہ آزوف کے کنارے ماریوپول اہم بندرگاہ ہے۔ ان متذکرہ بالا مرکزوں کے علاوہ بہت سی چھوٹی جگہیں بھی ایسی ہیں جہاں مخصوص چیزوں کے کارخانے ہیں۔ اس علاقے میں دریائے نیپر کے کنارے کنارے نیپسارائی کے بہت بڑے بجلی گھر سے برقی قوت حاصل کی جاتی ہے۔ اور نلوں کا ایک سلسلہ روستوف آن ڈان سے گزرتا ہوا اسے قفقاز کے تیل کے چشموں سے ملاتا ہے۔

یوکرین کو جو زراعتی اور بھاری صنعتی کاروبار کے قدرتی فوائد حاصل ہیں وہ روس میں شاید سب سے زیادہ ہیں اور بظاہر اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ اس کی افضلیت قایم نہ رہے گی۔ سوائے کسنیز کی وادی کے جو بہت دور واقع ہے ایسا اچھا کوئلہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں تیل کے چشمے بھی ہیں لیکن ابھی تک وہاں ایک ہی کنویں سے کام لیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ گزشتہ جنگ عظیم اور خانہ جنگی میں میدان کارزار رہ چکا ہے۔ اور اسی وجہ سے موجودہ ہوائی لڑائی کے زمانے میں دشمنوں نے فی الحال اس پر قبضہ کر رکھا ہے۔ جیسا کہ ذیل میں دیے ہوئے فاصلوں سے ظاہر ہوگا۔

کانسٹنزا یا بکارسٹ سے ڈنباس تک	۵۰۰-۶۰۰ میل
رومانوی سرحد سے کیف	۲۰۰ "
کانسٹنزا سے اوڈیسا	۲۰۰ "

جنوب کے علاقے میں جو گیہوں جاڑوں میں بویا جاتا ہے اس کی فصل جون کے آخر میں کٹتی ہے اور شمال میں جولائی کے درمیان۔

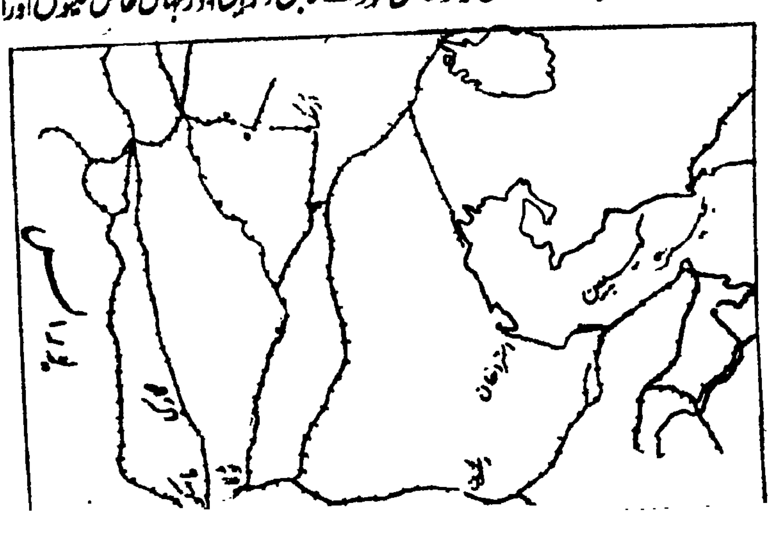
۳۔ نئے صنعتی علاقے | یورالس۔ روس کی صنعتی پالیسی کا خاص مقصد یہ رہا ہو کہ مقامی طور پر کچا مال فراہم کرکے جو ملک کے معدنی ذخیرہ کا چوتھائی ہو، یورالس کے علاقوں میں بھاری صنعتوں کے مرکزوں کو ترقی دیجائے اس میں ماؤنٹ سرڈسک، چلیابنسک، چکالوف اور کاشغر کے صوبے شامل ہیں ۱۹۱۴ء میں کچھ معدنیات کو چھوڑکر اس علاقہ میں محض زراعت ہوتی تھی آج کل برقی قوت پیدا کرنے میں ماسکو، لینن گراڈ اور یوکرین کے بعد اس کا چوتھا درجہ ہو۔ یوکرین اور سائبریا کے بعد تیسرا نمبر کوئلے نکالنے میں اور باکو، گروزنی اور میکوپ کے بعد چوتھا درجہ تیل نکالنے میں ہیں۔ میگنیٹو گارسک اور آرسک ہلیوف میں لوہا اور کیزل میں کوئلہ، ڈگٹیار کا میں تانبا اور سونا، آرسک میں نکل اور کروم، اشکر میں تیل، سولیکمسک میں پوٹاش کے خاص ذخیرے ہیں۔ یہاں ترقی کی راہ میں اچھا کوئلہ نہ ملنے کی بڑی رکاوٹ رہی ہو۔ چالیس لاکھ ٹن کوئلہ کزنیز اور کاراگنڈا سے لایا جاتا ہو اور اسے بہت راستہ طے کرنا پڑتا ہو۔ ابھی تک تیل کی بیشتر مقدار قفقاز سے لائی جاتی ہو میگنیٹو گارسک سے چلیابنسک ہوتی ہوئی سورڈلوسک تک ریل بن گئی ہو۔ اس طرح دو خاص لائنیں شمال سے جنوب تک مل گئی ہیں۔ اور اس علاقہ کو اور فروغ ہو سکا ہو۔

۱۹۳۹ء میں خاص صنعتی مرکز مع اپنی آبادی کے میگنیٹو گارسک (۱۴۵،۸۷۰)، سورڈلوسک ۴۲۵۵۴۴ اوفا (۲۴۵،۶۲۳)، نزہنی تاگیل (۱۵۹،۸۶۴)، چلیابنسک (۲۷۳،۰۰۰) ہلیوف اور ریوڈا تھے۔

روس میں میگنیٹو گارسک میں لوہے اور فولاد کے بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں اور بھاری مشینوں کا کام بہت تنوعات کے ساتھ ہوتا ہو۔ زراعتی مشینیں زیادہ تر چلیابنسک میں بنائی جاتی ہیں جون ۱۹۴۰ء میں نزہنی تاگیل میں دھات کے کام کا بہت بڑا کارخانہ کھولدیا گیا تھا یہ کہا جاتا تھا کہ کام کرنے والے حصے میں ۲۳۵،۰۰۰ ٹن سالانہ کی صلاحیت ہو اور جب یہ کارخانہ مکمل ہو جائے گا تو تقریباً بیس لاکھ ٹن پٹا ہوا لوہا اور پندرہ لاکھ ٹن پختہ لوہا نکالا جاسکے گا اور سورڈلوسک اور دوسری جگہوں اور موٹر اور انجینیری کے کارخانوں کو کچا لوہا دے سکے گا۔ یہ کارخانہ لوہے کی کانوں میں واقع ہو اور وادی کزنیز جو نو سو میل ہو اس کے اور مقامی کیزل کے کوئلہ کو ملاکر جلایا جاتا ہو اطراف کے اعلیٰ ذخیروں کو کام میں لانے کے لیے ہلیوف میں ایک دوسرا فولاد کا کارخانہ اس علاقے کے جنوبی حصے میں کھولنے کا ارادہ کیا جارہا ہو۔ سورڈلوسک کے قریب

زیوڈا کے تانبا صاف کرنے والے کارخانے نے ۱۹۴۰ء میں کام شروع کردیا۔ تیل کے ذخیرے مشرقی قفقاز کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تیل کا علاقہ یورال سے والگا تک اور شمال میں ٹیچورا کی وادی سے کاما کی وادی اور والگا کے کنارے شہر سزران اور والگا کے پار شمالی قزاقستان کے جنگلات تک پھیلا ہوا ہے۔ پانچ چھ سال کی کھدائی کے بعد بھی مشکلات کے باعث اس علاقے سے ۱۹۳۶ء میں صرف ۲۰۰ لاکھ ٹن تیل نکالا جا سکا۔ تیل کے اہم چشمے جو کام دے رہے ہیں وہ اشمبیوف میں ہیں۔ ان چشموں سے نلوں کے ذریعہ تیل اوفا پہنچایا جاتا ہے جہاں موجودہ اصولوں پر اسے صاف کرنے کی مشین ہے۔ سزران میں بھی صاف کرنے کی مشین موجود ہے۔ کبی شیف (شمارا) اوریم کے اطراف میں تین دکراسنو کمک، سیوڈکمک اور بلازنا) اضلاع ہیں۔ جہاں اس کام کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ یہاں کا تیل سراٹوف میں صاف کیا جاتا ہے۔ یوگوروسلان جو صوبہ چکالو میں واقع ہے اور آخرالذکر بہت ہی زرخیز کہا جاتا ہے۔ کروڈ آئل میں گندھک ملا ہوتا ہے اور تیل صاف کرنے کی مشینوں سے جو کچھ بچتا ہے اسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں پوٹاش سوڈیم سلفیٹ اور فاسفورٹیٹس کا بھی کافی ذخیرہ ہے اور کیمیاوی صنعتوں کے لیے کافی کچا مال ملتا ہے۔ تیل صاف کرنے والے کارخانوں کے اطراف میں کیمیاوی کارخانے بھی قایم کیے جانے والے ہیں۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تمام وسیع ترقی کے باوجود یہ علاقہ کچھ عرصے تک پرانے صنعتی مرکزوں کا محتاج رہے گا جس میں ماسکو اور لینن گراڈ خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور جہاں خاص مشینوں اور اوزار



بنانے والے تجربہ کار دستری بستے ہیں گو اب کچھ ازوار یورال کے علاقے میں بھی بننے لگے ہیں۔

۱۹۳۶ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ قفقاز کی آبادی ۱۹۲۶ء میں ۵۵ لاکھ تھی اور ۱۹۳۶ء میں اس میں ۲۵ لاکھ کا اضافہ ہوا اور یہ ۸۰ لاکھ ہو گئی گویہ اور علاقوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اضافہ نہیں مگر اس سے صنعتی کاروبار میں کافی ترقی ظاہر ہوتی ہے۔

بحر کیسپین کے بندرگاہ باکو سے سب سے زیادہ مال لادا جاتا ہے اور دوسری بندرگاہوں کے مقابلہ میں اب اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ کیونکہ بحر اسود خطرے کے علاقے میں ہے۔ باکو سے مکاچ کیل اور استراخان کو جہاز تیل لے جاتے ہیں۔ آذربائیجان اب تک صرف روس کا اسی فیصدی تیل ہی نہیں فراہم کرتا رہا بلکہ یہ تیل صاف کرنے کا اہم مرکز بھی ہے۔ اور اس کا فضلہ کیمیائی صنعتوں کے کام آتا ہے۔ جارجیائی تیل کے چشموں میں دور کے اضلاع میں چار چھوٹے چھوٹے علاقے ہیں۔ زیادہ اہمیت باطوم کے تیل صاف کرنے کے کارخانوں کی ہے جن میں کچھ عرصے پہلے توسیع کی جا چکی ہے۔ تیل کے علاوہ جیاتوری سے میگنیز اور آرمینیا سے تانبا ابھی تک حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسرے معدنیات پہاڑوں میں ہیں جس میں پارہ اور ٹنگسٹن (ایک دھات) اہم ہیں وہ ابھی تک پوری طرح نہیں کھودے گئے۔ البتہ سنکھیا نکالا جاتا ہے اور ۱۹۴۰ء میں نالچک سے پچاس میل کے فاصلہ پر مولب ڈنم (ایک دھات کا نام) کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ قفقاز کی پرانی صنعتوں میں جارجیا میں ریشم کا کام جنگ کے لیے زوروں پر ہو رہا ہے۔ ہوائی چھتریاں وغیرہ بنائی جارہی ہیں۔ چائے بھی زیادہ مقدار میں پیدا کی جارہی ہے۔ سیون جھیل کے پانی کو کام میں لاکر بجلی پیدا کی جاتی ہے اور آرمینی صنعتوں کو مدد دی جارہی ہے۔ آرمینیا میں ایک قسم کا پتھر بھی ملتا ہے جس سے ایریوان میں کیمیاوی ربڑ بنائی جاتی ہے۔ یہ تیار شدہ مال لینن گراڈ کے ربڑ کے کارخانہ میں کام میں لایا جاتا ہے۔ ڈیلالف میں سیمنٹ بھی بنایا جاتا ہے۔

مغربی سائبیریا میں کزباس اور قزاقستان | دریائے اوبی کی وادی میں نوؤسبرسک کے قریب کزنیز کے کوئلے کے علاقے کو حال ہی میں خاص ترقی دی گئی ہے۔ یہ زرخیز علاقہ ایندھن اور ریلوں کے کوئلے کی کئی قسمیں اور مغربی سائبیریا، علاقہ یورال اور مشرق بعید کی صنعتوں کے لیے کوئلہ مہیا کرتا ہے۔ یوکرین کی کانوں کے بعد

اسی کو سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اطراف میں لوہے کے ذخیروں سے پورے طور پر کام لیا جاتا ہے لیکن مقامی صنعتوں کی ضروریات کے لیے کچا لوہا باہر سے بھی لایا جاتا ہے۔ اس علاقے میں بھاری صنعتوں کا بہت بڑا مرکز قایم کرنے کا ارادہ رہا ہے۔ کیونکہ یہاں ہوائی حملوں کا امکان نہیں۔ اس علاقے کے گاؤں بڑے بڑے صنعتی مرکز بن گئے ہیں اور نئے نئے شہر آباد ہوگئے ہیں۔ کوئلے کی کانوں کے قریب کے کارخانے وسط ایشیا کی دوسری دھاتوں کو افراط سے کام میں لاسکتے ہیں۔ اس درمیان میں علاقہ کزباس کے خاص شہروں نے جو ترقی کی وہ یہاں کے کاروبار کی اچھی مثال ہے۔

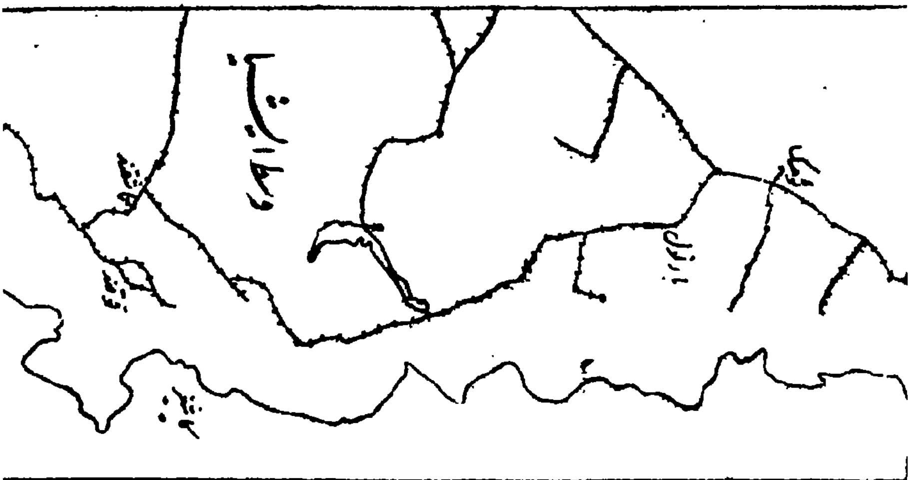
صنعتی شہروں کی ترقی آبادی

شہر	۱۹۲۶ء	۱۹۳۹ء
نووسبرسک	۱۲۰،۱۲۸	۴۰۵،۵۸۹
کیمیروو	۲۱،۷۲۶	۱۳۲،۹۷۸
سٹالنسک	۳،۸۹۴	۱۶۹،۵۳۸

برنال میں کپڑا بنا جاتا ہے۔ اور اسکا منوگارسک میں تانبا صاف کیا جاتا ہے۔ قزاقستان کے مشرقی اضلاع میں نئے صنعتی علاقہ کو فروغ دیا جارہا ہے۔ گاراگنڈا کی کوئلے کی کانوں پر یہ صنعتی سرگرمی مبنی ہے۔ دس سال پہلے ان کی نکاسی ۹۰۰۰۰ ٹن تھی مگر ۱۹۴۷ء میں ان سے ۶،۳۰۰،۰۰۰ ٹن کوئلہ نکالا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں کاراگنڈا کا شہر تھا ہی نہیں اور ۱۹۳۹ء میں اس کی آبادی ۱۶۵،۹۳۷ تھی۔ سارے قزاقستان میں جس کا بیشتر حصہ ابھی تک صحرائی ہے صنعتی مال نصف سے زیادہ بنایا جاتا ہے۔ لوہے کے علاوہ دوسری دھاتوں کی صنعت میں خاص ترقی کی گئی ہے۔ لاپرواہی، بدانتظامی اور غیرمہذب مقامی مزدوروں کے باوجود مال بہت زیادہ بنایا جاتا ہے۔

چمکنٹ میں جس کی آبادی ۷۴،۱۸۵ ہے۔ سیسے اور جستے کے کارخانے ہیں یہ یونین کے مال کا ۹۱ فی صدی بناتا ہے۔ اور ریڈر کا مختلف دھاتوں کا کارخانہ سیسے کے سامان ۲۲ فی صدی فراہم کرتا ہے بہت سی نادر دھاتوں کے ذخیروں کے لیے کہا جاتا ہے کہ موجود ہیں مگر ابھی سوائے او بنسک میں وولفرام دھات کے اور

کوئی کموڈی نہیں گئی چمکنٹ، یڈر، کاراگنڈا اور بلکاشل اہم مرکز ہیں جہاں موجودہ طرز کے بڑے بڑے کارخانے کھولے گئے ہیں اور یوکرین وسط روس اور یورپی روس کے دوسرے حصوں سے تجربہ کار مزدوروں کے جتھے بلاکر کام میں مدد لی گئی ہے۔



سویٹ وسط ایشیا | اس میں ترکستان، ازبکستان، قزاقستان، قرغیزیا کی خودمختار ریپبلک شامل ہیں۔ پہلے اس علاقے میں ابتدائی اصولوں پر تجارت ہوتی تھی اور خانہ بدوش مویشی پالتے اور ان کی پرورش کرتے تھے مگر گزشتہ پندرہ بیس برس میں یہاں بڑے پیمانہ پر صنعتوں کے لیے کاشت کی جانے لگی ہے۔ خاص طور پر روئی کی کاشت ہوتی ہے اور صنعتی فروغ کی کوشش کی جا رہی ہے آبادی محض تاتار ترکمان اور منگول نسل کی ہے۔ یہ ۱۹۲۶ء میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے بڑھ کر ۱۹۳۹ء میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہو گئی۔ ازبکستان میں دیہاتی آبادی دس لاکھ بڑھی مگر خاص اضافہ شہروں میں ہوا۔ تاشقند کے تاریخی شہر کی موجودہ آبادی ۵۰۰۰۰۰ ہے اور سمرقند و بخارا، خوقند میں موجودہ طرز کے وسیع محلے بنائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں پانچ ہائیڈرو الکٹرک بجلی گھر، کپڑے کی ملیں اور دوسرے کارخانے ہیں محکمہ آب پاشی کی وجہ سے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک روئی کی کاشت تگنی ہو گئی۔ کچھ روئی تو اسی جگہ یعنی فرغانہ (ترکستان) عشق آباد (ترکمانستان) کے نئے قایم کردہ کارخانوں میں بُننے اور کاتنے میں استعمال کیجاتی ہے۔ اس علاقے میں تیل، کوئلے، لوہے

مولب ڈنم اور دوسری دھاتیں پائی جاتی ہیں لیکن ان معدنیات کی وسیع پیمانے پر کھدائی ابھی شروع ہی کی گئی ہے۔ ترکمانستان میں نذ بنڈگ میں تیل کے نئے چشمے کھودے جا رہے ہیں۔

مشرق بعید | روسی مشرق بعید میں صوبہ بیریا یم اور خابرووسک کے علاقے ہیں جس میں آمور، کمچٹکا، آخوتسیچ سخالین اور خابرووسک کے صوبے شامل ہیں روس کو یہ خطرہ ہے کہ اسے مشرق بعید کو جاپان سے بچانا پڑے گا اسی وجہ سے وہ اس علاقے میں صنعتوں کو بڑھا کر آبادی اور وسائل میں اضافہ کر رہا ہے۔ تاکہ وہاں لڑنے والی فوجیں صرف اسی رسد کی محتاج نہ رہیں جو ٹرانس سائبرین ریلوے پر لائی جاتی ہیں۔ گو وہاں دوہری لائن بنادی گئی ہے لیکن فوجوں کے لیے ریلیں اتنی دور رسکو سے جو ۵۰۰۰ میل ہے یا یورالس سے بھی جو ۴۰۰۰ میل ہے سامان پہنچانے کی صعوبت برداشت نہیں کر سکتیں۔ یہاں کھانے کا سامان بھی کافی نہیں کیونکہ غلہ کم پیدا ہوتا ہے۔ اور ان سالوں میں مویشیوں میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوا اس لیے سامان جنوبی سائبریا سے بھیجنا پڑے گا۔ صنعتوں کو ترقی دینے کے منصوبوں کو بہت تاخیر سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ولاڈی واسٹک کے مشرق میں لاسس (سوچن) کی کانیں اچھے کوئلہ کا خاص وسیلہ ہیں، بوریٹیا کی وسیع بھورے رنگ کے کوئلے کی کانوں سے کوئلہ نکالنے میں بہت کم ترقی کی گئی ہے۔ کچا لوہا زیادہ نہیں پایا جاتا گو نکولیوسک اور ٹل چیگان میں اس کے ذخیرے موجود ہیں۔ اس درمیان میں خابرووسک کے موجودہ اور کسومولسک کے بھاری کام کے نئے کارخانوں کے لیے لوہا اور فولاد مشرقی سائبریا اور یورالس سے لایا جاتا ہے۔ آئسترال میں فولاد اور لوہے کا ایک وسیع کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے لیکن مغرب سے ضروری سامان نہ ملنے کی وجہ سے کافی دیر ہو رہی ہے۔

ولاڈی واسٹک کے شمال میں ٹیٹیوگ میں جستے کی کانیں کھودی گئی ہیں اور سیونا ایلین پہاڑ کی چاندی اور سیسے اور اس جستے کو کام میں لانے کے لیے ایک انجمن بنادی گئی ہے۔ تعمیر کے لیے پتھر اور عمارتی لکڑی بہت ہے اور یسوری ریلوے پر واقع اسپانسک میں سیمنٹ فیکٹری کھولی گئی ہے تیل کی جو ضرورت پڑتی ہے۔ وہ امریکہ سے ولاڈی واسٹک کے ذریعے لایا جاتا ہے۔ گو ۱۹۳۵ء میں سخالین میں ۳۶۰۰۰۰ ٹن تیل نکلا تھا۔ روسی مشرق بعید میں ٹین، مولب ڈنم اور ٹنگسٹن کے قیمتی ذخیرے بھی ہیں جنہیں ابھی کھودا نہیں گیا ہے۔

۴۔ روس کی پیداوار صنعتوں اور معدنیات کی مجموعی کیفیت | اس فہرست سے ظاہر ہوگا کہ سنہ ۱۹۳۷ء یا اکثر جگہ سنہ ۱۹۳۸ء میں ساری دنیا کی پیداوار صنعتوں اور معدنیات میں روس کا فیصدی کیا تناسب رہا ہے اور دوسرے ممالک میں اسکا درجہ کیا تھا

معدنیات

اشیاء	نکاسی میٹری ٹن	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
پٹرولیم (۱۹۳۹)	۲۹،۵۳۰،۰۰۰	۱۰٫۶	دوسرا
کوئلہ	۱۳۲،۸۸۸،۰۰۰	۱۰٫۹	چوتھا
کچا لوہا	۱۴،۰۶۰،۰۰۰	۱۹٫۵	پہلا (امریکہ کے ساتھ)
باکسائٹ (کچا)	۲۵۰،۰۰۰	۶٫۱	آٹھواں
کروم (۱۹۳۷)	۹۰،۰۰۰	۱۶٫۳	تیسرا
تانبا	۹۸،۰۰۰	۴٫۸	چھٹا
سونا	—	۱۲٫۵	تیسرا
سیسا	۶۹،۰۰۰	۳٫۹	آٹھواں
مینگنیز	۱،۰۰۵،۰۰۰	۴۱٫۳	پہلا
پارہ (۱۹۳۴)	۲۶۸،۰۰۰	۵٫۲	پانچواں
نکل	۲،۵۰۰	۲٫۳	تیسرا
جستہ	۷۰،۰۰۰	۳٫۷	ساتواں
اسبسٹوس (۱۹۳۶)	۱۲۵،۰۰۰	—	—
فاسفیٹ	۲،۳۰۳،۰۰۰	۱۵٫۸	دوسرا
پوٹاش	۱۲۲،۰۰۰	۴٫۱	چوتھا

بُننے کا سامان

روئی (۱۹۳۹)	۸۸۰،۰۰۰	۱۲٫۵	تیسرا
کتان (۱۹۳۹)	۶۳۳،۰۰۰	۶۸٫۰	پہلا

اشیاء	نکاسی (میٹری ٹن)	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
سن (۱۹۳۹)	۱۱۰,۰۰۰	۲۹/۳	پہلا
ریشم (خام)	۱۰,۸۰۰	۳/۲	چوتھا
اون	۱۳۷,۰۰۰	۷/۶	پانچواں

تیل نکالنے والی اشیاء

اشیاء	نکاسی (میٹری ٹن)	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
بنولا (۱۹۳۹)	۱,۹۰۰,۰۰۰	۱۴/۵	تیسرا
السی	۶۵۰,۰۰۰	۲۳/۱	دوسرا
تِل	۹,۰۰۰	۱/۴	آٹھواں
سویا کی پھلیاں (۱۹۳۷)	۱۰۰,۰۰۰	۱/۳	چھٹا

غلہ اور دیگر سامان خوردنی

اشیاء	نکاسی (میٹری ٹن)	ساری دنیا میں تناسب	درجہ
جو	۸,۲۰۰,۰۰۰	۱۹/۲	پہلا
مکھن	۱۹۸,۰۰۰	—	—
جوار	۲,۶۹۰,۰۰۰	۲/۳	چھٹا (ہنگری کے ساتھ)
گوشت	۲,۳۰۳,۰۰۰	—	—
مچھلی	۱۲,۹۹۰,۰۰۰	۲۵/۲	پہلا
رائی	۲۰,۹۳۰,۰۰۰	۴۳/۴	پہلا
موٹا چاول	۳۱۷,۰۰۰	/۳	انیسواں
چائے (۱۹۳۹)	۱۱,۰۰۰	۱/۸	ساتواں (چین کو نکال کر)
شکر (چقندر کی-۱۹۳۹)	۲,۴۰۰,۰۰۰	۲۳/۰	پہلا
تمباکو (۱۹۳۶)	۲۷۶,۰۰۰	۱۱/۶	تیسرا
گیہوں	۴۰,۸۸۰,۰۰۰	۲۵/۰	پہلا

(مترجمہ ش-ا-ک)

جاپان کی اقتصادی کمزوری اور قوت

معاشی طاقت کے ذرائع بڑی طاقتوں میں جاپان کا شمار ابھی حال ہی میں ہوا ہے۔ وہ اپنی طاقت کے اقتصادی ذرائع کے اعتبار سے سوائے اطالیہ کے سب سے پیچھے ہے یا یوں سمجھیے کہ موجودہ جنگ کے شروع میں تھا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ بلحاظ آبادی وہ اقوام عالم میں ممتاز ہے۔ ۷۰۰ لاکھ لوگ جاپان خاص میں ۲۱۰ لاکھ رعایا کوریا، فارموسا، کوان ٹنگ اور سکھالین میں ہے۔ مزید براں ۳۹۰ لاکھ کی آبادی منچوریا اور جہول میں علاوہ چین کے متعدد حصوں کی آبادی کے کم وبیش اس کے زیرنگیں ہے۔ اس کی قومی آمدنی صرف جاپان خاص کی برطانیہ کی قومی آمدنی کے نصف سے کسی قدر کم ہے اور اس لیے وہ بحیثیت مال برآمد کرنے والے اور تاجر کے ریاستہائے متحدہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس سے خاصا پیچھے ہے۔ مزید براں چونکہ اس کی فی الاصل آمدنی کسی بڑی قوت والے ملک کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے لہٰذا اس کی مجموعی پیداوار کی طاقت کا تناسب آبادی کی ضروریات پورا کرنے کے بعد جنگ جیسے مقاصد کے لیے نسبتاً بہت کم رہ جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر جاپان کی بڑائی کا انحصار کس چیز پر ہے۔ اول یہ کہ اس حیثیت کا انحصار جغرافی جائے وقوع پر ہے۔ مغربی تہذیب کے مرکزوں سے دور دراز ہے اور اُن گنجان آبادیوں سے نزدیک ہے جن کا معاشی معیار نسبتاً پست ہے اور جن سے اسے نفع بخش تجارت کے موقعے ہاتھ آتے ہیں نیز جو فوجی اعتبار سے بھی اس کی کم مخالفت کر سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ اسے اپنے تجارتی بیڑے پر بھروسہ ہے (جو بذات خود اس کے جغرافی احول کی پیداوار ہے) جو کہ دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ اگرچہ جسامت کے اعتبار سے امریکہ کے نصف اور برطانیہ کے ایک ثلث کے برابر ہے۔ اس کی بدولت اس کی بحری طاقت بھی قایم ہے جو بتدریج ہر دو دول کی طاقتوں کے تقریباً برابر ہے۔ سوم یہ کہ جاپان ایک بڑی طاقت یوں بھی ہو گئی کہ وہ اپنے وسایل زیادہ تر فوجی اور جہازی مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہتا ہے۔ دس سال قبل فتح منچوریا سے پہلے ہی جاپان تقریباً ساڑھے چار فیصدی قومی آمدنی اور ۳۰ فی صدی ریاست کی آمدنی فوجوں پر خرچ کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ

میں برطانیہ کا خرچ ۲½ اور ۱۴ فیصدی علی الترتیب تھا۔

جنگی قوت | جاپان کا عام معاشی نظام موماً ایسا نہیں ہے کہ اس کو ایک بڑی جنگی قوت بنا سکے۔ مثلاً کوئلہ ہے تو کافی لیکن کان کنی کے اعتبار سے گراں نیز کچے لوہے کے وسائل بہت کم ہیں پھر بھی ان کی مدد سے اس کی فولاد کی نکاسی ان دنوں غالباً سات لاکھ میٹری ٹن سالانہ ہے۔ فلزیات کے باب میں قدرتی کمزوریوں نے اسے بجائے بھاری صنعتوں کے ہلکی صنعتوں کا ماہر بنا دیا ہے۔ تقریباً نصف صنعتی کارکن کپڑے کی صنعتوں میں لگے ہیں اور انجنیری صنعتوں نے بالکل بنیادی یا انتہائی مکمل قسم کا سامان بنانے میں کم ترقی کی ہے۔ مثلاً ایک طرف مشینوں کے پرزے نہ ملیں گے تو دوسری طرف مکمل شدہ موٹریں اور ہوائی جہاز کم ہوں گے

اگرچہ اسے پارچہ بافی پر بہت بھروسہ ہے لیکن پھر بھی کئی اعتبار سے اس وقت جاپان کی اقتصادی حالت برطانیہ کی گزشتہ درمیانی صدی والی اقتصادی حالت سے ملتی جلتی ہے۔ جاپان کی مقبوضہ آبادی کا نصف حصہ زراعت یا ماہی گیری پر گذر کرتا ہے۔ رہی صنعت وحرفت سو وہ اس وقت بڑی حد تک گھریلو دستکاری یا چھوٹے سے کارخانوں کے درجہ پر ہے لیکن ۱۸۵۰ء کے برطانیہ سے اب جو اختلافات ہیں ان کی وجہ سے بنیادی یکسانیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً یہ کہ معاشی قوت کا چند دولتمند خاندانوں کے ہاتھ میں ہونا نیز جاپان کی جدید جزوی صنعت کا بڑے پیمانے پر پھیلنا وغیرہ وغیرہ اگر جاپان کی زراعت کا اوسطاً ایک صدی پہلے کے برطانیہ کی زراعت سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا جاپانی زراعت مقابلتہً پست ہوتا ہم یہ کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

جنگ کے نقطۂ نظر سے جاپانی معاشیات کی کمزوری اسوقت اور اجاگر ہو جاتی ہے جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی حیثیت کا انحصار بیرونی تجارت پر کس قدر ہے۔ بمقابلہ برطانیہ کے جاپان کی بیرونی تجارت اس کی قومی آمدنی کے لحاظ سے بہت کم ہے لیکن جہاں یہ تقریباً صحیح ہے کہ ماکولات کے سلسلہ میں انگلستان کا انحصار درآمد پر ہے اور اس کے بعد صنعتی خام مال پر ہے وہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جاپان غذا کے معاملہ میں اپنا آپ کفیل ہے اور صنعتی خام مال اور ایندھن کے لیے باہر کا محتاج ہے۔ جنگ سے پہلے جاپان کی تجارت درآمد کی فہرست میں سب سے بڑی شے کپاس کی تھی (سنہ ۱۹۳۶ء کی کل درآمد کا ۱۲ فیصدی) دوسری اہمیت خام اون کی تھی

(۲ء۷ فی صدی) معدنی تیل (۷ء۶ فی صدی) پٹا لوہا کچا لوہا اور آہنی کترن (۵ء۹ فیصدی) کھاد (۳ء۰ فی صدی) اور ربڑ (۲ء۲ فی صدی) اس کے علاوہ تھے۔ ان تمام ضروری سامان کی درآمد ۵ء۷ فی صدی سے زیادہ تھی۔ یہ صحیح ہو کہ بوقت ضرورت اس کے سوتی کپڑے کی برآمد میں کمی یا التوا اس کی کپاس کی ضرورت میں کمی کر سکتے ہیں لیکن بات یہ ہو کہ اس درآمد کا بیشتر حصہ نیز دیگر متذکرہ چیزیں خود اس کے ذاتی استعمال کے لیے ضروری ہیں چنانچہ اس کے فولادی مال کے ⅔ حصہ سے زیادہ کی تیاری کا انحصار درآمدہ لوہے پر ہو اور ½ درآمدہ پٹے اور کترنی لوہے پر ہو اور بقیہ سے اسی طرح کچے لوہے پر۔ کچا لوہا جزوی طور پر منچوریا سے مہیا ہو سکتا تھا لیکن بیشتر فولادی کترن امریکہ سے آتی تھی۔

ظاہر ہو کہ ایک غیر معمولی جنگ میں بھی اس کی تیل کی ضروریات میں اضافہ ہوگا اور تقریباً ⅘ ضروریات کو کیلی فورنیا پورا کرتا تھا۔ ربڑ اس کے ہاں نیدرلینڈز انڈیا اور ملایا سے، روئی ہندوستان اور امریکہ سے اور اون آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ سے فراہم ہوتا تھا۔ کھاد جو اس کی زراعت کے لیے اشد ضروری ہو کچھ تو منچوریا سے۔ سویابین اور کیک کی صورت میں آتی ہو لیکن اس کی سب سے زیادہ مقدار ہندوستان سے جاتی تھی اسی طرح یہ بھی معلوم ہو کہ جاپان باکیسٹ اور دیگر آہن آمیز دھاتوں کی ضروریات میں اور جیسا کہ صنعتی ترقی کے باب میں بتایا جا چکا ہو۔ اعلیٰ درجہ کی انجنیری کی پیداوار میں دوسروں کا محتاج ہو۔ اور جو صرف امریکہ برطانیہ اور جرمنی سے فراہم ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات صاف ہو کہ اب جبکہ جاپان زبردست بحری مہمات کی جنگ میں اُلجھ گیا ہو تو اسے اپنے خاص جنگی سامان کی فراہمی کے لیے بڑے بڑے راستوں کا کھلا رکھنا دشوار ہوگا بحض مغربی بحر الکاہل پر سیادت ناکافی ہوگی۔

۲۔ جنگ: متذکرہ حالات کے پیش نظر یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں کہ خود اس کا چین سے مناقشہ جسے ساڑھے تین سال سے زیادہ ہو چکے ہیں اور مغرب کی لڑائی اس کی معاشیات پر بہت کچھ اثر انداز ہوئی لیکن عرصہ سے جنگی اقتصادیات کی طرف اس کا رجحان زیادہ رہا ہو۔ اس کا حساب لگایا گیا ہو کہ ۳۷-۱۹۳۶ء میں جب جاپان کے کل تیار شدہ مال کی قیمت ۱۲۰۰۰۰ لاکھ ین سے بڑھ کر ۳۹-۱۹۳۸ء میں ۱۲۵۰۰۰ لاکھ ین تک پہنچی تو اس اضافہ میں سے ۲۰۰۰۰ لاکھ ین سامان جنگ کی پیداوار تھی۔ اس کی اصلی نکاسی علاوہ

سامان حرب کے اس دو سال کے وقفہ میں تقریباً ½ ۱۲ فی صدی گر گئی اور اس کا خاص سبب یہ تھا کہ شہری استعمال کے لیے صنعتی نکاسی میں ایک تہائی سے زائد کمی ہو گئی تھی مگر اس کے سنہ ۱۹۳۶ء اور سنہ ۱۹۳۸ء کے درمیان خاص فوجی سامان کی درآمد ۶۶۰۰ لاکھ ین سے ۱۲۴۶۰ لاکھ ین تک پہنچی اور دیگر مال کی درآمد ۲۱۰۴۰ لاکھ ین سے ۱۴۱۳۰ لاکھ ین رہ گئی۔ اس طرح مجموعی شہریوں کے لیے مال کی نسبت میں تقریباً ⅓ کی کمی ہو گئی۔

سامان جنگ کی خریداری کے سلسلہ میں بیرونی شرح مبادلہ میں کمی نیز جاپانی مال کے غیر سرکاری بائیکاٹ کی وجہ سے (خاص کر اس کی انتہائی اہم ریشم کی برآمد جو امریکہ کو ہوتی تھی) ادائیگیوں پر پابندی کے سبب سے (جس کا حساب امریکہ کے تجارتی محکمہ نے لگایا تھا کہ شروع سنہ ۱۹۳۹ء میں ۶۰ فی صدی کمی ہو گئی تھی) تجارت درآمد پر سخت گیری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں ین کی قیمت سنہ ۱۹۳۸ء کے وسط تک اس کے ایک سال قبل کی قیمت کا صرف ۶۵ فی صدی رہ گئی سنہ ۱۹۳۹ء اور سنہ ۱۹۴۰ء میں کچھ اضافہ ہوا لیکن ابھی حال ہی کے چند ماہ میں سنہ ۱۹۳۶ء کے ½ سے بھی نیچے گر گئی ہے۔ البتہ برآمد میں زیادہ اضافہ ہوا ہے اور بظاہر تجارت کے میزانیہ میں ۱۹۳۶ء میں سونے کی زبردست نکاسی کے بعد ترقی ہوتی رہی۔ اس چار سال کے عرصہ میں رفتار سرمایہ اور خفیہ تجارت کی ہیئت کے متعلق تو اچھی طرح علم نہیں البتہ بیان کیا جاتا ہے کہ معرکہ چین کے پہلے تین برس میں جو سونا امریکہ کو بھیجا گیا اس کی مالیت ۲۴۰۰۰ لاکھ ین سے زیادہ تھی۔ اس حساب سے موجودہ سونے کی نکاسی تقریباً ۴۰۰۰ لاکھ ین سالانہ یعنی اس کا صرف نصف ہوئی۔

تجارت درآمد پر سختی کا یہ اثر ہوا کہ کپڑے کی تیاری میں سخت تخفیف کی گئی۔ ملکی مصرف کے لیے بھی کل پیداوار میں بہت کمی کر دی گئی لیکن اس سے تجارت برآمد نقصان اٹھائے بغیر نہ رہ سکی۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء کے ابتدائی ۷ ماہ میں سوتی کپڑے کی برآمد اس سے ایک سال قبل کے مقابلہ میں نسبتاً ۲۲ فی صدی کم تھی اور سنہ ۱۹۳۹ء کے تمام سال میں سنہ ۱۹۳۷ء کے مقابلہ میں ۱۰ فی صدی کم تھی۔ کچے ریشم کی برآمد بھی بہت گھٹ گئی یعنی سنہ ۱۹۴۰ء کے ابتدائی ۷ ماہ کے مقابلہ میں سنہ ۱۹۳۹ء کے بہ نسبت ۴۰ فی صدی کم ہو گئی اور سنہ ۱۹۳۹ء میں بمقابلہ سنہ ۱۹۳۶ء کے من حیث المجموع ۲۳ فی صدی کم تھی۔ اس کے علاوہ کوئلہ پر پابندی اور برق آبی کی موسمی

کمی کی وجہ سے ۱۹۴۰ء کے شروع میں برقی قوت میں انتہائی کمی ہوگئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود کپڑے کے کارخانے اور دوسری کمپنیاں خوب نفع کماتی رہیں۔

۴۔ مالیات اور زرِ افراطِ زر: جنگِ چین کی وجہ سے قدرتی طور پر حکومت کے مصارف بڑھ گئے۔ نقشہ ذیل سے حالت ظاہر ہو۔

(جاپانی بجٹ کا حساب اس میں ریلوے اور مصارف خصوصی وغیرہ شامل نہیں ہیں لیکن معرکہ چین سے متعلق اخراجات شامل ہیں)

سال	آمدنی	خرچ	خسارہ	فوج و بیڑہ (مع جنگ چین)
۱۹۳۶-۳۷	۱۵۶۲	۲۲۸۲	۷۲۰	۱۰۷۸
۱۹۳۷-۳۸ء	۲۲۱۹	۵۳۱۱	۳۰۹۲	۴۴۲۲
۱۹۳۸-۳۹ء	۲۹۱۰	۸۱۳۸	۵۲۲۸	۶۰۹۷
۱۹۳۹-۴۰ء	۳۱۰۸	۹۵۰۰	۶۳۹۲	۶۴۳۲
۱۹۴۰-۴۱ء	۴۱۹۱	۱۰۳۶۰	۶۱۶۹	۶۷۶۲
۱۹۴۱-۴۲ء	۴۷۸۳ تقریباً	۱۱۰۰۰ تقریباً	۶۰۰۰	۷۶۲۸

اس سے معلوم ہوگا کہ فوجی مصارف مع ان کے جو چین میں برداشت ہوئے کلیتاً قرض سے پورے کیے جا رہے ہیں۔ گزشتہ سال کے آخر میں قومی قرضہ ۰۰۰،۷ ملین ین تھا۔ ۱۹۳۶ء کے آخر سے اس قرضہ میں ۰۰۰،۱۷ ملین ین کا اضافہ ہوا۔ اور اس قرض کی ادائگی میں آمدنی کا تقریباً ۴۰ فی صدی کھپ جاتا ہے۔ آخر اتنے زبردست قرض کو چندہ سے کہاں تک کم کیا جا سکتا ہے نیز اس قرض سے بڑی حد تک زرِ افراطِ زر کی خرابیاں پیدا ہو جائینگی۔ موسیو ساکر اوچی وزیر مالیات نے ایک سال پہلے تخمینہ کیا تھا کہ پبلک چندہ پچھلے سال میں ۰۰۰،۱۰ ملین ین تک پہنچ چکا تھا۔ اسے ایک قابل لحاظ کامیابی سمجھنا چاہئیے کیونکہ یہ رقم قومی آمدنی کے ½ سے خاصی زیادہ تھی لیکن چونکہ ۱۹۴۲-۴۳ء کی باقی شدہ آمدنی کا تناسب ⅓ سے زائد معلوم ہوتا ہے لہذا یہ کامیابی ممکنات میں سے نہیں ہے۔ صنعتی مصارف اور حکومت کے ۱۹۴۰ء والے قرض مل جل کر اس رقم کو کم و بیش ختم کر دیں گے۔ قرضی

افزایش زر کی خرابیاں جو تیزی سے پھیل رہی ہیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ کفایت شعاری تمام بار کو اُٹھانے کے لیے ناکافی ہوگی۔ جاپان بنک کے پاس جو سرکاری تمسکات ہیں ان میں ۲۵۰۰ ملین ین کا اضافہ چین کی جنگ کے شروع ہونے پر ہوا۔ اس وقت کل رقم ۳۰۰۰ ملین ین ہے اور نوٹ کا اجرا دوگنے سے بھی زیادہ کر دیا گیا ہے۔ زر کی فراہمی کی نسبت سے چیزوں کی قیمتوں کو بڑھنے سے روک دیا گیا ہے۔ اس بات کی براہ راست کوشش کی گئی ہے کہ عام قیمت کی سطح وسط سنہ ۱۹۳۸ء کی قیمتوں سے بلند نہ ہونے پائے پھر بھی اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں کل تجارت کا انڈکس سنہ ۱۹۳۸ء کے اوسط سے ۲۳ فی صدی بلند رہا۔ اس کے مقابلہ میں روزمرہ زندگی کے عام خرچ کا انڈکس نومبر میں ۳۱ فی صدی اور غذا کی قیمت کا انڈکس سنہ ۱۹۳۸ء کی سطح سے ۳۲ فی صدی بلند تھا۔ اس اضافہ کے ساتھ ساتھ کل مال کی تیاری میں کوئی اضافہ نہیں ہوا چنانچہ جون سنہ ۱۹۴۰ء میں صنعتی پیداوار کا عام انڈکس (موسمی تغیرات کو نظر انداز کرتے ہوئے) اس سطح پر تھا جیسا کہ تقریباً سنہ ۱۹۳۶ء میں رہا اور سنہ ۱۹۳۹ء کے اوسط سے نسبتاً کچھ کم سنہ ۱۹۴۰ء میں۔ سنہ ۱۹۳۸ء کے مقابلہ میں استعمالی مال کی مجموعی پیداوار ۱۰ فی صدی گھٹ گئی۔ اور وہ سامان سے جن سے دیگر سامان بنایا جا سکتا ہے مجموعی حیثیت سے ۱۱ فی صدی کم رہا لیکن پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مال کی کل مقدار موجودہ حالات کے ماتحت اپنی انتہائی حد کو پہنچ چکی ہے۔

مالی بچت موجودہ سطح تک سخت کفایت شعاری سے پہنچائی گئی ہے اس سلسلہ میں کسی قدر جبر و تشدد سے بھی کام لیا گیا ہے (مثلاً کمپنی کے حصہ داروں کو منافع کم دیا گیا وغیرہ وغیرہ) پھر بھی جیسا اوپر ظاہر کیا گیا کہ مصنوعی ذرائع سے روپیہ کی افزایش کی خرابیاں ابھی بڑی حد تک جاری ہیں یکم مارچ کے رسالہ اکونامسٹ میں ایک نامہ نگار نے بیان کیا کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں جنگی صنعتوں پر ۶۰۰۰ ملین ین صرف کرنے کا ارادہ ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو ظاہر ہے کہ مصنوعی طور پر زر کی افزایش موجودہ شرح یا اس سے زیادہ پر ضرور بالضرور جاری رہے گی

۵۔ جاپان کی جنگی تیاری موجودہ قیمتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس سال سنہ ۱۹۴۲ء میں جاپانی قومی آمدنی ۳۰۰۰۰ ملین ین سے بڑھ سکے گی لہذا حکومت ½ آمدنی کو جنگی مقاصد کے لیے صرف کرنا چاہتی ہے اور دیگر ½ کو بھی اسی قسم کے مقاصد کے لیے نئی ضروریات پر صرف کرنا چاہتی ہے۔ حال کے چند سال

میں آمدنی کا اسی تناسب کے لگ بھگ غیر معرفی مقاصد پر صرف کیا جا چکا ہے یہ ایک ایسے ملک کو دیکھتے ہوئے کہ جس کا معیار زندگی اس درجہ پست ہو ایک قابل لحاظ کارنامہ ہے۔ اوپر کے واقعہ سے ظاہر ہے کہ نہ صرف قومی آمدنی ہی موجودہ حالات میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے بلکہ اس کا وہ تناسب جسے جنگی مقاصد پر لگایا جا سکتا ہے بہت آہستہ ہی بڑھایا جا سکتا ہے اس کی ایک وجہ اور تھی وہ یہ کہ برقی قوت، لوہے (خصوصاً جب سے آہنی کترن پر جس پر جاپان کو بڑا بھروسہ تھا امریکہ نے بند کر دیا) میکانی اوزاروں اور مکمل شدہ انجینیری اشیا کی فراہمی میں بڑی دقتیں ہو گئی ہیں۔ ان کی درآمد میں علاوہ خانگی مصرف میں تخفیف کی دقتوں کے مشکلات بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر جاپان کی جنگی سرگرمی غالباً اب اپنی انتہائی حد کو پہنچ گئی ہے چین کی جنگ کے علاوہ موجودہ جنگ کے لیے اسے بحری بیڑہ استعمال کرنا پڑ رہا ہے جو اب تک باقاعدہ شریک جنگ نہیں ہوا تھا۔ اور اسی لیے چین میں سرگرمیاں فی الحال کم کر دی گئی ہیں۔

نظر ثانی

آیئے جاپان کے معاشی وسائل اور ان کی جدید ترقی کی وجہ سے جنگ کی طوالت کے امکانات کو دیکھ جائیں۔ ڈاکٹر ڈالٹن کا بیان ہے کہ جاپان عرصۂ دراز سے اور ایک خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے جنگی تیاری میں مصروف ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ امر بعید از قیاس ہے کہ وہ بآسانی ملکوں کو فتح کر سکے گا۔

اگر جاپان کے اقتصادی، عسکری، ہوائی اور بحری وسائل کا ایک پست معیار پر اندازہ کیا جائے تو یہ بڑی غلطی ہوگی۔ جاپان کے جنگ میں شریک ہونے کا اثر یہ ہوگا کہ جنگ طول کھینچے گی۔

ڈاکٹر ڈالٹن نے بتایا کہ حال ہی کے چند سالوں سے جاپان کے ساتھ ہماری تجارت برآمد کم ہو گئی تھی بسنہ ۱۹۳۷ء میں برطانیہ نے ۴,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ کا سامان سنہ ۱۹۳۸ء میں ۲,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ سے کچھ کم کا سنہ ۱۹۳۹ء میں ۱,۰۰۰,۰۰۰ پونڈ سے کچھ کم کا سامان برآمد کیا تھا اور جرمنی سے جنگ چھڑ جانے پر اس تجارت پر پابندیاں عائد کرنے میں پیش قدمی کی گئی۔ گزشتہ جولائی سے برطانیہ و اتحادیوں اور جاپان کے درمیان تجارت بند ہو گئی۔ چنانچہ انجماد سرمایہ کے وقت سے برطانیہ سے جاپان کو برآمد قطعاً بند ہو گئی

"ہماری ناکہ بندی خواہ کیسی ہی زبردست ہو ہم جاپانیوں کو عرصہ دراز تک فاقہ کشی پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔ ان کی گزر بسر زیادہ تر چاول پر ہے جو ان کے پاس کافی مقدار میں موجود ہے۔ جاپان کے پاس تقریباً تین سال کی رسد موجود ہے نیز انڈوچین اور تھائی لینڈ سے اسے خوراک مل سکے گی۔"

جاپان تیل اور غیر آہنی دھاتوں کے حق میں بہت کمزور تھا۔ اس کے کیمیائی تیل کی صنعت اخفا میں تھی لیکن ریاستہائے متحدہ کے بحری سکرٹری کرنل ناکس نے حال ہی میں بتلایا کہ ان کے خیال میں جاپان کے پاس ۱۸ ماہ کے لیے زبردست بری، بحری اور فضائی لڑائی لڑنے کیلیے کافی تیل موجود ہے۔ وزارت اقتصادیات جنگ کو اس اندازہ تخمینہ سے بڑی حد تک اتفاق ہوا۔ پھر بھی یہ صحیح ہے کہ جاپان کے پاس نکل اور غیر آہنی دھاتوں کی کمی ہے لیکن توپ میگزین اور بحری بیڑے کی تیاری بالکل مکمل ہو چکی ہے

(مترجمہ ا-ا-ف)

فلسطین
جنگ کے زمانے میں

۱۔ آغاز جنگ | ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑتے ہی فلسطین میں نسلی و رجماعتی کش مکش پر سکوت طاری ہو گیا یہود و عرب ہر دو آبادیوں نے سمجھ لیا کہ ان کا مفاد برطانیہ سے وابستہ ہو لہذا دونوں نے خدمات پیش کر دیں بغیر اس کا خیال کیے کہ عہد انتداب میں ان دونوں کی حکمت عملی کیا تھی۔ ۱۸ سے ۵۰ سال تک کے مردوں اور عورتوں کی صیہونی بھرتی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۸۶۰۰۰ مرد اور ۵۰۰۰۰ عورتوں نے جنگ کے لیے خدمات پیش کیں۔ تمام صیہونی جماعتوں میں ایک عارضی راضی نامہ ہوا جس کی رو سے قومی صیہونی کونسل کو ہر طبقۂ رائے کی نمائندگی کے لیے ایک غیر جانبدار صدر کے ماتحت ترتیب دیا گیا۔ لوٹ مار عملاً ختم ہو گئی اور خاص سڑکوں پر چلنے کیلیے ڈرائیوروں اور مسافروں کو جو فوجی پاس حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اسے عام حالات کو دیکھتے ہوئے اوائل اکتوبر میں قطعاً ختم کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں عرب باغیوں اور مشتبہ اشخاص کی ایک بڑی تعداد کو نظر بندی سے رہا کر دیا گیا۔ اس طرح جہاں تک زندگی اور کاروبار کا تعلق ہو فلسطین ایک محاصرہ کی حالت سے نکل کر اوسط حالت میں آ گیا۔ جا بجا کے عربوں نے ہمسایہ صیہونی بستیوں سے تجارت شروع کر دی اور بعض دیہی اضلاع میں یہودیوں اور عربوں میں بظاہر برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

لڑائی چھڑ جانے پر صیہونی ایجنسی نے فلسطین اور دنیا بھر ہر دو مقامات سے ایک بڑی یہودی فوج فراہم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے یہودیوں کا قومی امتیاز نمایاں ہوتا تھا۔ حکومت نے فلسطینی دستوں کی بھرتی (جس میں عرب و یہودی دونوں شامل تھے) کرنے اور انھیں پہلے موقع پر خدمات ملک کے لیے متعین کرنے پر ترجیح دی۔ پہلے اعلان میں مختلف فوجی دستوں کے لیے ۱۲۶۰ آدمیوں کو طلب کیا گیا اور اس کے بعد دو اور کمپنیوں کی بھرتی ہوئی جن میں چھ چھ سو آدمی تھے۔ ان کا تعلق آگزیلری ملٹری پائنیر دستے سے تھا۔ ان کے

بعد ان دو کمپنیوں میں پانیرس کی ایک نامتر یہودی کمپنی کو شامل کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں نوآبادیات کے سکرٹری نے اعلان کیا کہ ۱۰۰۷ یہودی اور ۳۹۲ عرب بیرونی خدمات کے لیے نامزد ہوئے ہیں۔ ان میں سے ۴۴۲ یہودی اور ۳۰۱ عرب پہلے ہی سے فرانس میں کام کر رہے ہیں۔ بعد ازاں اوائل جولائی میں چار نئی فلسطینی فوجوں کی ترتیب کا اعلان ہوا جن میں ایک آرتیزن کمپنی، ایک کانسٹرکشن اینڈ لائن کی اور دو مکینیکل ٹرانسپورٹ کمپنیاں تھیں۔ ان میں دو یہودی اور دو کمپنیاں عرب تھیں۔ ۵؍ ستمبر سے قبل جنگی دستوں کے لیے رضاکار نہیں بھرتی کیے گئے تھے۔ اس وقت دو کمپنیاں بنائی گئیں ایک عرب دوسری یہودی۔ ان کا تعلق رائل ایسٹ کینٹ رجمنٹ سے تھا۔ سپاہیوں کی کل تعداد ۸۰۰ تھی۔ علاوہ ازیں چار اور کمپنیاں (دو عرب اور دو یہودی) اس وقت سے اس اول الذکر پیدل سپاہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ مارچ ۱۹۴۱ء کے شروع میں تقریباً ۱۰۰۰ یہودی اور ۲۰۰۰ عرب: مختلف خدمات پر تھے مشرق وسطیٰ کی برطانوی سپاہ کے ساتھ میدان جنگ میں تھے۔ اس کے علاوہ رائل ایر فورس میں ۱۵۰۰ یہودی ہوائی مرکزوں پر مامور تھے آسٹریلیا کی فوجوں کا پہلا دستہ بغرض مشق ۱۴؍ فروری ۱۹۴۰ء سے پہنچنے لگا۔ اہل آسٹریلیا کا فلسطین میں دلی استقبال ہوا۔ دلی اس وجہ سے کہ ان کی آمد سے اکثر مقامی طبقات کی آبادی خوش حال ہو گئی ان میں کیمپ کے رسدی ٹھیکیداروں سے لے کر پھیری والے تک شامل ہیں علاوہ ازیں وہ لوگ (آسٹریلین) جلد ہی دیہاتی عربوں اور یہودیوں سے گھل مل گئے۔ چنانچہ ٹائمس کے یروشلم کا نامہ نگار (۲؍ اپریل ۱۹۴۰ء) لکھتا ہے: "برطانیہ کے تازہ ترین سفرا" فوجیں ہیں۔ مئی میں جنوبی رہوڈیشیا سے ایک دستہ آکر آسٹریلی سپاہ سے مل گیا نیز ایک اور آسٹریلی دستہ بھی پہنچ گیا۔ فتح فرانس کے بعد پولینڈ اور آزاد فرانس کے دستوں کو بھی شام سے فلسطین آنا پڑا۔

۲۔ انتقال اراضی کے ضابطے | فلسطین میں اندرونی کشمکش کے بظاہر سکوت کا مگر یہ مطلب نہ تھا کہ فریقین اپنے اپنے سیاسی مقاصد سے دست بردار ہو گئے۔ عربوں کو امید تھی کہ انتدابی طاقت حسب تجویز مسٹر میکڈانل مئی ۱۹۳۹ء والے قرطاس ابیض کی متعدد تجاویز پر عمل پیرا ہو گی۔ دوسری طرف یہودیوں کی تجویز تھی کہ فی الحال یعنی دوران جنگ میں متذکرہ حکمت عملی کو عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔ ان حالات میں گورنمنٹ نہ تو اقدام سے اور نہ سکوت ہی سے ایک طویل مدت تک سیاسی احتجاج کو نظر انداز کر سکتی تھی چنانچہ بخطرہ

۲۸ر فروری ۱۹۴۰ء کو ضابطہ ہائے انتقال اراضی کی وجہ سے جلد ظہور پذیر ہوا جو قرطاس ابیض سے متعلق تھے۔ ان ضابطوں کی بدولت ملک تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) ۶۶۱۵ مربع میل کا ایک رقبہ زیادہ تر پہاڑی جس میں فلسطینی عربوں کو یہودیوں کے ہاتھ اراضی منتقل کرنے کی ممانعت تھی۔ فلسطینی عربوں کے علاوہ دوسرے لوگ اس کے مجاز تھے (۲)۔ ۳۲۲۵ مربع میل کا ایک رقبہ جس میں فلسطینی عربوں کے علاوہ دوسروں کو انتقال اراضی کی آزادی تھی لیکن فلسطینی عربوں کے لیے شرائط عاید تھیں (۳) ایک آزادانہ انتقال کا خطہ تقریباً ۳۱۹۹ مربع میل۔ مگر جس میں طلنتورا اور علاقہ رمیلہ کی جنوبی حد کے درمیان کا زرخیز میدان شامل تھا۔

گورنمنٹ نے ایک تفصیلی بیان شایع کیا جس میں اس امر کا اظہار کیا کہ متعدد ماہرین کمیشن ان خطرات کی طرف توجہ دلا چکے ہیں جو عربوں کے یہودیوں کو زمین دینے سے پیدا ہوں گے۔ یہ خطرات ان حالات کے پیش نظر ہیں کہ عرب آبادی کی شرح پیدایش قدرتی طور پر زیادہ ہے اور عرب کاشتکار کا معیار زندگی پست ہے گورنمنٹ نے اس آخرالذکر مسئلہ کو نہ صرف منفی حیثیت سے حل کرنا چاہا یعنی انتقال اراضی پر شرائط کے ذریعہ سے بلکہ اثباتی طور پر یعنی بہتر ذرائع زراعت کو ترقی دے کر بھی۔ انھیں امید یہ تھی کہ جب ان کی یہ مثبت حکمت عملی کامیاب ہو جائے گی تو فروخت اراضی کی پابندیوں کو کم کیا جا سکے گا۔

یہودی ایجنسی اس دلیل کے مقابلہ پر آگئی۔ اس نے کہا کہ عرب مزارع میں ترقی صرف انھیں کاشتکاروں نے کی ہے جنھوں نے اپنی کچھ املاک یہودیوں کے ہاتھ بیچ دی ہے کہ قرض سے سبکدوش ہو جائیں اور بقیہ اراضی کو ترقی دیں ایجنسی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ضابطے اور قرطاس ابیض دونوں انتداب کے مقصد کے خلاف ہیں ۲۹ر فروری کو تمام یہودی حلقوں میں عام ہڑتال ہو گئی اور یروشلم تل ابیب، حیفہ اور رحوبوتھ میں مظاہرین اور پولیس میں تصادم ہو گیا۔ ان مظاہروں میں زخمی یہودیوں میں سے دو مر گئے۔ یہ ہڑتال ۲ر مارچ تک رہی متذکرہ ضوابط کے خلاف یہودی منظم جماعتوں نے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی احتجاجات کیے اور دارالعوام میں یہودیوں کے اس معاملہ کو قرار واقعی تائید ملی۔

اُدھر عربوں میں ضوابط کی تائید میں مسلم مجلس اعلیٰ، احمد حلمی پاشا رکن مجلس عالیہ کے ایک رکن جنھیں ملک میں داخلہ کی اجازت مل گئی تھی، اور امیر شرق اردن کی جانب سے ہائی کمشنر کو تار دیے گئے۔ عربوں نے حکومت

کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ انہیں یہ امید بھی تھی کہ اس کے بعد زرعی ترقی کی حکمت عملی پر عمل کیا جائے گا۔ نیز یہ بھی سمجھے کہ اس سے قرطاس ابیض کی تنظیمی دستوری تجاویز کو پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ دونوں فرقے یہود و عرب بے چینی و بے صبری سے (بے چینی یہودیوں کو، اور بے صبری عربوں کو) اس بات کے منتظر ہیں کہ آیا حکومت نئی پالیسی کی آیندہ قسط دے گی یا نہیں۔ غالباً جنگ کی وجہ سے یہ صورت حال ابھی حل نہیں ہو سکی۔

۳۔ یہودیوں کا داخلہ | یہودی مہاجرین کے سلسلے میں یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۰ء تک چھ ماہ میں ۹۰۰۰ تبدیل وطن کے سرٹیفکٹ دیے گئے تھے۔ اس میں چار ہزار پناہ گزیں بھی شامل تھے۔ ان سرٹیفکٹوں کو اتحادی اور غیر جانبدار ممالک میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس تمام تعداد کو تین قسطوں میں تقسیم کرنا تھا۔ دوسری اور تیسری قسط میں شرط یہ تھی کہ ان میں غیر قانونی تارکان وطن کی تعداد کے لحاظ سے جو گزشتہ دو مہینے میں ہوئی ہوگی، کمی کر دی جائے گی۔ جہاں سے یہودی آنے والے تھے ان ممالک کے سیاسی حالات اور نقل و حمل کی دقتوں کی وجہ سے ان سرٹیفکٹوں میں سے صرف ۱۳۰۰ استعمال میں لائے جا سکے۔ اس امر کے پیش نظر کہ مجوزہ مہاجرین ایسے وقت میں فلسطین نہ پہنچ سکے جس عرصے میں انہیں آنے کی اجازت دی گئی تھی، گورنمنٹ نے آیندہ چھ ماہ کے لیے مزید اجازت کا دروازہ بند کر دیا۔

وجہ یہ تھی کہ باوجود آمدورفت کی دقتوں کے اور اجازت کی کمی کے کوئی ۱۲۰۰۰ یہودی جنگ کے پہلے بارہ مہینوں میں فلسطین غیر قانونی طریقے پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے اکثر بحر ہند اور بحر احمر کے راستے سے گئے تھے حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء کے موسم گرما تک یہ سلسلہ آمد کا کچھ نہ کچھ جاری رہا۔ دسمبر ۱۹۴۰ء میں یروشلم میں سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ اپریل ۱۹۳۹ء اور ستمبر ۱۹۴۰ء کے درمیان ۱۶۱۰۰ یہودی فلسطین میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے ہیں اسی عرصہ میں قانونی مہاجرین کی تعداد ۱۲۲۷۰ تھی۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۰ء کو حکومت نے اعلان کیا کہ آیندہ غیر مجاز مہاجرین ایک برطانوی نوآبادی میں بھیج دیے جائیں گے اور زمانہ جنگ تک انہیں وہیں رکھا جائے گا۔ یہ طے نہیں پایا کہ وہ جنگ کے بعد بھی وہ نوآبادی ہی میں رہیں گے یا پھر فلسطین کو بھیج دیے جائیں گے۔ غیر مجاز مہاجرین کا پہلا جتھا تعدادی ۱۹۰۴ بندرگاہ حیفہ میں ایس۔ ایس پیٹریا جہاز پر روانگی کے لیے جمع کیا گیا۔ ۲۵ نومبر کی صبح کو پیٹریا ایک دھماکے کے ساتھ غرق ہوگیا۔ یہ حرکت مہاجرین کے ہمدردوں کی تھی تاکہ جہاز انہیں نہ لے جا سکے۔ اس

غرقابی میں تعداد اموات ۲۰۰ تک تھی۔ ازراہ خاص رحم کھا کر پس ماندگان کو فلسطین میں رہنے کی اجازت دیدی گئی پھر بھی اس وقت سے ۱۶۰۰ یہودی ماریشس کو بھیجے جا چکے ہیں۔

۴-۱ اقتصادی حالت | اقتصادی حالت بہتر ہی اور اس حالت سے بہتر ہی جس کی آغاز جنگ کے وقت توقع تھی۔ فلسطینی تجارت کی ہیئت یک طرفہ ہی یعنی میزانیہ بظاہر بہت کچھ نامساعد ہی۔ اس کی وجہ سے ۱۹۳۸ء میں ۵۰ لاکھ پونڈ کی برآمد کے مقابلہ میں درآمد تقریباً ۱۴۰ لاکھ پونڈ کی تھی اور چونکہ زیادہ تر برآمد کا انحصار ترنج کے پھلوں پر تھا (۳۰ لاکھ پونڈ ۱۹۳۸ء میں) لہذا خطرات ظاہر تھے کہ اگر کسی وجہ سے ملک میں سرمایہ کی آمد بند ہو گئی یا تجارت برآمد پر ناکہ بندی ہو گئی تو غضب ہی ہو جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں ترنج کی تجارت برآمد گزشتہ سال کی اس تجارت کے نصف سے کچھ کم تھی اور اٹلی کے شریک جنگ ہو جانے سے جہاز رانی میں جو دشواریاں بڑھ گئی تھیں انھوں نے ۱۹۴۱ء کے فصلی حالات کو بد سے بدتر کر دیا تھا۔ چاہے مال کی کھپت نوج میں کی جاتی یا سرکہ جیسی ضمنی پیداواروں کو مکمل کیا جاتا۔ تجارت برآمد کے بازار کے نقصان کی کمی کسی طرح نہ ہو پاتی تھی۔

ادھر وہ عرب اور یہودی کاشتکار جو ۱۹۴۰ء میں اپنا اپنا مقررہ حصہ مال کا بذریعہ جہاز برآمد کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں آپس میں مل گئے اور حکومت کے پاس اپنی تجاویز پہنچانے کے لیے انھوں نے ایک کمیٹی کا تقرر کیا۔ اسکے جواب میں ہائی کمشنر نے اعلان کیا کہ گورنمنٹ اور بینک اس کام پر قرض دینے کے لیے تیار ہیں۔ نیز جس زمین پر ترنج کی کاشت ہوتی ہو اس پر دیہی محصول میں بھی کمی کر دی جائے گی اس قسم کی امداد مشروط تھی یعنی صنعت کو ایک ترنج کنٹرول بورڈ کی نگرانی میں اصولی طور پر چلانا تھا۔ اس جماعت کا تقرر اکتوبر میں ہو گیا۔ امدادی قرضہ جس کی ضامن تھوڑی بہت حکومت بھی تھی ۵۲۲۰۰۰ پونڈ تھا۔ اس سے ان لوگوں کو ہی مدد دی گئی جن کے درختوں میں عنقریب پھل آنے والے تھے۔ جنگ سے پہلے ہی فلسطین کی ترنج کی پیداوار کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی دنیا کے اور حصوں میں اس کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا لہذا حکومت پر ظاہر ہو گیا کہ ایسے حالات میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لیے عوام کا روپیہ صرف کرنا مناسب نہیں۔ اس صنعت کی مزید امداد کے لیے نوآبادیات کے انڈر سکریٹری نے جب ۱۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو دارالعوام میں اعلان کیا تو ساتھ ہی یہ کہا تھا کہ "پورے تیار اور پوری فصل دینے والے

درختوں کی کافی تعداد کو محفوظ رکھنا ہی ہمارا مقصد ہے"

اس آشوب کے خطرات کو کم کرنے کے لیے دوسرے طریقوں سے مدد کی گئی مثلاً بے روزگاری بہت بڑھی ہوئی تھی۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء میں ۵۰۰۰۰۰ پونڈ (م) سے قرض اور عطیات کی شکل میں ملک کی امداد کی گئی جوائی میں ملک کی قوت افزائش کو بڑھانے نیز درآمد اشیا خوردنی کی جگہ ملکی پیداوار کو ترقی دینے کی غرض سے کاشتکاروں کے لیے ۱۰۰۰۰۰ پونڈ (م) کی تقاوی علیحدہ کرلی گئی چنانچہ سنہ ۱۹۴۲ء میں فلسطین کی فصل ایک امتیازی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی وجہ سے ضروری کھانے پینے کی چیزوں میں کمی کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا اگرچہ قیمتیں بڑی تیزی سے بڑھ چکی ہیں۔ یہودی ایجنسی کے اعداد وشمار نے حساب لگایا ہے کہ آغاز جنگ اور اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء تک ضروریات زندگی کی قیمت میں ۲۴۴ فی صدی کا اضافہ ہوا اور صرف ماکولات کی قیمت میں اضافہ اس سے بھی زیادہ تھا۔

صنعت پر نقصان کا اثر کم پڑا۔ فوجی ٹھیکوں کی ایک کثیر تعداد کی وجہ سے تجارت پر کی بلا ٹل گئی بحیرۂ مردار سے پوٹاش اور برومائن کی برآمد جنگ کے پہلے سال میں دوگنی ہوگئی۔ ادھر مشرق وسطیٰ میں ایک زبردست برطانوی فوج پڑی ہوئی تھی ادھر فلسطینی نمایندے دہلی کانفرنس میں آئے ہوئے تھے لہٰذا یہ امید تھی کہ فلسطین میں جنگی صنعتیں خاصے بڑے پیمانے پر جاری ہو جائیں گی۔ لیکن ان امیدوں نے عملی جامہ نہ پہنا اب حالت یہ ہے کہ اس ملک میں خام مال کی کمی ہے نیز آج کل ان کا یا میکانی اوزاروں کا وہاں پہنچنا مشکل ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ فوجوں کے متعدد ذخیروں کی درآمد کی وجہ سے تھوڑا بہت روزگار جاری رہے گا۔

(مترجمہ۔ا۔ا۔ف)

عراق کی حیثیت مشرق وسطیٰ میں

مضمون ہذا کے متعلق جو نقشہ ہے اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ اس سے مشرق وسطیٰ میں عراق اس کی ریلوں اور دیگر ذرائع حمل ونقل کا ہمسایہ ممالک سے جو تعلق ہے واضح ہو جائے۔ جب شط العرب میں خلیج فارس کے دہانہ پر بصرہ کی حیثیت پر غور کیا جاتا ہے تو وہاں برطانوی شاہی فوجوں کے قیام کا مقصد واضح تر ہو جاتا ہے۔ عراقی سرحد سے پار ایرانی صوبہ خوزستان کے نفط کے میدانوں اور آبادان کے تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں برطانیہ کا مفاد مضمر ہے۔ اگر برطانیہ کے اس زبردست مفاد میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے تو اس مرکز یعنی بصرہ سے اسے روکا جا سکتا ہے۔ بحرین میں تیل کی ترقی پذیر پیداوار کو نیز عراق اور ترکی تجارت کو جو بصرہ کے راستہ سے ہوتی ہے یہیں (بصرہ) سے بچایا جا سکتا ہے۔ بصرہ سے بغداد تک چھوٹی لائن ہے۔ سامان تجارت بغداد تک جہاز سے پہنچایا جاتا ہے۔ جب سے بعیجت الکوچک کی ریلوے لائن مکمل ہوئی ہے اس وقت سے بغداد سے استنبول تک براہ راست سلسلۂ آمدورفت ہو گیا ہے (پہلی مسافر گاڑی بغداد سے ۱۷ جولائی ۱۹۴۰ء کو روانہ ہوئی) یہ استنبول بغداد لائن ترکی ریلوے سے مل گئی ہے۔ شمال میں انقرہ اور اناطولیہ کے دوسرے مرکزوں سے اور جنوب میں شامی فلسطینی ریلوے سے اور یہاں تک کہ سوئز سے جا ملی ہے۔ ادھر موصل کے نفطی میدان میں کرکک سے بھی تعلق ہے لیکن یہاں سے تیل کی نکاسی خلیج فارس سے نہیں بلکہ نلوں کے ذریعہ حیفہ کے رستہ ہوتی ہے۔ تیل کی اسی ایک شاخ سے ان دنوں کام لیا جا رہا ہے کیونکہ شام میں جو شاخ ترپولی کو جاتی تھی اسے کاٹ دیا گیا یعنی جولائی ۱۹۴۰ء کے پہلے ہفتہ میں زوال فرانس کے بعد ہی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اس بندرگاہ ترپولی کے رستہ دشمن کو تیل پہنچانا ناممکن ہو جائے۔

نقشے میں صحرائے شام سے نیز شرق یردن سے شام اور فلسطین کو جانے والے موٹر سڑک کے خاص راستے تو دیئے ہوئے ہیں لیکن اس میں خود عراق کی خاص سڑکیں نہیں دکھائی گئیں ہیں۔ اس بات کا خیال رہے کہ عراق میں اندرون ملک کی سڑکوں میں خاصی ترقی ہو گئی ہے اور بعض خاص سڑکیں بجائے

کچے رستوں کے پختہ چکنی سڑکیں بن گئی ہیں۔ چنانچہ بصرہ و بغداد کے درمیان دو سڑکیں ہیں اور بغداد کے شمال میں دریائے دجلہ کے برابر ایک سڑک موصل کو جاتی ہے جہاں سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر ترکی اور شام کی سرحدوں کو جاتی ہے ایک اور اہم سڑک بغداد سے پہلے شمال مشرق کو اور پھر شمال میں کرکک کو جاتی ہے۔ اس کی ایک خاص شاخ مشرق کی جانب ایرانی سرحد کو جاتی ہے اور یہ خود شمال مغرب میں موصل کی طرف مڑ جاتی ہے۔

ان راستوں میں جو بحیرۂ روم کے ساحلی شہروں کو جاتے ہیں۔ جنگ چھڑنے کے وقت تک جو سب سے زیادہ مشہور تھا۔ دمشق۔ بغداد کا رستہ تھا جسے نقشہ میں دکھایا گیا ہے لیکن موجودہ حالات میں صورت یہ ہے کہ ترجیح کی مغربی شاہراہ سے جو ایک راستہ شرق یردن ہوتا ہوا فلسطین کو جاتا ہے اس پر مسافروں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے۔

بصرہ کی اہمیت اس اعتبار سے کہ وہ بحرِ ہند اور ممالک مشرق وسطیٰ کے درمیان ایک رود بار رسل و رسائل ہے، امن کے زمانہ میں بھی صاف ظاہر ہے۔ اور آج کل تو اس کی اہمیت بے انتہا بڑھ گئی ہے کیونکہ ادھر بحرِ روم جنگ کا ایک گرما گرم اکھاڑہ ہے (برطانیہ نے ۲۶ اپریل کو اس کے تمام حصوں کو جہاز رانی کے لیے خطرناک بتا دیا تھا) ادھر بحرِ ہند اور ضمناً خلیج فارس اس خطۂ جنگ و جدل سے باہر ہیں لہٰذا مسافروں اور رسد کے لیے اس راستہ میں دشمن سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس جگہ سے محض عراق ہی کی نہیں بلکہ ایران روس اور دیگر ریاستوں اور خصوصاً ترکی کی مدد ہو سکتی ہے۔ ترکی کی تجارت بصرہ کے راستے بہت بڑھی ہوئی ہے اور اگر ریل اور دیگر ذرائع جو اس وقت ناکافی ہیں مدد معاون ہو گئے تو اور بھی بڑھ جائے گی۔ جنگ یورپ کی وجہ سے وسط مشرق کی تجارت تھوڑے دنوں تک بہت کچھ مشرقی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ چنانچہ اکتوبر میں یہ انتظام کیا گیا تھا کہ عراق سنہ ۱۹۴۰ء کی اپنی کل روئی کی پیداوار جاپانی فرم متسوبیشی کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔ (ملاحظہ ہو فائنشل نیوز ۹ اکتوبر اور مانچسٹر گارڈین ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء) نیز سنہ ۱۹۳۹ء کی فصل کا باقی مال بھی اس میں شامل ہے (تقریباً ۲۲ ہزار گٹھے) اس جاپانی سودے میں ۰۰۰، ٹن جو، ۲۰۰۰ ٹن السی، ۰۰۰، ٹن تل اور ۲۰۰۰ ٹن جو بھی شامل تھے۔ ادھر جاپان نے بھی عراقی کھجور خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ یہ نقل و حمل جاپانی

جہازوں کے ذریعہ ہوگی جب ترکی کی تجارت جرمنی کے ساتھ بہت کم ہوگئی تو اسے نئے بازاروں کی تلاش ہوئی۔ نہ صرف برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ بلکہ ہندوستان، جاپان اور امریکہ کے ساتھ بھی۔ اس تجارت کے پیش نظر استنبول بغداد ریلوے کے کوچک لیمبی حصہ کی تکمیل ہوتے ہی ایک ترکی گماشتہ بصرہ روانہ ہوگیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آیا اس بندرگاہ کے ذریعہ مال بھیجنے کے امکانات ہیں۔ توقع تھی کہ شاید تجارتی تعلقات بڑھانے کی غرض سے وہ ہندوستان بھی پہنچے۔

مشرق وسطیٰ میں فضائی مدافعت کی کمک کے طور پر طیاروں اور دیگر سامان حرب کی شکل میں بندرگاہ مذکور کی جائے وقوع سے بڑے فائدے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہوائی جہازوں کو وہاں سے ایندھن مل سکتا ہو۔ نیز وہیں سے وہ ترکی اور برطانوی مقبوضات کے متعدد ہوائی اڈوں کو روانہ کیے جاسکتے ہیں۔ مزید براں اگر ترکی کو براہ راست کسی وقت فوجی مدد کی ضرورت پیش آسے تو بصرہ سے مل سکتی ہو۔

<u>عراق کی شرائط معاہدہ</u> | جون ۱۹۳۰ء کے انگریزی عراقی معاہدۂ اتحاد پر بغداد میں ۳۰ جون ۱۹۳۰ء کو دستخط ہوئے اس کا اولین مقصد تو یہ تھا کہ عراق برطانوی انتداب کی سیادت سے آزاد ہوجائے اور اس کا داخلہ جمعیۃ الاقوام میں بحیثیت ایک ریاستی رکن کے ہوجائے۔ معاہدہ مذکور کے مطابق ۱۹۳۲ء میں عراق جمعیۃ مذکور میں داخل ہوگیا اور اس کو مکمل آزادی اور مساوات دی گئی اور یہ معاہدہ ۲۵ سال کے عرصہ کے لیے جائز و قابل عمل قرار دیا گیا۔ برطانوی معاہدہ اتحاد نے عراق پر خاص پابندیاں عائد کردیں ان میں سے بعض صرف پانچ سال کے لیے تھیں اور بقیہ مستقل۔ مقصد یہ تھا کہ "خارجی معاملات میں پورا اور پرخلوص باہمی مشورہ" ہو۔ نیز یہ بھی کہ اگر برطانیہ یا عراق کسی سے برسرپیکار رہو تو دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیئے۔ دفعہ ۵ کی رو سے ہر حالات میں برطانیہ کے اہم سلسلۂ رسل و رسائل کو مستقل محفوظ رکھا جائے اور اس مقصد کے پیش نظر برطانیہ کو بصرہ کے قرب میں اور فرات کے مغرب میں ایک جگہ برطانوی فضائی مستقر قایم کرنے کی اجازت ہو۔ فضائی مقامات ٹھیکہ پر دینے کے شرائط، ریلوں کے تبادلے کے انتظامات بھی طے کیے گئے اور بندرگاہ بصرہ کا نظم و نسق ایک وقف کے حوالہ کیا گیا۔ یہ سب معاہدۂ مذکور کے ایک ضمیمہ اور ایک متعلقہ نوٹ سے بخوبی واضح ہیں معاہدہ کے ساتھ ہی ساتھ جو مختصر خط و کتابت ہوئی ہے اس کے دوران میں اس امر پر بھی اتفاق کیا گیا کہ

بغداد میں برطانوی نمائندہ کی حیثیت ایک سفیر جیسی ہوگی نیز جب عراق کو باہری افسران کی ضرورت ہو تو وہ بالعموم برطانوی ہونا چاہئیں اور بری اور بحری فوجوں کی طاقت بڑھانے کے لیے حکومت عراق کو برطانوی مشاورتی ملٹری مشن سے رجوع کرنا چاہیے۔

ازروئے معاہدہ بصرہ اور حبانیہ اہم ہوائی اڈے برطانیہ کے قبضہ میں ہیں۔

خارجی تعلقات | انگریزی عراقی معاہدہ وہ اساس ہے جس پر عراق کی آزادی قایم ہے اور اس وجہ سے عراق کے خارجی تعلقات میں یہ ایک زبردست عنصر ہے۔ چونکہ اس ملک کا شاہی خاندان ہاشمی ہے اور موجودہ صغیرسن بادشاہ کے دادا امیر فیصل تھے جو گزشتہ جنگ میں عرب کی آزادی کے لیے لڑے تھے اور برطانیہ کی مدد سے تخت عراق پر بٹھائے گئے تھے، لہذا شرق اردن کے ساتھ قدرتی طور پر اس کے دوستانہ تعلقات تھے شرق اردن کا حکمراں امیر عبداللہ، فیصل اول کا بھائی تھا البتہ سعودی عرب کے ساتھ اس کے تعلقات بوجوہ ہمیشہ اچھے نہیں رہے ہیں مثلاً (۱) ابن سعود نے ہاشمی شاہزادے شریف حسین کو حجاز سے بے دخل کیا تھا۔ (۲) علاوہ اس کے جنوبی عراق زیادہ تر شیعہ ہے اور ابن سعود کے وہابی کٹر اور ثقہ مسلمان ہیں نیز سرحدی خانہ بدوش قبائل جو غیر متعین سرحد کے آس پار رہتے ہیں ان سے مستقل کشمکش رہتی ہے۔ بایں ہمہ دونوں ریاستوں میں ۲ را پریل ۱۹۳۶ء کو، اخوت عرب کے نام سے ایک معاہدہ ہوگیا۔ ادھر ایران کے ساتھ ایک سرحدی جھگڑے کے سبب عرصہ دراز سے تعلقات کشیدہ تھے یہ کشمکش شط العرب کے تصرف کے سلسلہ میں تھی کیونکہ خلیج فارس جانے کے لیے یہ ایک نہایت اہم دریائی راستہ ہے لیکن اس باب میں ۴ رجولائی ۱۹۳۷ء کو سمجھوتہ ہوگیا۔ اس کے چار دن بعد ترکی، ایران، عراق اور افغانستان کے مابین معاہدہ سعد آباد ہوا۔ ہر چہار دول اپنے اپنے مشترکہ مفاد پر اثر انداز ہونے والے معاملات میں باہم مشورہ کرنے نیز باہم جارحانہ اقدام سے گریز کرنے پر رضامند ہوگئیں۔ دیگر خلیجی ریاستیں خصوصاً کویت اور بحرین یہ اس سے علیحدہ ہیں۔ ان کے تمدن کا مرکز بغداد ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑ گئی تو عراق نے جرمنی سے تعلقات منقطع کر لیے نیز ملکی جرمنوں کو یا تو ملک بدر کر دیا یا حراست میں لے لیا۔ ایسی صورت میں جرمنی کے پروپیگنڈے کے لیے جو قریب ترین

مرکز تھا۔ وہ طہران تھا لیکن جب اطالیہ لڑائی میں کودا تو اس کے ساتھ عراق کے تعلقات بدستور قایم رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطالوی سفارت خانہ پروپیگنڈے کا مرکز بنا رہا۔ اسے برلن اور باری کے عربی نشر سے بہت کچھ مدد ملتی رہی۔ محوری نقطۂ نظر قصص و موسیقی کے ساتھ عراقیوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے کافی دلچسپی لی گئی۔ فلسطینی اور شامی عربوں پر برطانوی اور فرانسیسی استبداد کے چھوٹے چھوٹے قصوں کو بڑا طول دیا گیا۔ عراق میں عرب کی ہمدردی کو ابھارنے کے لیے شام و فلسطین کے تمام واقعات کافی مواد فراہم کر دیا کرتے ہیں۔ اور عرب قوموں سے کہا گیا کہ محوری طاقتیں انھیں خوش حال کر دیں گی۔ اور مغرب کی سرمایہ دارانہ زنجیروں یعنی اتحادیوں سے انھیں آزادی مل جائے گی۔ چنانچہ عراقی پان عرب پریس جرمنی کے اعلانات کو پورا پورا شایع کرتا اور برطانیہ کی خبروں پر نسبتاً کم متوجہ ہوتا تھا۔ اگرچہ عراق کے تعلقات برطانیہ کے ساتھ سرکاری طور پر ٹھیک رہے اور ترکی کے ساتھ خوشگوار۔ پھر بھی برطانیہ کے خلاف کافی جذبات پیدا ہو گئے یہ بات خاص طور پر عراقی فوج میں تھی جو برطانیہ کے زیر سایہ اور اس کے سامان کی مدد سے ایک زبردست قوت بن گئی تھی۔

<u>داخلی حالات</u> | گزشتہ ۲ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء کو جو انقلاب حکومت ہوا تھا۔ اس کے ذمہ دار فوجی افسران ہیں قیاس ہو کہ جرمن پروپیگنڈے کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر انھوں نے ایسا کیا۔ خیر یہ جیسے بھی ہوا ہو۔ جب برطانوی حکومت نے اپنے معاہدہ کے حقوق کو استعمال کیا اور سلسلۂ رسل و رسائل کو از سر نو جاری کرنے کے لیے شاہی فوجیں بصرہ بھیج دیں تو نئی حکومت (حکومت عراق) نے (فوجوں کی موجودگی کا اعلان وہاں ۱۹ اپریل کو کر دیا گیا تھا) بہت مناسب برتاؤ کیا یعنی فوجوں کو پوری پوری آسانیاں بہم پہنچائی گئیں نیز برطانوی سپہ سالار کی پیشوائی اور اس سے تعاون کے لیے ایک اعلی فوجی افسر بھیجا گیا۔ مزید دوستانہ تعلقات کا راستہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء میں سر کناہان کارنوالس کے برطانوی سفیر مقرر ہونے سے ہموار ہو گیا۔ صاحب موصوف ملک سے بخوبی واقف تھے نیز سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک بغداد میں بحیثیت مشیر وزارت داخلہ بھی رہ چکے تھے

اس فوجی انقلاب ریاست نے ان ان گنت واقعات کا خاتمہ کر دیا جنھوں نے سیاست عراق کو قدرے غیر متوازن کر دیا تھا لیکن یہ امر ایک ایسے ملک میں جہاں حریت اور جمہوریت کا کم تجربہ ہو غالباً

تعجب انگیز نہیں ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ایک فوجی انقلاب ریاست ظہور پذیر ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنرل بکر صدقی نے حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ شاہ فیصل ثانی سات سال کے بچے ہیں۔ یہ اپنے والد شاہ غازی کی وفات پر ۴ راپریل ۱۹۳۹ء کو ایک حادثہ کی بدولت واقع ہوئی تخت نشین ہوئے۔ شاہی اختیارات ایک والی یعنی شاہ موصوف کے ماموں امیر عبداللہ کے ہاتھ میں دیدیے گئے تھے۔

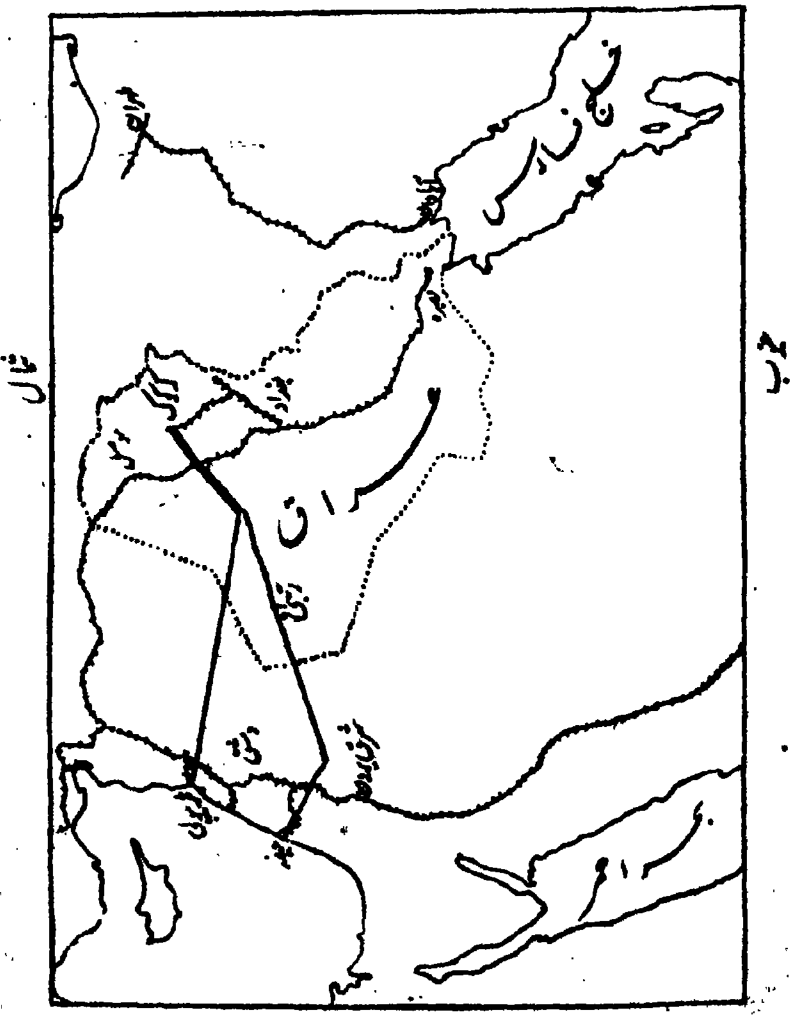
سنہ ۱۹۴۰ء میں دو نازک واقعات ظہور میں آئے۔ انھیں جزوی طور پر فوجی افسران کے اثر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ پہلا واقعہ جنوری میں سید رستم حیدر وزیر مال کا قتل ہے۔ اُس وقت اس سلسلہ میں جنرل نوری سعید نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے ایک طویل تحقیقات کرنی چاہی تھی لیکن اس میں کامیاب نہ ہوسکے دوسرا واقعہ وہ تھا کہ جب اطالیہ کے داخلہ جنگ پر اس سے قطع تعلق کا سوال پیدا ہوا۔ اس وقت راشد عالی گیلانی وزیر اعظم تھے۔ حکومت پر عدم اعتماد کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ فلسطین کے عربوں کی حمایت کے معاملہ میں اس نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں وزارت امور خارجہ سے جنرل نوری کے استعفیٰ دینے پر اور بھی مصیبت آئی۔ ۳۱ر جنوری کو راشد عالی سے زبردستی استعفیٰ لیا گیا اور جنرل طہٰ الہاشمی کے زیر قیادت جو سرداران فوج کی ریشہ دوانیاں روکنے سے قاصر تھے۔ ایک نئی کابینہ مرتب ہوئی۔

۳ راپریل کو سید راشد عالی نے اعلیٰ فوجی کمان کے چار مستعد پان اسلامی ارکان کی مدد سے نئی کابینہ کو نکال باہر کیا۔ والی کو معزول کر دیا اور اس کے بجائے خانوادہ ہاشمی کے ایک اور فرد کو مقرر کر دیا۔ نئی حکومت "حکومت مدافعت قوم" کے نام سے سید راشد عالی کے ماتحت وجود میں آئی۔ سید راشد عالی نے اعلان کر دیا کہ عراق کے بین الاقوامی معاہدانہ تعلقات قایم رکھے جائیں گے۔ نیز یہ کہ فوج نے ملک کے امن و تنظیم کی بقا کا اسے ذمہ دار بنایا ہے اور دستور مملکت کو تعدی کے حملے سے محفوظ رکھنے کا فرض اس پر عاید کیا ہے۔ اس نئی حکومت نے ترکی کے ذریعہ برطانیہ پر یہ بات واضح کر دی کہ خارجی حکمت عملی میں رد و بدل نہ ہوگا۔ برطانوی حکومت اس پر کچھ خاموش رہی۔ ۹ راپریل کو دارالعوام میں مسٹر ایڈن نے بیان کیا کہ ملک معظم کی حکومت کو اس انقلاب پر افسوس ہے ان کے نزدیک یہ انقلاب قطعاً غیر دستوری ہے۔ بہرحال معاہدہ پر پورا پورا عمل کیا جائے گا۔

یہ بھی دو حالات ناسازگار ہیں کہ جن کے سبب شاہی فوجیں وسط اپریل میں بصرہ پہنچیں لیکن ان کا استقبال

جس دوستانہ طور سے کیا گیا۔اس سے امید بڑھی کہ عراق اور برطانیہ کے تعلقات پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہو جائیں گے بغدادی کابینہ نے بلکہ ہر طرح سے اطمینان کرلیا تھا کہ رپیڈ میں حسب قرارداد محض سلسلہ رسل و رسائل کے لیے بھیجی گئی ہیں۔ پھر بھی راشد عالی کی فوجوں نے حبانیہ پر حملہ کر دیا۔اس کش مکش میں بالآخر راشد عالی فرار ہو کر ایران چلے گئے اور جرمن سیاست کے بھید کھل گئے۔ برطانیہ نے دوبارہ امیر عبداللہ کو ریجنٹ بنا دیا اور عراق کا ہنگامہ ختم ہو گیا

(مترجمہ ا-ا-ف)



بہار جاوداں

بہار آنے پہ ہر پھول مسکراتا ہے — ہر اک پرند مسرت کے گیت گاتا ہے
کچھ اس ادا سے نسیم بہار چلتی ہے — کہ کوہ و دشت کے دل سے دعا نکلتی ہے
شجر شجر سے ٹپکتی ہیں مستیاں لاکھوں — ہر ایک شے سے برستی ہیں مستیاں لاکھوں
سرور روح میں رہتا ہے بادۂ جوبن کر — شراب تیرتی پھرتی ہے رنگ و بو بن کر
سرور و نور میں بہتی ہے کائنات تمام — خوشی سے جھومتی رہتی ہے کائنات تمام

مگر خزاں میں عجب بے کسی برستی ہے!
نہ راگ ہے نہ تبسم نہ رقص مستی ہے!

مگر یہ دل کہ محبت سے آشنا ہے ہنوز — ترے جمال کی جنت سے آشنا ہے ہنوز
یہ دل کہ اس پہ رہی ہے تری نگاہ کرم — یہ دل کہ اس کو ملی ہے تری پناہ کرم
یہ دل کہ درد محبت سے بہرہ یاب ہوا — یہ دل کہ سوز محبت سے آفتاب ہوا
یہ دل کہ تاک محبت سے لی ہے مَے اس نے — یہ دل کہ تیری نگاہوں سے پی ہے مَے اس نے
یہ دل کہ تیرا تبسم ہے گل فشاں اس میں — یہ دل کہ تیری ہی تصویر ہے عیاں اس میں

بہار ہو کہ خزاں بے نیاز رہتا ہے،
مدام بادہ کش و نے نواز رہتا ہے،

آثر صہبائی

غزل

شب سیاہ کی پہنائیاں معاذ اللہ
اسی سبو سے چھلکتی تو ہے سحر پھر بھی

حریم یار سے ٹکرا کے رہ گئے نالے
مزاج یار کو ہو جائے گی خبر پھر بھی

میں نامراد سہی پھر بھی بے مراد نہیں
فغاں کی بے اثری میں تو ہے اثر پھر بھی

لہو میں رنگ تو ہے بجلیاں نہیں نہ سہی
ہماری خاک سے اُٹھتے نہیں شرر پھر بھی

اسی کے ایک نفس میں درازیٔ شب غم
یہی حیات ہے کہنے کو مختصر پھر بھی

آل احمد سرور

بحرالکاہل میں سمندری اور ہوائی مستقر

...تر: پجٹ ساؤنڈ (واشنگٹن) جزیرہ میر (سان فرانسسکو) سان پیڈرو (کیلیفورنیا) سان ڈیگو (کیلیفورنیا)

...ما) بندرگاہ پرل (جزائر ہوائی)

مستقر: بندرگاہ ڈچ (الاسکا) کوڈیاک (الاسکا) رسٹکا (الاسکا) آکیکا (الاسکا) کوایت (فلپائن) اولنگاپو

... بیگو بیگو (سموا) دیگر: بندر بارو (الاسکا) فیربینکس (الاسکا) اینکریج (الاسکا) نوم (الاسکا) ٹاکوما (واشنگٹن)

... پائنٹ (واشنگٹن) مارچ فیلڈ (لاس انجلیز اور سان ڈیگو کے درمیان) ہملٹن فیلڈ (سان فرانسسکو)

... (جزائر ہوائی)

...لیے، جہازوں کے اترنے اور معمولی رسل و رسائل کے دیگر مرکز: جزیرہ مڈوے۔ جزیرہ جانسٹن

... جزیرہ ہاؤلینڈ۔ جزیرہ انڈربری۔ جزیرہ ویک۔ گوام۔ پولک (فلپائن)

برطانیہ

مستقر: سنگاپور (ملایا) سڈنی (آسٹریلیا) دیگر اہم مستقر: اسکیوما لٹ (کناڈا) ہانگ کانگ (چین) پورٹ ڈارون

... جزیرہ تھرس ڈے (آسٹریلیا) آکلینڈ (نیوزی لینڈ) جنوبی سمندروں میں چھوٹے چھوٹے چند مقامات اور بھی ہیں

جاپان

مستقر: یوکوسوکا (جاپان خاص) کیوری (جاپان خاص) سسیبو (جاپان) اومیناٹو (جاپان) مردران (جاپان)

...) رشتن کوریا) چھوٹے مستقر: بندر آرتھر (منچوریا) پوموشیرو (جزائر کیورائل) بندر لانڈ (جزائر بانین) کلونگ

... فارموسا) جزائر پیکیڈورس۔ دیگر: جزائر اسپراٹلی (فلپائن اور انڈوچین کے درمیان) انگور (جزائر پلیو)

...ک کنگ، تورک (لارون) سیپان (جزائر کیرولین) جلوئت (جزائر مارشل) یپ (جزائر کیرولین)

...سیگاؤں (انڈوچین) کوکانگ (انڈوچین) چھوٹے مستقر: کام ران (انڈوچین) دیگر: کوانگ چاؤ ان۔ زبیا۔

...ر: خاص بندرگاہ ساتا ہیب۔ سنگرا ہیں

...س بندرگاہ واڈی واسٹک۔ دیگر: جزائر کی نڈر۔ نکولیفسک پیٹرو پاؤلوفسک

شغا
ی

ده
بند

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز راں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی اور کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام
نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑا جو ہر جہاز کا سرتاج ایس ایس اسلامی
(وزن ۵۰۰۹ ٹن)
بھی شامل ہے

گذشتہ موسم حج میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں
تفصیلات کے لئے خط کتابت کیجیے :-

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۳ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں اُن کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی اُنھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں مُلک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہی بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اِس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر۔ جِنا بلڈنگ لکھنؤ

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

یعنے

حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) جو اس اصول کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ دین (یعنی انسانی فطرت کے لئے ضابطہ زندگی) کے متعلق کوئی سوال آپ کے سامنے آئے اُس کے متعلق قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم ایک مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔ یہ مایہ ناز کتاب

جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

کے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے

جلد اوّل

چھپ کر تیار ہے جو بڑی تقطیع کے پونے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اعلیٰ درجے کی۔ قیمت مجلد چھ روپے چار آنے۔ محصول ڈاک ۵ار۔ بلا جلد پانچ روپے۔ محصول ڈاک ۱۲ار

ملنے کا پتہ

نئی دہلی :- ناظم ادارہ طلوع اسلام شمیم منزل، رشیدی پورہ، نئی دہلی

لاہور :- ملک رشید الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ پنجاب کوآپریٹو یونین، ۳۱ لوئر مال نزد عدالت خفیفہ لاہور

(لاہور سے کتاب دستی ملے گی)

اُردُو ادب میں ایک اضافہ

نورس

مسعود اختر جمال کی زندگی بخش نظموں کا مجموعہ

آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ
آپ زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں اور اس زمانے میں جب
کہ دُنیا جنگ کی ہولناکیوں سے زیر و زبر ہو رہی ہے اِس
کتاب کا مطالعہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں آپ کی مدد کرے گا۔

قیمت فی جلد

بار اوّل — قسم اوّل مجلّد تین روپے (ستے)

ایک ہزار (۱۰۰۰) — 〃 دوم غیر مجلّد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

مَکتَبَہ

ادبستان۔ پانڈے حویلی۔ بنارس

ندوۃ المصنفین کی دو نئی کتابیں

قصص القرآن کتاب کے اس حصے میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور تک پوری تحقیق و تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حالات اور قصص قرآنی پر اردو اور دوسری زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ قصص القرآن کے درجے کی کوئی کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی جس میں عبر و نصائح کے اس عظیم الشان دفتر کو ایسی جامعیت اور تحقیق کے ساتھ یکجا کیا گیا ہو۔ قصص القرآن نہ صرف انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کی مستند ترین تاریخ ہے بلکہ قرآن پاک کے ایک بہت بڑے حصے کی بلند پایہ محققانہ تفسیر بھی ہے جس کی خوبیوں اور خصوصیتوں کا صحیح اندازہ مطالعے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ ذیل میں چند خصوصیتیں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) تمام حالات و واقعات کی اساس قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور تاریخی بیانات سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے (۲) جدید تاریخ اور کتب مقدسہ قدیم کے بیانات اور قرآن عزیز کے بیانات کے درمیان اگر کہیں تعارض اور اختلاف ہو گیا ہے تو کھلے ہوئے دلائل و براہین کے ذریعے اس اختلاف میں تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر صداقت قرآنی کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے (۳) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے مغرضانہ اعتراضات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے (۴) خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی مشکلات پر بحث کے بعد سلف صالح کے مسلک کے مطابق ان مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے (۵) ان تمام امور کے ساتھ ساتھ واقعات کے اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۰۰، بڑی تقطیع، کتابت، طباعت نہایت اعلیٰ

قیمت غیر مجلد چار روپے (للعہ/)، مجلد للعہ

تاریخ انقلاب روس ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اگر آپ موجودہ روسی نظام کے پس منظر کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں جو آج کل تمام بریت کا شکار بنا ہوا ہے تو اس کتاب کو اپنے مطالعے میں ضرور رکھئے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ/)

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ "برہان" دہلی قرول باغ

تاریخ وجغرافیہ

خلافت الٰہیہ — رسول مقبول کی سیرت پاک پر مولانا عبدالماجد قادری کی دل کش تصنیف۔ آخر میں مسلمانوں کے مکمل دستور العمل کے لئے ۶۰ حدیثیں تقسیم ابواب کے ساتھ مع اصل ومتن وترجمہ۔ ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عمر

تاریخ خلافت موسوم بہ خلافت نبویہ — مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایونی۔ اس میں حضرت ابوبکر کی خلافت سے لے کر خلافت آل عثمان تک کا حال درج ہے۔ خلافت اور جدید ہندوستان کے نام سے بھی ایک مضمون درج ہے۔ قیمت عہ ر

رحلت خلفائے راشدین — از عبدالرزاق ملیح آبادی۔ خلفائے راشدین کے آخری ایام اور وفات کی مستند تاریخ۔ قیمت ۵ر

ترکانِ احرار — غازی مصطفےٰ کمال پاشا، غازی انور پاشا، عصمت پاشا وغیرہ جیسے فدایان ملت کے کارنامے۔ قیمت عہ

خلافت وسلطنت — بغداد کی خلافتِ عباسیہ سے تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہ اور بغداد کی تباہی کے مفصل حالات اور نتائج۔ از ڈاکٹر امیر حسن صاحب۔ قیمت عہ

تاریخ سلطنت خداداد — میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ یہ ایک طرف مواد ودلائل اور دوسری طرف جوش وعقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند — یہ جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی و خارجی اسناد مرتب کئے ہیں۔ قیمت سے ر

داستان غدر — حضرت ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوق نے چشم دید حالات غدر دہلی کے لکھے ہیں

آج وہ قصے اور کہانیاں ہیں۔ مگر کچھ ایسے دردناک ہیں کہ دل ہل جاتے ہیں۔ قیمت عہ

مرات مصطفیٰ آباد قدیم زمانے میں کچھ سے لے کر کوکن تک ایک ہی مملکت تھی اور ایک ہی زبان اس سارے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ مگر بعد میں سیاسی انقلابات کے باعث یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک کا نام گجرات اور دوسرے کا سوراشٹ۔ یہ سوراشٹ یا جوناگڈھ (مصطفیٰ آباد) کی تاریخ ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز ۲۰×۳۰ کاغذ لکھائی، چھپائی اعلیٰ۔ قیمت مجلد للعہ

مرآت محمدی مصنفہ شیخ غلام محمد صاحب، گجرات کی مکمل اسلامی تاریخ۔ ۲۰۷ صفحے، بڑی تقطیع۔ قیمت عہ

تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ علی خاں شوق۔ اس میں تقریباً ۲۰۰ بزرگان رام پور کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ قیمت سے

سوئٹ روس کا نظام مترجمہ مولانا مظہر علی اظہر۔ روسی قوم کے حالات، ان کی سیاسی، معاشرتی، تمدنی ضروریات، سرمایہ اور افلاس کی کشمکش کی داستان اس کتاب کے مطالعے سے ہر اہل نظر روس جدید کی حکومت اور موجودہ طریق کار سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ قیمت عہ

مرقع عالم سید شرف الدین صاحب قادری ایم اے۔ بی ٹی نے اسے برسوں کی کتب بینی اور غور و فکر کے بعد اہل ملک کے سامنے پیش کیا۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ہاف ٹون بلاک کی رنگین و سادہ ۹۴ تصویریں ہیں۔ دوسرے حصے میں لائن بلاک کے ۹۴ رنگین نقشے ہیں اور تیسرے میں دونوں کا خلاصہ۔ اب تک تاریخ جغرافیہ اور معلومات کے لئے کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ قیمت مجلد عہ

جغرافیہ دنیا سید شرف الدین صاحب قادری کی تصنیف ہے جو جماعت وسطانیہ کے لئے لکھی گئی ہے۔ واقعات عالم کے پہلو بہ پہلو صحیح نقشے اور دلکش و نایاب عکسی تصویریں بھی ہیں۔ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے یہ مختلف صوبوں میں داخل نصاب ہے۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ

ایجنسی کی کتابیں

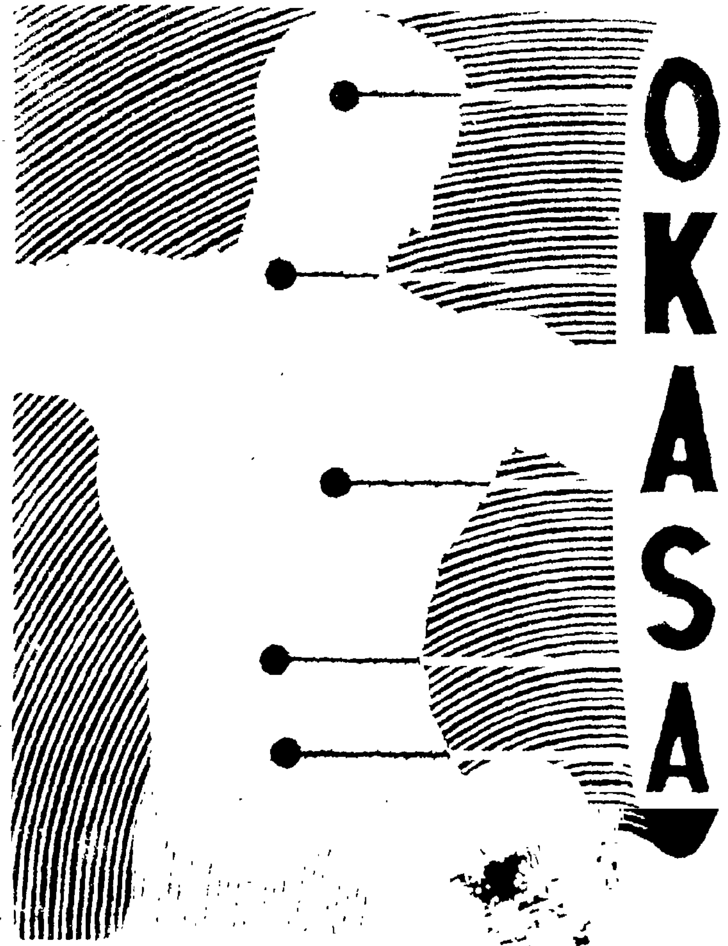
مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مولانا نے اپنی زندگی میں یورپ کے کچھ سفر کئے۔ یورپ کو بہت دیکھا اور اس پر بہت کچھ لکھا ان کے دل و دماغ پر جو کچھ گذرتا تھا اس سے کبھی تو موزوں شکل میں احباب کی بے تکلف صحبتوں کو گرماتے تھے اور کبھی الفاظ کا لطیف جامہ پہنا کر خطوط و مضامین کی صورت میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ یہ انہی مضامین اور خطوط کا مجموعہ ہے۔ قیمت مجلد عہ

افسانہ نگاری از وقار عظیم صاحب ایم اے۔ اس کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری کے فن پر ہر پہلو سے بحث کی ہے اور پھر اُن ہی اصولوں پر اُردو کے متعدد افسانے نگاروں کو جانچا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ (عہ)

ہمارے افسانے از وقار عظیم صاحب ایم اے۔ یہ کتاب افسانہ نگاری کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں اردو کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کے متعلق مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فہرست میں ستائیس افسانہ نگاروں کے نام درج ہیں جن میں چند ایسے افسانہ نگار شامل ہیں جو کبھی ہمارے ادب کے مہر و ماہ ہوں گے۔ قیمت عہ

متاعِ اقبال مصنفہ ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم اے۔ لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن۔ موصوف نے اقبال کی شاعری اور اس کے پس منظر، اُن کے ذہنی ارتقا اور شاعرانہ فلسفے پر ایک اجمالی بحث کی ہے۔ قابل دید ہے۔ قیمت عہ

گلدستہ مضامین و انشاء پردازی یہ طلبار ہائی اسکول، ورناکیولر، ایف اے، منشی فاضل و کالج کے لئے معلّم ہدایت ہے۔ مختلف موضوع پر دلچسپ مضامین کے علاوہ مضامین اور خطوط نویسی کے نمونے اور مستند انشاء پردازوں کے ادبی خطوط کا مجموعہ ہے جو تین ماہرین فن تعلیم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ قیمت عہ


OKASA

جامعہ

زیر ادارت :- نور الحسن ہاشمی ایم ۔ اے

جلد ۳۶ نمبر ۲	بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء	چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ ندوۃ المصنفین، دہلی انڈین پریس، الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمائیے اور قواعد وضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے

غالب کی اُردو خطوط نویسی کے آغاز کی تاریخ

سوانح غالب کے متعلق یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہو کہ انھوں نے کب فارسی میں خط لکھنا ترک کرکے اردو میں لکھنا شروع کیا، مولانا حالی فرماتے ہیں کہ میرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے رہے مگر اس سال جب وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں معروف ہو گئے تو اس کے بعد چونکہ انھیں اپنی طرز خاص میں فارسی زبان میں خطوط لکھنے کے لیے وقت نہیں مل سکتا تھا اس لیے انھوں نے فارسی میں خط لکھنا چھوڑ دیا اور اردو میں لکھنے لگے

اگر ہم حالی کا مندرجہ بالا بیان درست مان لیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ غالب نے ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد اُردو خطوط نویسی شروع کی۔ یہ دعویٰ بوجوہ محل نظر ہو۔ ہمارے پاس میرزا کے جو مطبوعہ خطوط موجود ہیں ان سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ اس سے پہلے اردو میں لکھنا شروع کر چکے تھے۔

اُردوے معلیٰ میں جو خطوط شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر خطوں پر تاریخیں نہیں۔ ایسے ہی خطوں میں سے ایک خط منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہو لکھتے ہیں[1]۔

بھائی یہ مصرع جو تم کو ہم پہنچا ہو۔ فن تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرع سلمان ساوجی اور ظہیر کا سا ہو۔ چار لفظ اور چاروں واقعہ کے مناسب یہ مصرع کہہ کر اوّل مصرع کی فکر کرنی کس واسطے۔ واہ وا سبحان اللہ۔ اور یہ جو تم کو فر کے لفظ میں تردد ہوا اور ایک سو کھا سہا شعر ظہوری کا لکھا تعجب ہو یہ لفظ میرے ہاں پنج آہنگ میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا۔ فر اور فرہ لفظ فارسی ہو مرادف جاہ کے پس جاہ کو اور اس (یعنی فر) کو کس نے کہا ہو کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھے۔ عالیجاہ اور سکندر جاہ اور مظفر فر اور فریدون فر یوں بھی درست ہو اور صرف جاہ اور فر یوں بھی درست ہو

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۱ (طبع اول ۱۹۲۲ء مطبع کریمی لاہور)

میرزا اس خط میں تفتہ کے اس قطعہ تاریخ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو انھوں نے میرزا کو بہادر شاہ کی طرف سے عطائے خطاب کے موقع پر لکھا ہو۔ قطعہ حسب ذیل ہے

سراج الدین بہادر شاہ غازی داد غالب را — خطابے جو ہر ہر لفظ آں روشن تر از اختر
دبیر الملک نجم الدولہ یک جزو دگر ہم — نظام اول بود زاں بعد لفظ جنگ ای سرور
خطاب و خلعت شش پارچہ بخشید و بر خلعت — فزوده جیغہ و سرپیچ و بالائے درد گوہر
بریں توقیر دانستم کہ باشد خسرو دہلی — سخن فہم و سخن گر پرور و دانا و دانشور
پئے تحریر تاریخ خطاب و خلعت شاہی — بدریائے تفکر غوطہ زد طبع سخن گستر
ہنگامیکہ شد در غوطہ پایش بر زمیں قائم — بگوش تفتہ ہاتف گفت کے زد زباں آور

بگو گر سال ایں پیش آمد اقبال می خواہی
یکے ساماں، دوم حشمت، سوم اعزاز، چہارم فر

ساماں، حشمت، اعزاز، فر چاروں الفاظ کے اعداد ۱۲۶۶ ہوتے ہیں جو اس واقعہ کی ہجری تاریخ ہے۔ جیسا کہ میرزا نے مہر نیمروز کے آغاز میں لکھا ہے[۱] ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ کے دربار میں حاضر ہوئے جب ظفر نے انھیں شش پارچہ خلعت اور سہ رقوم جواہر کے علاوہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات عطا فرمائے اور ساتھ ہی خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت بھی ان کے سپرد ہوئی۔ لازماً تفتہ نے اس کے بعد جلد ہی یہ قطعہ تاریخ لکھا ہوگا جس پر میرزا نے یہ خط لکھا۔ بہرحال یہ خط کسی صورت میں جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد کا نہیں ہو سکتا۔

لیکن کیا حالی کا یہ مدعا ہے کہ ۱۰ مرہم جولائی کو وہ تاریخ نویسی پر مقرر ہوئے اور ادھر اگلے دن ۵ تاریخ سے انھوں نے مہر نیمروز لکھنا شروع کر دی اور ساتھ ہی فارسی میں خط لکھنا بھی ترک کر دیا۔ اس تاریخ کے متعلق تقسیم کار کا یوں فیصلہ ہوا تھا کہ مدار المہام شاہی حکیم احسن اللہ خاں بہادر واقعات کا انتخاب کر کے

---

[۱] اگرچہ میرزا نے یہاں تاریخ ۴ جون لکھی ہو لیکن جیسا کہ میں ذکر غالب میں ثابت کر چکا ہوں یہ سہو قلم ہے۔ صحیح تاریخ ۴ جولائی ہے۔

مضمون میرزا کے حوالہ کر دیتے (اور ممکن ہے وہ اردو میں لکھ کے دیتے ہوں) اور میرزا اس مضمون کو فارسی کا جامہ پہنا دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ایسا آسان نہیں تھا کہ جولائی سے شروع ہو جاتا اور میرزا فوراً ہی اردو میں خط لکھنے پر مجبور ہو جاتے کیونکہ اب[1] پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی طاقت[2] ان میں نہیں رہی تھی۔ اقتباس و التقاط اور ترجمہ میں کتنا وقت صرف ہوا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مہر نیمروز کی ضخامت ۱۲۰ صفحات کے قریب ہے اور یہ کہیں فروری یا مارچ سنہ ۱۸۵۲ء میں جا کر ختم ہوئی تھی گویا انھوں نے ۱۲۰ صفحے کم و بیش پونے دو سال میں لکھے پس اگر میں یہ کہوں کہ ان کا جولائی میں کام شروع کر دینا محالات میں سے ہے تو مبالغہ نہ ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ جولائی میں تفتہ کو اردو میں خط لکھ رہے ہیں۔ پس حالی کا یہ دعویٰ کہ میرزا نے مہر نیمروز کے شروع کرنے کے بعد اردو خطوط نویسی کا آغاز کیا غلط معلوم ہوتا ہے۔

پھر اس خط سے عیاں ہے کہ اردو میں یہ پہلا خط نہیں جو میرزا نے ان کے نام لکھا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح انھیں بھی فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔ تفتہ کے نام کے فارسی خط پنج آہنگ[3] میں موجود ہیں۔ لازماً جب انھوں نے فارسی چھوڑ کر اردو میں لکھنا شروع کیا ہوگا تو اس کی توجیہ کی ہوگی اور وہ خط یقیناً اس جولائی والے خط سے پہلے لکھا ہوگا۔ پنج آہنگ میں تفتہ کے نام کا آخری خط ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کا لکھا ہوا[1] ہے۔ گمان غالب ہے کہ انھوں نے تفتہ کو پہلا اردو خط ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء اور جولائی ۱۸۵۰ء کے درمیان کسی تاریخ کو لکھا ہوگا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ۱۸۴۹ء میں اردو میں لکھنا شروع کر چکے تھے اس کی تائید ایک اور خط سے ہوتی ہے۔ میرزا منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھتے ہیں[2] جو ان دنوں پنجاب کے کسی مقام پر سرکاری ملازم (غالباً تحصیلدار) تھے۔

.... فرایاد شما خواہد بود کہ کلہے از پوست برہ داشتم حالیا آں را کرم خوردہ و سرم بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلاہی جویم اما لنگ ابریشمی چنانکہ در پٹیالہ و ملتان سازند و امیان آں قلمرو بسو پہندی خواہم اما لنگی کہ رنگہائے شوخ برنایانہ نداشتہ باشد و حاشیہ سرخ بود

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۲۱۱ (طبع نولکشور کانپور ۱۸۶۸ء) [2] کلیات نثر صفحہ ۲۰۵۔

وصندلی پود از بائے نازک وطراز ہائے نغز داشتہ باشد وتا۔ بائے زر وسیم را ازاں بعرف نکردہ باشند وابریشم سیاہ وسبز وکبود وزرد در بافتن آں بکار رفتہ باشد و غالب کہ دراں دیار این چنیں متاع زود وآسان بدست آید بجویند وبہم رسانند و سوئے من در ڈاک روان دارند و قیمت آں بنگارند تا بہا خواہند نوشت نخواہم شد۔ ہدیہ وارمغان آنست کہ ناخواستہ فرستند وآنچہ خواستہ کسے باشد ہدیہ نمی تواند بود۔ از گفتار من آں نسنجند کہ ہدیہ از شما نپذیرم الا بلکہ لنگ را خریدارم و ہر چہ ناخواستہ باشد آنرا نپذیرفتار بہر حال در فرستادن لنگ درنگ و در نگاشتن قیمت تکلیف نکنند والدعا نگاشتہ صبح آدینہ

یکم دسمبر ۱۸۴۸ء۔

اب اس کے بعد مندرجہ ذیل اردو خط ملاحظہ فرمائیں۔

برخوردار منشی جواہر سنگھ کو بعد دعائے عمر و دولت معلوم ہو خط تمھارا پہنچا خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی قطعے جو تم کو مطلوب تھے اُن کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ نے کی ہو میں تم سے نہیں کہہ سکتا۔ نری کوشش نہیں روپیہ صرف کیا ...... جب سب قطعے تمھارے پاس پہنچ جائیں گے تب اس کا حسن خدمت تم پر ظاہر ہوگا۔ کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتہ میں بھیجوں گا۔ والدعا۔ اسد اللہ

میرزا سب سے پہلے لنگی کی فرمایش یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے خط میں کرتے ہیں اس لیے دوسرا خط زیادہ سے زیادہ ۱۸۴۹ء کے اوائل کا ہو سکتا ہے اور ہمیں ماننا پڑے گا کہ انھوں نے اس زمانہ میں اردو میں خط لکھنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ نویسی سے بعد کا دعویٰ نادرست ہے اور پھر یہ خط بھی پہلا خط نہیں معلوم ہوتا اس اردو کے خط کے متعلق دو ایک اور باتیں غور طلب ہیں۔ شروع کے فقرے ہیں "بعد دعائے عمر و دولت معلوم ہو خط تمھارا پہنچا خیر و عافیت تمھاری معلوم ہوئی" یہ وہ اسلوب نگارش نہیں جو غالب سے

سلہ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۲

مخصوص ہے وہ ایسے رسمی فقروں سے اجتناب کرتے تھے۔ پس ماننا پڑے گا کہ یہ نہایت ابتدائی زمانے کا اردو خط ہے۔ دوسرے آخر میں صرف اسد اللہ لکھا ہے یہ بھی ابتدا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میرزا کے جملہ مطبوعہ فارسی خطوط کے آخر میں بالعموم صرف اسد اللہ لکھا ہے اردو خطوں کے آخر میں بھی غدر تک عموماً اور ۱۸۵۵ء تک خصوصاً وہ صرف اسد اللہ لکھتے رہے۔ غدر کے بعد عام طور پر انھوں نے غالب لکھنا شروع کیا۔ غدر کے بعد کے خطوط میں سے بہت کم ایسے خط ملیں گے جن میں صرف اسد اللہ ہو۔ بالعموم صرف غالب یا اسد اللہ خاں غالب۔ شاید چند خطوں میں غالب علی شاہ یا کوئی ایسا فقرہ ہوگا۔

الغرض جواہر سنگھ کے نام کا خط ان کے نہایت ابتدائی خطوں میں سے ہے اور یہ ۱۸۴۹ء کے آغاز کا ہے۔ اردوے معلیٰ میں ایک اور خط مردان علی خاں رعنا کے نام ہے جس پر تاریخ شائع نہیں ہوئی لکھتے ہیں[1]

> خاں صاحب شفیق عالیشان کو میرا سلام۔ کل تمھارا عنایت نامہ پہنچا۔ رامپور کا لفافہ آج رامپور کو روانہ ہوا...... نواب صاحب اردو کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ فارسی غزل تم نے بے فائدہ لکھی۔ دیکھو صاحب تم نے اپنے سکن کا پتہ لکھا سو میں نے دوسرے دن تمھارے خط کا جواب روانہ کیا۔ منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے مجھ سے ملے۔ بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمھارے وہ مداح اور میں ان کا ثنا خواں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ خط کب کا لکھا ہوا ہے لیکن اگر اس میں نواب صاحب سے مراد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور تذکرہ سے مراد گلشن بے خار ہے تو پھر اردو خطوط شروع کرنے کی تاریخ ۱۸۴۹ء سے ہٹا کر اور پیچھے کرنی پڑے گی۔ شیفتہ کا تذکرہ ۱۲۵۰ھ یعنی ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا تھا[2] لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہاں

---

[1] اردوے معلیٰ صفحہ ۱۵۱۔ [2] غالب نے قطعہ تاریخ لکھا ہے

غالب ایں رنگیں کتاب گلشن بے خار نام — رو کش جنات تجری تحتہا الانہار است

گر کسے لب تشنۂ تاریخ اتمامش بود — گو بیہائے آب ہم در گلشن بیخار است

۱۲۵۰ھ

شیفتہ کے تذکرہ کی طرف اشارہ نہیں اور یہ کسی اور تذکرہ کا ذکر ہے۔ کیا نوابان رامپور میں سے کسی نے شعراء کا کوئی تذکرہ لکھا تھا؟ منشی نولکشور کی سنہ ۱۸۴۹ء میں کیا عمر ہوگی؟ ان دونوں سوالوں کے جواب سے بھی اس خط کی تاریخ پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

بہرحال اس امر کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں کہ وہ سنہ ۱۸۴۹ء میں اردو میں خط لکھ رہے تھے۔ بعض اصحاب کے پاس میرزا کے غیر شائع شدہ اصل خطوط ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے اس سے قبل کی کسی تاریخ کا کوئی خط دستیاب ہو جائے۔

پھر حالی نے اردو میں خطوط شروع کرنے کی جو وجہ بیان کی ہے وہ بھی کچھ مضحکہ خیز سی ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ پوری تاریخ پہلے دو برس میں لکھی گئی تھی یعنی چھ صفحے کے قریب ایک ماہ میں۔ کیا واقعی یہ ایسی ہی غیر معمولی اور ناقابل برداشت مشقت ہے کہ اس کے بعد ان کے لیے فارسی میں خطوط لکھنا مشکل ہو جاتا۔ ماننا پڑے گا کہ حالی نے اردو خطوط نویسی کی جو تاریخ لکھی ہے اور جو توجیہ کی ہے دونوں غلط ہیں۔ میرزا نے سنہ ۱۸۴۹ء میں (یا اس سے بھی پہلے) اردو میں لکھنا شروع کیا اور اس لیے نہیں کہ ان کے لیے فارسی میں لکھنا محال تھا کیونکہ وہ اس کے بعد بھی کبھی کبھی فارسی میں لکھتے رہے بلکہ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب ہندوستان میں سے فارسی کا دور دورہ ختم ہو گیا ہے اور مستقبل اردو کے ہاتھ میں ہے۔ عوام تو درکنار رہے خواص تک فارسی کے صحیح ذوق سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں انھیں اپنی فارسی اور فارسیت کی کما حقہ داد کہاں مل سکتی تھی۔ لہذا انھوں نے طوعاً یا کرہاً فارسی کی جگہ اردو کو اختیار کیا۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے شروع میں محض بطور تفنن اردو میں لکھا ہو لیکن جب دیکھا کہ ان کے احباب ان کے اردو خطوط سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں جیسے فارسی خطوط سے ہوتے تھے تو آہستہ آہستہ انھوں نے ساری خط و کتابت اردو ہی میں کر دی اور اس کے بعد خاص حالات کے سوا آخر تک اردو ہی میں لکھا کیے۔

مالک رام ایم۔ اے

ریڈیائی جنگ

ریڈیو پروپیگنڈا کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے ملک اپنی خارجی پالیسی میں نمایاں چیزوں مثلاً حکمت عملی، اقتصادی مسائل اور فوجی قوت کے پہلو بہ پہلو اس کو بھی جگہ دیتے ہیں. روس نے اس سلسلہ میں نمایاں کام کئے اور ساری دنیا کو سوویٹ حکومت کے زرین حالات سے آگاہ کرتا رہا۔ ہٹلر نے اس حربے کو سیکھا اور جس طور پر اس نے اپنے نئے ہوائی جہازوں کا تجربہ اسپین میں کیا. اسی طرح سار (SAAR) اور آسٹریا میں ریڈیو کے ان حربوں کی بھی آزمایش کی جو وہ آیندہ انگلستان اور فرانس پر کرنے والا تھا۔ میونخ سے اس نے ریڈیو پر پیغامات نشر کرکے سوڈیٹن لینڈ میں جرمنوں کو چیک حکومت کے مظالم سے آگاہ کیا اسی زمانے میں اطالوی نشرگاہ باری سے پروگرام عربوں کو برطانیہ کے خلاف اکساتے رہے۔ اس کے علاوہ روم اور برلن سے ایسے پیغامات نشر ہوتے رہے جن کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی امریکہ کو ریاست ہائے متحدہ سے بدظن کر دیا جائے۔

موجودہ جنگ سے پہلے ریڈیائی پروپیگنڈا آمروں کے سیاسی اقتدار بنانے اور قایم رکھنے میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا. مگر جب سے جنگ چھڑی ہے تمام جمہوری، آمری اور دوسری حکومتوں نے جو جنگ میں شریک ہیں ریڈیائی پروپیگنڈا کرنے والے شعبوں کو جنگی کارروائی میں بہت وسیع جگہ دے رکھی ہے۔ اپنے ملک میں عوام اور فوجوں کو متحد کرنے اور قربانی کرنے کے لیے آگے ڈھکیلا جا رہا ہے۔ غیر جانبدار ملکوں کو خبریں واقعات حاضرہ پر تبصرے اور مباحثے سنائے جاتے ہیں اور دشمن کے گھروں اور چھاؤنیوں میں دلائل، واقعات اور الزامات پیش کیے جاتے ہیں جس سے ان کا اعتماد گر جائے۔

<u>ریڈیائی پروپیگنڈا جنگ کے حربے کی حیثیت سے</u> | ریڈیائی پروپیگنڈے سے محض میدان جنگ سے نزدیک اور دور کے لوگوں کو ہموار کرنے ہی کا کام نہیں لیا گیا بلکہ جنگ میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ اس طور پر جرمنوں نے اسے ایک تندرکاری وار کی حیثیت دے رکھی ہے جس سے حملے میں بہت مدد ملتی ہے جنگ کے وقت جب

ریڈیائی اطلاعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جرمن جاسوس ہر جگہ ہیں وہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں اور اس کی اطلاع دیتے رہتے ہیں تو اس سے محض یہ مطلب ہوتا ہے کہ مخالفین کے دل بیٹھ جائیں۔

ایک فرانسیسی ہاوٹزر ٹولیین دستہ پیرس کے قریب مامور تھا اور جرمن اس پر گولہ باری کر رہے تھے اس نے جگہ بدلنے کا ارادہ کر لیا تھوڑی ہی دیر کے بعد سٹٹ گارٹ ریڈیو سے اس کے نقل منزل کی خبر نشر کی گئی۔ اس میں نئی منزل کی جائے وقوع اور کوچ کا وقت بالکل صحیح بتلایا گیا تھا لیکن اس کا علم لوٹ لیا گیا اور فرانسیسیوں کو اس کے چند ہی لمحوں کے بعد خبر دیدی گئی۔ جب زیزن ریڈیو نے مڈلینڈ میں ایک شہر کے انگریزوں کو وہیں کے ایک اسلحہ ساز کارخانہ کی جگہ کام کرنے والوں کی تعداد اور ہوائی تہ خانوں کا صحیح مقام بتایا تو وہ خوفزدہ ہو کر کانپ اٹھے۔ دو فرانسیسی جرنیل بیجو لائن میں رات کو بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سٹٹ گارٹ ریڈیو نے انہیں کھانے کی پوری تفصیل بتادی۔

اسی طرح حملے کے وقت ریڈیو بے چینی اور ہلچل پیدا کر سکتا ہے جب جرمن پیرس کی طرف بڑھ رہے تھے تو انھوں نے فرانسیسی لہروں پر پیرز ورادر ڈراؤنے لہجے میں شہر اور گاؤں کے باشندوں کو خبردار کیا کہ قبل اس کے جرمن ٹینک اور بمبار آئیں وہ اپنی جان سنبھال کر بھاگ کھڑے ہوں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں آدمی خوفزدہ ہو کر اپنا مال متاع سنبھالے سڑکوں اور دوسرے راستوں پر نکل کھڑے ہوئے اور فرانس کے لیے تازہ کمک بھیجنا مشکل ہو گیا۔

لیوپولڈ کے ہتھیار ڈالدینے پر یہ دہشت دلانے کی ترکیب پھر کامیاب ہوئی جب جرمن شمالی فرانس میں بڑھ رہے تھے تو انھوں نے بہت سی لہروں پر جو اس قدر قوی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا ساری فضا پر چھا گئی ہیں اعلانات کرنا شروع کیے۔ اس میں فرانسیسیوں کو یہ بھڑکایا گیا تھا کہ وہ اس جنگ کو جس میں ان کے لیے کوئی امید نہیں خیرباد کہدیں اور اپنی حکومت کو جھک جانے پر مجبور کریں۔ ۲۰ رمئی ۱۹۴۰ء کو نازیوں نے فرانسیسی میں وہاں کے لوگوں کو یہ پیغام بھیجا تھا جسے بوسٹن (امریکہ) کے سننے والے مرکز نے قلمبند کرالیا

"جرمنی کی تباہ کن طاقت سے مجبور ہو کر شاہ بلجیم نے اپنی جنگ کا جو بے معنی ہو چلی تھی خاتمہ کر دیا۔ فرانس کے باشندو اور سپاہیو بلجیم کی فتح سے فرانس کی فوجی حیثیت یہ

رہ گئی ہو کہ بیمنو لائن کا شمالی حصہ چور چور ہو گیا ہے۔ مغربی حصے کی منزلت جاتی رہی ہے۔ اپنا
ملک چھوڑ کر اپنی جانیں بچانے کی فکر کرو۔ اپنی حکومت کو صلح کرنے پر مجبور کرو ورنہ اسے
اُلٹ دو۔ امرا، تاجروں، سرمایہ داروں اور انگریزوں اور یہودیوں کو بھاگنے نہ دو نہیں
تو وہ تمہیں دلدل میں پھنسا جائیں گے۔"

یہ ظاہر کیا گیا کہ برطانیہ کا معاملہ دگرگوں ہو چکا ہے اور کچھ ہی دنوں میں وہ ہار مان لینے والے ہیں
جرمن ریڈیو نے اس پر اصرار کیا کہ "جلد کام کرو۔ بھاگنے والے انگریز اپنی خبر خود ہی لیں گے ان ذلیل لوگوں
کی یہی سزا ہے جو اپنے قول پر قائم نہیں رہتے" معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے صلح کی شرطیں اسی وجہ سے مان
لیں کہ انہیں برطانیہ کے جلد ہار جانے کا یقین تھا۔ درحقیقت ریڈیو نے ایسے خیالات پیدا کرنے میں نمایاں
حصہ لیا۔

اس درمیان میں فرانسیسی نشریات نے وہاں کے سپاہیوں اور عوام کی ہمتیں اور دل بڑھانے
کے لیے کچھ نہیں کیا۔ وزیراعظم رینا اکثر ریڈیو پر بولے مگر انھوں نے برطانیہ کی طرح سچ بولنے سے کام نہیں
لیا بلکہ وہ ڈرامائی اور خوف دلانے والے لہجے میں مخاطب ہوئے اور اس سے الٹا اثر پڑا متحد کرنے اور ہمت
دلانے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ مارسلائس موسیقی کے علاوہ اور کوئی گانے نشر نہیں کیے جاتے تھے۔
اور گراموفون کا یہ ریکارڈ بھی اس قدر بجایا جاتا تھا کہ وہ فرسودہ ہو گیا اور اس سے حزنیہ کیفیت پیدا ہونے
لگی۔ فرانس میں جنگ اور اس کے آغاز کی روائی اور مقاصد سے متعلق جو بے حسی تھی اس کے بہت سے وجوہات
ہیں جن میں بہت سے ریڈیو کی اس مردہ پالیسی سے زیادہ بنیادی ہیں مگر تب بھی اس پر الزام عاید ہوتا ہے۔

فرانسیسی پروگراموں میں خاص عیب یہ تھا کہ وہ بالکل خشک تھے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر گوئبلس نے
یہ حکم دے رکھا تھا کہ جرمن نشریات میں دلچسپی کو مقدم رکھا جائے۔ فرانس میں جنگ سے پہلے بہت سے
مکالمے اور سریلے گانے نشر کیے جاتے تھے مگر اس کے بعد وہ اس وجہ سے بند کر دیے گئے کہ وہ زیب نہیں
دیتے۔ سخت احتساب کی وجہ سے خبروں کی بہت تراش خراش کی گئی اور ان میں بھی اتنی دیر کی جاتی تھی
کہ پہلے بیرونی ریڈیو انھیں سنا دیتے تھے۔ اس کے علاوہ جنگ کی ضرورت کا بہت کم احساس دلایا گیا

نازی جرمنی پر کھلے ہوئے حملے کم کیے جاتے تھے۔ اور جرمنی کی طرح فوجی باجہ بھی شاید ہی کبھی سنایا جاتا ہو
اس صورت حال کے کئی سبب ہیں۔ فرانسیسی حکومت اور فوجی قیادت کی مدافعتی کارروائی کو
پیش نظر رکھتے ہوئے ریڈیو کی پالیسی منفی تھی اور نفی کی حیثیت رکھتی تھی۔ پروپیگنڈے کا شعبہ بھی ناکافی تھا۔
موسیو گیرادو جو اس کے ڈائرکٹر بنائے گئے تھے مصنف اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ممتاز تھے مگر انتظامی
امور اور پروپیگنڈے کے اصولوں سے نابلد۔ اور انھوں نے طریق کار میں اپنی بلند عالمانہ صلاحیتوں سے مدد لی
ان کا عملہ غیر منظم تھا اور اس میں اور پالیسی میں اکثر تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ریڈیو کے شعبہ میں عملہ بہت کم اور
موجودہ سامان خال خال نظر آتا تھا۔ بی۔ بی۔ سی کی طرح فرانس نے بیرونی پروپیگنڈے کو روکنے
کے لیے مستعدانہ کارروائی کبھی نہیں کی۔

فرانسیسی ریڈیو پر خبروں کی کمی اور خشکی اور تفریح کے مسالے کی ابتری کی وجہ سے وہاں کے
باشندے مستقل طور پر باہر کی نشرگاہوں کو سنتے تھے۔ سٹٹ گارڈ ریڈیو فرانس کے بہت سے حصوں میں
سنا جاتا تھا گو پیرس میں پرانے ٹرانسمٹر Transmitter کے استعمال کی وجہ سے سنا نہیں جا سکتا تھا
اس لیے یہاں ہمبرگ کے نشریات عموماً سنے جا سکتے تھے۔ بحیثیت مجموعی لوگ جرمن نشرگاہوں کو
بیشتر سنتے تھے۔ خاص طور پر سپاہیوں کا یہی رویہ تھا جنھیں سردیوں کے طویل زمانے میں میجنو لائن سے
کچھ مطلب نہ تھا۔

اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ جرمن ریڈیائی پروپیگنڈے کا فرانس میں رائے عامہ پر کافی اثر ہوا۔
لیکن اس نے سپاہیوں سے زیادہ عام آبادی پر اثر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سپاہیوں نے بیرونی ریڈیو کو محض تفریح
اور وقت بہلانے کے لیے سنا اور ان کوششوں کے خلاف جو ان کی ہمتیں توڑنے یا انھیں برطانیہ کا
مخالف بنا دینے کے لیے کی گئیں نفرت سے کان پھیر لیے۔ بہت سے مبصروں کا یہ خیال ہے کہ پروپیگنڈے
کی مسلسل بوچھار کی وجہ سے یہ نفرت کم ہوتی گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ فرانسیسی حکومت نے اپنے سپاہیوں کو جرمن
پروگرام سننے سے روکنے یا حوصلہ شکنی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ جرمن پروپیگنڈے کے کئی موضوع یہاں مثالاً
پیش کیے جاتے ہیں۔ ۱۔ اتحادیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے نازیوں نے پروگراموں کے آخر میں یہ کہنا

شروع کیا۔ انگریز اپنی مشینیں دیتے ہیں اور فرانسیسی اپنے سینے پیش کرتے ہیں۔ بار بار یہ کہا جاتا تھا کہ "جب تک ایک بھی فرانسیسی زندہ رہے گا انگریز لڑتے رہیں گے"۔ یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ انگریز سپاہیوں کو کسی نے میدان جنگ میں نہیں دیکھا کیونکہ وہ فرانسیسی سپاہیوں کی بیویوں کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔

ظاہر اریڈیائی پروپیگنڈا جو عام باشندوں سے مخاطب ہو کر کیا جاتا تھا زیادہ موثر ہوتا تھا مگر اس پروپیگنڈے کا قطعی اثر معلوم کرنا مشکل رہا ہے۔ عوام سے مسلسل اپیلیں کی جاتی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اعتماد اور وفاداری کو متزلزل کر دیا جائے اور فرانس کے جنگی مقاصد اور اس کے جیت جانے کی اہلیت کے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کیے جائیں۔ سرمایہ داروں اور دولت مند وزرا پر خاص طور سے حملے کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ اور یہودیوں کے خلاف بھی بہت پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔ آخر میں دہشت پیدا کرنے کے لیے فرانسیسیوں کو جرمنوں کی برتر طاقت کا احساس بار بار دلایا جاتا تھا جن کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ہار سکتے ہی نہیں اور انھیں خوفناک حملوں اور بمباری کی اطلاع دی جاتی تھی جس کا ہونا یقینی تھا۔ اس طور پر فرانسیسیوں نے باہر سے بہتیرے خیالات دماغ میں جا لیے اور فرانس کا ناکارہ اور کوتاہ بیں ریڈیو انھیں دور نہ کر سکا۔ وہاں کے سپاہی اور عوام قبل اس کے کہ جرمن حملہ کریں ریڈیو کی لڑائی ہار چکے تھے۔

جب جرمن حملہ ہوا تو ریڈیو جس طور پر اوپر بیان کیا جا چکا ہے فتوحات کے لیے استعمال کیا جانے لگا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی یہ دو دھاری تلوار کا کام کرنے لگے تھے کیونکہ جرمن فرانس کی ساری نشرگاہیں استعمال کر کے مفتوح قوم پر برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈے کی بارش کر سکتے تھے مگر وہ انھیں لندن سے جنرل ڈیگال، مسٹر چرچل یا پریسیڈنٹ روزولٹ کی دوبارہ نشر کی ہوئی تقریریں بی بی سی سے سننے سے نہیں روک سکتے تھے۔ برطانیہ نے ناروے، ہالینڈ اور بلجیم والوں کے لیے جب سے وہ ہارے ہیں باقاعدہ انھیں کی زبانوں میں ریڈیائی پروگرام نشر کر کے ان کی ہمتیں بڑھا رکھی ہیں۔ اور جب سے فرانس نے صلح کی ہے انہوں نے روزانہ وہاں کے مصیبت زدہ لوگوں کے لیے پروگرام نشر کیے ہیں اور اس کا خاصا اثر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس... قصہ سے ظاہر ہو گا۔ گزشتہ ستمبر کے آخر میں ایک امریکی پیرس کی پان مارچ بازار جوتا خریدنے کے لیے گیا اسے دکان

کے سامنے جوتے کے خریداروں کی بھیڑ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ اس نے وجہ دریافت کی تو یہ معلوم ہوا کہ پچھلی رات کو جنرل ڈیگال نے فرانسیسیوں سے کہا تھا کہ وہ جتنے جوڑے جوتے ممکن ہو خرید لیں اور جرمنوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے دیں جو عنقریب سامان لے لینے والے ہیں۔

دشمن کے علاقہ میں پروپیگنڈا پہلے دشمن کے علاقہ میں پروپیگنڈا کرنا مشکل تھا مگر ریڈیو کے سحر سے آسان ہو گیا ہے۔ پہلے غیر جاذب طریقے تھے یعنی ہوائی جہازوں سے اشتہار گرانا یا غبارے اڑانا ان کا حلقہ محدود اور اثر بھی کم ہوتا تھا لیکن ریڈیو آسانی سے دشمن کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ایک پل میں زمین کے سات چکر کر لیتا ہے۔

نازیوں نے شروع میں جرمنوں کو بیرونی نشرگاہوں سے سننے کی ممانعت کر دی تھی۔ برطانیہ نے یہ نہیں کیا۔ وہاں کے اخبار والے بہت خلوص سے ہر ہٹلر کی تقریر کا وقت لکھ لیا کرتے تھے۔ حال میں انگلستان میں اس طرح سننا وطنیت کے منافی قرار دے دیا گیا ہے۔ ضمناً دونوں فریق جنگ کے گرفتار قیدیوں کے نام سناتے ہیں تاکہ دشمن پروگرام میں دلچسپی لے۔

دشمن کی ہمت اور ضبط النفس توڑنے کے لیے عوام کو ان کے لیڈروں کی امن کے زمانے کی بداعمالیاں اور زمانہ جنگ کی نااہلی بتائی جاتی ہے۔ بی۔ بی۔ سی نے جرمنوں سے کہا۔ "اور اب کچھ ڈاکٹر گوبلز کے متعلق سنیئے۔ آپ اس کے معقول طریق کار سے تو واقف ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس نے آپ کو اپنے محل کی بابت بہت کم بتایا ہے جو دریائے برنبی کے کنارے واقع ہے جس کی دیواریں سنگ مرمر سے آراستہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دیہات میں گھر ہے جو دریائے لینگ گنسی پر واقع ہے اور ایک سو پچاس کمروں کا احاطہ برلن میں بھی ہے۔" اسی طرح گورنگ ہیملر اور ربن ٹراپ کو بے نقاب کیا گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بتانا دلچسپ ہوگا کہ برطانیہ ہٹلر کی ذات پر کوئی حملے نہیں کرتا لیڈر کی حیثیت سے اس پر نکتہ چینی کرتا ہے۔

دشمن کے علاقہ میں ہلچل، شبہات اور اضطراب پیدا کرنے کے لیے تمام لڑنے والی حکومتیں مضرت رساں پروپیگنڈے سے کام لیتی ہیں۔ یہ ثابت کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ دشمن کے لیے کوئی امید نہیں۔ سماجی، اقتصادی اور مالی حالت اگر دگرگوں نہیں تو سنگین ضرور بتائی

جاتی ہے۔ جرمنی برطانیہ اور فرانس سے سوال کرتا تھا کہ وہ ڈیزنگ لڑنے کیوں جاتے ہیں۔ مزدور طبقے سے وہ مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ زوال آمادہ اقتدار کو بچانے کے لیے تم اپنی جانیں کیوں قربان کرتے ہو۔ یہ آخری اپیل برطانیہ بھی اپنے جرمن نشریات میں کرتا تھا۔ بی۔ بی۔ سی نے ۸ رجولائی ۱۹۴۰ء کو یہی کہا کہ جرمنی کے نئے نظام کے معنی یہ ہیں کہ وہاں ہمیشہ طبقاتی نزاع رہے گا اور یہ نظام جس کے متعلق ہٹلر کو یہ یقین ہے کہ ایک ہزار سال سے زیادہ قایم رہے گا سرمایہ داروں کا ایک چلتا ہوا حربہ ہے جس کا مقصد مزدوروں کے اتحاد کو ختم کر دینا ہے۔

جرمن بار بار یہودیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ فرانس اور ریاستہائے متحدہ میں طبقاتی جنگ کا بیج بو دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی ہٹلر اور بہت سے ملکوں کی یہودیوں کے جانی دشمن کی حیثیت سے تحسین و آفریں حاصل کرے۔ نازیوں نے برطانیہ سے کہا ہے "وہ یہودی، اس لیے زندہ ہیں تاکہ دنیا کی دولت اور قوت پر غلبہ حاصل کریں۔ انھیں قومی حقوق اور آرزوؤں کا بالکل لحاظ نہیں نہ انسانی جذبات اور شائستگی کا پاس ہے" اور امریکہ والوں سے یہ کہا کہ جرمنی کو نہ تو یہودیوں کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے نسلی اصولوں کی وضاحت کی۔ کیونکہ دونوں باتیں امریکہ میں قانونِ حیات کی طرح مان لی گئیں ہیں۔"

غیر جانبدار ملکوں اور خاص کر ریاستہائے متحدہ کو ملانے کی کش مکش میں ریڈیو نے اہم کام کیے ہیں۔ یہاں پر بیرونی پروپیگنڈا کرنے والے کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے کیونکہ یہاں نہ تو محتسب (censor) ہے جو پریشان کن باتوں کو عوام تک پہنچنے نہ دے اور نہ پولیس جو دشمن کی باتیں نہ سننے دے۔ اگر نازیوں کا ریڈیو امریکہ کو کسی سمندری لڑائی کا غلط یا بڑھا کر چڑھا کر حال سناتا ہے تو امریکی ریڈیو یا بی۔ بی۔ سی سے اس کی تردید لازمی ہے۔ لڑنے والی حکومتوں کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کو دور کرنے کے لیے امریکہ میں ان لوگوں نے بہت کچھ کیا ہے جو خبروں کی ترتیب اور تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر بیرونی پروپیگنڈا کرنے والا اپنے سننے والوں کی تعداد برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے ان کی زندگی رسوم اور ادب کو سمجھنا اور ان کا نقطۂ نظر بھی جاننا چاہیئے اور آخر میں اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ

گزشتہ جنگ میں دونوں فریقوں نے ناقص تدابیر کیں۔ خاص کر مظالم کی داستانیں بہت نمک مرچ لگاکر بیان کی گئیں۔ اس وجہ سے لوگوں کو پروپیگنڈے کا احساس ہو گیا۔ اس صورت حال کی وجہ سے بہت مبہم اور دھیمے انداز میں پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔

غیر جانبدار ملکوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اپنا مفاد دشمن کے مقاصد سے برتر پیش کیا جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ ہمارے مقاصد سچے اور مثالی ہیں اور دشمن کے جابرانہ اور پرفریب ہیں۔ اسی اصول کے ماتحت بی۔ بی۔ سی پر ریورینڈ میک کارمک نے امریکہ والوں سے کہا۔ "برطانیہ اور وہ تمام چیزیں جن کا وہ مدعی ہے کبھی فنا نہیں ہو سکتیں۔ وہ آخر ایک دن ضرور جیتے گا کیونکہ وہ اچھائی، حق، صداقت اور شرافت کا علمبردار رہا ہے"۔ دی الکزنڈر امیر البحر امریکہ والوں کو یاد دلاتے ہیں کہ اگر انگریز فرانسیسی بیڑے کو جرمنی کے قبضے میں چلا جانے دیتے تو امریکہ کی حالت کس قدر مخدوش ہو جاتی"۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر آٹو کولش وز امریکہ کو یہ پیغام بھیجتے ہیں "جرمن جنگ کی سختیاں برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں انھیں کسی مبہم، تاریک، بدل جانے والے نصب العین کی ضرورت نہیں جسے مثالی کہا جاتا ہے وہ محض زندہ رہنے کے حق کی مدافعت کر رہے ہیں جو بہت ابتدائی، بنیادی اور مسلمہ حق ہے" ایک اور موقع پر نازیوں نے کہا۔ "اب جرمنی آزاد حکومت کی حیثیت سے قائم رہنے کے لیے لڑ رہا ہے۔ وہ رہنے کی جگہ کے لیے مصروف جنگ ہے............ اس کی مراد اس جگہ سے ہے جس کی ایک قوم کو پرسکون اقتصادی ترقی کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں وہ کوئی سازش یا معاہدے روا نہیں رکھ سکتا۔ جرمنی کو قدرت ہی نے وسط یورپ کی جگہ رہنے کے لیے دی ہے۔ دشمنوں کو اس سرزمین سے باہر رکھنا ظلم نہیں"۔

جنگ کی کارروائی میں ہر فریق نے ایک دوسرے پر لعن طعن کی ہے۔ برطانیہ پولینڈ پر مظالم سمندری جنگ میں بہت سے غیر انسانی افعال، مفتوحہ ممالک کی لوٹ مار اور کھلے شہروں کی بمباری پر نالاں رہا۔ مسٹر ہیسٹنگس ۵ دسمبر ۱۹۴۰ء کو امریکیوں سے اس طور پر مخاطب ہوئے "میں بول رہا ہوں اور بم برسائے جا رہے ہیں جو پانچ میل تک تباہی اور بربادی پھیلا دیتے ہیں قتل عام کو دنیا میں

جان بوجھ کر نہایت دردناک قتل عام ہو رہا ہے۔ کل دبے پسے اور دم گھٹے ہوئے مرد، عورتوں اور بچوں کی ایک اور داستان ہوگی اور نازی اطمینان کے سانس لیں گے۔"

جرمن الگ برطانیہ کی احتسابی کارروائی، اسمارک کی تلاشی اور عوام کی بمباری کی بے ضابطگی پر زور دیتے ہیں۔ مثال دیکھیے "ہمارا یہ خیال تھا کہ انگلستان بھی عوام مرد، عورتوں اور بچوں کو محض تفریحاً نہیں مارے گا .... جرمن عوام پر جو کچھ ہو رہا ہے اسے بہت توجہ سے یاد رکھا جا رہا ہے اور جب اس کی تفصیل پیش کرنے کا وقت آئے گا تو برطانیہ کو اس کی زبردست قیمت ادا کرنی ہوگی۔۔" برطانیہ نے اوران میں فرانسیسی بیڑے کے خلاف کارروائی کی تو برلن سے ای۔ ڈی۔ وارڈ نے اس کا مقابلہ اس طرح کیا جس سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوا۔

جنگ کے ابتدائی مہینوں میں جب جرمن یہ کوشش کر رہے تھے کہ امریکہ سے تعلقات میں زیادہ کشیدگی پیدا ہو تو وہ امریکہ والوں کو جرمن سورماؤں مثلاً جنرل ہرکمر کی یاد دلاتے تھے جو جنگوں میں لڑتے تھے یا جنھوں نے وہاں کی زندگی میں نمایاں کام کیے مثلاً ڈاکٹر مہلن برگ جو پنسلوانیا میں مبلغ تھے۔ جب امریکہ نے برطانوی فتح کی خواہش کی تو نازی پروپیگنڈے کے شعبے نے دوسرے موضوع اختیار کیے جو ان کے مادی مفاد کو ظاہر کرتے تھے اس میں اکثر دھمکی بھی ہوتی جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

لڑنے والا جب ریڈیو اس غرض سے استعمال کرتا ہے کہ غیر جانبدار ملکوں کے ساتھ مفاد اور نصب العین میں یگانگت ظاہر کرے تو وہ اس کے ساتھ ہی چاہتا ہے کہ اس کے دشمن سے ان ملکوں کے تعلقات خراب ہو جائیں۔ جرمنی نے ریڈیو پر امریکہ کو بہت سے تاریخی اتفاقات کی یاد دلائی۔ ان لڑائیوں اور تنازعوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بوسٹن چاپارٹی (Boston Tea Party) سے لے کر جنگی قرضے تک ہوتے رہے۔ نازیوں کے الزامات کا ایک محبوب موضوع یہ تھا کہ ۱۹۱۷ء کی طرح آج بھی برطانیہ امریکہ کو جنگ میں کھینچنا چاہتا ہے "نام تاریخیں اور ترتیب بدل دیجیے" ای۔ ڈی۔ وارڈ کا قول ہے" اور آپ وہی داستان پائیں گے جو بائیس برس پہلے لکھی گئی تھی"۔ رودبار انگلستان کی دوسری جانب سے انگریز مقررین اس وسیع خلیج کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نازی حماقت اور امریکہ کی جمہوری تخیلات کے درمیان حائل ہے اور اس

بات پر زور دیتے ہیں کہ امریکہ کے بین الاقوامی اخلاق کے تصورات، ڈنمارک، ہالینڈ اور بلجیم پر جرمن حملے کو روا اور بجا قرار نہیں دے سکتے

امریکی امداد کے لیے ریڈیو کی لڑائی

اقتصادی، سیاسی اور فوجی معاملات کی طرح ریڈیو کی لڑائی میں بھی ڈکٹیٹروں کا رویہ جارحانہ، تندانہ اور ظالمانہ رہا ہے اور جمہوریتوں کا کم از کم جنگ فلانڈرس تک تو ضرور دھیما اور مدافعتی رہا۔ ڈکٹیٹروں کو اس جنگ میں بہت پہلے برتری حاصل تھی۔ روسیوں نے اشتراکی پرچار کرنے والوں کو جمہوریتی ممالک میں بھیجا مگر ان لوگوں نے اس تحریک کے خطرات کے باوجود اس کے رد عمل کے لیے ریڈیو سے بہت کم کام لیا۔ جرمنوں نے عام رائے دہندگی میں سار والوں کی موافقت حاصل کرنے کے لیے زبردست پروپیگنڈا ریڈیو سے شروع کر دیا اور فرانس کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ اطالوی ریڈیو برابر عربوں کو انگریزی مظالموں کے خلاف بھڑکاتا رہا اور برطانیہ نے دو سال کی خاموشی کے بعد کہیں اس کا دنداں شکن جواب دیا۔

جب موجودہ جنگ چھڑی تو نازیوں نے اس میں پہل کی اور کئی مہینوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کے پاس برسوں کے تجربے کا اعلیٰ ساز و سامان اور منظم عملہ تھا اور کچھ ہی دنوں میں وہ شمالی امریکہ والوں کو روز ۱۱ گھنٹے کا پروگرام سنانے لگے اور یہ وعدہ کرتے تھے کہ ساز، رقص، لطائف و ظرائف فرانسیسی موسیقی اور دوسرے لطیف اور شیریں گانے اور باجے اور مزیدار چٹکلے آپ لوگوں کو برابر سنائے جائیں گے اور جنگ کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ ساز، رقص اور ہم آہنگ موسیقی کے درمیان تقریریں اور حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے جرمنوں نے اس غرض سے امریکی مرد اور عورتوں سے کام لیا۔ وہ سب امریکی زندگی سے آشنا تھے اور کچھ تو آئیووا ان فرڈ کالج (   ) کی طرح خاص علاقوں میں رہ چکے والوں سے انہیں کے انداز اور لب و لہجے سے گفتگو کر سکتے تھے۔ شروع ہی سے ان مقرروں نے برطانیہ سے خود ساختہ الزامات اور مظالم منسوب کر دیے اور ان کا زبردست مظاہرہ کر کے امریکہ والوں کو جنگ میں حصہ لینے سے خبردار کیا۔ ریاست ہائے متحدہ میں چند جماعتوں اور انجمنوں پر سخت نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ان میں یہودی، اخبارات اور سیاست داں مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی ہمدردی حاصل کرنے

اور یہ ظاہر کرنے کی کہ جرمنوں کی فتح سے امریکہ کے مفاد پر کوئی اثر نہیں ہوگا ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی۔

۱۹۴۰ء کی گرمیوں سے نازی ریڈیو نے ریاست ہائے متحدہ کے ریڈیائی پروپیگنڈے میں ناقدانہ لہجہ اختیار کیا گیا تھا اور چند ماہ تک زور و شور سے قائم رہا جرمن مقرران کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ حکومت سے بے اعتباری پیدا ہو اور فرقہ واری جنگ چھڑ جائے۔ پہلی مرتبہ نازی پروپیگنڈا کرنے والے اپنی بحث کرتے معلوم ہوتے تھے پھر ان کی کوشش محض یہ رہی کہ امریکہ جو برطانیہ کو روز بروز زیادہ امداد دے رہا ہے اسے روکا جائے۔ اس کی کوشش میں وہ طلانیہ حملے بھی کرتے تھے وہ امریکہ والوں کو خبردار کرتے تھے کہ اگر انھوں نے برطانیہ کی امداد جاری رکھی تو انھیں کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔ چونکہ امریکی تاجر آج کل جرمنوں سے تجارت نہیں کرتے وہ جنگ کے بعد بھی نہیں کر سکیں گے اور پھر ملک کو بہت سے نقصانات ہوں گے معیارِ زندگی گر جائے گا وغیرہ وغیرہ اور ان تنبیہوں کے ساتھ یہ یقین دلایا جاتا تھا کہ ہٹلر کی جنوبی امریکہ پر نیت نہیں اور نہ وہ ریاست ہائے متحدہ پر کوئی تشددانہ کارروائی کا منصوبہ رکھتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ، اس کے رہناؤں اور اداروں پر جرمنوں کے بڑھتے ہوئے حملے دیکھتے ہوئے اور اس حقیقت کو مدنظر رکھتے کہ جرمن ریڈیو کا جو رویہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف ہے اس میں بہت کم فرق رہ گیا۔ امریکہ والوں نے لازماً یہ نتیجہ نکال لیا کہ جرمن انھیں دشمن خیال کرتے ہیں۔

برطانوی پروپیگنڈا فرانسیسی سے زیادہ منظم اور مالی حیثیت سے بہتر تھا مگر اس کے مقابلہ میں جرمن بمباری سے پہلے سُست اور بے جان تھا۔ پرنسٹن مرکز سماعت امریکہ نے اس کا جو تبصرہ کیا تھا وہ پیش کیا جاتا ہے

ریاست ہائے متحدہ والوں کے سننے والوں کے ساتھ نوآبادیات اور مقبوضات کا سا رویہ تھا۔ امریکہ کے سننے والوں کو خبریں سنانے کے لیے لندن کی نشرگاہیں اپنے غیر ملکی محکمہ پر اعتماد کرتی تھیں جو مقبوضات کو بھی خبریں سنایا کرتا تھا اور امریکہ والے معمولی خبریں بھی اس طرح سننے کے عادی ہو گئے تھے گویا وہ سارے نظام شمسی کی تباہی کا پیش خیمہ ہوں۔ اور ملک کے اندر جو طرز عمل تھا اسی سے یہ پالیسی ہم آہنگ تھی۔ نوآبادیات اور مقبوضات کی امداد جنگ اور ان کی فوجوں کے برطانیہ میں نقل و حرکت بیان کرنے پر بہت وقت صرف کیا جاتا تھا۔ لارڈ مسٹر ابیلی برطانوی مزدوروں کے نمائندے نے فروری ۱۹۴۱ء میں بی۔ بی۔ سی

کی نشر کی ہوئی خبروں کی "قلت، تکرار اور پھیکے پن" کی شکایت کی تھی اور امریکہ کے سننے والوں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

لیکن سن ۱۹۴۰ء کے آخر سے برطانیہ کے امریکی نشریات بڑھ گئے اور جاندار بھی ہو گئے۔ خاص طور پر پروگرام تیار کر کے وہاں والوں کو سنائے جاتے تھے۔ اس میں بہترین مقرر حصہ لیتے تھے جن میں جے۔ بی۔ پریسٹلی، وکم اسٹیڈ، سلی ہاورڈ، سامرسٹ اہم وغیرہ بھی شامل تھے برطانیہ نے ان ممتاز لوگوں سے کام لے کر جنہیں امریکہ والے تصانیف یا سائنسی کمالات کی وجہ سے جانتے تھے جرمنوں پر فوقیت حاصل کر لی۔ جرمنی کے مقرر امریکہ والوں کے لیے اجنبی تھے اور اکثر ایسی زبان اور لہجہ اختیار کرتے تھے جو ان کے مذاق کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔ برطانیہ نے دلچسپ مباحثے اور اعتراضات بھی نشر کرنا شروع کیے جو ابھی تک جرمنی کا امتیاز تھا۔ امریکہ والے جو بی۔ بی۔ سی کے محتاط اور پر وقار مقرروں کو سننے کے عادی تھے اس قسم کے اعلانات سن کر جو نئی پالیسی کے مظہر تھے کافی متحیر ہوئے کہ "شاہزادی الزبتھ کو نہ بھول لیجئے گا۔ وہ آئندہ اتوار کو گرینوچ اسٹینڈرڈ ٹائم پر پونے آٹھ بجے تقریر کریں گی"۔

جنگ فلانڈرس کے بعد ریڈیو کے نظم ونسق میں جو یہ ترقی ہوئی اسی کے متوازی پروپگنڈے میں فنی حیثیت سے نمایاں تبدیلی کی گئی۔ اس سے پہلے برطانیہ والے محض اپنی فتح ہونے پر زور دیتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ جرمن دھمکیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے اور آزادی سے اتحادیوں کی مدد دی جائے برطانیہ والے یہ بھی کہتے تھے کہ وہ پروپگنڈے سے بالکل محترز ہیں۔ مگر انھوں نے نیا طرز عمل اختیار کیا ریڈیو کے موضوعات دفعتاً بدل گئے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ برطانیہ اور امریکہ کی قسمتیں الگ نہیں کی جا سکتیں ہیں اور ہٹلر کا اگلا نشانہ امریکہ ہی ہے۔ چونکہ امریکہ کے تحفظ میں برطانیہ پہلی کڑی ہے۔ اس وجہ سے یہ مناسب ہے کہ امریکہ کی مادی اور اخلاقی امداد پر زیادہ سے زیادہ اعتماد کیا جائے جرمن ریڈیو امریکی رائے عامہ میں تفرقہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برخلاف برطانیہ ان کو اپنی امداد کے لیے متحد کرنا چاہتا تھا اس کے مقرروں نے اعتماد اور دونوں قوموں کے مفاد اور جذبات میں یگانگت پیدا کرنا چاہی۔

فرانسیسیوں نے جنگ چھڑنے پر امریکی رائے عامہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور انھوں نے امریکہ کی مدد لینے کا کام برطانیہ ہی کے سر ڈال دیا۔ ان کے امریکی پروگرام میں محض خبروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا تھا جس میں صرف واقعات ہوتے تھے اور گانے، ڈرامے اور ادبی چیزیں بہت عالمانہ اور بلند ہوتی تھیں۔ یہ اکثر بالکل عقیدت مندانہ ہو جاتیں اور اس دلچسپی اور جاذبیت سے عاری تھیں جو جرمن یا اکثر برطانوی پروگراموں میں ہوتی تھی۔ ان میں بہت سے فنی عیوب تھے مثلاً ایسے فرانسیسی مقرر بولتے تھے جو خبروں کا لفظاً بہ لفظاً اور وہ بھی وقت پر ترجمہ کرتے تھے۔ اور اکثر زنانے لہجے میں بولتے تھے جو شریک جنگ ملک کے لیے بالکل مناسب نہیں تھا۔ پروگرام امریکہ والوں کے مذاق کے مطابق بنانے کی بہت کم کوشش کی جاتی تھی لیکن ڈنمارک پر حملے کے بعد ہی فرانسیسیوں نے اپنی ساری ریڈیو پالیسی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ گو ملکی پروگراموں میں کم ترقی کی گئی لیکن بیرونی نشریات خاص طور سے ہالینڈ پر حملے کے بعد بہت بہتر ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے سے لے کر شکست کھانے تک کے مختصر عرصہ میں فرانس نے پروگراموں کا ایسا سلسلہ پیش کیا جو امریکہ میں سنے جانے والے تمام نشریات سے زیادہ دلچسپ تھے۔ پروگراموں کے درمیان خبریں سنائی جاتی تھیں۔ چنگ و رباب کی بجائے فوجی بینڈ اکثر و بیشتر بجایا جاتا تھا اور امریکی سفیر اور پناہ گزیں اکثر تقریریں کرتے تھے۔ جمہوری ممالک میں پیرس موڈیل پہلی نشرگاہ تھی جو امریکی مقررین کو اپنے پروگراموں میں باقاعدہ جگہ دیتی رہی۔

اس اٹھارہ ماہ کی ریڈیائی جنگ پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ نازی ریڈیو نے وسیع تجربے، بہتر نظم و نسق اور زیادہ جاندار اور مفکرانہ پالیسی کے باوجود امریکی عوام پر برطانیہ سے کم اثر کیا۔ پہلے تو ریڈیو پروپیگنڈے کی فضا برطانیہ کو راس آئی ہے۔ گیلپ میں جو رائیں لی گئی تھیں اس کے مطابق ریاست ہائے متحدہ میں بہت زیادہ لوگ برطانیہ کے ہمدرد نکلے۔ وہ لوگ عموماً اس خیال کے حامی تھے کہ اقتصادی، فوجی اور تمدنی نظریات کے علاوہ مفاد بھی متوازی اور اکثر ایک ہی ہے۔ قدرتاً ہر شخص اپنے ساتھی دار اور دوست کی بات زیادہ ہمدردی سے سنے گا نہ کہ اس کی جو تجارت میں اس کا حریف اور ساتھ ہی دشمن بھی ہو۔ برطانیہ میں مسٹر ونسٹن چرچل ایسے مقرر ہیں جن کی بڑا اعتماد جیتے تلے اور مردوں طرز ادا

کا جس میں جا بجا طنز اور بذلہ سنجی جھلکتی رہتی ہے کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بنیادی حقائق ایسے ہیں جو امریکہ کے سننے والوں کو جرمن مفاد کے علمبرداروں سے پہلے ہی سے بدظن کر دیتے ہیں۔ گزشتہ جنگ میں جرمنی نے بلجیم پر جو دست درازی کی اور آبدوزوں اور زہریلی گیس کا استعمال کیا اسے وہ کبھی نہیں جھٹلا سکتا۔ اسی طرح وہ جو کچھ یہودیوں پر کر رہا ہے اور کرنے والا ہے یا جس بے دردی سے اس نے روٹرڈم کو برباد کیا ہے۔ اسے گانے کے طاقتنے یا دہلانے والی باتیں کسی طرح دور نہیں کرسکتیں۔

دوسرے ریڈیو سننے والوں کا معاملہ ہے یہاں بھی برطانیہ کو برتری حاصل ہے۔ منتشر امداد و شمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امریکی سننے والوں میں دس پندرہ فی صدی سے زیادہ یورپ کی شارٹ ویو نشریات کو نہیں سنتے۔ اطالوی یا جرمن شارٹ ویو نشریات سننے والے بیشتر یا تو نوآبادیں یا جن کی امریکہ میں پہلی پشت ہے۔ حقیقتاً اس موضوع میں دلچسپی لینے والوں میں بہتوں کا خیال ہے کہ نازی اور فاشستی ریڈیو کا خاص مقصد یہ ہے کہ ان جماعتوں سے عقیدت پیدا کی جائے یا اسے قائم رکھا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہمدردوں اور پانچویں کالم والوں کی رہبری کی جائے تاکہ وہ ملک میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرسکیں۔ امریکی عوام میں ایسے سننے والوں کا تناسب بہت کم رہا۔ اس کے برخلاف بہت سے برطانوی پروگرام امریکہ میں دوبارہ نشر کیے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے آخر تک اٹھاسی امریکی نشرگاہیں بی۔ بی۔ سی کی خبریں نشر کرنے لگی تھیں اور امریکہ ایک خاص سلسلہ نشریات باہمی تو انہیں پھر سے سناتا تھا اور مسائل حاضرہ پر تقریریں بھی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کناڈا کی نشرگاہوں کو ریاست ہائے متحدہ میں اکثر جگہ اچھی طرح سنا جاسکتا تھا اور وہ لندن کے نشریات کو مفصل پیش کرتی تھیں مزید براں جنگ پر ان کے اپنے خیالات برطانیہ ہی کی طرح ہوتے تھے۔ کناڈا کے ریڈیو کے اس بیش بہا وسیلۂ گفتگو کا جرمن مقابلہ نہیں کرسکتے۔

ایک اور فوقیت جو برطانوی ریڈیو کو جرمنی پر حاصل ہے وہ اس کی راست بازی ہے۔ اطالوی اور جرمن نشریات میں عموماً واضح طور پر غلط تصویر پیش کی جاتی ہے اور غلط بیانی یا سراسر جھوٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر بی۔ بی۔ سی سچ سے کبھی نہیں ہٹتا۔ بی۔ بی۔ سی البتہ اکثر پوری حقیقت نہیں بیان کرتا یا بعض خبریں دیر میں سناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سچ کی تلاش میں اسے دیر لگ جاتی ہے۔ ہمیشہ اس کی نشریات میں بہت زیادہ

سچائی سے کام لیا گیا ہے۔ جرمن اور برطانوی ریڈیو ان وکیلوں کی طرح ہیں جن میں ایک تو شہادت بناتا ہے اور دوسرا اخلاق سوز حرکتوں سے محترز رہ کر اپنے موکل کا مقدمہ بہتر سے بہتر تیار کرتا ہے۔ اس بات کا کافی ثبوت موجود ہے کہ امریکہ میں سننے والے برطانوی خبروں پر جرمن خبروں سے زیادہ یقین کرتے ہیں اور بی بی سی کے اسی رویے سے امریکیوں کو اس کی خبروں پر زیادہ اعتماد ہو گیا اور انھیں پروپیگنڈے کا جو خوف گھیرے ہوئے تھا وہ قطعاً دور ہو گیا۔

پروپیگنڈے کا یہ تصور بھی آزاد خیالی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ شریک جنگ ملک کی ہر بات پروپیگنڈا قرار دے کر اس سے کان پھیر لینے کی ذہنیت بڑی حماقت ہے۔ اہم مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا یہ بات صحیح اور اپیل مناسب ہے یا نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے سینما میں جب تباہ کردہ کوونٹری کے منظر پیش کیے جاتے تھے تو طالب علم اسے پروپیگنڈا کہتے ہوئے اپنی نشستوں پر اچھلے پڑتے تھے ہمیں غلط فہمی کی وجہ سے سچ کو جھوٹ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ مفروضہ باتوں پر کام کرنا چاہیئے۔ (ترجمہ)

مترجمہ شفقت اللہ کرمانی بی اے (آنرز)

سائنس اور معاشرہ

موجودہ زمانہ کو عام طور پر سائنس کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس اگر انسانیت کے تمام شعبوں میں نہیں تو کم از کم اکثر میں اپنا اقتدار پوری طرح قایم کر چکی ہے۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ازمنۂ گزشتہ میں سماج کے پیچھے جو مقصدی طاقت تھی اس کا نام تھا مذہب یا توہمات، اصنام پرستی، اخلاقیات اور تصوف کا وسیع میدان یہ سب اس صنف میں شامل کیے جاتے ہیں لیکن صنعتی انقلاب نے ان سب کو بدل ڈالا۔ مذہب کو سائنس کے آگے جھکنا پڑا۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس طریقۂ فکر نے بڑی ترقی کی خصوصاً جب ڈاروِن، ہکسلے اور اسپنسر نے مذہبی اعتقادات کی بنیادوں کو کمزور کر کے دلیل کو اس کی جگہ پر پوری طرح مسلط کر دیا۔ اس زمانہ سے آج تک صنعتی ایجادات، فطرت کی تسخیر، حیاتیاتی اور انسانیاتی ترقیوں نے فاصلہ کو کم کر دیا، مجموعی پیداوار کو بڑھا دیا اور انسانیت کو اس کے "انسان نما بندر" ہونے کا یقین دلا کر اس کی ذہنی آزادی کو وسعت دی مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ سائنس نے مذہب کو اس کی مربیانہ سرپرستی سے جو وہ سماج کی کرتا رہا ہے بالکل خارج کر دیا۔ اس عقلیت پسندی سے متاثر ہو کر انسانی دماغ مستقبل کی پہنائیوں میں ڈوب کر کچھ حقایق کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ خیال پرستانہ کتابیں لکھی جاتی ہیں اور سنجیدہ آدمی طفلانہ پیشین گوئیوں میں مبتلا ہو کر معاشرہ کی ترقی اسی نہج پر قرار دیتے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کے پیچھے یہ اصول کار فرما ہے کہ جو طریقہ ہائے کار آج عمل پیرا ہیں وہ اصولاً آئندہ بھی بغیر روک ٹوک اسی طرح کام کرتے رہیں گے مختصر یہ ہے کہ معاشرہ کی ترقی کو ایک نئے "عہد سعادت" تک پہنچنے کے لیے راستہ مل جائے گا۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ معاشرہ کے ارتقا میں سائنس کسی طرح کی کوئی امداد نہیں کر سکی مگر یہ تصور تاریخی حیثیت سے بھی درست نہیں۔ یہ اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جو اس نام نہاد متمدن دور پیدا ہوا اور جس کو بے جا اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ تنگ نظریہ اس گروہ کا ادعا ہے جو بزعم خود اپنے آپ کو تعلیم یافتہ

سمجھتا ہے۔ حیرت انگیز سائنسی ایجادات یعنی سائنس کے ان شعبوں کی ترقیاں جو حقیقی معنوں میں سماج سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور انسان کی روزمرہ کی زندگی نے یہ تاریک ذہنیت کب پیدا کی ہے یہ تو یہ ہے کہ سائنس اور معاشرہ کی تاریخیں دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ سماجی ترقی میں سائنسی عنصر کے پیچھے بڑی طویل تاریخ ہے۔ تاریخ ہمیں اس قدیم زمانہ تک لے جاتی ہے جسے عموماً قبل از تاریخ کہا جاتا ہے۔ آگ کا انکشاف شاید سب سے بڑا سائنسی کارنامہ تھا۔ جانوروں کی پرداخت ترقی پاکر مینڈل کے نظریہ وراثت تک پہنچ گئی اور اسی طرح مویشی کی افزائش نسل کے نئے طریقے بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہیں کشتی بنانے کی ابتدائی کوششیں، ہتھیاروں کا رواج، مٹی کے برتنوں کا استعمال، مکانوں کی پہلے پہل تعمیر، قدیم انسان کا سردی اور گرمی سے بچنے کا احساس اور کوشش، کپڑوں کی ایجاد اور زراعت کا رواج، کھانا پکانے کے لیے آگ کا رفتہ رفتہ استعمال ـــــ یہ تمام مثالیں معاشرہ پر سائنس کے اثر کے سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور یہاں تک کہ یونانی اور لاطینی زمانہ بھی جاری رہا۔ جون اسٹریچی کے الفاظ میں: "قرون سابقہ کے ابتدائی کارنامے موقوف تھے اور ان میں اس طرح کی چیزیں شامل تھیں جیسے زمین کی کاشت کا رواج بعض جانوروں کا پالنا اور جہازوں کی ایجاد وغیرہ" اس نوع کی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مثلاً فن تحریر کی ایجاد اور ترقی، کاغذ کی ایجاد، سنار اور لوہار کے کاموں کی ابتدا، فن تعمیر کی حیرت انگیز ترقی جس کا اندازہ اسیریا کے محلات، اہرام مصر، شمالی ہند اور وسط افریقہ کی عبادت گاہوں سے آسانی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کے چھوٹے بڑے بے شمار ایجادات، انکشافات اور تجربات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سائنس ہمیشہ ان مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرتی رہی جس سے تنازع للبقا کے سلسلے میں دوچار ہونا پڑا۔ انسان کی یہ کوشش اپنی زندگی کا معیار بلند تر کرنے کے لیے ہوتی رہیں۔ یہ عمل قرون وسطیٰ میں بھی جاری رہا جیسا کہ بالخصوص صنعتی فنون اور جہازرانی کی ترقیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس طرح انسانی زندگی کی یہ دلفریب کہانی موجودہ زمانہ تک آپہنچتی ہے۔

کارل مارکس نے کہا تھا کہ "مادی زندگی میں پیداوار کا طریقہ عمومی پہلوؤں یعنی سماجی، سیاسی اور روحانی عوامل کو متعین کرتا ہے۔" دوسرے الفاظ میں تاریخ کا مادی تصور ہم کو یہ بتاتا ہے کہ تاریخ بہت

سے اسباب کا ایک پیچیدہ نتیجہ ہے جس میں اقتصادی یا صنعتی سب سے اہم ہے۔ اس اصول کو تسلیم کرکے اور اس موجودہ معاشرہ پر مطابق کرکے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صنعتی پیداوار کا طریقہ ہی معاشرہ کا جائز متعین کرکے اس کے مستقبل کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ معاشرہ کا واحد اور سب سے بڑا کارنامہ پیداوار کا بدلا ہوا طریقہ ہے جو صنعتی انقلاب کی وجہ سے وجود میں آیا۔ اس طرح ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آج معاشرہ اور سائنس کا تانا بانا کس طرح ایک ساتھ ملا ہوا ہے۔ اگر سادہ الفاظ میں صنعتی انقلاب کی تعریف کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نام ہے صنعتی پیداوار میں سائنسی طریقوں کے استعمال کرنے کا۔ ان سائنسی ایجادات ہی کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ صنعتی پیداوار کے سلسلے میں تقسیم کار کا ٹھیک ٹھیک لحاظ رکھا جائے۔ اور اس کا نتیجہ ایک زبردست صنعتی پیداوار کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دنیا میں ہر قسم اور ہر رنگ کی چیزیں پھیل کر عام ہو گئیں۔ اشیاء کی مقدار میں اضافہ ہو جانے سے ان کی قیمتیں گھٹ گئیں۔ یہ طریق عمل پیچیدہ اور طولانی سا تھا مگر اس کا عمومی اثر یہ ہوا کہ ہمارا معیار زندگی ایسا بڑھ گیا کہ کسی دوسرے زمانہ میں اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی نت نئے تکلفات سیلاب کی طرح اُمنڈ آئے اور پرانے تعیشات اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور جہاں تک صنعتی ممالک کا تعلق ہے اس میں متوسط اور مزدور طبقہ کا معیار زندگی بدل گیا بلکہ پرانے خیالات کی قدروں میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ہمارے خیالات تیزی سے بدل رہے ہیں یہاں تک کہ کل کے خوابوں کی آج تعبیر کرنا بھی آسان نہیں۔ نوع انسان بلند سے بلند تر معیار کی طرف جا رہی ہے اور وہ چیز جس نے اس عظیم الشان کارگہ ترقی کو چلایا اور اب بھی چلا رہی ہے وہ سائنسی اختراع کی کرشمہ سازی ہے جو صنعتوں میں برابر مشین کا استعمال کیا جا رہا ہے اور پیداوار میں انسانی عنصر رفتہ رفتہ برائے نام رہ گیا ہے۔ اسی سے ہمارے متمدن دور کا یہ اہم مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہمارے کام کی وہ دلکشی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ سائنس نے نہ صرف صنعت و حرفت کو مشینوں کے پھیلے ہوئے جال میں جکڑ دیا بلکہ اس کی کوشش انسان کو بھی میکانکی بنا دینا ہے۔

اس طرح سائنس نے معاشرہ کے پورے اساس کو بدل دیا۔ قرون وسطیٰ کی سماج کے آثار پر اس جدید سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پڑی جس طریقہ عمل سے یہ عہد تغیر پیدا ہوا اس کا نام صنعتی انقلاب ہے۔

اور یہ صنعتی انقلاب صرف ان چند سائنسی ایجادات کا نتیجہ ہے جنھوں نے اپنا اثر صنعتی پیداوار کے اصولوں پر ڈالا اس زمانہ سے سائنس برابر ترقی کر رہی ہے اور صنعت وحرفت میں ایسا انقلاب برپا ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ برابر نئی نئی تبدیلیوں سے ہو کر گزر رہا ہے۔ سرمایہ داری کو سائنس نے روشناس کیا اور یہ بھی پیداوار کے اصولوں میں سائنس کی روز افزوں اہمیت ہے جو ہمارے معاشرہ کی تشکیل کا مطالبہ کر رہی ہے پس سائنسی ایجادات کا جدید معاشرہ کے بنانے میں بھی پورا پورا ہاتھ ہے نئے سماجی نظام کی پیداوار میں بھی وہ اپنا اثر ڈال رہی ہیں صنعتی انقلاب کے دوران میں سائنسی اختراعات کو ایک بنا بنایا سماجی نظام اپنا کام کرنے کیلیے مل گیا جس کا نام سرمایہ داری ہے اگرچہ سماجی ترقی اس پرانے سماجی نظام کو بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے جس طرح کہ صنعتی انقلاب کے زمانہ میں ہوا لیکن پھر بھی نئی چیزوں میں ہم آہنگی قایم رکھنے کے لیے ایک معاشرتی سلسلہ اب بھی قایم ہے۔ البتہ اس میں فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری کو خوش آیند سمجھ کر عام طور پر قبول کر لیا گیا اور اشتراکیت کی آج بڑی سخت مخالفت کی جا رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی کبھی بھی یہ کوشش نہیں تھی کہ پرانے راستہ سے قطعی طور پر علیحدگی اختیار کر لی جائے مگر برخلاف اس کے اشتراکیت سرمایہ دارانہ سماج کو جڑ بنیاد سے پھینک دینا چاہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیلیاں ایک زبردست اندرونی کشمکش کے خارجی اثرات ہیں۔ یہ کشمکش ایک حرکیاتی قوت کی ہے سکونیاتی معاشرہ میں سائنسی ایجادات سیلاب کے بہاؤ کی طرح بڑھتے چلے آتے ہیں۔ معاشرتی ڈھانچہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش رہتا ہے اور پھر ایک بارگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ سائنس نے صنعت وحرفت کے اصولی پہلوؤں کا نئے سرے سے چولا بدل ڈالا اور اس طرح گویا معاشرہ کے اساسی عنصر میں تبدیلی رونما ہوئی بلکہ اس کا کام معاشرہ پر خبررسانی اور جنگ کے ضمن میں بھی اثر انداز ہوا۔ خبررسانی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس نے دو مختلف قسم کے نتائج پیدا کیے ہیں۔ سائنسی تحقیقات کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ مرکز گریز نتیجہ پیدا کیا اور دوسرا اس کے بالکل برعکس مائل بہ مرکز۔ بھاپ کی ایجاد کے بعد دخانی انجن نے نقل وحمل میں سب سے بڑی تبدیلی پیدا کر دی کیونکہ اسی کی وجہ سے موٹر اور ہوائی جہاز وجود میں آئے اور سمندر کی موٹر کو بھی اسی میں شمار کرنا چاہیئے۔ موٹر اور ہوائی حرکیات کی انجینیری کی غیر معمولی ترقی اور اسی کے ساتھ ساتھ مختلف دھاتوں اور ہوائی حرکیات

کی ایجادوں اور کام نے وقت اور رفتار کے تمام نظریے بدل ڈالے ہیں۔ ہوائی جہاز نے دنیا کے اس وسیع کرہ کی لمبائی کو سمیٹ کر مختصر کر دیا۔ مولیس، کنگز فورڈ اسمتھ اور اسکاٹ کی پروازوں نے زمین کے بہت سے خطوں کا کھوج نکالا ہے جو مہذب دنیا سے الگ تھلگ تھے۔ پوسٹ اور گیٹی کی دنیا کے گرد پروازوں نے تمام کرہ کی ہوا بازی کے اور اسی طرح روسی قطب کی پروازوں نے لمبے فاصلہ کی ہوا بازی کے امکانات زیادہ وسیع کر دیے ہیں۔

ہوائی جہاز سے بھی زیادہ اہم موٹر ہے کیونکہ ہوائی جہاز ابھی تک دولت مندوں کا کھلونا ہے لیکن فورڈ نے موٹر کو متوسط طبقے تک پہنچا دیا ہے۔ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اس کے نتائج غیر معمولی طور پر دور رس ثابت ہوئے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر طرح کے فاصلے کم ہو گئے۔ اس طرح اگر تمام نہیں تو کم از کم آپس کے اکثر جھوٹے شبہات رفع ہو کر مختلف اقوام کا رشتۂ اتحاد اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اس طرح کے رابطۂ محبت بڑھ جانے سے بین الاقوامی اخوت کے مواقع اور زیادہ بڑھ گئے۔ سفر کے سستا اور مختصر ہو جانے کے باعث انسان کو جرأت ہوئی کہ وہ تمام دنیا میں جائے اور ان ملکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جنہیں وہ صرف عالم خواب میں دیکھتا تھا۔

جبکہ ہوائی جہاز، موٹر اور دریائی موٹر ہمیں اپنے گھروں سے باہر جانے کی دعوت دیتے ہیں، ریڈیو گرافون اور متحرک فلم ہمیں ترغیب دیتے ہیں کہ ہم ان سے زیادہ دور نہ رہیں صحیح معنوں میں ریڈیو اور گراموفون نے "دنیا کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے" جیسا کہ جولین ہکسلے نے کہا ہے۔ اس دس لاکھ آوازوں کے گانے والے تار نے سیاستداں اور موسیقار، استاد اور مبلغ کی آوازوں کو محض ایک لکھے ہوئے بیان کے بجائے ان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے ہمیں موقع دیا کہ ہم نغمہ و سرود کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوں۔ جو سیکڑوں اور ہزاروں میل کے فاصلہ پر برپا ہیں۔ اسی نوع کا اثر گراموفون کا بھی ہے۔ ریڈیو اور گراموفون سے ہم صرف سن سکتے ہیں مگر سینما ہمیں دیکھنے کا بھی موقع دیتا ہے اور یہاں تک کہ بعض مصنفین کی بلند پروازی اس میں سونگھنے اور محسوس کرنے کے امکانات بھی تلاش کر رہی ہے۔

اس سائنسی ایجادات کے اجتماعی اثرات بہت مختلف النوع اور دور رس ہوئے۔ مجموعی طور پر یہ

کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نئی موسیقی، لطف اندوزی کے نئے خیالات اور مختصر یہ کہ ایک نئی ذہنیت پیدا کی ہے۔ یہ نئی موسیقی ریڈیو گراموفون اور ناطق فلم کے ذریعہ سے عالم وجود میں آئی ہے۔ نئی موسیقی کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلی چیز جس کا لحاظ ہمیں رکھنا ہے وہ یہ کہ اس کے ذرائع اظہار عالمگیر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ عالمگیر دلچسپی کی رعایت سے بنی ہے اور تیسرے یہ کہ دنیا کے بیشتر حصوں کے عوام عموماً ادنیٰ درجہ کا جمالیاتی ذوق رکھتے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ سینما اور ریڈیو کی قسم کے بہت سے موسیقیاتی کھیلوں کا اصلی مقصد روپیہ کا انبار پیدا کرنا ہے اور اسی سے وہ جدید موسیقی وجود میں آئی جسے جاز کہتے ہیں۔ ہالڈس ہکسلے لکھتا ہے۔ "تاثرات ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں لیکن ان کا فن کارانہ اظہار ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں مختلف ہوتا رہتا ہے جس طرح فاصلہ کی دوری اس کو علیحدہ کر دیتی ہے اسی طرح وقت کی دوری بھی۔" بجائے خود یہ واقعہ کہ جاز تمام اقوام کے سامعین کے لیے بنایا گیا ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی باریکی اور نازک خیالی کی گنجائش نہیں۔ یہاں اتنا کہہ دینا ضرور ہے کہ چونکہ جدید جاز امریکی پیداوار ہے لہذا جاز کی نازک خیالی بھی امریکی ہوگی جو ایک جاپانی یا ہندوستانی کی سمجھ سے باہر ہوگی۔ اس طرح اگر جاز کے سُروں کی ترتیب تال کے لحاظ سے دیکھی جائے تو اس آواز "ٹم ٹم ٹم ٹم" کی طرح نکلتی ہے اور یہ موسیقی کا ایسا ساز ہے جو تمام ملکوں میں مشترک ہے خواہ ان میں گانے کا رواج کتنا ہی کم کیوں نہ ہو جاز موسیقی کے بہت ابتدائی اثرات کے لیے تسکین بخش ثابت ہو سکتی ہے جو تمام انسانوں میں مشترک پائے جاتے ہیں۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جدید جاز کی بدآوازی اور بے آہنگی کے دو اسباب ہیں اول سائنسی ایجادات کی بدولت عالمی بازار کا لحاظ ثانیاً ایک ایسے باجہ کی ایجاد جو موسیقی کو اس طرح تقسیم کر دے کہ اس کو عالمگیر طور پر سمجھا اور لطف اٹھایا جا سکے۔ گراموفون اور ریڈیو نے جاز کو عام مقبولیت بخشی ہے اور اب یہی کام سینما بھی کر رہا ہے۔ موسیقی فلم بنائے جانے کے بعد یہ دلچسپ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اس جدید جاز کو بغیر ناچ کے پس منظر کے سمجھنا دشوار ہے۔ سینما کے معاشرتی اثرات میں سے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس نے لطف اندوزی کا ایک نیا معیار اور ایک نیا صناعانہ رنگ پیدا کیا ہے۔ وہی دو اثرات جن کے باعث جاز کا وجود عمل میں آیا — عالمی بازار کا لحاظ اور عالمگیر لطف اندوزی — انھیں نے فلمی فن کاری کو بھی موجودہ صورت بخشی ہے محض یہ لحاظ کہ ہالی وڈ اور اسٹری

میں جو فلم بنایا جائے وہ بھی اپنی اشاعت میں اتنی ہی وسعت اختیار کرے جتنی کہ مغربی تہذیب۔ اس بات پر مجبور کرتا ہو کہ اداکاروں اور سینمائی ساز و سامان پر بے اندازہ روپیہ صرف کیا جائے۔ اس مصروف، پریشان اور شکی ہوئی دنیا میں سینما زندگی کے لیے بڑی تسکین ہو۔ ہمارے متمدن معاشرہ میں اسی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوا اور اسی لیے وہ عالمگیر تفریح کا ذریعہ بن گیا ہو۔

اب تک ہم نے سائنسی کارنامہ کے اس حصہ پر گفتگو کی ہو جس نے انسانی معاشرہ کی یکجہتی میں امداد کی ہو۔ سائنس کا کارنامہ جنگ کے میدان عمل میں معاندانہ ذہنیت کا بھڑکا دینا ہو جس کا انجام قوموں کا الگ الگ ہوکر آپس میں دست و گریبان ہو جانا ہو۔

جنگ کے سلسلے میں سائنس کا سب سے پہلا کارنامہ جنگی ہولناکیوں کو آخری درجہ تک بڑھا دینا ہو سائنس کی مدد سے بنائے ہوئے جنگی اسلحہ کی تیزی اور موجودہ لڑائیوں میں زہریلی گیسوں کے استعمال نے نہ صرف سپاہی بلکہ شہری کی زندگی کو بھی خطرہ میں ڈال دیا ہو۔ جنگ کا دوسرا اگر سب سے بھیانک پہلو جنگ کی تباہ کاریاں ہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ آج کل کی جنگ میں نہ بم سے عمارتیں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہیں اور نہ زہریلی گیس جانوں کو ہلاک کر سکتی ہو۔ اصل یوں ہو کہ اب جنگ کا سارا رومان ختم ہو گیا ہو۔ بارود کی ایجاد نے جنگ سے انسانی عنصر کو خارج کر دیا اور سائنس نے جنگ کو میکانکی بنا دیا ——— یعنی ریاضیاتی قوتوں، صحیح توازن اور تناسب کا باہم ٹکرانا۔ آج کل کی جنگ سائنسداں اپنے دارالتجربہ میں اور ماہر اعداد و شمار اپنے محل میں لڑتا ہو۔ البتہ خاک و خون میں آلودہ ہونا اور مرنا سپاہی کا کام ہو۔ ان فوری نتائج کے علاوہ بھی سائنسی جنگ کے اثرات بہت دور تک پہنچتے ہیں جنگ تو ختم ہو جاتی ہو مگر ہمارے معاشرہ کو لاتعداد مصیبتیں اپنی پوری پوری زور آزمائیوں کے ساتھ گھیر لیتی ہیں جن میں سے ہر ایک جنگ سے زیادہ خطرناک ہو۔ مثلاً اقتصادی نظام کا درہم برہم ہونا، پیمانے لاکھوں جانبازوں کی بیکاری۔ انسانوں کا اندھا دھند جنون۔ ہاتھ پیر کٹ جانا، اعصابی کمزوریاں، بدمزاجی اور تقدیر پرستی۔

آج کل کی جنگ کے معاشرتی اثرات بھی نظرانداز کر دینے کے قابل نہیں تو انین بالکل اپنے ہاتھ میں سے لیے جاتے ہیں اور عام رواج سے بالکل مختلف حقوق و فرائض کا ایک انوکھا سیاہ قائم ہو جاتا ہو

جو سپاہی کا ایک اچھا شہری بننے نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ موجودہ طریقہ جنگ کی بربریت اسے انسانی زندگی کے لیے درشت اور سفاک بنا دیتی ہے۔ بندوق اس کے لیے صرف ہتھیار ہی نہیں بلکہ شعار بھی بن جاتی ہے۔ شاید انہیں اثرات نے متمدن معاشرتی زندگی میں لوٹ مار اور منظم تشدد کو اس کے مسلمہ عناصر میں شامل کر دیا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ہیبت ناک اثرات نفسیاتی ہیں۔ جنگ عظیم نے اعصابی کمزوری اور تربیوں سے دہشت انگیزی کی لاتعداد مثالیں پیش کی ہیں۔ کچھ افراد کا دماغی توازن اُلٹ دینے کے علاوہ جنگ کا عام نفسیاتی اثر بھی سب لڑنے والوں پر ضرور پڑتا ہے۔ بد مزاجی تقدیر پرستی اور تمام مسلمہ معیاروں کو الگ پھینک دینا اس نوع کے رجحانات اس سپاہی میں مزید پائے جائیں گے جو لڑائی سے تازہ واپس ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک طرح کی سراسیمگی اور بے چینی سماج پر حملہ کرکے اسے دبا لیتی ہے۔ جرایم میں اضافہ ہوتا ہے۔ فسادات بڑھتے ہیں اور عام اخلاقی معیار بالکل پست ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سائنسی جنگ نے امن پسندی کو ایک اہم مسئلہ بنا دیا ہے۔ مذہب امن پسندی اپنی ترویج کے لیے ایلڈوس ہکسلے، نارمن اینجل اور کینن شیپرڈ جیسے مختلف النوع مبلغین تلاش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امن پسندی کا مسلک ہر قسم اور ہر طبقہ کو اپنی جانب مائل کر رہا ہے۔ ہمیں اس کے صرف ایک پہلو پر گفتگو کرنا ہے یعنی یہ کہ سائنسداں کا طرز عمل لڑائی میں کیا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔

موجودہ صورت میں سائنسداں کا طرز عمل بالکل غیر تیقن ہے۔ اس نے اپنی تحقیق تو شروع کر دی مگر یہ قطعاً بھول گیا کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے مگر اس ذہنیت کو تبدیل کرنا ضرور ہے۔ سائنسداں پر ایک سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس کو اپنے میں سماجی شعور پیدا کرنا چاہیئے۔ معاشرہ کے ایک فرد کی حیثیت سے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے علم کا ناجائز استعمال نہ کرے۔ جہاں تک پیشہ کی نوعیت کا تعلق ہے اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ طب پوری طرح ثابت کر چکی ہے کہ پیشہ ورانہ کام اعلیٰ معیاری حالتوں میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک طریقہ جس سے سائنسداں جنگ کی ہولناکیوں کو کم کر سکتا ہے یہ ہے کہ وہ ان مسائل پر تحقیق کرنے سے انکار کر دے جس کا تعلق جنگ سے ہو۔ وہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنا کام کرنے میں اس کا افادی پہلو پیش نظر رکھے یا اپنی کسی ایجاد کو محفوظ کر لے یا بیک وقت اس کو دنیا کی جملہ اقوام کو دے دے یا سب

بہتر یہ کہ کسی زہریلی ایجاد کے ساتھ اس کے لیے تریاق بھی تلاش کرے اور دونوں ایجادات کا ساتھ ساتھ اعلان کر دے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بہت سے سائنسداں قومی دارالتجربوں میں خالص خون آشام تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اس کا سد باب آسانی سے بین الاقوامی سائنسدانوں کی ایک منظم جماعت کر سکتی ہے۔ وطن پرستی کا گمراہ کن تصور اکثر اس کا محرک ہوتا ہے اور اس نوع کی تحقیقات سے یہ جھوٹی امید بھی قائم کر لی جاتی ہے کہ اس کے اثرات انسانیت کے زخموں کے لیے مرہم کا کام کریں گے۔ اگر امن پسند سائنسداں افادی مقصد کو سامنے رکھ کر پروپیگنڈہ کریں تو اس نام نہاد وطن پرستی کا آسانی سے بھرم کھل جائے۔ دوسرے پہلو کے متعلق ذرا سی حقیقت شناسی سے کام لینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ متمدن امن پرستی اپنی جگہ ناقص ہے۔ ایلڈوس ہکسلے اسی مسئلہ کی ایک بیباکانہ تشریح پیش کرتا ہے کہ ہم اپنے دماغوں کے لیے تجریدی توجیہ، استعارہ اور تشبیہ کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں اور اس حقیقت سے بچتے ہیں جس کو صاف سمجھنے کی ہم کوشش نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اپنے ضمیر سے جھوٹ بولتے ہیں تاکہ ناواقفیت کا بہانہ تلاش کر سکیں۔ اصل یہ ہے کہ سائنسداں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سازش سے علیٰحدہ رکھے جس میں وہ اب پوری طرح شریک ہے۔ یہ فرض سائنس اور انسانی معاشرہ دونوں جانب سے اس پر عاید ہوتا ہے۔

مگر اس مقصد کے حصول میں بہت سی دشواریاں حائل ہیں۔ سائنسداں کو اس سیاسی اور معاشی نظام کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ایک خود مختار قوم کی ریاست میں رہتے ہوئے اس کے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اصول اور مطمح نظر کے مطابق کام کر سکے۔ اسے اپنے وطن کے مطالبات کی بھی تشفی کرنا ہوتی ہے۔ وہ ایک عجیب کش مکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قومی مجبوریاں سزایابی کا خوف اور سماج کی طعن و تشنیع اس کے اصول سے دوچار ہوتے ہیں اور بیشتر وہ سہل تر راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر سماجی حالات کو دیکھتے ہوئے روٹی کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی مجبوریاں کبھی کبھی اسے خون کے آنسو رلاتی ہیں مگر اس کا کام بہر صورت جاری ہی رہتا ہے جب تک جنگی تحقیقات میں پورا پورا مالی منافع موجود ہے کالج کے معمل سے ذہین سائنسدانوں کا سرکاری دارالتجربوں

میں آتے رہنا بند نہ ہوگا۔ سائنس چاہے اپنی سی کیسی ہی کوشش کرے معاشرہ اس کی ایک نہ چلنے دیگا
امن پسندی کا مسئلہ گویا اس طرح اب حقیقتاً صرف سماجی اور سیاسی ہو کر رہ گیا ہے جب تک ان
دونوں شعبوں میں پوری پوری تبدیلیاں نہ ہوں سائنس اپنی کسی طرح اندازی دکھانے سے قاصر رہیگی
سائنس اور معاشرہ کا تعلق صنعت و حرفت، رسل و رسائل اور جنگ کے پہلوؤں سے واضح کرنے
کے بعد ہمیں چند عام مشاہدات کو پیش کرنا باقی رہ جاتا ہے۔

سائنس معاشرہ کے جدید جوہرت پسند نظام کو ایک عالمگیر مقصد کی طرف لے جا رہی ہے۔ اگرچہ موجود
معاشرتی نظام سائنس کا پیدا کیا ہوا ہے مگر آنے والا معاشرہ جو اس کی تردید کرے گا اس کا باعث بھی اسی سائنس
کی انقلاب پسندی ہوگی۔ تاریخ تردیدات کا ایک طویل سلسلہ ہے اور ساری ترقی کا قانون بھی اسی انکاریت میں
مضمر ہے جسے ہیگل کے الفاظ میں تردید کی تردید کہہ سکتے ہیں۔ جدید معاشرہ کے حرفتی پہلو میں تبدیلی رونما ہو چلی
ہے۔ پرانا نظام نئے آنے والے دور کے لیے جگہ خالی کر رہا ہے جس میں سائنس اپنا پورا پورا کام کرتی رہی ہے
منطقی رو سے یہ دور تغیر پرسکون ہونا چاہیئے تھا مگر حقیقت میں نظر جو کچھ دیکھتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف
ہے۔ سائنس کو اگر تنہا رہنے دیا جاتا تو وہ اس معاشرتی تغیر میں اپنا کام کر جاتی لیکن تبدیلی کے اس بہتے چشمے
کو معاشرہ کا یہ سرکشانہ اور تاریخی طور پر غلط نظام جگہ جگہ روکتا رہتا ہے۔ سائنسی تفتیش سیاست کے اشاروں پر
چلتی ہے اور جو بے اندازہ روپیہ صحت عامہ کے لیے صرف کیا جانا چاہیئے تھا جنگی تحقیقات پر بہایا جا رہا ہے۔
معاشرہ کا اقتصادی نظام ان چیزوں اور آسائشوں کی مساویانہ تقسیم ہونے نہیں دیتا جو سائنس فراہم کرتی ہے
اور جن کے ذریعہ بنی نوع انسان کی صحت اور مسرت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

کسی سماج کا وحشی وجود جو پہلے اثر انداز ہوتا رہا ہے اور وہ سائنس جس کی ترقی سماج سے رکی ہے
ہمیں آخر یہ تلخ حقیقت یاد دلاتے ہیں کہ باوجود صدیوں کی کوشش کے انسانی زندگی میں وہ خصوصیات
پائی جاتی ہیں جنہیں ہم جس نے اس تاریخ کے اولیں دور سے منسوب کیا تھا ــــــ اب بھی پہلے کی طرح
زندگی غلیظ، وحشیانہ اور مختصر ہے؟ کیا یہی انسانی تاریخ کا مآل ہے؟ کیا اسی کے لیے بے شمار نسلوں نے
کام کیا اور ختم ہو گئیں؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مسئلہ کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ موجودہ سائنسی ایجادات کو عملی مسائل میں استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس سے انکار کی گنجایش نہیں کہ صنعتی اداروں نے سائنسی ایجادات کے حقوق محفوظ کرا لیے انھیں اپنے تک محدود کر رکھا ہے۔ میکانکی ایجادات اور کیمیاوی اجزا کے متعلق یہ کم از کم یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ سرمایہ کی کمی کے سبب سے سائنس سے بعض امور میں فائدہ اٹھانا ممکن نہیں مثلاً مکانوں کی ترتیب اور شہروں کے خاکہ میں کوئی نمایاں اصلاح یا اسی طرح کا کوئی اور مفید کام۔ اکثر ناگزیر برائیوں کی مجبوریاں مثلاً جنگی تحقیق جو صرف ذاتی منافع کی سرمایہ داری کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ صحت عامہ اور اسی نوع کے ضروری امور میں کافی خرچ کرنے نہیں دیتی۔ دوسرے یہ کہ روایت پرستی اور قدامت پسندی پہلے زمانہ کی طرح آج بھی ایسی بنیادی تبدیلیاں نہیں ہونے دیتی جس کا ہونا نہ صرف ضروری ہے بلکہ ممکن بھی ہے۔ تیسرے یہ کہ اگرچہ مخصوص معاشرتی مسائل کا مطالعہ سائنسی طور پر کیا جا رہا ہے۔ مگر معاشرتی متعلقات کے پورے ماحول کو ایک نئے سائنسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا اب بھی باقی ہے۔ عمرانی اور سماجی مسائل سائنسی تفتیش کے انتظار میں ہیں۔ چونکہ سائنسداں کا معاشرتی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا شاید اسی لیے اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہ دی جا سکی جس کا یہ محتاج ہے اور پھر یہ کہ قدامت پسند ہرگز نہیں چاہتے کہ پرانے خیالات میں کوئی تبدیلی کی جائے۔ یہاں تصور جتنا سائنس کا ہے اتنا ہی معاشرہ کا بھی ہے!

مقبول الرحمٰن ایم۔ اے

ہمارا معاشرہ اور اس کا اثر معاش پر

ہر ملک کے معاشرتی اور مذہبی اداروں نے تاریخ کے ہر دور میں اہل ملک کی معاشی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ترقی کے اس موجودہ دور میں مذہب اور سماج کے ان بندھنوں کو بہت کچھ توڑا جا سکا ہے مگر ہندوستان ابھی معاشی اور ذہنی ترقی کے اس معیار تک نہیں پہنچا ہے کہ جس میں مذہب اور سماج کی یہ بندشیں بالکل توڑ دی جاتی ہیں اور انسان اپنے قول و فعل میں کامل اختیار رکھتا ہے۔ تعلیم کی ترقی اور مغربی خیالات کی آمد سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان چیزوں کا بہت کم لحاظ کرتا ہے مگر اس کی تعداد اتنی کم ہے کہ یہ ہندوستان کے اصل ذہنی رجحان کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی اصل آبادی پر ابھی تک مذہبی اور رواجی خوش اعتقادیوں کا گہرا اثر ہے۔

ذات پات کی بندش۔ یہ ہماری سماجی زندگی کی ایک اہم خصوصیت ہے اور اس سے بڑے دور رس معاشی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی خواہ شریمد بھگوت گیتا کے مطابق سری کرشن جی نے اس تقسیم کی ابتدا کی ہو۔ یا جیمس مل کے مطابق یہ تقسیم عمل کی اہم ضرورت کا نتیجہ ہو یا پھر سینارٹ کے خیال میں قدیم آریائی اداروں کا ارتقا ہو جسے ہندوستان کے حالات نے موجودہ صورت بخشی۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح بھی ذاتوں کی تقسیم ہمارے معاشرہ کا ایک اہم جز بن گئی ہے اور ہماری زندگی پر اس قدر چھا گئی کہ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے الفاظ میں۔

"پیدائش ہی سے انسان کے معاشرتی اور گھریلو تعلقات ہمیشہ کے لیے معین ہو جاتے ہیں اور اسے اپنی ذات والوں کے طور طریقوں کے مطابق کھانا پینا، پہننا اور شادی بیاہ وغیرہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے"

اس طریقے سے بہت سے خاندانوں کا ایک خاص پیشہ اختیار کر لینا ایک ہی بزرگ کی اولاد ہونا اور تقریباً ایک ہی قسم کے مذہبی خیالات رکھنا مراد ہے۔

ذات پات کے طریقے نے ہندوستان میں اپنی انتہائی شکل اختیار کرلی ہر ذات کے علیحدہ پیشے بن گئے ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں جانا ناممکن ہوگیا۔ اس تقسیم نے اور تو اور مسلمانوں پر بھی اثر ڈالا۔ ان کے ہاں بھی خاندانی پیشے کو چھوڑ کر دوسرے پیشے اختیار کرلینا بڑے ننگ کا باعث سمجھا جانے لگا آج بھی خاندانی مراتب کا خیال ہندوستان میں لوگوں کی معاشی ترقی میں سدراہ بنتا ہے۔ ہندوستان کے بہت کم گھرانے ایسے ہوں گے جنھوں نے ان خیالات کو پس پشت ڈال رکھا ہے تعلیم یافتہ طبقہ چاہتا ہے کہ ان بندشوں کو توڑ دے مگر اسے بھی خاندان کے ننگ و ناموس کا خیال اور بزرگوں کا لحاظ ایسا کرنے سے روکے رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں بڑی خرابی یہ ہے کہ ہمارا روشن خیال طبقہ عوام کے ساتھ زیادہ راہ و رسم نہیں رکھتا۔ ان کی تمام سرگرمیاں اپنے ہی حلقے میں محدود رہتی ہیں جس کی وجہ سے عوام پر جدید ترقیات کا رنگ چڑھنے نہیں پاتا اس پر طرہ یہ کہ تعلیم کی رفتار بہت سست اور اس کی قیمت بہت گراں ہے۔ غریب عوام جو دو وقت کی روٹی بھی حاصل نہیں کرسکتے کیونکر اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں۔ ان حالات کے تحت ملک میں روشن خیالی پھیلے تو کیسے اور معاشی ترقی کا دور دورہ ہو تو کس طرح؟

موجودہ زمانے میں ہندوستان میں تین قسم کی ذاتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) پیشہ واری ذاتیں۔ یہ وہ ذاتیں ہیں جن کا تقسیم عمل کی ضرورت سے وجود ہوا۔ ان میں برہمن، کھتری اور ویش وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں چھوٹی چھوٹی صنعتی برادریاں جیسے سنار، بڑھئی، حجام، دھوبی اور کمہار وغیرہ بھی اسی تقسیم میں شامل ہیں۔

(۲) نسلی یا آبائی۔ یہ ذاتیں ہندوستان میں بہت سی ہیں بنگال کے چنڈیل اور راج بنسی، راجپوتانے اور پنجاب کے جاٹ گوجر وغیرہ نسلی امتیاز کی بدولت وجود میں آئیں۔

(۳) وہ ذاتیں جو مذہبی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوگئیں فرقہ واری ذاتیں کہلاتی ہیں بمبئی کے لنگایت اس تقسیم کی ایک اچھی مثال ہیں۔

یہ امر تو اب کسی تشریح کا محتاج نہیں کہ آج بھی ہمارے دیہات میں ذات پات کی تقسیم کا وجود ہے اگرچہ اس کے بندھن ڈھیلے ہو چلے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لوگوں کی معاشی زندگی پر اس تقسیم

کا کیا اثر ہوتا ہے۔

ذات پات کے طریقے کو سراسر برا بتانا بھی ٹھیک نہیں اس میں چند خوبیاں بھی ہیں۔ اول تو یہ کہ اس سے ایک طرح کی تقسیم عمل پیدا ہو جاتی ہے جس سے سوسائٹی میں کارکردگی اور نظم پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر شخص اپنی برادری کے ماحول میں اور اپنے والدین کی مدد سے بآسانی فنی مہارت حاصل کر لیتا ہے خاص کر قدیم زمانے میں جبکہ آج کل کی طرح کے قدیم کالج نہیں کھلے تھے اپنی ذات والوں کی مدد سے اپنے کام میں کوئی شخص نہ صرف ماہر ہو جاتا تھا بلکہ اپنے آبائی پیشوں کے ان رازہائے سربستہ سے بھی واقف ہو جاتا تھا جو قدیم سے سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پیشوں کے ذات میں محدود ہونے کی وجہ سے مسابقت کا دائرہ بھی محدود رہتا ہے اور مسابقت کی وہ خرابیاں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اس کی انتہائی صورت میں عام نظر آتی ہیں۔

باوجود ان تمام خوبیوں کے ذاتوں کی تقسیم معاشی حالات پر بڑا مضر اثر ڈالتی ہے اور خاص کر موجودہ دور میں اس کی خرابیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ مسٹر سی۔ پی فلپس اپنی کتاب علم تمدن میں لکھتے ہیں

معاشی آزادی کا مخالف اور معاشی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے میں کوئی طریقہ اس نظام ذات پات کی تقسیم سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا"

بڑی خرابی اس طریقے میں یہ ہے کہ ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے پیشے پر ہی زندگی گزارے۔ اگر یہ پیشہ اس کی طبیعت کے موافق ہوا تو خیر ورنہ زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اسی کام میں اچھا رہتا ہے جس کی اس میں صلاحیت ہو مگر اس طرح مجبور کرنے سے اس کی صلاحیت ابھرنے نہیں پاتی۔ وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے پیشوں میں اس کے لیے ترقی کا زیادہ موقع ہے مگر ذات پات کی بندشیں اسے ترقی سے روکے رکھتی ہیں اور یہ چیز معاشی پستی کا باعث ہوتی ہے۔

کاریگر ایک پیشے سے دوسرے پیشے میں نہیں جا سکتا اس لیے اپنا اصل بھی دوسرے پیشے میں منتقل نہیں کر سکتا اس طرح گویا محنت اور اصل کی نقل پذیری ناممکن ہو جاتی ہے۔

مزید براں ذاتوں کی تقسیم سے محنت کی رسد بھی محدود ہو جاتی ہے۔ رسد طلب کے بڑھنے

یا گھٹنے کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر کے راستے میں بھی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اصل محنت اور تنظیم۔ یہ تینوں عاملین پیدائش جن کی طریق پیمانہ کبیر میں ایک ساتھ ضرورت ہوتی ہے الگ الگ ذاتوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو یکجا کرنے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ ذات پات کی اس تقسیم کا جو ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تعلیم ذرائع آمدورفت اور انگریزی قانون کے اثر سے ذاتوں کی تقسیم کم ہونا شروع ہو گئی ہے اور ہم نے پوری تندہی اور دل سے کام کیا تو وہ دن دور نہیں جب ہم اپنی سوسائٹی کے دامن سے یہ بدنما دھبہ مٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ملک میں ذات پات کے بندھنوں کو ڈھیلا کرنے اور ان امتیازات کو فنا کر دینے کا ایک عام رجحان پایا جاتا ہے۔

مشترک خاندان۔ ذات پات کی طرح مشترک خاندان کا طریقہ بھی ہندوستان ہی کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ یورپ اور امریکہ میں ایک کنبہ میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے مگر ہندوستان میں خاندان کے دوسرے رشتہ دار بھی ساتھ رہتے ہیں۔ خاندان کا بزرگ تمام خاندان کی معاشی بہبود کا ذمہ دار اور گھر کا منتظم ہوتا ہے۔ گھر کی بڑی بوڑھی گھر کے کل اخراجات اور دوسرے کام کاج کی نگرانی کرتی ہے۔ کل افراد خاندان کی آمدنی مشترک طور پر خرچ ہوتی ہے۔ اس طرح رہنے سہنے سے ہمیں بہت سے معاشی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے۔ یتیم، بیوائیں، بیمار اور بوڑھے بھی پرورش پاتے ہیں سب آمدنی یکجا کر کے خرچ کرنے میں بھی کفایت رہتی ہے۔ کاروبار میں اہل خاندان سے ہر وقت صلاح مشورہ اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تقسیم اور انتشار اراضی کی مشکلات پیش نہیں آتیں کیونکہ مشترک جائداد میں کاشت بھی مشترک ہوتی ہے۔

مگر اس طریق میں سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے جس کی وجہ سے بہت سے کاہل لوگ مفت کی روٹیاں توڑا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر شخص پر خاندان کے کل افراد کی ذمہ داری ہوتی اور انفرادی اولوالعزمیوں کو اجاگر ہونے کا موقع نہیں ملتا اتنے بڑے خاندان

کا دباؤ اور روائی ذمہ داریاں اس کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتی ہیں اور اس کی طبیعت کے وہ جوہر جو جلا ہونے پر انسانیت کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ضائع ہو جاتے ہیں۔

گزرے ذات کی طرح۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ یہ طریقہ آج کل زوال پذیر ہے۔ یوں تو کہیں کہیں مشترک خاندان آج بھی نظر پڑ جاتے ہیں مگر وہ اپنی زندگی کے آخری دن پورے کر رہے ہیں۔ مشترک خاندان کا وہ پہلا سا نظام اب کہیں نظر نہیں آتا لیکن اس گئی گزری حالت میں بھی اس طریق کا اثر ہمارے معاشرے پر باقی ہے۔ آج بھی اکثر گھرانوں میں بیوی بچوں کے علاوہ کمسن بھائی، بیوہ بہنیں، بوڑھے والدین اور بعض قریبی رشتہ دار جن کا کوئی آسرا باقی نہیں رہا ہے پرورش پا رہے ہیں۔

مغربی خیالات، انفرادیت کے جدید تخیل اور قدیم پیشوں کی تباہی اور برطانوی سول قانون نے اس نظام کی جڑیں ہلا ڈالی ہیں۔ جائداد کے حصے بخرے ہو جانا اس لحاظ سے تو بہتر ہے کہ دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہونے نہیں پاتی بلکہ تقسیم ہو کر متوسط طبقے کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ مگر چھوٹے چھوٹے حصے ہونے کی وجہ سے کسی کے پاس بھی اس کی اتنی بڑی مقدار جمع نہیں ہونے پاتی کہ جس سے جدید طرز کے کاروبار پیمانۂ کبیر پر چلائے جا سکیں۔ لیکن اس خرابی کی اصلاح اس طرح ممکن ہے کہ ملک میں مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کے طریق کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔

غرض کہ مشترک خاندان کے نظام میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ مگر واضح رہے کہ یہ برائیاں اس قسم کی ہیں کہ اگر ان میں ترمیم یا اصلاح کر دی جائے تو پھر کسی قسم کا کھٹکا نہیں رہتا اور بقول مسٹر پریم ناتھ بنرجی کے

> "ایک ایسے ملک میں جہاں نہ تو حکومت اور نہ کوئی دوسرا ادارہ ہی معاشرے کے بناہ گزینوں یعنی بوڑھوں، غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی روزی کا سامان کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے مشترک خاندان کے ٹوٹ جانے سے بہت سی عملی مشکلات پیش آئیں گی۔"

دیہاتی برادریاں ـــــ ہندوستان کی ۵۰ و ۸۹ فی صدی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ نا انصافی

ہوگی اگر ہم گاؤں کے معاشی نظام کی اہمیت نظر انداز کر جائیں۔ آج سے نہیں صدہا برس سے ہماری دیہاتی زندگی برابر اپنی پرانی ڈگر پر چلی جا رہی ہے۔ نئے خیالات نئے رنگ اور نئے حالات آتے ہیں۔ دیہات کی ظاہری صورت پر بھی تھوڑا بہت مستقل یا غیر مستقل اثر ڈالتے ہیں۔ مگر دیہاتی نظم کی روح سدا برقرار رہتی ہے۔

الفنسٹن صاحب کی رائے ہے کہ دیہاتی برادریاں ریاست کے تمام لوازم کی حامل ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ہر گاؤں اپنی پنچایت کی مدد سے اپنے کل معاشی اور معاشرتی مسائل کا تصفیہ کر لیتا ہے۔ بہت کم ان دیہات والوں کو شہر کی عدالت میں جانے کی نوبت آتی ہے۔ ہر گاؤں میں زمیندار خواہ وہ حکومت ہو یا کوئی اور، اور کاشتکار کے دو اہم طبقے ہوتے ہیں۔ ان کی ضروریات کو پورا کرنے کیلیے چند دوسرے کاریگر مثلاً بڑھئی، لوہار، تیلی، جولاہے وغیرہ بھی گاؤں میں بستے ہیں۔ ان کو خدمات کے عوض غلہ دینے کا دستور رہا مگر اب نقد زر دیا جاتا ہے۔ آڑے وقت میں کاشتکاروں کی امداد کرنے والا ایک ساہوکار بھی ہوتا ہے جو ضرورت کے وقت ان کو قرض دیتا ہے اور پھر ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر دوگنا تگنا سود وصول کرتا ہے مگر آج کل بعض قوانین اور انجمن ہائے امداد باہمی کی بدولت اس خرابی کا سد باب کیا جا رہا ہے۔

گاؤں والے دنیا سے الگ تھلگ اپنی برادری میں مگن رہتے ہیں بیرونی دنیا سے ان کے تعلقات بہت کم اور رسمی ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات کے لیے خود کفیل ہوتے ہیں۔ اپنی ضروریات کی تمام چیزیں انھیں گاؤں ہی کے کاریگروں سے مل جاتی ہیں۔ گاؤں کے باہر کبھی کبھار صرف فصل فروخت کرنے کے لیے وہ جاتے ہیں ورنہ اکثر اپنی پیداوار دیہاتی ساہوکاروں کے ہاتھ یا گاؤں کی منڈی میں بیچ ڈالتے ہیں۔

گاؤں کے اس طریق بود و ماند کے گہرے معاشی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ اول تو یہ کہ دیہات کے سیدھے سادے نظام میں لوگوں کے مفاد ایک دوسرے سے بہت کم ٹکراتے ہیں مسابقت کی گرم بازاری نہیں ہونے پاتی جس کی وجہ سے آزاد مسابقت کی خرابیوں سے حفاظت رہتی ہے۔ محنت اور اس کے ساتھ اصل بھی گاؤں کی زمینوں میں مقید رہتا ہے جس سے کاشتکار ترقی کے بہت سے مواقع سے

محروم ہو جاتا ہے۔

گاؤں کے اکثر معاملات رواج کی مدد سے طے پاتے ہیں۔ مقابلے کی جگہ رواج کا زیادہ دوردورہ ہے۔ برطانوی حکومت کے آنے کے بعد مسابقت کا زیادہ زور شور ہوا اگر حکومت نے مسابقت کی خرابیوں کے مدنظر اسے بالکل فنا تو نہیں کیا البتہ محدود ضرور کر دیا ہے اور اب گاؤں سے لگان وصول کرنے میں اسی اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اجرت کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی رواج ہی کے مطابق معین ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں قیمتیں بھی رواج کے مطابق معین ہوتی تھیں مگر اب قانون طلب و رسد کے تحت ان کا تعین ہوتا ہے۔

آج کل دیہاتی نظام بھی رفتہ رفتہ بدل رہا ہے۔ ذرائع آمدورفت کی سہولتوں اور برطانوی قانون کی بدولت اس نظام پر سختی سے اب کہیں بھی عمل نہیں ہوتا۔ قرائن بتا رہے ہیں کہ ہندوستان کی معاشی زندگی میں انقلاب آنے والا ہے۔

ہماری سماج میں مذہب کو بڑی زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ذات پات کے بندھن، مشترک خاندان، اور نظام دیہ سب کے سب بری طرح مذہب سے متاثر ہوئے ہیں۔ مذہبیت ہمارے ہر روایتی نظام کا جزو لاینفک بلکہ روح رواں ہے۔ مذہب کے اس عمل دخل کو دیکھتے ہوئے ایک خیال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب ہماری معاشی پستی کا باعث ہے کیونکہ یہ معاشرے پر براہ راست اور معاشیں پر بالواسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ ملک کا نوجوان طبقہ اس خیال کا بڑی حد تک حامی ہے۔ مگر دراصل یہ مذہب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ مذہب ہماری معاشی حالت پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے مگر اس حد تک نہیں کہ معاشی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا اثر معاشی جدوجہد کرنے والوں میں دیانتداری اور راست بازی پیدا کرتا ہے جو معاملت میں کامیابی کی روح رواں ہیں۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مذہبی عقائد ہمارے ہاں ایسے ہیں جو ایک خاص قسم کی معاشی جدوجہد سے روکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ذات پات کی کڑی بندشیں ہی ہیں جن کا مفصل ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں بعض دوسرے اعتقادات بھی ہیں مثلاً بعض ہندو ذاتوں میں مچھلی ہڈی اور فضلے کا استعمال بطور کھاد کے ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ہاں گوشت کا بیوپار بھی معیوب ہے اسی طرح

مسلمانوں میں شراب کا پینا اور سود کا لین دین حرام ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانیوں میں اولوالعزمی کا فقدان ہے ورنہ کرنے کے لیے سیکڑوں کاروبار ہیں۔ بدقسمتی سے حکومت بھی ملک کی ترقی اور مفاد سے پوری ہمدردی نہیں رکھتی۔

یہ رکاوٹیں آج نئی نہیں ہیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے جب ہم قدیم ہندوستان کی مادی ترقی پر نظر ڈالتے ہیں یہی غربت اور افلاس کا مارا ہندوستان کسی زمانے میں دنیا کے نہایت دولت مند ملکوں شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کی صنعتوں نے یورپ کی منڈیوں پر قبضہ جما رکھا تھا اور اٹھارویں صدی تک ہندوستان کی تجارت یورپ کی تمام قوموں سے بڑھی ہوئی تھی آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی نئی صنعتی اور تجارتی تعمیر میں اہل ہنود میں مارواڑی اجینی اور بھاٹیہ اور مسلمانوں میں خوجے میمن اور بوہرے سب سے پیش پیش ہیں۔ حالانکہ مذہب کے معاملہ میں یہی لوگ سب سے زیادہ راسخ العقیدہ واقع ہوئے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ مذہب فی نفسہ معاشی ترقی کو نہیں روکتا اور واقعہ یہ ہے کہ ایک عام انسان کے لیے معاشی محرکات بھی اسی قدر طاقتور ہوتے ہیں جس قدر کہ مذہبی محرکات۔ دراصل ہندوستان کی اس معاشی پستی کے اسباب کچھ اور ہیں۔ دیسی حکومت کے برباد ہونے کے بعد ملک میں بدنظمی کا دور دورہ ہوگیا۔ انگریزی حکومت کی روش بھی شروع شروع میں حد درجہ غاصبانہ رہی۔ اپنے مفاد کی خاطر کمپنی نے ملک کی معاشی ترقیات میں انتہائی مشکلات پیدا کردیں۔ انیسویں صدی میں قحط اور وباؤں کا بھی دور دورہ رہا۔ غرض ان تمام حالات نے مل کر اہل ملک کے حوصلوں کو پست اور ان کے زاویہ نگاہ کو مایوسانہ بنا دیا۔ اسی قسم کی مایوسانہ کیفیت سائنس کے جدید دور کے شروع ہونے سے قبل یورپ پر بھی طاری ہو چکی ہے مگر سائنس کی مدد سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا۔

ہندوستان کی حالت بھی اب بدلنی شروع ہوگئی ہے۔ مغربی اثرات کے پڑنے سے یہاں بھی مذہبی اعتقادات کو نئے نئے معنی پہنائے جا رہے ہیں تعلیم کی ترقی بھی اگرچہ سست ہی سہی اس مایوسی کو کھلنے میں بہت کچھ کامیاب ہو چکی ہے مگر اب بھی بہت کام باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ

نہ صرف مردوں میں تعلیم عام کی جائے بلکہ علم کی روشنی مستورات میں بھی پھیلائی جائے کیونکہ مذہبی اور رواجی خوش اعتقادیاں اور تباہ کن رسوم اسی طبقے میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

نئے دور میں ہم کو ایک نئے نظام کی ضرورت ہو مگر ہم مغرب کی اندھی تقلید میں مشرق کی مقدس روایات کو ترک نہیں کریں گے۔ ہمارے نئے نظام میں نہ تو فرسودہ تمدن کے گلے سڑے اور معزت رساں عناصر ہوں گے اور نہ ہی مغرب کی انتہا سے بڑھی ہوئی مادیت۔ ہماری اس عظیم الشان کوشش سے ہی زندگی کی تمام خوبیاں وابستہ ہوں گی

آیتہ اللہ بیگ عارف

جان کیٹس کی زندگی

روما۔

پیازا دسا پنیا (میدان اسپانیا)۔

فروری ۱۸۲۱ء۔

ایک مکان کے معمولی کمرہ میں جس کا رخ میدان کی طرف ہے چوبیس سال کا ایک نوجوان لیٹا ہوا ہے جو ستم رسیدہ ہے، غمزدہ ہے اور ہر طرح کی کلفتیں اس کی آزمائش میں مصروف ہیں۔

وہ عزت و شہرت کا خواستگار رہا لیکن سوائے محرومی و ناکامی کے کچھ اس کے حصہ میں نہ آیا۔

وہ اگرچہ سبزہ آغاز تھا لیکن سل کا شکار رہا اس لیے وہ شباب کی ہلچل سے لطف اندوز نہ ہوسکا

وہ صحت کی دعائیں مانگ رہا تھا لیکن شومئی تقدیر سے شیشۂ دل کو چور کرنے والی محبت کا شکار ہوگیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ محبت کے تیروں نے اس کے مرض کو دوچند کر دیا اور زندگی کا جنازہ بالآخر قبرستان پہنچا دیا گیا۔ یہ جان کیٹس ہے۔

یہ اس شخص کا ذکر ہے جس کی زندگی کی آخری سانسیں روما میں منقطع ہوئیں جس کے چہرہ، ہاتھ اور زبان تینوں کا رنگ بدل گیا تھا، جو دوستوں سے مجبور تھا، ہم وطنوں سے دور تھا۔ غریب تھا اور علاج کے لیے محض طبیب کی شفقت کا سہارا... وہ عالم فانی سے رخصت ہوتا ہے اور حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک نہ اعزا و اقارب ہیں نہ کوئی دوست و غمگسار، مگر ہاں اگر کوئی ہے تو ایک جوانمرد جس نے اپنا وقت، اپنی آسایش، اپنی نیند غرض اپنا سب کچھ اس بدنصیب عبقری کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

مشہور انگریزی شاعر اور تنقید نگار رابرٹ برجیس نے لکھا ہے "اگر آج خدا مجھ کو اختیار دے کہ میں عالم بالا سے صرف ایک انگریزی شاعر کو بلا سکوں تاکہ وہ اپنے ناتمام اعمال کی تکمیل کرے تو میں انگلستان کا تاج انتخاب جان کیٹس کے سر پر رکھ دوں۔"

اس کے باوجود موت کے بہت دنوں بعد تک کیٹس تنقید نگاروں کا موضوعِ سخن بنا رہا۔ اس کی عبقریت ہر کس و ناکس کی ہدفِ ملامت تھی۔ دیکھئے؛ ٹامس ڈیکوینسی نے اس پر کتنی جگر خراش تنقید کی ہے: "کیٹس نے ہماری مادری زبان کو اس طرح کچلا کہ جس طرح عقل و خرد سے عاری ایک ہیبنس کسی زبان کو کچل ڈالے" اس کے ذکر کی ضرورت نہیں کہ آج تنقید نگاروں کے نزدیک کیٹس کی کیا عظمت ہے۔ انہوں نے صرف ڈیکوینسی کے خیال کے خلاف ہی نہیں کہا بلکہ آج کی تنقید نگاری کا اجماع ہے کہ وہ شیکسپیر اور ملٹن کے مرتبے سے کسی طرح کم نہ تھا اور اسے ان دونوں کے علاوہ اسلوبِ بیان اور فصاحت و بلاغت میں ہر شاعر سے بہت بلند قرار دیتے ہیں

---

۲۹ راکتوبر ۱۷۹۵ء کو کیٹس ایک متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی نو سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے والد ۱۸۰۴ء میں گھوڑے سے گرے اور مر گئے۔ اب اس کی ماں کے سر اس کی اور تینوں بھائیوں اور بہنوں کی تربیت عاید ہوئی۔ جارج سب سے بڑا بھائی تھا۔ ٹامس جان اس سے چھوٹا تھا اور ایک بہن ستی جو سب سے چھوٹی تھی۔ کیٹس کو باپ سے وراثۃً اس کا اخلاق، اس کے عادات اور اس کا رنگ روپ ملا تھا لیکن بدقسمتی سے ماں کی جانب سے سب سے زیادہ بدبخت وراثت ملی یعنی سل کا نامبارک مرض جس نے پچیس سال جیسی سرمست بہاریں بھی گذارنے کا موقع نہ دیا۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کی زندگی شروع سے نامراد اور اس کے اعضا کمزور اور قویٰ مضمحل تھے۔ یہ اس کی ایک غلط تصویر ہے جس کی اشاعت میں شیلی مدد و معاون ہوا۔ کیونکہ اس کی موت کے حادثے نے اس پر سخت جذباتی اثر کیا اور اسی کا تقاضا تھا کہ اس نے اس مضمون نگار پر سخت حملہ کیا ہے جس نے کیٹس کے قصیدہ پر سخت تنقید کی تھی اور اس کو کیٹس کا قاتل قرار دیا ہے۔ یہ دراصل اس خیال کی ترجمانی ہے کہ کیٹس کی موت کا باعث اس کی نظموں پر سخت ترین تنقیدیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کیٹس کی موت کا باعث سل کا مرض تھا۔ باوجودیکہ اس کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اتنا تندرست اور صحیح القویٰ تھا کہ بلا اوقات خون کی روانی سے

مجبور ہوکر اپنے دوستوں اور ہم سبقوں سے کشتی لڑنے لگتا تھا۔ کیٹس کی جسمانی طاقت، تندرستی، جسمانی ریاضت اور دوستوں سے لڑنا جھگڑنا ان ہی باتوں کا طفیل تھا کہ وہ جو کچھ چاہتا تھا منوا لیتا تھا۔ ان تمام خصوصیتوں کی بنا پر اس سے واقف کاروں کا خیال تھا کہ وہ ایک عظیم الشان مستقبل کا مالک ہوگا۔ لیکن "یہ پیشین گوئی میدان جنگ یا اور دوسرے میدانوں کے متعلق کی گئی تھی نہ کہ علم و ادب کے خطرناک منازل کے متعلق" یہ مشہور ادیب ہومز کا خیال ہو جو تعلیم کے زمانے میں اس کا دوست تھا۔

لیکن کیٹس کی طبیعت میں جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ قوت احساس اور جذبات و خیالات کا فطری عطیہ بھی موجود تھا جس سے اس کی حلاوت آمیز شاعری کا چشمہ اُبل پڑا کیونکہ اس کے جذبات کا یہ حال تھا کہ لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ابھی وہ بہت خوش اور بشاش ہوا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے اوپر کسی طرح کے غم کے آثار ہیں لیکن پھر دم بھر میں سخت غمگین ہوا اور آنکھوں سے حزن و ملال کا چشمہ جاری ہو۔ اس کے غم کا ایک واقعہ یہ مشہور ہو کہ جب اس کی والدہ کا سنہ ۱۸۱۰ء میں اچانک انتقال ہوگیا تو چند دنوں تک کیلیے وہ اپنے استاد کے کتب خانہ میں گھس گیا اور غم سے نڈھال ہوگیا۔ تمام دوستوں اور استادوں نے لاکھ تسلی دی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔

کیٹس کو مدرسہ میں ابھی بہت دن بھی نہیں گزرے تھے کہ جسمانی تندرستی اور کشتی وغیرہ کا شوق یکقلم موقوف ہوگیا اور اس کے بجائے مطالعہ اور تحصیل علم کی رغبت پیدا ہوگئی چنانچہ اس نے ادب کے تمام اوّل انعامات حاصل کرلیے۔ لہو ولعب کی تمام دلچسپیوں سے بالکل نفرت سی ہوگئی اور فرصت کے اوقات جسے دوسرے طلبا دلچسپیوں میں گزارتے تھے وہ ورجل اور دوکن کی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرنے میں صرف کرنے لگا۔ اس کے انہماک کا یہ حال تھا کہ اساتذہ کو مجبوراً کھیل کود کی تلقین کرنی پڑتی اور کمرے سے نکالنا پڑتا۔ لیکن وہ برابر اصرار کرتا کہ مجھے اپنے ہی کاموں میں مشغول رہنے دیجئے پر جب یہ راضی نہ ہوتے تو ہاتھ میں کتاب لے کر کمرے سے باہر چلا جاتا اور اس طرح استادوں کے حکم کی تعمیل اور اپنی خواہش دونوں ہی ہوجاتی۔ اس کمسنی کے زمانے میں لاطینی زبان سیکھ ڈالی ۔ اب تک باضابطہ یونانی پڑھنی شروع نہیں کی تھی لیکن پھر بھی یونانی زبان سے غافل نہیں ہوا بلکہ یونانی سے بھی کچھ کتابیں انگریزی میں ترجمہ کر ڈالیں۔ اس زمانے میں

روبنس کروزو کا قصہ پڑھا شیکسپیر کے فیض رساں چشمہ سے تشنگی بجھائی۔ اس کے مطالعہ اور خیالات میں غرق رہنے کی سب سے بڑی تصدیق اس کے اس قول سے ہوتی ہو جو اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تھا جو مدرسہ میں اس کا دوست تھا "میرا یقین ہو کہ کوئی شخص دو بجے رات کو کمرے میں تنہا بیٹھ کر مکبتھ کے مطالعہ کی جرأت نہیں کر سکتا۔

قبل ازیں کہ کیٹس اس مدرسہ (مدرسہ مسٹر کلارک) کی تعلیم ختم کرے اپنی آخری رشتہ دار اور مربی کی آغوش تربیت سے بھی چھوٹ گیا اور اب ان چاروں بھائیوں کی تربیت کی ذمہ داری ایک تاجر مسٹر ایبی نے اپنے ذمہ لی کیٹس کے پاس اب جو رقم تھی وہ کسی طرح آٹھ ہزار پونڈ سے زیادہ نہ تھی۔ جب ۱۸۱۰ء کی گرمیوں میں کیٹس نے مدرسہ کلارک چھوڑا (جبکہ اس کی عمر پندرہ سال کی ہو گی) اور طب کی تعلیم کی غرض سے اڈمنٹن کے ایک مشہور سرجن مسٹر ہامونڈ کے پاس بھیجا گیا۔ ظاہر ہو کہ تحصیل طب کی غرض سے بھیجنے کے لیے کیٹس سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ اگر اس سے مشورہ کیا جاتا تو وہ ادبی تعلیم کو طبعی مناسبت کی وجہ سے ترجیح دیتا اور بجائے انسانی اعضا کی تشریح پڑھنے کے اپنے اوقات نئی نظموں کی تیاریوں میں صرف کرتا۔

لیکن خوبی قسمت سے یہی ایک مبارک موقع تھا جب قضا و قدر نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ اس کے ساتھ نرمی و مہربانی اور رفق و محبت کا برتاؤ کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہو کہ باوجود اس کے کہ اس کا تعلق ادب سے منقطع ہو کر طب اور طبابت سے قایم ہو گیا تھا لیکن اڈمنٹن اور انفیلڈ میں کچھ زیادہ بعد نہ تھا اس لیے کیٹس کے تعلقات مسٹر کلارک کے خاندان سے باقی رہ گئے اور چارلز کاؤڈن کلارک (خلف مسٹر کلارک) اور کیٹس میں خوشگوار دوستی قایم ہو گئی گو کہ وہ عمر میں کیٹس سے چند سال بڑا تھا لیکن روحانی اور فکری صلاحیتوں میں اس کا ہم مشرب تھا اور جیسا کہ معلوم ہوتا ہو کہ چارلز کلارک کا مطالعہ بہت وسیع تھا کیٹس نے اس کی دوستی سے پورا فائدہ اٹھایا اور تاریخ کے سامنے اس کی عنایتوں کا اعتراف بھی کیا ہو چنانچہ ایک قطعہ میں لکھتا ہو جو اسی کے نام سے معنون ہو۔

ترجمہ:۔ آج ہی سے نہیں بلکہ مجھ کو بہت پہلے سے اعتراف ہو کہ تم ہی نے مجھے سب سے پہلے نغمہ کی تمام شیرینیوں سے آشنا کیا۔"

پھر وہ نغمات کی شیرینیوں کے سارے اقسام کو بیان کرتا ہے جن کا علم اس دوست کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔

ترجمہ:۔ ایسے اعلیٰ لذیذ نغمیں، رواں اور بلیغ نغمے جو ذکاوت احساس کے ساتھ ترقی کرتے ہیں اور جو عمدہ اور مسرور کن ہیں۔

پھر دیکھیے کہ کس طرح صرف چند الفاظ میں دو عظیم الشان شاعر اسپنسر اور ملٹن کے شاعرانہ اعجاز اور خوبیوں کو بیان کیا ہے۔

ترجمہ:۔ اسپنسر کے الفاظ جو بہت آسانی سے زبان پر رواں ہو جاتے ہیں، ایسے ہیں گویا گرمی کے زمانے میں سمندر پر چڑیاں اڑتی ہوں اور ملٹن کا طوفان اور ملٹن کی لطافتیں ایسی ہیں جیسے میکائیل زرہ پوش ہوں یا مقدس حوا کی نزاکتیں نظم میں آگئی ہوں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چارلز کلارک کو مطالعہ شاعری پر گہرا عبور حاصل تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے اس نوجوان شاعر کے ذہن میں دقت فکر اور احساس کا پائدار اثر چھوڑا نیز اس نے رزمیات کا بھی شوق پیدا کر دیا۔ چنانچہ کیٹس خود اسے مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ترجمہ:۔ تم نے بھی کلوز کی خوبصورتی کو بے نقاب کیا ہے اور محب وطن کو اس کا اہم فریضہ یاد دلایا ہے۔ الفرڈ کی طاقت قتل کی کمان، بر دٹس کا ہاتھ جس نے ظالم کا ہاتھ کچل ڈالا۔ ان سب کی یاد پھر سے تازہ کر دی ہے۔

پھر اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنے دوست کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

ترجمہ:۔ اگر میں نے تم کو دیکھا نہ ہوتا یا تمہاری مہربانیوں سے ناآشنا رہتا تو میں کیا ہو سکتا تھا!؟

اس درجہ تک کیٹس اپنے دوست کا مداح تھا، بلا شبہ اگر الفت کا رشتہ قایم نہ ہوتا تو کیٹس ہرگز انگریزی اور یونانی ادب سے سیراب نہ ہو سکتا اور انگریزی زبان میں ایک قیمتی جوہر کا اضافہ نہ ہوتا۔

اس معاملہ میں کیٹس کی حالت بالکل شیکسپیر کی سی ہے۔ اس کا ادبی تبحر درسی تعلیم کا نتیجہ نہ تھا بلکہ محض اتفاقیہ

تعلقات کے فیض کا اثر تھا کیونکہ کیٹس نے اپنی ادبی تعلیم چارلز کلارک سے حاصل کی۔ اسی طرح اس نے بہت کچھ علم اپنے مشہور ادیب اور سیاست داں دوست لی ہنٹ سے بھی حاصل کیا جبکہ وہ جنگلوں کی سیاحت کرتا تھا اور اُنھیں خوشگوار مناظر اور سکون کے دلآویز لمحات میسر آتے تھے۔

کیٹس ایڈمنٹن میں ڈاکٹری کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۱۵ء میں لندن کے ایک شفاخانہ میں مشق کی غرض سے منتقل ہو گیا۔ آئندہ سال لی ہنٹ سے تعلقات کا غنیمت موقع ہاتھ آگیا۔ تعارف کا ہونا تھا کہ دونوں میں گہرے تعلقات قایم ہو گئے جو دوستی کی حد سے گزر کر عزت و احترام کی حد تک پہنچ گئے۔ وفاداری اور محبت کا ہدیہ شاعر کی طرف سے پیش کیا گیا اور قدر شناسی کا انعام آزاد خیال ادیب کی جانب سے۔ اسی صداقت اور خلوص کے گہوارے سے شاعری کا وہ چشمہ پیدا ہو گیا جس کی حلاوت سے آج انگریزی کا مطالعہ کرنے والا ہر فرد لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک سال سے پہلے ہی عالم ادب میں کیٹس کا پہلا دیوان شائع ہوا جس کے ابتدا میں پہلی نظم کے اندر لی ہنٹ کی محبت اور اخلاص کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور دیوان کو لی ہنٹ کے نام سے معنون کیا گیا تھا۔ چنانچہ بسلسلہ انتساب وتمہید یہ ایک قصیدہ میں لکھا ہے۔

ترجمہ:- مگر اب تک وہ پُر کیف مسرتیں باقی ہیں اور میں اس بنا پر ہمیشہ اپنی قسمت پر ناز کروں گا کہ آپ جیسے انسان کی خدمت میں یہ حقیر ہدیہ پیش کر کے آپ کا سپاس گزار بن سکتا ہوں۔

شومیٔ قسمت اس کی طالب تھی کہ اس دیوان کو ذرہ برابر کامیابی نہ نصیب ہو چنانچہ کسی پڑھنے والے نے نہ تو اس کو خریدا اور نہ ہی اس کو پسند کیا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا رنج تھا کہ جس نے مجد و شرف کے متلاشی نوجوان پر بہت اثر کیا لیکن جب اس خراج تحسین کا جو خاص دوستوں اور ممتاز ادبا کی طرف سے پیش کیا گیا تھا جمہور عوام اور علم پڑھنے والوں سے مقابلہ کرتا تو وہ مجبور رہتا کہ اس ناکامی کی ذمہ داری غریب ناشر کے سر ڈال دے چنانچہ اس واقعہ کی بنا پر کیٹس کے تعلقات مسٹر اولیر جو خود بھی ایک نوجوان ادیب اور شاعر تھے اور جنھوں نے کیٹس کی شاعری سے متاثر ہو کر دیوان شائع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی منقطع ہو گئے۔

پہلا دیوان مارچ ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا لیکن اس کی عدم مقبولیت کا یہ اثر نہیں ہوا اور نہ ہونا چاہیئے تھا کہ کیٹس شاعری کا راستہ ہی ترک کر دے بلکہ اس کے برخلاف اسی سال اس نے اپنا مشہور مرثیہ "اینڈیمیان" نظم کرنا شروع کر دیا جو ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا جبکہ وہ ایک ڈرامہ "ریزا بیلا" مرتب کر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ انگلستان کی جھیلوں اور اسکاٹ لینڈ کی سیر کو روانہ ہو گیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹری کے پیشہ کو قطعاً ہاتھ نہیں لگائے گا حالانکہ اس کو کسی آپریشن میں اب تک ناکامی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کو ہر آن یہ خوف لگا رہتا تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی آپریشن میں غلطی ہو گئی تو ایک بے گناہ کا خون ہو گا اور اس کا سارا عذاب اس کے سر عاید ہو گا۔ بلاشبہ اس خوف کے پیدا کرنے میں کیٹس کی قوتِ تخیل کو بہت زیادہ دخل تھا جس کے اثر سے متاثر ہو کر اس نے اپنے رزق کے وسیلہ کو ترک کر دیا اور محض قوتِ یومیہ پر زندگی گزارنے لگا جس نے اس کی زندگی کو آزمائشوں میں مبتلا کر دیا اور اس کے دوستوں کا یہ حال کہ روپے کی چار اٹھنیاں بنا رہے تھے۔

کیٹس نے انگلستان کی جھیلوں کی سیاحت اس غرض سے شروع کی تھی تاکہ اس کی صحت سنبھل جائے کیونکہ اب اس پر ضعف اور مرض کے آثار نمودار ہونے لگے تھے لیکن زیادہ دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ اس کے حلق میں سوزش شروع ہو گئی اور لندن واپس آنا پڑا۔ اگست اور ستمبر میں رسالہ "کوارٹرلی" اور "بلیک وڈ" میں "اینڈیمیان" پر دو تنقیدی مضامین شائع ہوئے اس تنقید کا مقصد کیٹس سے سیاسی انتقام لینا تھا کیونکہ اس کتاب میں لی ہینٹ کی تعریف کی گئی تھی اور جیل سے رہائی کے موقع پر ایک تہنیت کا قصیدہ لکھا تھا جو اسی کتاب میں شریکِ اشاعت تھا۔ اس کی قید سخت سیاسی کش مکشوں اور باہمی تشاجر کا نتیجہ تھا۔

میں نے اس سے قبل اس غلط فہمی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ خیال محض غلط ہے کہ ان دونوں مضامین نے کیٹس کے غم کو بڑھا دیا جس کا حسرت ناک انجام بہت جلد نمودار ہوا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ شائع شدہ دیوان پر اتنا غم اس لیے نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کی امیدوں کا مرکز اب زیرِ تصنیف نئی کتاب تھی اگر شیلی نے مرحوم دوست کی الفت اور اس کی جدائی کے جگر خراش صدمے کی بنا پر اور اگر بائرن ایک شاعر کی موت سے متاثر ہونے کے سبب اور دوسری طرف عبقریت سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھے

کہ اس کی موت درحقیقت ان ہی مضامین کا نتیجہ تھی تو دوسری طرف ایک تاریخی دستاویز بھی ہے جس نے حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے اور کیٹس کی پیشانی سے بزدلی کا یہ داغ مٹا دیا کہ سخت تنقیدوں کے تیر سے زخمی ہوا اور جانبر نہ ہو سکا چنانچہ ۹ راکتوبر ۱۸۱۸ء کو جو خط ناشر کتاب ہیسی کو لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے موثر پیغام کی کامیابی کا کتنا یقین تھا نیز ان تجربوں، ناکامیوں اور پھر کامیابی کی جد وجہد کس مبارک انجام کا پیغام لائے گی۔

"میں نے اپنی طاقت کا خوب اندازہ کر لیا ہے کہ مجھ میں کیا نقائص اور کیا خوبیاں ہیں۔ نقد و تبصرہ و تحسین کا حامل ہو خواہ تنقیص کا بلاشبہ مجھ کو بلیک ووڈ اور کوارٹرلی کی تنقیدوں سے سخت تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر یہ سوچ کر تسکین ہو جاتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور تنقیدوں کا لب ولہجہ درحقیقت اس جذبۂ حسد کا نتیجہ ہے جو میری عمدہ تحریر کو پڑھ کر ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جو کچھ مجھ کو آئے گا لکھتا جاؤں گا لیکن میں نے یہ طے کیا ہے کہ اب میں مستقل نہیں لکھوں گا اس سے قبل بغیر تدقیق کے مستقل لکھا کرتا تھا مگر اب نہایت احتیاط سے لکھوں گا۔ شعر کا حسن خود بخود کنگی سے لطیف ہوتا جائے گا۔ خدا سے دعا ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر رفتہ رفتہ اس کی خوبیاں ترقی کرتی رہیں۔"

۲۹ راکتوبر ۱۸۱۸ء کو کیٹس ایک خط میں اپنے بھائی جارج کو لکھتا ہے۔

"مجھ کو یقین ہے کہ میں موت کے بعد چند جدید انگریزی شعرا کی صف میں شمار کیا جاؤں گا رسالہ کوارٹرلی نے مجھ کو رسوا کرنے کی جو ناکام کوشش کی ہے اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ دشمنوں ہی سے میری شہرت ہو گی بلکہ جو شخص بھی عوام میں ذلیل کرنا چاہے گا اس کا انجام سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس کے ذریعہ بجائے نقصان کے فائدہ ہی ہوگا میں اس شخص کو جانتا ہوں جو مجھ سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے اور اسے وہ درجہ بھی دیتا ہوں جس فضیلت و شہرت کا وہ مستحق ہے۔ اسی وجہ سے میں اس کو اپنے سوا دوسرے تاقد کا درجہ دیتا ہوں۔"

ان فقروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ کہ اس ذلت سے کیٹس کو اتنا صدمہ ہوا کہ یہی مضامین اس کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئے، درحقیقت یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی کوئی سند موجود نہیں۔

اکتوبر ۱۸۱۸ء کو کیٹس کے صفحۂ زندگی میں محبت والفت، شوق و بے قراری، غم و فراق کی وہ پہلی سطر لکھی گئی جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

کیٹس کی پہلی ملاقات ایک دوشیزہ جان کاکس سے ہوئی۔ اس کے متعلق اپنے بھائی جارج کو ایک خط میں ۱۹؍اکتوبر ۱۸۱۸ء کو لکھتا ہے:

"گو وہ کلوپٹرا نہیں ہے لیکن شامیان سے کسی طرح کم نہیں۔ جسم میں حسن کی فراوانی ہے، نگاہیں سحر طراز، اخلاق اعلیٰ، جب وہ کمرے میں داخل ہوتی ہے تو دوشیزگی کا سحر پورے کمرے پر چھا جاتا ہے اس دوشیزہ کے دیدار سے ایک سرور سا پیدا ہوتا ہے۔ اس کے دیدار سے مجھ میں حیات کی ایک لہر اور ایک خاص قسم کی زندگی پیدا ہو جاتی ہے جو میں کسی دوسری مخلوق کے ساتھ رہ کر محسوس نہیں کر سکتا۔ میں اب اپنی ذات کو بالکل بھول گیا ہوں کیونکہ میری زندگی اس کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔"

اس عبارت کے دامن میں بوئے محبت پنہاں ہے۔ بلاشبہ کیٹس کے سیرت نگاروں کا خیال غلط ہے کہ اسکی محبوبہ کا نام جان کاکس تھا جس کی طرف لفظ شامیان سے اشارہ کیا گیا ہے حالانکہ اس نے خود اس کا نام فانی براؤن بتایا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ لارڈ ہاؤٹن نے بھی کیٹس کی سیرت میں مندرجہ بالا خط پر تبصرہ کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اب اس پر بحث کریں کہ اسی خاتون نے جس کا ذکر سابق صفحات میں گزر چکا ہے کیٹس کے دل میں ایسی آگ لگا دی جو تا وفات نہ بجھ سکی۔"

یہ غلطی کوئی غیر متوقع غلطی نہیں جس میں کیٹس کے سوانح نگاروں کا پڑجانا کوئی تعجب خیز امر ہو۔ کیٹس نے اپنے بھائی کو جو خط لکھا ہے اس میں سچائی کے ساتھ اس نے حقیقت اور دل کے سچے جذبات کو پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ

مذکورہ بالا عبارت کے بعد لکھتا ہے

"آپ کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں بلاشبہ مجھ کو اس سے انتہائی محبت ہے بلکہ محبت سے بھی فزوں تر الفت موجود ہے اب میری حالت وہ نہیں ہے جو اس سے پہلے تھی۔ اس کی یاد میں پوری پوری شب بیداری میں گزار دیتا ہوں جیسے کوئی موزارٹ کے نغموں میں محو ہو"

لیکن ان الفاظ کو رقم کرتے وقت قضا و قدر کے ناطق فیصلہ کی اسے کیا خبر تھی۔ ابھی اس نے یہ خط بھیجا نہ تھا کہ فانی براؤن سے ملاقات ہوگئی وہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی کیٹس سے عمر میں پانچ سال چھوٹی، نرم و نازک حسن و دلربائی کا مرقع، اگر اس کی ذات کو کیٹس کی زندگی میں دخل نہ ہوتا تو اس کی زندگی ان غموں سے خالی ہوتی جس سے اس کے خطوط بھرے پڑے ہیں اگر اس کے جلوۂ جمال کی کارفرمائی نہ ہوتی تو دنیا کیٹس کی عبقریت کے اس مظہر کو کیسے دیکھ سکتی جو قدم قدم پر اس کی نظموں میں جلوہ گر ہے۔ کیا دنیا "بلبل سے خطاب" "یونانی ساغر" "چمکدار ستارہ" اور دیگر ادبی جواہر ریزوں سے لطف اندوز ہو سکتی ــــــ؟

کیٹس نے فانی براؤن کے معائب و محاسن ان الفاظ میں بیان کیے ہیں۔

"خوبصورت ہے، سبک قامت ہے، نازک اور چنچل ہے، اس کی ادائیں دلفریب ہیں،"

ایک اور موقع پر اس کی تعریف یوں کی ہے۔

"بڑی تفریح پسند ہے" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسی عادتیں موجود تھیں جنھیں اس کمسنی میں ہونا ہی چاہیے تھا۔ اس نے اپنے محبوب کے دل میں جلا دینے والے شعلے بھڑکا دیے جس نے مورخین کو موقع دیا کہ وہ اس واقعہ سے فائدہ اٹھائیں اور فانی براؤن کی زندگی پر ایک بدنما داغ لگا دیں حتی کہ سر سڈنی مون نے لکھا ہے۔ "اس عورت کی محبت کیٹس کی زندگی میں سب سے نحس واقعہ ہے" لیکن اس جملہ کی تلخی خود سر سڈنی کے دوسرے جملے سے بہت کم ہو جاتی ہے کہ شاعر کے حالات کا ہی یہ تقاضا تھا کہ خواہ کسی عورت سے محبت کرتا ایسی ہی بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ تقریباً یہی رائے لارڈ ہاؤٹن کی بھی ہے کہ کیٹس میں محبت کی شدید جذباتی قوت اس کے فنا کا باعث اور موت کے راستہ پر چلنے کی محرک ہوئی اگر اس کی جذباتی لہر کچھ کم ہوتی تو کچھ زیادہ دنوں تک

زندہ رہ سکتا۔

کیٹس جنت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے لیکن وہ خائف ہے، مضطرب اور بے چین ہے وہ اپنی شدید نفسانی قوت پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے۔

"میں عوام اور عورت کی خوشنودی دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ دونوں کی حالت گندگی سی ہے جن کے پال و پر میں انسان چپک کر آزادی کھو دیتا ہے"

ایک شب تقریباً گیارہ بجے کیٹس نہایت مضطرب الحال واپس آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نشہ میں مدہوش ہے۔ اس نے اپنے مخلص رفیق و ہمدم براؤن سے کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بخار پھر آئے گا جو ان دنوں آتا ہے" بستر پر لیٹا ہی چاہتا تھا کہ سر تکیہ پر رکھنے سے پہلے ایک خفیف کھانسی آئی۔ فوراً اپنے دوست سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے منہ سے خون آگیا ہے۔ روشنی لاؤ تو ذرا دیکھیں کہ خون ہی ہے۔ کچھ دیر تک مسکین شاعر اس قرمزی دائرہ کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر نہایت یاس انگیز سکون کے ساتھ اپنے دوست سے کہا۔

"میں اس خون کا رنگ پہچان گیا۔ یہ شریان کا خون ہے۔ ممکن ہو کہ خون کے بارے میں میری تشخیص غلط ہو۔ یہ قطرہ میری موت کا پیغام ہے اور میرا جینا محال ہے"

براؤن نے فوراً سرجن کو بلایا۔ فصد خون کے آپریشن کے بعد کیٹس کو سکون کی نیند آگئی۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ دونوں پھیپھڑے ابھی سالم ہیں اور حالت تشویشناک نہیں ہے لیکن مریض جو خود بھی صحیح معنوں میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی تجزیہ ڈاکٹر کی رائے سے خلاف ہے اس لیے اس پر ناامیدی چھائی ہوئی ہے۔ جب وہ ناامیدیوں کی کشاکش سے خالی ہوتا ہے تو اپنے دوست سے اس طرح گفتگو کرتا ہے۔

"اگر میری شفایابی کی تمنا ہے تو پہلے اس کی دعا کرو کہ میری گردش دور ہو جائے اور زندگی کی حقیقی مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ میں اب اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اب امیدوں سے کھیلنے کے سوا اور کسی قابل نہیں"

ایک دوسرے دن یہ کہتا ہے۔

"میرے ہاتھ کو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پچاس سالہ انسان کا بے جان ہاتھ ہے۔"

لیکن کیٹس رنج والم کی سخت سے سخت گھڑی میں بھی اپنی محبوبہ کی یاد کو نہیں بھولتا چنانچہ ایک خط میں محبوبہ کو لکھتا ہے کہ اس رات بھی جب شدید ترین مرض کے حملے کا شکار ہوا تھا اور یقین ہو گیا تھا کہ وہ ابدی عالم کے دروازے پر دستک دے رہا تھا اگر اس کے ذہن میں کوئی چیز تھی تو وہ محض محبوبہ کی یاد تھی پھر جوں جوں اس کا مرض بڑھتا گیا محبوبہ کی خدمت میں سلام شوق اور اخلاص و وفا کے خطوط کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ ایک دفعہ وہ ایک خط میں لکھتا ہے:۔

"صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ میری تقدیر میں تمہارے وصل کی سعادت لکھی بھی گئی ہے یا نہیں لیکن بہرحال میں اتنا جانتا ہوں کہ یہی میرے لیے بڑی سعادت ہے کہ میں نے تم سے اس حد تک محبت کی اور اگر میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ یہ محبت اس حد سے آگے نہ بڑھ سکے تو میں خدا کے اس نعمت کی ناشکری بھی نہیں کروں گا۔"

ایک دوسرے خط میں لکھتا ہے:۔

"تمہاری دلفریبی روزانہ بڑھتی جاتی ہے تمہارا آخری بوسہ سب سے زیادہ شیریں تھا تمہارا آخری تبسم سب سے زیادہ مسرت بخش تھا۔ تمہاری آخری چال سب سے زیادہ خوشتر تھی کل جب تم میری کھڑکی کے پاس سے گزریں تو تمہاری رنگینی کی بنا پر مجھ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے تم کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں کبھی یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ مجھ کو تمہارے علاوہ کسی دوسرے شخص سے پُرسکون لذت اور اطمینان حاصل ہوگا۔"

ایک منصف تنقید نگار ان بلیغ فقروں کو پڑھنے کے بعد یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ فانی براؤن کے تعلقات سے سوا اس کے کہ شاعر کو رنج و محن کا شکار ہونا پڑے اور کوئی حلاوت حاصل نہ ہوئی۔ بلاشبہ اس حادثہ فاجعہ کی ذمہ داری فانی براؤن پر عاید نہیں ہوتی بلکہ یہ سب شاعر کی خراب صحت کا نتیجہ تھا۔ اس کے اعصاب اتنے کمزور ہو گیے تھے کہ طرح طرح کے شکوک اس کے سامنے آتے تھے اور اس طرح بعض سوالات پر مجبور کرتے تھے کہ کیا فانی محبت کے عہد کو برقرار رکھے گی یا بیاری اور کلفتوں کے باوجود وفاشعاری کا ثبوت دے گی وغیرہ وغیرہ۔

کیٹس کے اعصاب اور جسمانی قویٰ کمزور ہو گیے تھے اس لیے اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے رہتے تھے جس کی مثال محبت کی تاریخ میں بہت کم ملتی ہو کیا اس جذبہ کا نتیجہ نہ تھا جب کیٹس نے فانی بھاؤن کی محبت کا متہم گردانا! کیا اسی جذبہ کا نتیجہ نہ تھا کہ اس نے فانی کو ہر طرح کی دعوت قبول کرنے سے ممانعت کر دی اور شہر میں تنہا جانے پر پابندی عاید کر دی! کیا کیٹس نے اس کزنی ہینٹ، کے مکان کے قیام کے دوران میں یہ نہیں لکھا!

"میں تم کو تمھارے پیشوا مسیح کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ جب تم نے اس ماہ وہ کام کیا جس سے مجھ کو بڑا دکھ پہنچا ہو تو مجھ سے خط و کتابت کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاید اب تم بدل گئیں لیکن اگر تمھارا دعویٰ ہو کہ ایسا نہیں ہوا اور اس کے باوجود تم اس پر قایم رہیں جو میں نے ڈانسنگ ہال اور دوسرے جلسوں میں دیکھا ہو تو پھر مجھ کو زندگی کی کوئی تمنا نہیں اگر تم نے کوئی ایسا کام کیا ہو جس سے مجھ کو دکھ ہو تو میں دعا کرتا ہوں کہ آنے والی رات میری زندگی کی آخری رات ہو۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ صرف تمھارے ہی بغیر نہیں بلکہ اس صورت میں کہ تم عفیفہ اور پاکدامن بھی رہو۔"

یہ تھا وہ لب و لہجہ جو کیٹس نے اپنے خطوط میں اس وفا شعار عورت کے لیے اختیار کیا تھا جس پر کسی کو غداری اور خیانت کا شبہ کرنے کی مجال بھی نہیں مگر پھر کیٹس خود ہی اپنی غلطی پر نادم ہوتا ہے اور عذر خواہ ہو۔

"میں چاہتا ہوں کہ ابدیت کا قایل ہو جاؤں اور ابد تک تمھارے ساتھ رہوں۔"

کیٹس نے اس مہلک مرض سے نکلنے کی جتنی کوششیں کیں سب بے سود ثابت ہوئیں بالآخر ۱۸۲۰ء کے موسم بہار میں یہ رائے طے پائی کہ یہ نوجوان تبدیل آب و ہوا کی غرض سے اٹلی کا ایک طویل سفر کرے۔ اس وقت اس کا ایک مصور دوست سیفرن رفاقت سفر کے لیے آمادہ ہوا جس کو شاہی اکاڈمی کی طرف سے سونے کا تمغہ ملا تھا اور یہ وہی تمغہ تھا جو بارہ سال سے کسی کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ مبادا کسی غیر مستحق کو نہ مل جائے۔ سیفرن کی اس رفاقت کا باعث کیٹس کا وہ احسان بھی تھا کہ جب سیفرن کو تمغہ ملا تھا تو کیٹس نے دشمنوں کے حملے اور

ان کے اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ چنانچہ سیفرن نے دولت و ثروت، آرام و آسائش غرض ہر چیز کو اس بدنصیب مبتری کی خاطر تج دیا، اور ہمہ تن تیارداری میں منہمک ہو گیا۔

اواخر اکتوبر ۱۸۲۰ء میں سفر کی پریشانیوں کے بعد جس سے تکلیف اور بڑھ گئی کیٹس اور اس کا دوست تالی پہنچا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے براؤن کو لکھا۔

"مجھ کو یقین ہو کہ اب میں اس کو نہیں دیکھ سکوں گا (اشارہ فانی براؤن کی طرف ہی) کیونکہ اب میری صحت کے سنبھلنے کا امکان نہیں ہو۔ اگر اس دنیا کو الوداع کہنے سے پہلے مجھ کو میری عزیز براؤن مل سکے تو شاید میں صحت یاب اور تندرست رہ سکوں۔ مجھ کو مر جانے کی طاقت ہو لیکن جدائی کی تاب نہیں۔ آہ! اے خدا!! اے خدا!!! میرے دل میں اس کی یاد کے جتنے گوشے موجود ہیں سب تیر بن کر چبھ رہے ہیں۔ وہ تمام ریشمی کپڑے جو اس نے میرے سفری سامانوں کے ساتھ رکھے تھے میرے دماغ میں سخت تپش پیدا کیے ہوئے ہیں۔ میرا تصور جس میں اس کو دیکھتا ہوں اس سے باتیں کرتا ہوں سخت دردناک ہو۔"

شاعر ان دنوں کو یاد کرتا ہو جب وہ "ہاسٹڈ" میں تھا اور سارا سارا دن محبوبہ کے مکان کی طرف دیکھا کرتا تھا

"مجھے بہت زیادہ امید تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ لیکن آہ کہ آج مجھے اس کی بھی امید نہیں کہ اس کے مکان کے قریب ایک گز زمین بھی دفن ہونے کے لیے پا سکوں۔ میں اب اس کو کچھ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس کی کوئی امید نہیں کہ اب اس کا کوئی خط پا سکوں گا جب میں اس کی تحریر دیکھتا ہوں تو میرا دل دھڑکنے لگتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی موقعہ پر اس کا ذکر آجاتا ہو یا اس کا نام کسی جگہ لکھا دیکھتا ہوں تو دھڑکن سی پیدا ہو جاتی ہو۔ اور اب یہ چیز میری برداشت سے باہر ہو۔"

کیٹس تالی سے روما منتقل ہو گیا جہاں ایک مشہور طبیب مسٹر جیمس کلارک کے پاس گیا اور اس کی خدمت میں ایک خط پیش کیا کہ یہ ایسا طبیب تھے علاج و معالجہ اور رفق و محبت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اپنے مکان کے سامنے میدان اسپان (پیازا دسپانیا) میں ٹھہرایا لیکن مشہور خیال اور عام حالت کی وجہ سے

لگے اس طرح دور دور رہنے لگے جس طرح ایک صحیح و سالم اونٹ کسی خارشتی اونٹ سے دور دور رہتا ہے کیونکہ حالت کی وجہ سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مرض بہت متعدی ہوتا ہے جب کیٹس کو سب سے زیادہ محبت اور دلجوئی کی ضرورت تھی اس وقت اسے نفرت اور کنارہ کشی سے دوچار ہونا پڑا۔

بالآخر قدرت نے یہ دیکھنا گوارا نہ کیا کہ یہ درد سے پُر رنج و غم سے چور زیادہ دنوں تک اس اذیت میں مبتلا رہے۔ بیماری ترقی کرتی رہی معدہ بگڑ گیا اور ذرا لکھنے پڑھنے کا قصد بھی دشوار اور سخت اذیت دہ ہو گیا چنانچہ وہ اپنے دوست براؤن کو اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے آخری خط میں لکھتا ہے

"اب یہ تاثر پورا احساس پوری طرح پیدا ہو گیا ہے کہ میری زندگی ختم ہو چکی ہے اور اب قبر کے عالم میں زندگی گزاروں گا"

انتقال کی داستان اس کے وفا شعار اور مخلص دوست سیورن نے نہایت دردناک الفاظ میں بیان کی ہے۔ اس موقع پر اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں کہ ان میں سے چند اخلاص سے پُر فقرے نقل کر دوں جس کے حرف حرف سے غم کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔

"۱۴ر دسمبر مجھ کو خوف ہے کہ آج ستم رسیدہ کیٹس کی حالت بہت زیادہ خراب ہو جائے گی کیونکہ غیر متوقع ضعف پیدا ہو چلا ہے جس نے اسے بستر پر لٹا دیا ہے اب تمام امیدیں برعکس نظر آ رہی ہیں۔ اس کی تکلیفیں بہت زیادہ اور بیہم ہیں ضعف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے اور ہذیان کا دورہ بھی زوروں پر ہے"

"۱۷ر دسمبر، وقت ۴ بجے صبح...... صرف ابھی نیند آئی ہے.... گزشتہ آٹھ راتوں میں صرف پہلی مرتبہ۔ اب تک کھانسی کے وقت پانچ مرتبہ اس کے منہ سے خون آ چکا ہے۔ اب کوئی شئے ہضم بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود ہر وقت کھانے کو مانگتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ وہ بھوک سے مر جائے گا میں اجازت سے زیادہ کھانے کو دینے کے لیے مجبور ہو گیا ہوں اس کی قوت تخیل اور حافظہ ہر وقت کسی خائف شئے کے تصور میں منہمک رہتے ہیں چنانچہ اکثر وہ خوف کی حالت میں اپنے دوست ڈاکٹر براؤن کو یاد کرتا ہے اور ان چاند مہینوں کو یاد کرتا ہے

جو اس نے اس کے ساتھ گزارے نیز فانی براؤن اس کی بہنیں اور اس کے بھائی کو بھی یاد کرتا ہے۔

۱۵ر جنوری۔ وقت ساڑھے بارہ...... اس وقت کیٹس سویا ہوا ہے میں اس کی تیمارداری کے لیے برابر جاگتا رہا اور کوشش کی کہ وہ سو جائے۔ اس نے مجھ سے کہا سیفرن! مجھ کو تمہاری پرسکون نظروں میں عظیم الشان صبر کی جھلک نظر آتی ہے مجھے جو کچھ نظر آرہا ہے وہ تم سمجھ نہیں سکتے۔ تم نے میرے لیے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی جتنی کہ میں نہیں چاہتا۔ ہائے کاش! میرا آخری وقت آجاتا!! چونکہ ہم لوگ روپیہ لے چکے تھے۔ اس لیے خزانچی ٹورلینیا نے اب مزید روپیہ دینے سے صاف انکار کر دیا اس لیے اب ہم مجبور ہو گئے کہ مکان کے کرایہ کی ادائیگی میں باقی ماندہ چوتھائی پونڈ کی حقیر رقم بھی خرچ کر دیں کیونکہ دوسری صورت میں کیٹس کی موت کے بعد تمام اثاثہ اور کرسیاں وغیرہ جلائی جائیں گی اور دیوار پر پھر نئے سرے سے سفیدی کرائی جائے گی۔ اور اس وقت یقیناً سو پونڈ یا اس سے زائد دینے پڑیں گے لیکن ان سب سے اہم اس نوجوان کا معاملہ ہے جو بستر پر دراز ہے اور زندگی کے آخری لمحات میں بھی روحی سکون سے محروم ہے! اب وہ خط کے پڑھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اس نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں خطوط نہ کھولوں بلکہ اس کے سرہانے رکھ دوں چونکہ شدت مرض سے اس کا دل پاش پاش ہو رہا ہے۔ اسی لیے اب لفافہ کا پتہ دیکھنے کی طاقت بھی باقی نہیں۔

۱۴ر فروری۔ ہوش و حواس دونوں واپس آنا شروع ہو گئے ہیں۔ رات اس نے بہت گفتگو کی لیکن بہت سکون کے ساتھ پھر وہ گہری نیند سو گیا۔ اس رات اس نے وہ بات جس پر سب سے زیادہ زور دیا یہ تھی کہ اس کی قبر پر یہ عبارت کندہ کر دی جائے۔

"یہاں ایک ایسا شخص محو خواب ہے جس کا نام صفحۂ آب پر لکھا گیا"

...... مجھ کو آج ایک خط ملا جس کو میں نے یہ سمجھ کر کیٹس کو دے دیا کہ تمہارا (براؤن) خط ہے لیکن

افسوس یہ خیال خام تھا۔ اس نے ایک نظر ڈالی اور فوراً خط کو چاک کیا مگر خط پڑھا نہیں کیونکہ اب اس میں اتنی صلاحیت باقی نہیں تھی کہ پڑھ سکے۔ اس سے وہ چند دنوں تک متاثر رہا اور مجھ سے کہا کہ ایک تھیلی میں اس خط اور اس کی بہن کے خط کو نعش کے ساتھ رکھ دینا۔

۲۷ر فروری تاآج رخصت ہوگیا۔ اس نے زندگی کو نہایت سکون سے الوداع کہا گویا وہ تیس سال کی عمر میں نیند سونے جارہا ہو۔ چار بجے سے پہلے موت کے آثار پیدا ہونے لگے اس لئے مجھ سے کہا، سیورن اٹھو۔ .... ذرا مجھ کو اٹھاؤ! .... اب میں مررہا ہوں ..... میں نہایت سہولت اور اطمینان سے چلا جاؤں گا۔ گھبراؤ مت! ..... صبر سے کام لو اور خدا کا شکر کرو کہ ساعت آگئی ..... !

اس طرح کیٹس کی شمع زندگی کی آخری لو بھڑک اٹھی ....،

یہ نوجوان شاعر جان کیٹس ابدی دنیا کی طرف پرواز کرگیا لیکن اس کی شہرت اور عزت کا خوشنما رشتہ اس دنیا سے منقطع نہیں ہوا۔ اور آج وہ دنیا کے بڑے بڑے شعراء کی صف میں کھڑا ہے۔

(مترجمہ) بدرالدین عظیم

غزل

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی — وہ پو پھٹی، وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ — مسافروں سے کہو اُس کی رہ گزر آئی

ترا ہی رنگ سرشکِ غمِ جہاں میں بھی تھا — نگاہ میں تری تصویر سی اُتر آئی

ستارے چھٹکے جب اس چاند کیلیے رویا — کہ بال کھولے ہوئے شام بے سحر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن — پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

نیا نہیں ہے مجھے مرگِ ناگہاں کا پیام — کہ جیتے جی مجھے اکثر مری خبر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا — کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

کہیں نشانِ سکوں بھی ہے فرش سے تا عرش — مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

غم و نشاط کی دیوی پھر ایک عمر کے بعد — یہ چہرہ متبسم بہ چشم تر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست — ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شبِ فراقؔ اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

فراقؔ گورکھپوری

گُل دوُرو

ساقیٔ خود فروش کی چشم سیاہ مست
جامِ مے طہور کو دینے چلی شکست

اللہ یہ جو فروشیاں گندم نمائیاں
کفر آشنا زبان بایں شکل حق پرست

پایا کہیں نہ منزلِ افتادکا نشاں
دیکھے ہیں راہِ شوق میں کیا کیا بلند و پست

خود کامیوں کی حد ہے کہ بس خود نمائیے
اب کہیے خود پرست کہیں یا خدا پرست

دعویٰ زہد اور غزلیتِ فجور و فسق
ریو و ریا شعار و لیے سبحہ بدست

ابرو کشیدہ اور یہ آنکھیں جھکی جھکی
کس بے گنہ کو تاکا ہے کس پر لگائی شست

یہ بے نیازیاں کہ الٰہی تری پناہ!
کچھ یاد ہے کہ بھول گئے وعدۂ الست

جانے نہ کوئی خوبیٔ صورت پہ آپ ہیں
مطلب پرست، مال پرست و ہوا پرست

کشتی کسی کی تیرے کہ ڈوبے کہ پار ہو
قلزم صفت جناب کی ہے طبع موج مست

چھوڑے ادھر شگوفے ادھر گل کھلا دیے
ان رنگ بازیوں کا کہاں تک ہو بند و بست

نیرنگ حسن ایک تماشا ہے کیا کہیں
"معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است

با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد"

عبداللطیف تپش

بغاوت

یوں تو ——

رقص و نغمے سے جواں ہے مرا رنگین شباب — ٹوٹ کر بنتے ہیں تخئیل کے قلزم میں حباب
مسکراتی ہے مری موج سے فطرت کی کلی — زندگی ہے مری مانندِ نسیمِ سحری
فکرِ رنگین سے دیتا ہوں خیالوں کو ثبات — رنگ دنیا سے سجاتا ہوں شبستانِ حیات
ساحلِ عشق پہ ہوتا ہے تمنا کا گزر — اکثر اک نورِ تصور سے چمکتی ہے نظر

شعلہ پیکر کی ازل سے مری فطرت ہے قتیل
کھینچ لیتی ہے مجھے بارگہِ حسنِ جمیل

لیکن ——

دیکھتا ہوں درِ مغرور پہ جب جھکتی جبیں — لڑکھڑاتا ہوا ترے دلِ صد چاک زمیں
جب ہلاتی ہے فلک تلخیٔ ایام میں زیست — بند ہوتی ہے غلامی کے در و بام میں زیست
دیکھتا ہوں جب اسی دہر میں توہینِ شباب — بھڑک اٹھتا ہے نوا سے مری فطرت کا رباب
مطلعِ زیست پہ ہوتی ہے تجلی کی نمود — ٹوٹ جاتے ہیں تب و تاب سے آئینِ جمود

غیرتِ عشق جوانی کی قسم کھاتی ہے
روحِ احرار بغاوت پہ اتر آتی ہے

فضل حسین کیف اسرائیلی

دعا

سمندر کو لعل و گہر دینے والے　　گداؤں کو تاج و کمر دینے والے
دعاؤں کو رنگ اثر دینے والے　　دلوں کو مزاج شرر دینے والے

اکیلا ہوں، اک ہمسفر چاہتا ہوں.....

کیے آسماں کو عطا چاند تارے　　دیے بلبلوں کو چمن کے نظارے
کسی کے لیے دام گیسو سنوارے　　سبک سیر ندیوں کو بخشے کنارے

بھکاری ہوں، لطف نظر چاہتا ہوں...

جبیں آبِ رنگِ زمانہ سے عاری　　طبیعت غرورِ شہانہ سے عاری
ادا شوخیٔ دلبرانہ سے عاری　　نظر تنگیٔ زاہدانہ سے عاری

شبِ غم، ضمیرِ سحر چاہتا ہوں.....

جو عقل و عزیمت کو معیار سمجھے　　جو دنیا کی ہر جیت کو ہار سمجھے
جو حسن و حقیقت کو نادار سمجھے　　جو ہر بار دیکھے، جو ہر بار سمجھے

وہ آزردہ خاطر نظر چاہتا ہوں.....

گماں نے نہ بخشی مجال نظارا　　نہ منزل سے دوری نہ منزل کا یارا
نہیں تلخیٔ نوشِ ہستی گوارا　　بجھا چاہتا ہے جنوں کا شرارا

اگر دے تو عزمِ ظفر چاہتا ہوں....

نہیں نام کا ننگ حاصل تو کیا ہے؟　　نہیں جوہرِ حسن قابل تو کیا ہے؟
زمانہ نہیں دل کا قائل تو کیا ہے؟　　نہیں ظرفِ دولت پہ مائل تو کیا ہے؟

میں کب جلوۂ رہگزر چاہتا ہوں....

جو بامِ ثریا پہ بستی بسائیں　　جو سدرہ کو اپنی نگہ میں نہ لائیں
جو جبریل کو تازہ نغمے سنائیں　　جو بالا ہوں دنیا سے دنیا پہ چھائیں

وہ قلب و جگر، بال و پر چاہتا ہوں....

خورشید الاسلام

راسخ دہلوی

مولوی محمد عبدالرحمن راسخ دہلی کے شعرا کی صف اول میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے مجموعہ کلام میں تغزل کے بہترین نمونے موجود ہیں کلام میں پختگی، روانی اور جوش ہے۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور سادہ ہے۔ زبان صاف اور نکھری ہوئی ہے۔ رنگ البتہ وہی ہے جو داغ اور امیر کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ راسخ کو مرنے کے بعد وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو داغ اور امیر کے حصہ میں آئی تھی ع

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ورنہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے راسخ کا درجہ داغ اور امیر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ارمغان جدید معروف بہ دیوان راسخ سنہ ۱۹۰۹ء میں افضل المطابع دہلی میں شائع ہوا تھا۔ یہ انتخاب جو پیش کیا جا رہا ہے اسی دیوان کا ہے۔

پئے تعظیم جھک جاؤں جو دو رخ ہو رضا تیری پشیمانی سلیقہ ہو مری عصیاں شعاری کا
حیا میں شوخی سکھائی تمھیں کرم میں ستم نگہ میں ناز ادا میں غرور ہم سے ہوا
زندگی سمجھا تھا جسکو موت تھی مجھ کو راسخ عمر بھر دھوکا رہا
شیخ محراب عبادت سمجھا اُف رے عالم تری انگڑائی کا
رتبہ پاتی ہے تمھاری شہرت نام لے کر مری رسوائی کا
پی لی جب سے راسخ ناداں مری خاطر سے ہاں سمجھ جس نے پلائی وہ گنہگار رہا
چین لینے نہ دیا عشق بتاں نے راسخ عمر بھر روگ رہا عمر بھر آزار رہا
اس کے تقوے پہ تصدق مری توبہ راسخ مرتے مرتے بھی ہو جس کو طلب جام شراب
قدامت سے دونوں ہیں شایانِ قدر پرانی محبت، پرانی شراب

کشش دل سے جب ملیں گے آپ — بے طلب بے سبب ملیں گے آپ

کئی گزری جو لب تک آئی بات — منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات

کھیل ہے مجھ کو شغل جانبازی — تجھ کو ہے خنجر آزمائی بات

مرے آگے تری جفائیں کھیل — تیرے نزدیک بیوفائی بات

آگ لگ جائے سوز پنہاں کو — آبلہ بن کے لب تک آئی بات

پرتوفگن ہے عارض ساقی شراب میں — دو آفتاب ڈوبے ہیں اک آفتاب میں

عکس رخ نگار ہے ساقی شراب میں — اولے کے پھول ہیں طبق آفتاب میں

دل جلے دل جلائے بیٹھے ہیں — آگ گھر میں لگائے بیٹھے ہیں

درد! تیرے اٹھائے اٹھیں گے — ضعف! تیرے بٹھائے بیٹھے ہیں

وعدۂ حشر وہ کریں تو بھی — میں تو ہنگامہ ساز محشر ہوں

تو اپنی شوخیوں سے وہاں ہے جہاں نہ تھا — میں اپنی بے خودی سے جہاں تھا وہاں نہیں

اللہ رے نیم جلوہ سے وارفتگی مری — میں خود کو ڈھونڈتا ہوں کہاں ہوں کہاں نہیں

سینہ پہ رکھ کے دست تسلی نہ پوچھیے — اب کیا بتاؤں درد کہاں ہے کہاں نہیں

یہ مے ہے شیخ صاحب ایک سانس میں اسکو نہیں پیتے — جناب آہستہ آہستہ، حضور! آہستہ آہستہ

کسی کے عارض تاباں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے — کسی کا بام ہو جائے گا طور آہستہ آہستہ

طوفان فنا نہر ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے حبابوں کا تماشا مرے آگے

جنت میں وہی حور وہی شاہد وہی حوریں — جو میں نے کیا تھا وہی آیا مرے آگے

بشر کو چاہیے پاس دل بشر رکھے — کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے

ہاتھ دل پر دھرے وہ بیٹھے ہیں — اس تسلی میں اضطراب بھی ہے

سکوت عیب ہے عشاق نیم جاں کے لیے — فغاں زباں کے لیے ہے زباں فغاں کے لیے

(مرسلہ) حبیب کیفوی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

محشرِ خیال: از سجاد علی انصاری مرحوم بی۔اے، ایل، ایل، بی (علیگ)، ناشر خان الیاس احمد مجیبی۔ قرول باغ دہلی۔ تعداد صفحات ۲۰۰ سائز ۲۰×۲۶/۱۶۔ قیمت ۲/ کاغذ کتابت و طباعت نفیس۔

سجاد انصاری مرحوم سے ہر وہ شخص واقف ہوگا جو اردو ادب کا اعلیٰ اور نفیس معیار و مذاق رکھتا ہو۔ ان کی گرمیِ تخیل کا پہلا حشر اب سے کوئی پندرہ سال پہلے قایم ہوا تھا۔ محشرِ خیال کا چنانچہ یہ دوسرا اڈیشن ہو جو بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہو۔

انصاری مرحوم علی گڑھ کے ان شاندار اور بیباک سپوتوں میں سے تھے جو اگر زندہ رہ جاتے تو دنیائے ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیتے اور لوگوں کے ادبی شعری عقاید و مسلمات میں ایک حشر برپا ہو جاتا۔ آتشیں تخیل اور پھر اس پر آتش بیانی ایک طوفان ہو جو خس و خاشاک کو جلاتا چلا جاتا ہو۔ محبت کی ماہیت نفسی عفتِ نسواں، حقیقتِ عریاں، پیامِ زلیخا، روزِ جزا تک پڑھتے چلے جائیے آپ کو وہ نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی جن کی فراوانی اور گرمی سے آپ کا ذہن متحیر آپ کا دل گرم اور آپ کی روح مشتعل ہو جائے گی۔ سوچنے کا طریقہ اور کہنے کا ڈھنگ دونوں نرالے ہیں، شعر و فلسفہ، عشق و محبت، عصمت و رندی، بوالہوسی اور بدمذاقی زیادہ تر اسی قسم کے موضوع ہیں لیکن طرزِ ادا میں وہ بیباکی، بغاوت اور جذبۂ تعمیر و اصلاح موجود ہو جو ہمیں کہیں اور نہ دکھائی دے گی۔ شاعرانہ جوشِ تخیل فلسفیانہ حقایق کو شی کے ساتھ مشکل سے مل سکے گا معلوم ہوتا ہو کہ ایک دیوانہ مجذوب ہو جو با صد ہوشیاری و فرزانگی حقایق و معارف کو کمالِ حسن و خوبی کے ساتھ الٹتا پلٹتا چلا جاتا ہو۔

اس اڈیشن میں ان کا ایک نامکمل ڈراما "روزِ جزا" بھی دیدیا گیا ہو۔ اس ڈرامے میں قیامت کا منظر دکھایا گیا ہو جس کے افراد آدم و حوا، شیطان اور فرشتے، صوفی و زاہد، خوبصورت مرد اور خوبصورت عورت

ہیں۔ باوجودیکہ یہ ڈراما نامکمل رہا ہے پھر بھی سجاد کی آتش فشانی بے پناہ ہے۔

آخر میں سجاد کی چند نظمیں اور غزلوں کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ ان کے اشعار میں بھی وہی بیباکیٔ تخیل باغی تصور اور تعمیری جذبہ نمایاں رہتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

دام فریب حرص ہے شعبدۂ نماز کیا — دل ہے طلسم آرزو سجدۂ بے نیاز کیا
صوفیٔ حیلہ ساز بھی بے خبرِ جمال ہے — آئینۂ مجاز میں جوہر امتیاز کیا
صورت کائنات ہی پردہ کشائے حسن ہے — زیرِ نقاب کچھ نہیں شورِ جہانِ راز کیا
زہدکرشمۂ زبوں، صبرِ فسوں بے اثر — بادہ کشِ حیات ہوں مسئلۂ جواز کیا

اللہ رے میرے ذوق نظر کی تجلیاں — جس ذرہ پر نگاہ پڑی طور ہو گیا
پنہاں تھیں مجھ میں حسن کی سارِی حقیقتیں — ہر حرفِ شوق نعرۂ منصور ہو گیا

مرے ہر ہر گنہ میں ہیں ہزاروں منتیں مضمر — کسی کو اور دکھلا یہ فریب اتقا اپنا

شرمندگیٔ عفو سے ہوں شعلہ بداماں — اے رحمتِ گستاخ، گناہوں کی حیا دیکھ

یقین ہے ارباب ذوق عموماً اور نوجوان طبقہ خصوصاً اس مجموعۂ خیال سے ضرور مستفید ہوگا۔

تاریخ انقلاب روس :- از ایم ایم جوہر میرٹھی۔ ناشر مکتبہ برہان قرول باغ دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۸۱۔ قیمت عہ۔ کاغذ معمولی، کتابت مختلف، طباعت اچھی۔

جوہر صاحب کی سیاسی تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ معاملہ اور مسائل کو آسان سلجھا کر لکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی جو سیاست سے قطعی ناواقف ہو اس مسئلہ کو سمجھ سکتا ہے۔ زیر نظر کتاب دراصل ایک مکمل خلاصہ ہے۔ ٹراٹسکی کی مشہور و معروف تاریخ انقلاب روس کا۔ اس میں روس کے تمام موجودہ سیاسی و اقتصادی انقلابات کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اور موجودہ روس کے نظام کو سمجھنے کے لیے بڑے اچھے پس منظر کا کام دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جوہر صاحب کی پہلی کتاب ٹروٹسکی کی طرح یہ بھی ایسے سادہ اور آسان انداز میں لکھی گئی ہے کہ ہر شخص بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے یا معلومات حاصل کرنے والے حضرات اس کتاب سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

بچوں کی تربیت :- مرتبہ مسرت زمانی صاحبہ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، سول لائن علی گڑھ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۴، کاغذ کتابت و طباعت خاصی۔ قیمت درج نہیں۔

یہ کتاب دراصل ہائی اسکول کی لڑکیوں کے تعلیمی نصاب کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سوسترا بائی لیڈی سول سرجن اور ڈاکٹر محمود نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ زیر نظر کتاب میں وہ تمام باتیں درج کر دی گئی ہیں جو بچوں کی اچھی نگہداشت اور تربیت کے لیے بہت ضروری ہیں۔ ساتھ ہی اس میں بچوں کی پیدائش کے متعلق تمام ضروری ہدایات دی گئی ہیں جو ہر زچہ کے لیے بہت مفید ہو سکتی ہیں۔ کتاب بڑی لیاقت اور محنت سے ترتیب دی گئی ہے۔ تمام ضروری ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے اور بچوں کی پیدائش، ان کی نگرانی، ان کی خوراک اور ساتھ ہی ان کی ذہنی اور جسمانی تعلیم و تربیت کے تمام طبی، اخلاقی اور تعلیمی اصول درج کیے گیے ہیں۔ عورتوں کیلیے عموماً اور اُن لڑکیوں کے لیے خصوصاً جو مائیں بننے والی ہیں یہ کتاب بہت مفید اور ضروری ہے۔

شمع حرم :- مرتبہ راجہ مہدی علی خاں۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لوہاری دروازہ لاہور۔ تعداد صفحات ۲۷۲ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عہ/ کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

مہدی علی خاں صاحب نے ہندوستان کی مشہور افسانہ لکھنے والی خواتین کے منتخب افسانے جمع کیے ہیں اس مجموعہ میں حجاب امتیاز علی، حمیدہ سلطانہ، ز۔ ب، سنتا چترجی، مسز عبدالقادر، عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں، مسز مالتی دیوی، مسز شانتی دیوی کے افسانے شامل ہیں۔ ہر خاتون کا ان کے افسانے کے شروع میں بہت مختصر سا تعارف بھی کرا دیا گیا ہے۔ دو ایک جملے ان کے افسانوں کی خصوصیات کے متعلق بھی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ بہت اچھا ہے ہمیں تقریباً ہر افسانہ نگار کے متعلق کچھ نہ کچھ علم ہو جاتا ہے۔ انتخاب بھی خاصا اچھا کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہیں تو بہت مناسب ہے۔

گل و بلبل :- از جناب قاضی محمد صادق صاحب قریشی۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز، لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۵۱، قیمت عہ/ کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ افسانے ایسے ہیں جن میں نہ غربت، مزدور اور عورت کا پروپیگنڈا ہے نہ کوئی اصلاحی یا اخلاقی مقصد پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بقول مصنف "باغ عالم کی سیر کے بعض عینی یا خیالی مشاہدات کی محض ایک یادداشت ہے۔"

یہ افسانے ایسے ہیں کہ محض خوبصورتی کے لیے خوبصورت طریقہ پر لکھے گئے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے حسن برائے حسن یا ادب برائے ادب یا آرٹ برائے آرٹ کہا جا سکتا ہے۔ حسن جہاں کہیں ہو بھلا لگتا ہے۔ اسے زندگی کا پابند ہونے کی ضرورت نہیں خود زندگی والے زندگی سے پریشان ہو کر یا اس سے بلند ہو کر اسی حسن میں اطمینان و سکون حاصل کیا کرتے ہیں بلکہ اپنی زندگی یا تفسیر حیات کا پروپیگنڈا بھی حسن اور آرٹ کے بغیر نہیں کرتے بلکہ آج کل تفسیر حیات محض گرے ہوئے طریقے پر ہو تو اسے پروپیگنڈا کہا جاتا ہے اور اگر خوبصورت طریقے پر ہو تو اسے ادب کہہ لیتے ہیں اور مقصد کے بغیر ادب کو ادب نہیں سمجھتے۔ ادب اور آرٹ کو آپ کہاں کام میں نہیں لا سکتے لیکن اس کام یا مقصد کو لازمہ ادب یا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب تصویر حیات بھی ہوتا ہے اور یہ افسانے بھی ہماری حیات کی تصویریں ہیں تفسیریں نہیں۔ اور خوبصورت تصویریں ہیں۔

صادق قریشی صاحب لایق مبارکباد ہیں کہ ایسے فن کارانہ آٹھ افسانوں کا مجموعہ پیش کیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ارمغان ہاے ناز کا سلسلہ جاری رکھیں گے اور آئندہ پنجابی قواعد اردو سے حتی الامکان پرہیز کریں گے۔

بیوی کی تلاش ؎ از احسان بی۔ اے (آنرز)، ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۸، قیمت عہ، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی

یہ احسان صاحب کے سات مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں اپنا حال بھی مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ احسان صاحب میں مزاح بھی ہے اور لکھا طنز بھی۔ طبیعت میں ظرافت معلوم ہوتی ہے اور تنظر میں تنقید بھی لیکن احسان صاحب کا یہ مجموعہ ابھی شایع نہ ہونا چاہیے تھا۔ ابتدائی کوششوں کو ہمیشہ مشق ہی سمجھنا چاہیئے اگر وہ شایع بھی کی جائیں تو بہت کاٹ چھانٹ کے بعد اور مدت کے بعد۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی چیزوں کی اشاعت کا ہر ایک کو شوق ہوتا ہے اور اپنے محبوب مضامین پردہ گمنامی میں نہیں رکھے جاتے لیکن زیادہ بہتر ہو اگر یہ چھپتے فنا کر دیے جائیں۔ اسی طریقہ سے ایک افسانہ نگار اور ایک ادیب میں پختگی پیدا ہو سکتی اور ہوتی ہے۔ ویسے احسان صاحب کے آخری دو مضامین اپنی لطیف طنز اور ہجو ملیح کے لحاظ سے بہت اچھے نمونے ہیں لیکن انھیں ابھی اپنے عام مذاق کے معیار کو اور بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ان میں ایسی صلاحیتیں موجود ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ بسیار نویسی اور زود نویسی پر عمل کر کے دوسرے مزاحیہ نگاروں کی طرح اپنی جگہ دوسرے تیسرے درجہ پر نہ قایم کریں گے۔

ساقی: ۔ از آتش گجراتوالیہ۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۹۵، قیمت عمر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ ایک ناول ہے جس کا پلاٹ مختصراً یہ ہے کہ ایک طوائف ایک امیر کو پھنسا تی ہے اور خود بھی اس کی محبت میں پھنس جاتی ہے۔ لا محالہ وہ امیر اپنی بیوی کو چھوڑ دیتا ہے اور اپنی دولت اور تمام زمینداری اس عیاشی میں اڑا دیتا ہے بیاہتا بیوی اس طوائف سے اپنا درد دکھ کہتی ہے اسے رحم آتا ہے اور وہ اپنے روپے سے اس کی زمینداری کو دوبارہ خرید دیتی ہے اور شوہر کو بیوی سے ملا دیتی ہے اور ان دونوں کے اصرار سے خود بھی ان کے ساتھ دوسری بیوی کے طور پر رہنے لگتی ہے۔

پلاٹ میں نہ کوئی ندرت ہے نہ جدت، طرز بیان رومانی ہے اور شاعرانہ، کردار نگاری میں بھی انتہا پسندی ہے یعنی جب کوئی کردار نیکی پر آتا ہے تو مجسم نیکی بن جاتا ہے اور جب برائی پر آتا ہے تو مجسم برائی۔

نور و نار: ۔ از شیام سندر پردیپ، ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۲۲، قیمت عہر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

نور و نار بھی ایک شاعرانہ ناول ہے شاعری اور رومان سے بھرا ہوا۔ دور رومان سے بھرپور مستیاں شادی و محبت کا عہد و پیان کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی خود کو اور ایک دوسرے کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیے ہوئے ہیں کہ ان دونوں کو عشق حقیقی ہے۔ رضیہ کی شادی دوسری جگہ کر دی جاتی ہے اور میاں اسلم در بدر فقیروں کی طرح خاک چھاننے لگتے ہیں کئی سال گزر جاتے ہیں اور رضیہ کا شوہر جمیل ایک دفعہ سخت بیمار پڑتا ہے اور کشمیر تبدیل آب و ہوا کے لیے جاتا ہے۔ اس عرصہ میں اسلم اپنی حالت زار کے متعلق رضیہ کو ایک خط بھیج چکا تھا جس کا رضیہ مناسب جواب دے چکی تھی۔ اتفاق کہ جس ہوٹل میں رضیہ جا کر سری نگر میں ٹھرتی ہے وہیں اسلم بھی چکر لگاتا ملتا ہے۔ دونوں میں ملاقات ہوتی ہے اور اب رضیہ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسلم کی جس محبت کو وہ عشق سمجھی ہوئی تھی وہ محض ہوس تھی۔ ادھر جمیل اپنی نرس سے مانوس نظر آتا ہے۔ تنگ آ کر رضیہ جمیل سے محبت کرنے لگتی ہے اور اسلم نرس سے۔

تمام ناول شاعری اور رومانیت سے بھرپور ہے۔ جوانی کی سرمستیاں اور شباب و شاہد کی ہر جگہ زیادتی ہے۔ ہر باب پرانے طریقے پر کسی شعر سے شروع ہوتا ہے اور جگہ جگہ پردیپ کے اشعار لکھے جاتے ہیں۔ شاعری اور رومان کی

زیادتی نے اسے ایک پرانے قسم کا جاری دنیا سے اور ایک شاعرانہ ناول بنا دیا ہے۔

بہ حال ناولوں کی طرف ناشرین نے اب توجہ دینا شروع کی ہے امید ہے آئندہ اچھے اچھے ناول ظہور پذیر ہو سکیں گے۔ (م۔ح)

آفتاب (اسلام اور اسلامی مفکرین) ، مرتبہ جناب خورشید الاسلام صاحب صدر آفتاب مجلس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سائز ۲۲×۱۸ ، ضخامت ۲۸۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، قیمت ۱ ؎

آفتاب پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کا تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کو کس زاویے سے دیکھنا چاہتا ہے اور کس حد تک اس کا اسلام زمانہ کی قوتوں میں ایک زندہ قوت کی حیثیت سے شامل ہے۔ آفتاب میں تجدید و احیاء دین، اسلامی تہذیب پر دوسری تہذیبوں کے اثرات، کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے، حضرت امام غزالیؒ، مختصر سیرت محمد بن وہاب، علامہ سید جمال الدین افغانی کے عنوانات پر مقالے ہیں اور ہر مقالے کا مصنف معتبر حیثیت کا مالک ہے۔ مقالوں کے ساتھ ہی خورشید الاسلام صاحب کا پیش لفظ اپنی ادبی لطافت اور روح کے اعتبار سے خاص چیز ہے۔ بہ حیثیت مجموعی "آفتاب" نہ صرف خود پڑھنے کی چیز ہے بلکہ ذوق رکھنے والے دوستوں کے لیے ایک مسلمان کی طرف سے اچھا تحفہ بھی ہو سکتا ہے۔

تمدن اسلام :- از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کا ۲۲×۱۸ سائز پر ۲۴ صفحی مقالہ ہے جسے انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔

مقالے میں اکثر عمومی اور سطحی باتوں سے بحث کی گئی ہے۔ انداز بیان ضرور ایک بانکپن رکھتا ہے۔ جہاں مولانا نے دوسرے مذاہب کے تمدن کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا لہجہ سخت ہو گیا ہے جو اخلاق اور مصلحت دونوں کے منافی ہے۔ (ف۔ا۔ا)

ایک تصحیح :- ہمیں افسوس ہے کہ اکتوبر کے رسالہ جامعہ میں "ساز و آہنگ" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے تبصرہ نگار سے دو ایک غلطیاں ہو گئیں۔ اول تو یہ کہ "ساز و آہنگ" سیماب صاحب کی نظموں کا پہلا مجموعہ نہیں جیسا کہ ہمارے تبصرہ نگار کا خیال تھا۔ دوسرے یہ کہ "ساز و آہنگ" اقبال کی نقل میں نہیں نکالی گئی ہے بلکہ زمانہ کا چلن دیکھتے ہوئے اب سیماب صاحب نے نظموں کی طرف زیادہ توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ امید ہے کہ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں گے۔

(ادارہ)

رفتارِ زمانہ

جب سے دنیا میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے لوگ سمجھتے آئے ہیں کہ لڑائیوں میں فوجوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور فتح اس کی ہوتی ہے جس کی فوج میدان میں جیت جائے۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ سپہ سالار کی قابلیت سپاہیوں کی بہادری اور جنگ کے لئے صحیح موقع کے انتخاب کا لڑائی کے انجام پر بہت اثر پڑتا ہے، اگر صورت ایسی ہو کہ دو ایک معرکوں میں بات طے ہو جائے تو قسمت کا فیصلہ فوجیں ہی کرتی ہیں لیکن بڑے بڑے پیمانے کی جنگ میں فوج کو لڑنے کا صرف ایک ذریعہ، فوجوں کے مقابلے کو لڑنے کا صرف ایک ہی طریقہ سمجھنا چاہیے، ایسی جنگ میں آخری فیصلہ لڑنے والی قوموں کا مقصد اُن کا ارادہ، اُن کی تیاری، اُن کی استعداد کرتی ہے۔ اور جب تک اس میں کسر ہو فوجوں کی کامیابی بھی زیادہ کام نہیں آتی۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان نے اِس بھروسے پر لڑائی کی ٹھانی تھی کہ ان کے مقابلے پر جو قومیں ہیں ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ لڑیں تو کس مقصد کے لئے، وہ لڑائی کا پکّا ارادہ نہ کر سکیں گی جنگ کی تیاری میں ان کا دل نہ لگے گا۔ اور لڑائی اچانک اور بڑے پیمانے پر ہوئی تو اس کی نوبت نہ آئے گی کہ وہ اپنی پوری انتظامی اور صنعتی استعداد سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ یہ اندازہ غلط نہیں تھا، لیکن پچھلے دنوں چھبیس قوموں کا جو اتحاد فاشسٹ ریاستوں کے خلاف ہوا ہے اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے درمیان اتحادِ عمل کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندازہ صحیح بھی تھا کہ جرمنی، جاپان اور اٹلی کا مطلب حاصل ہو سکے۔ جمہوری قوموں کی صف آرائی میں ذرا سی کسر بس اب یہ رہ گئی ہے کہ روس نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا ہے۔ روسی کہتے ہیں کہ ان کے اور جاپانیوں کے درمیان پانچ سال کے لئے معاہدہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے۔ وہ جاپان صرف ہوائی حملے کر سکتے ہیں اور اس وقت کا تجربہ یہ ہے کہ خالی ہوائی حملوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا کہ جس سے جنگ کے انتظام میں کوئی بڑی رکاوٹ ہو۔ روسی یہ بھی کہتے ہیں کہ امن اور

جمہوریت کا اصل دشمن جرمنی ہے اور ان کا منشا یہ ہے کہ جمہوری ملک اپنی ساری قوت جرمنی کو شکست دینے کی کوشش میں صرف کریں۔ لیکن روسیوں نے یہ بھی جتا دیا ہے کہ ان کی مشرقی ایشیائی فوج ہر مہم کے لئے تیار ہے۔

فاشسٹ قوموں کے خلاف جو اتحاد ہوا ہے اس کے رہنما برطانیہ اور امریکہ ہیں مسٹر چرچل کی دوراندیشی نے اس تکلف کو بالکل برطرف کر دیا جو اب تک سیاست کے آداب میں شامل تھا۔ یعنی سفیروں اور سیاسی لیڈروں کی شان قائم رہتی تھی چاہے قوم کو نقصان اُٹھانا پڑتا۔ مسٹر چرچل کی بے تکلفی سے خلوص ٹپکتا ہے، اس سے دوست اور دشمن سب پر ظاہر ہو گیا ہے کہ فاشسٹوں کو شکست دینے کے بڑے مسئلے کے آگے وہ اور کسی چیز کا خیال نہیں کرتے اور وہ اپنی طرح جمہوری ملکوں کے دوسرے رہنماؤں میں وہ جوش اور یک جہتی پیدا کرلیں گے جو کامیابی کو یقینی کر دیتی ہے۔ مسٹر چرچل کے واشنگٹن جانے سے بہت سے معاملات چند گھنٹوں میں طے ہو گئے ہیں جو معمولی طریقے پر مہینوں میں بھی طے نہ ہوتے، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے اتحاد عمل کے نتیجے بھی نظروں کے سامنے آرہے ہیں۔ ایک بڑا نتیجہ یہی ہے کہ جنرل ویول (WAVELL) جنوب مغربی بحرالکاہل کی جنگ کے ذمہ دار بنا دیئے گئے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہر تدبیر وہی کریں گے۔ انھیں جنگ کے تمام وسائل پر پورا اختیار ہوگا اور فوج ہوائی جہاز اور بیڑے کو وہ اس طرح استعمال کر سکیں گے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ بچاؤ ہو اور دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچے۔ اب تک ہر محاذ پر جو تجربہ ہوا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کو پورا اختیار نہیں دیا جاتا تو اکثر تدبیریں کارگر نہیں ہوتی ہیں۔

بڑے کام کو سنبھالنے میں دیر لگتی ہے اور جاپانیوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو سنبھلنے اور اپنی قوت کو یکجا کرنے میں دیر لگے۔ جزیرہ ویک اور مڈوے اور گودیم کے فتح ہو جانے سے جو دشواری پیدا ہوتی تھی وہ ہانگ کانگ اور منیلا کے فتح ہونے سے اور بھی بڑھ گئی ہے، اور جاپانیوں کو اس کا موقع مل گیا ہے کہ ملایا

اور جزائر شرقی ہند میں اپنی فوجیں اتار دیں اور اطمینان کے ساتھ کمک اور سامان بھیجتے رہیں۔ ان کی توجہ خاص طور سے ملایا پر ہے۔ یہاں انھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے جس کی ہر تفصیل وہ پہلے سے طے کر چکے تھے اور جس کی مشق انھوں نے پرانے اور منتخب سپاہیوں کو اچھی طرح سے کرائی تھی۔ یہ نیا طریقہ جسے (INFILTRATION) کہتے ہیں جرمنی کی ایجاد ہے اور اسے پہلی مرتبہ فرانس میں آزمایا گیا۔ جاپانیوں نے اس تجربے سے سبق لیا اور اسے وہ ملایا میں اب تک خاصی کامیابی کے ساتھ برت رہے ہیں۔ اس میں فوج ایک دھارے کی طرح رکاوٹوں سے ٹکراتی، توپوں اور مشین گنوں کی مار کھاتی آگے نہیں بڑھتی، اس لئے کہ اس کے راستے میں ایسی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں، وہ توپ خانوں کا اس طرح نشانہ بنائی جا سکتی ہے کہ ایک ایک گز زمین کے بدلے ہزاروں جانیں قربان کرنا پڑے۔ بڑی فوج کو اس طرح قابو میں رکھنا بھی بہت مشکل ہے کہ دشمن کی ذرا سی غفلت یا بے پروائی یا غلطی سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے ......

(INFILTRATION) کے نئے طریقے میں فوج سینکڑوں چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے، جن میں کبھی سو پچاس، کبھی دس پانچ سپاہی ہوتے ہیں، انھیں بتا دیا جاتا ہے کہ کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ مقصد کے مناسب انھیں ہتھیار اور دوسرا سامان دیدیا جاتا ہے اور پھر وہ اپنا کام اپنے طریقے پر کرنے کے لئے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اس طرح جنگ کا ایک عام مقصد طے کرکے ہر چھوٹے سے چھوٹے فوجی افسر اور ہر سپاہی کو اس کا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی استعداد سے کام لے، اگر کسی گروہ کے سپاہی گرفتار کر لئے گئے یا قید کر دئے گئے تو جان اور سامان کا بہت نقصان نہیں ہوتا اور ایسے نقصان کے باوجود اس کا امکان رہتا ہے کہ مختلف گروہ چپکے چپکے رکاوٹوں سے بچتے اور خالی جگہوں کو تلاش کرکے نکالتے چلے جائیں جیسے سیلاب کا پانی چڑھتا ہے اور دشمن کو آخر میں ایکبارگی معلوم ہو کہ اگر وہ پیچھے نہ ہٹا گھر جائے گا۔ دشمن ہوشیار ہو تو وہ ایسے گروہوں کو پکڑ پکڑ کر ختم کر دے جیسا کہ ملایا میں برطانوی فوجوں نے کیا بھی۔ مگر ملایا کے جنگلوں نے جاپانی سپاہیوں کا

کو چھپ چھپ کر آگے بڑھنے کا بہت موقع دیا۔ اور ایک بات یہ بھی ہے کہ فوج جس طریقے پر لڑنے کے لئے تیار کی گئی ہو اس طریقے پر وہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکتی ہے۔ جاپانی سپاہیوں نے جس طریقے کی مہینوں مشق کی تھی جس کے لئے ہر ضروری سامان مہیا کیا جا چکا تھا اور جسے کارآمد بنانے کی ہر تدبیر سوچی جا چکی تھی اس کا برطانوی فوج فوراً توڑ نہیں کر سکتی تھی اور اس طرح جاپانی شمالی اور وسطی ملایا کے جنگلوں کو پار کر کے نکل آئے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہوں نے جو کام کیا ہے اس سے فائدہ اُٹھا کر اب بڑی فوجیں اور جنگ کا بھاری سامان جنگ کے لئے محاذ تک بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن جو طریقہ فرانس کی غیر مسلح آبادی کو سہمانے اور ملایا کے گھنے جنگلوں سے گذرنے میں کارآمد ثابت ہوا اس پر کھلے میدان میں عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ برطانوی فوجیں اب یکجا ہو کر نئے اور زیادہ مضبوط محاذ قائم کر رہی ہیں جنھیں پیچھے سے گھیرا نہ جا سکے گا اور ان محاذوں پر سنگاپور کے مرکز سے بہت جلد مدد بھی پہنچائی جا سکے گی۔ غالباً جاپانی اب اپنا طریقہ بدل دیں گے اور برطانوی فوج کی ٹکر لینے کے سوا انھیں کوئی چارہ نہ ہوگا۔

(INFILTRATION) کے طریقے میں اور صرف اس میں نہیں بلکہ (BLITZ-KRIEG) کے پورے اصول میں بس جرمن اب تک عمل کرتے رہے ہیں۔ یہ بڑی خامی ہے کہ وہ حملہ کرنے میں تو بہت کارآمد ہوتی ہے مگر حملہ روکنے کے لئے بیکار رہے۔ اس میں فوج کے قدم جمتے نہیں ہیں، وہ آگے بڑھتی رہے تو جس زمین پر قبضہ ہو گیا ہو اس پر قبضہ رہتا ہے لیکن اگر وہ روک لی جائے یا جیسے کہ روس میں ہوا ہے، موسم کی وجہ سے ہوائی جہاز اور ٹینک استعمال نہ کئے جا سکیں اور جنگ کو ملتوی کرنا پڑے تو فوج کے لئے کوئی سہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا اور وہ پیچھے ہٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ جرمن سپہ سالاروں کا پہلے یہ خیال تھا کہ وہ فوج کو آگے بڑھتے ہوئے حصوں کو واپس بلا کر ایک مستقل محاذ قائم کر لیں گے اور یہاں پر روسیوں کا مقابلہ کریں گے لیکن یہ محاذ بھی قائم نہ کیا جا سکا ہوگا، ورنہ جرمن فوج کرش (KERCH) فیوڈوسیہ (FEODOSIA) جیسے مورچوں کو ہرگز نہ چھوڑتی

جرمن پروگرام کے بگڑ جانے کی بات بہت پرانی ہوگئی ہے اور بار بار بیان کی جاچکی ہے لیکن اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جرمن سپہ سالار یقیناً جانتے بھالتے کہ ان کا طریقۂ جنگ ایک جگہ پر ٹھہر کر لڑنے کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اگر انھوں نے ایک خاص مدت کے اندر روسی فوجوں کو منتشر اور بے کار نہ کردیا تو انھیں پس پا ہونا پڑے گا، اور یہ پس پائی جاری رہے گی۔ جب تک موسم کچھ موافق نہ ہو اور ہوائی جہاز اور ٹینک میدان میں لائے جاسکیں۔ بہت ممکن ہے لڑائی ملتوی کرنے کا ارادہ کرتے ہی (BLIZKRIEG) کا بیشتر سامان محفوظ مقاموں پر بھیج دیا گیا ہو اور فوج کے ساتھ بس اتنا رکھا گیا ہو کہ پس پائی بھگدڑ کی صورت اختیار نہ کرلے۔ جرمن فوج نے لڑائی بند نہیں کی تھی تب بھی یہ خبریں آرہی تھیں کہ بلوں جہاز روسی محاذ سے اِدھر اُدھر بھیجے جارہے ہیں۔ لیکن بہت کچھ سامان رہ بھی گیا ہوگا جو اب روسیوں کے کام آئے گا۔ روسیوں کے ہاتھ پیر تو معلوم ہوتا ہے سخت سردی پڑتے پر اور بھی کھل گئے ہیں اور ان کے حوصلے اس قدر بلند ہورہے ہیں کہ ہرہٹلر کو خود جرمن فوج کی ہمت بڑھانے کے لئے محاذ پر جانا پڑا۔ اب تک تو (BLIZ KRIEG) کا یہ بگڑا کام کسی کے بنائے بنا نہیں ہے۔ اب دیکھئے ہرہٹلر کیا کرشمے دکھاتے ہیں۔

بہرحال جب تک روسی محاذ کی طرف سے اطمینان نہ ہوجائے ہرہٹلر بھی اسی میں مصلحت سمجھیں گے کہ دوسرے منصوبے ملتوی رکھے جائیں اور لیبیا کی شکست کا کڑوا گھونٹ جس طرح بن پڑے پی لیا جائے۔ یہاں پر برطانوی فوجیں بن غازی کے آگے تک پہنچ گئی ہیں اور غالباً اب وہ اور آگے نہ بڑھیں گی کیونکہ وہ اپنے مرکزوں سے بہت دور ہوگئی ہیں اور جنرل رومل (ROMMEL) اپنی فوج کا بیشتر حصہ بچا لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جب تک اٹلی کا بیڑہ سلامت ہے اور اس کا امکان ہے کہ فرانسیسی بیڑہ جرمنی کے اختیار میں آجائے برطانوی فوج کا طرابلس میں داخل ہونا احتیاط کے خلاف ہے۔ فرانس کے ۱۰ لاکھ سپاہی جرمنی میں قید ہیں جرمنی کے قبضے سے فرانسیسیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں

جو بڑی حد تک بھلائی جا سکتی ہیں۔ اگر فرانس جرمنی کی تمام شرطیں منظور کر کے باقاعدہ اتحاد کرے۔ دوسری طرف برطانیہ اور متحدہ ریاستوں سے فرانس کے تعلقات بگڑ تے ہی جاتے ہیں۔ ابھی حال میں آزاد فرانسیسی فوجوں نے جزائر سین پی ار (St PIERRE) اور مجلئے لون (MIGUELON) پر قبضہ کر لیا ہے اور فرانسیسی حکومت جانتی ہے کہ برطانیہ کی مدد کے بغیر یہ قبضہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے فرانس کا کچھ اعتبار نہیں ہے اور اس کی سیاست کسی وقت بھی پلٹا کھا سکتی ہے۔ ہر ہٹلر بیتاب ہوں گے کہ اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔ جرمن فوجوں کی جو بے آبروئی ہوئی ہے اس کے داغ کو کسی طرح مٹائیں۔ اسی وجہ سے ان کو اس کا بڑا دکھ ہے۔ روس میں جرمن فوجوں کی پس پائی کا سلسلہ بند نہیں ہوتا اور سیاست اور جنگ کے لئے کرتب دکھانے کا موقع نہیں آتا۔ وہ صبر اور سکون اور اطمینان جس پر مہذب دنیا کا گذر بسر ہوتا ہے ان کے اور ان کی سیاست کے لئے ایک قاتل زہر ہے۔

مغربی دنیا میں تو برطانیہ اور متحدہ ریاستوں نے جرمنی کے مقابلے کا انتظام کر لیا، لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جنگ کی جو صورت ہو گئی ہے۔ اس نے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ جنگ کے پرانے محاذوں پر زیادہ توجہ کی جائے یا اس نئے محاذ پر۔ آسٹریلیا اور چین کی خواہش ہے کہ اس نئے محاذ کو زیادہ اہمیت دی جائے۔ آسٹریلیا کے وزیر اعظم مسٹر کرٹن نے پریزیڈنٹ روز ولٹ سے براہ راست گفتگو اسی خیال کو پیش کرنے کے لئے کی تھی۔ چین کے اخبار میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں جنوب مشرقی ایشیا کی جنگ کو خاص اہمیت دینے کی مصلحت ثابت کی گئی ہے۔ مضمون نگار کی رائے تھی کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو بحر اٹلانٹک اور بحر روم پر تسلط حاصل ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی کو بالآخر شکست ہوگی۔ بحر الکاہل پر بھی برطانیہ اور متحدہ ریاستیں اگر چاہیں ایسا ہی تسلط قائم کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر انھوں نے اس کے اہتمام کو ملتوی رکھا تو ممکن ہے جاپان، ملایا، جزائر مشرقی ہند اور فلپائن

کرے گی کہ ایک ایسا مورچہ بنا سکے جس سے اس کو سپرے دخل کرنے کے لئے تمام بحری قوت کافی تر ہو۔ برطانیہ پارلیمنٹ میں بعض ممبروں کو اندیشہ ہے کہ ایشیائی محاذ کو کافی اہمیت نہیں دی جاتی ہے، اور مجموعی طور پر اراکین کو جنگ کے متعلق بحث کرنے اور سوالات پوچھنے کی اتنی خواہش ہے کہ مسٹر چرچل نے اس بحث کے لئے تین دن رکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن بحث کرنے سے یہ بات طے نہیں کی جا سکتی۔ جنگ کا میدان بہت پھیل گیا ہے۔ اتفاق سے ہر جگہ پیش قدمی کرنے کے بہتر موقعے دشمن ہی کو حاصل ہیں، اور کوئی محاذ ایسا نہیں ہے کہ جسے اہمیت میں کسی دوسرے محاذ سے کم قرار دیا جا سکے۔

چند اچھی کتابیں

تاریخ انقلاب روس - ایم - ایم - جوہر صاحب - قیمت غیر مجلد عہ

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام مولانا محمد طیب صاحب قیمت غیر مجلد عمہ مجلد عہ

اسلام کا اقتصادی نظام - مولانا حفظ الرحمن صاحب سہواری قیمت غیر مجلد عیہ

قصص القرآن - مترجمہ مولانا حفظ الرحمن صاحب سہواری قیمت مجلد للعہ غیر مجلد للعہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات - اسرار احمد آزاد " " عہ

شہنشاہیت - مترجم مظفر شاہ خاں " " عہ

وحی الٰہی - سعید احمد - ایم - اے " " عہ

فہم قرآن " " عمہ

لغات القرآن " " للعہ " للعہ

گلبانگ آزادی - نہال سہواری " " ۱۸

غلامان اسلام - تالیف مولانا سعید احمد ایم اے " " صہ " للعہ

اخلاق اور فلسفہ اخلاق - مولانا حفظ الرحمن صاحب سہواری " " صہ " للعہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت حصہ اول - سعید احمد ایم اے " " ے " عمہ

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مُدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں اُن کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے، زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی، اُنھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں مُلک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ مل جاتا ہے علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مُضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر چنا بلڈنگ لکھنؤ


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس ۔ قیمت ۱۰۰ گولیاں
"اوکاسا" ہر اچھے دوافروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک

جامعہ

زیرادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۶ - نمبر ۳ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی انڈین پریس الہ آباد اور تقریباً دوسرے تمام اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اردو اکادمی** کی ممبری قبول فرمائیے اور قواعد وضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے۔

نادر خطوط غالب

مرتبہ رسا ہمدانی

پر ایک نظر

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہو کہ غالب کے سینکڑوں دوست تھے اور انھوں نے اپنی زندگی میں ہزاروں خط لکھے۔ ابتدا میں وہ فارسی میں لکھتے رہے جن میں سے کچھ خط پنج آہنگ میں موجود ہیں۔ بعد میں انھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور اگرچہ فارسی میں خط و کتابت بالکل ترک تو نہیں کی لیکن اس کے بعد آخر تک بیشتر اردو ہی میں لکھتے رہے۔ ان کے اردو خطوں کے دو مجموعے "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" پہلے سے موجود تھے ۱۹۳۷ء میں تیسرا ارام پور سے "مکاتیب غالب" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں وہ خطوط ہیں جو میرزا نے نواب یوسف علی خاں بہادر فردوس مکان اور نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں اور بعض اصحاب رامپور کے نام لکھے تھے ۱۹۴۹ء کے وسط میں ایک مختصر مجموعہ "نادر خطوط غالب"[1] کے نام سے جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی نے شائع کیا۔ اس میں کل ۲۷ خطوط ہیں جن کے متعلق جناب مرتب کا دعویٰ ہو کہ ان میں سے پہلے ۲۳ میرزا نے ان کے پردادا سید کرامت حسین ہمدانی مرحوم کے نام لکھے تھے۔ آخری چار خطوں میں سے تین سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام ہیں اور ایک شاہ فرزند علی صوفی منیری کے نام۔

ایک دوست کی مہربانی سے یہ خطوط شائع ہونے سے پہلے مجھے دیکھنے کو مل گئے تھے۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ان میں سے بیشتر جعلی ہیں اور جناب رسا نے نہایت جسارت سے کام لیا ہے جو یہ کہا ہو کہ میرزا نے یہ ان کے پردادا مرحوم کے نام لکھے تھے لیکن چونکہ اس وقت میرے پاس کوئی کتاب نہیں تھی نیز میں عنقریب ایک لمبے سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ اس لیے میرے لیے مزید ثبوت مہیا کرنا دشوار تھا

---

[1] نادر خطوط غالب مرتبہ سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی گیاوی، ٹرپل ایم۔اے (گولڈ میڈلسٹ) بی۔ایل ... صفحات ۲۶+۴۹ ۱۹۴۹ء کا شائع کردہ ادب پبلشرز۔

میں نے اپنی اس رائے کا اظہار ان دوست سے کر دیا اور ہندوستان سے روانہ ہو گیا۔ جب تھوڑے دنوں بعد یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ مجھے بھی موصول ہوا۔ اب مجھے ان پر زیادہ غور کرنے کا موقعہ ملا اور میں دوبارہ اب کے زیادہ یقین کے ساتھ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ جناب رسا نے میرزا کے شائع شدہ خطوط میں سے ادھر اُدھر کے بعض ٹکڑے لے کر یہ خطوط خود لکھے ہیں اور انھیں شائع کر دیا ہے گویا میرزا نے یہ ان کے پردادا جناب کرامت ہمدانی مرحوم کے نام لکھے ہوں۔ میں اس مضمون میں کتاب زیر بحث کے خطوط اور ان کے بالمقابل اُن خطوں کی نقل پیش کروں گا جو اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں پہلے سے موجود ہیں۔ ناظرین اس سے میرے دعویٰ کی صحت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خط نمبر (۱)

دہلی یکم جنوری سنہ ۱۸۵۱ء

شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے جو میں تمہیں اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

میرے آم کھانے کا حال نہ پوچھو۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین العشاءین۔ ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم

(۱)..... بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگرکاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

(بنام عبدالرزاق شاکر۔ اردوئے معلے صفحہ ۱۷۱)

(۲)..... خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں طاقت کہاں سے پاؤں نہ آموں کی طرف رغبت نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا

بڑے ہوئے تو پانچ سات سے
دریغا کہ عہد جوانی گذشت   جوانی مگر زندگانی گذشت
عمدہ اور میٹھے آموں کا پارسل اگر آئے گا تو میں خوش
ضرور ہوں گا اور اگر نہ آئے گا تو طلب بھی نہیں کروں گا
(اس کے بعد منشی لال کی کتاب سراج المعرفت کے دیباچے
کی کچھ سطریں نقل کی ہیں جو میرزا نے لکھا تھا اور اردوئے
معلے میں بھی موجود ہے)

رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں آخر
روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا بے تکلف عرض
کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم
پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر
دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات سے
دریغا کہ عہد جوانی گذشت   جوانی مگر زندگانی گذشت
اب ان کے واسطے کیا سفر کروں مگر حضرت دیکھنا اس
کے واسطے تحمل رنج سفر ہوں تو جاڑے میں نہ برسات میں

ع لے ولے زمحرومی دیدار دگر ہیچ

(بنام چودھری عبدالغفور سرور۔ نوشتہ بعد غدر ۱۸۵۸ء اردوئے معلی صفحہ ۱۶۱)

آپ نے دیکھا کہ یہ خط پورے کا پورا اس سے پہلے ہمارے پاس موجود ہے البتہ ایک جگہ کامل نہیں بلکہ ٹکڑوں میں دو جگہ اب آئیے ذرا رسا صاحب کے خط پر ایک نظر ڈالیں۔

سب سے پہلے "دہلی یکم جنوری ۱۸۵۰ء" کا ٹکڑا ہے۔ میرزا عموماً تاریخ آخر میں لکھا کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی خط کے شروع میں یا درمیان میں بھی تاریخ کا اشارہ موجود ہوتا ہے۔ جناب رسا صاحب فرماتے ہیں:-

"موجودہ روش کے مطابق میں نے تاریخ و مقام خطوط کے سرنامہ پر لکھ دیے ہیں ورنہ زیادہ تر غالب کے خطوط میں تاریخ آخر میں مرقوم ہے" (دیباچہ صفحہ ۲۷)

جہاں تک میں نے دیکھا ہے غالب نے اپنے کسی خط میں مقام کا نام نہیں لکھا۔ تاریخ وہ ضرور لکھتے ہیں۔ اگر دہلی غالب کے خطوں میں نہیں لکھا تھا تو جناب رسا صاحب کا فرض تھا کہ وہ بھی نہ لکھتے یا کم از کم اشارہ کر دیتے کہ مقام کا نام میں نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ اس خط کے متعلق دیباچہ کے صفحہ ۱۴-۱۵ پر وہ لکھتے ہیں:-

"یہ خط ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اس میں غالب نے لکھا ہے کہ اردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ اس سے مولانا حالی کے کلام کی تائید ہوتی ہے۔ (یعنی میرزا مہر نیمروز کی تصنیف سے پہلے خط فارسی میں لکھا کرتے

تھے اور انہوں نے سنہ ۱۸۵۰ء کے اردو خطوط نویسی شروع کی) اور میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غالب نے سب سے پہلا خط میرے جد اعلیٰ کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا وہ پہلی تاریخ جنوری سنہ ۱۸۵۰ء کو لکھا۔ اردوئے معلےٰ میں جو خطوط شایع ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا خط باعتبار تاریخ کے روز یکشنبہ چہارم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء کا ہے جو منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔"

جناب رسا کی اس مختصر عبارت میں ایک آدھ نہیں تین تین غلطیاں ہیں۔ غالب نے یہ نہیں لکھا کہ "اردو زبان میں یہ میرا پہلا خط ہے" نہ انہوں نے سب سے پہلا اردو خط ان کے "جد اعلیٰ جناب کرامت ہمدانی بہاری مرحوم کے نام لکھا" اور نہ اردوئے معلےٰ میں سب سے پہلا خط باعتبار تاریخ چہارم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ جہاں تک میں غور کر سکا ہوں اردوئے معلےٰ میں سب سے پہلا خط اوائل سنہ ۱۸۴۹ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں انہوں نے لنگی کا تقاضا کیا ہے۔ چونکہ اس خط پر تاریخ موجود نہیں تھی اس لیے جناب رسا کو معلوم نہیں ہوا۔ یہ خط اردوئے معلےٰ کے صفحہ ۲۳۳ پر چھپا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں جوہر والے مولہ زق خط سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا اردو خطوط نویسی سنہ ۱۸۴۹ء میں بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے پہلے شروع کر چکے تھے۔ جناب رسا نے مولانا حالی کی تحریر پر بھروسا کر کے یہ خط تصنیف فرمایا اور اس پر تاریخ یکم جنوری سنہ ۱۸۵۰ء درج کر دی۔ غرضیکہ اگر یہ خط اصلی ہوتا تو بھی یہ کسی طرح میرزا کا اردو میں پہلا خط نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ہمارے پاس اردوئے معلےٰ کے مطبوعہ خطوں میں کم از کم دو خط ایسے موجود ہیں جو اس تاریخ سے پہلے لکھے گئے تھے۔ ایک میرزا تفتہ کے نام (اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۵۹) اور ایک منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام (اردوئے معلےٰ صفحہ ۲۳۶) ان دونوں کے متعلق تفصیل سے میں اپنے گزشتہ مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ خیر یہ تو رسا صاحب کے خط کا ایک پہلو تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پورے کا پورا خط پہلے سے ٹکڑوں میں موجود ہے جن میں سے ایک خط پر کوئی تاریخ نہیں لیکن دوسرا خط یقیناً غدر سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا لکھا ہے کیونکہ اس کی شروع کی سطروں میں مہر نیمروز کے بعد ماہ نیم ماہ کے نہ لکھنے کی وجہ اور غدر کا ذکر ہے۔ میرزا اپنے خطوں کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے ورنہ وہ بعد میں اردوئے معلےٰ میں چھاپنے کے لیے منشی غلام غوث خاں بے خبر اور نواب علاؤالدین احمد خاں سے خطوط کی نقل نہ طلب کرتے پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے سنہ ۱۸۵۰ء میں کرامت مرحوم کے نام یہ خط لکھا ہو اور چھ سات برس بعد اسی کو دو حصوں میں تقسیم

کرکے عبدالرزاق اور عبدالغفور کے نام بھیج دیا ہو۔

رسا صاحب کے خط میں ایک اور بات غور طلب ہو۔ اس خط میں آموں کے نہ بھیجنے کا ذکر ہو۔ خط یکم جنوری کا لکھا ہوا ہو اور یہ سردیوں کے شباب کا زمانہ ہو۔ کیا بہار میں آموں کی فصل ان ایام میں ہوا کرتی ہو؟

مجھے نہیں معلوم کہ مفتی ال سید رحمت علی خاں کی کتاب سراج المعرفت کب شائع ہوئی لیکن اس کے دیباچہ کے آخر میں میرزا لکھتے ہیں:-

"بادشاہ سے کیا عجب ہو کہ دو برس کی تنخواہ دے کر مجھے خانہ خدا کے طواف کی رخصت دیں کہ یہ گنہگار وہاں جاوے اور اگر زیست باقی ہو تو وہاں جاکر اور اپنے ستاون برس کے گناہ کہ جن میں سوائے شرک کے سب کچھ ہو بخشوا کر پھر آوے۔"

تنخواہ کی طرف اشارہ سے ثابت ہوتا ہو کہ میرزا تاریخ نویسی پر ملازم ہو چکے تھے جو جولائی ۱۸۵۰ء کا واقعہ ہو۔ ستاون برس کی عمر سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ دیباچہ انھوں نے سنہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں لکھا۔ اگر یہ استنباط صحیح ہو تو رسا صاحب والے خط کے جعلی ہونے پر قطعی دلیل ہو جس پر تاریخ یکم جنوری ۱۸۵۱ء ہو۔

خط نمبر (۲)

دہلی ۱۲ جنوری ۱۸۵۹ء

ستو میاں۔ طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہو اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایش دنیا بھی مجاز ہو۔ مرادف طرز۔ روش بھی طرح بفتحتین۔ پنج آہنگ تم نے لی۔ دیوان فارسی تمہارے پاس ہو۔ مگر یہ سمجھو کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب مجھ سے اس کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر جو کچھ ہو غنیمت ہو۔ دستنبو میں نے نذر کی ہو مہر نیمروز معلوم نہیں تمہارے پاس ہو یا نہیں الخ

(۱)..... طرح بفتح اول و سکون ثانی بمعنی فریب ہو اور تصویر کے خاکے کو بھی کہتے ہیں اور بمعنی آسایش دنیا بھی مجاز ہو۔ مرادف طرز و روش بھی طرح ہو بفتحتین۔ اس کا تفرقہ منظور رہا کرے۔

(بنام چودھری عبدالغفور سرور، عود ہندی صفحہ ۱۶۷)

(۲)..... پنج آہنگ آپ نے لی۔ دیوان فارسی آپ کے پاس ہو مگر یوں سمجھیے کہ یہ دونوں ناتمام ہیں اور اب مجھ سے اس کا اتمام ممکن نہیں۔ خیر جو کچھ ہو۔ دستنبو میں نے نذر کی ہو مہر نیمروز معلوم نہیں آپ کے پاس ہو یا نہیں الخ۔

(بنام صاحب عالم مارہروی، عود ہندی صفحہ ۱۰۸)

اس خط کے متعلق سب سے بڑا لطیفہ یہ ہے کہ جب اشاعت سے پہلے یہ خطوط میرے پاس آئے ہیں تو اس پر تاریخ ۱۲ر جنوری ۱۸۵۸ء درج تھی میں نے کہا یہ خط جعلی ہے کیونکہ اس میں دستنبو کے نذر کرنے کا ذکر ہوا اور یہ کتاب کہیں نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی جس چیز کا جنوری ۱۸۵۸ء میں وجود ہی نہیں تھا اس کا مہیا آنا یعنی چہ۔ اب اشاعت کے بعد جو دیکھتا ہوں تو اس پر تاریخ ۱۲ر جنوری ۱۸۵۹ء چھپی ہوئی ہے۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

خط نمبر (۳)

دہلی۔ ۲۵ر ستمبر ۱۸۵۸ء۔

جانِ غالب —

گرمی از آب بروں رفت حرارت ز ہوا
محمل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد

موسم اچھا آگیا ہے حسب رائے طبیب تنقیہ ضروری تھا آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ جو شعر تم نے لکھا ہے۔ اس پر خط بطلان غلطی سے کھینچ دیا گیا ہے قصد کرکے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کر دوں گا۔ خدا جانے قلم سے خط کیونکر کھینچ گیا ہے۔ اب مرا اس بجا نہیں۔ حافظہ نہیں رہا۔ اکثر الفاظ بے قصد لکھ جاتا ہوں۔

جس غزل کے بارے میں تم نے لکھا ہے وہ میری ضرور ہے لیکن میرے پاس موجود نہیں۔ میں نے وہ غزل نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو بھیج دی ہے۔ صرف تین شعر یاد رہ گئے ہیں وہ تمہیں بھیجتا ہوں۔ نہ مطلع یاد ہے نہ مقطع (اس کے بعد ہوش آور خروش آور والی زمین میں جو غزل ہے اس کے تین شعر ہیں)

(۱)۔۔۔ جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا معلوم ہوا کہ حرارت ہنوز باقی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائے گی۔ موسم اچھا آگیا ہے —

گرمی از آب بروں رفت حرارت ز ہوا
محمل مہر جہاں تاب بہ میزاں آمد

اگر صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کر لیجیے۔ مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے۔ پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔ (بنام انوار الدولہ شفق۔ عود ہندی ص[illegible]۔ اسی خط کے آخر میں نو شعر کی وہ غزل ہے جس میں سے تین شعر رسا صاحب والے خط میں دیے ہیں)

(۲)۔۔۔۔ نوازش نامہ کو دیکھ کر جانا کہ میں نے کمر بند کے شعر پر خط بطلان کھینچ دیا ہے۔ یہ تو کوئی گمان نہ کرے گا کہ میں کمر کو کمر بند نہیں جانتا۔ معہذا وہاں پہلے مصرع میں اگر کمر بمعنی کمر بند فرض کیجیے تو بھی تو شعر کاٹ ڈالنے کے قابل نہیں قصد کر کے بیٹھا تھا کہ اس شعر پر صاد کروں گا

> خدا جانے قلم سے خط کیونکر کھنچ گیا۔ اب حواس بجا نہیں حافظہ رہا نہیں۔ اکثر الفاظ بے قصد کہہ جاتا ہوں۔ ستر برس کی عمر ہوئی کہ ما تنک خرافت نہ آئے۔ اس شعر کا گنہگار اور حضرت سے شرمسار ہوں۔ معاف کیجیے زیادہ حد ادب
>
> (بنام انوار الدولہ شفق۔ عود ہندی صفحہ ۴۷)

شفق کے نام کے جن دو خطوں کے اقتباس اوپر دیے گئے ہیں، ان دونوں پر تاریخ درج نہیں اور بظاہر ان کی تاریخ تحریر معلوم کرنا محال نظر آتا ہے لیکن ایک قرینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا نے ہوش آور گوش آور والی زمین میں غزل دستنبو کی اشاعت کے بہت بعد لکھی تھی۔ جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں۔ دستنبو نومبر ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا تھا پس اگر یہ غزل نومبر کے بعد لکھی گئی تھی تو ظاہر ہے کہ وہ ستمبر سے پہلے شفق یا کرامت مرحوم کو نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ وہ قرینہ کیا ہے؟

صاحب عالم مارہروی کے نام جس خط کا اقتباس اوپر نمبر ۲ کے بالمقابل دے آیا ہوں۔ اس کے آخر کی عبارت ہے۔

> خلاصہ یہ کہ شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد کے بعد ایک قصیدہ یہ جو دستنبو میں ہے اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی مدح میں اور ایک قصیدہ نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی۔ اس نظم کے سوا اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لے لیجیے۔ قطعہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت الخ۔ رباعی دنیا ہمہ ہیچ است و شادی و غم ہیچ است الخ۔
>
> (بنام صاحب عالم مارہروی۔ عود ہندی صفحہ ۷۲)

میرزا کو ہمیشہ جستجو رہتی تھی کہ انھیں کوئی ان کی فارسی نظم و نثر کا قدرداں ملے۔ اگر وہ یہ غزل لکھ چکے تھے تو کوئی و نہیں نظر آتی کہ وہ کیوں عالم کے خط میں اس کا ذکر نہ کرتے جب کہ مکتوب الیہ خود ان سے تازہ کلام طلب کر رہے تھے اور جیسا کہ ان کے خطوں سے ظاہر ہے میرزا بھی ان کو دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ اس سے لازماً یہی نتیجہ نکلے گا کہ انھوں نے یہ غزل اس وقت تک لکھی ؟

نہیں تھی اور رتسا صاحب والے خط میں جس پر تاریخ ۲۵ ستمبر ہے، اس کا ذکر ناممکنات میں سے ہے۔

خط نمبر (۴)

دہلی۔ بلی ماران۔ ۷ رمئی ۱۸۶۱ء۔

جیتے رہو اور خوش رہو۔ مجھے اس وقت تو خوش کر دیا تھا خوش کر دی۔ تمھارا خط آج صبح کو آیا میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ آج کل یہاں کا حال نہ پوچھو۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دوکانیں حویلیاں ڈہائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائیگا رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈہے گا۔ دونوں طرف سے بھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی سب خیر و عافیت ہے۔ (اس کے بعد غالب کے ایک شعر کی شرح اور کرامت کے ایک شعر پر اصلاح ہے)

..... شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے؟ پون روٹی۔ کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دوکانیں حویلیاں ڈہائی جائیں گی۔ دار البقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کی بڑ تک ڈہے گا۔ دونوں طرف سے بھاوڑہ چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے.....

(بنام میر مہدی مجروح۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۱)

نوشتہ سہ شنبہ ۸ رنومبر ۱۸۵۹ء۔

یہ خط بہت دلچسپ ہے۔ جن اصحاب نے غالب کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ انھیں اس بات سے سخت چڑ تھی کہ کوئی ان سے خط پر لکھنے کے لیے گلی محلہ کا نام پوچھے یا خط کے عنوان میں یہ لکھ دے۔ بلا مبالغہ اردو فارسی تحریروں میں بیسیوں جگہ انھوں نے مکتوب الیہ کو لکھا ہے کہ عنوان میں صرف میرا نام اور دہلی لکھ دیں گلی یا محلہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ "در دہلی بہ اسد اللہ رسد" بس۔ انھیں اپنی شہرت اور نام آوری کا بڑا خیال تھا اگر کوئی ان سے محلہ کا نام پوچھتا تھا تو وہ اس پر برا مانتے اور خیال کرتے تھے گویا سائل انھیں گمنام اور ذلیل سمجھ رہا ہے کہ جب تک محلہ اور تھانہ کا نام نہ لکھا جائے ہرکارہ پتہ نہ پائے۔ الغرض مجھے یقین ہے کہ غالب کبھی بلی ماران نہیں لکھ سکتے تھے اور یہ "ایجاد بندہ" ہے۔

یہ محصول دہلی میں انگریزی قبضہ کے بہت بعد، نومبر ۱۸۵۹ء سے جاری ہوا تھا میرزا ایک دوسرے

خط میں حسین مرزا کو لکھتے ہیں:۔

"آج کل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ "پون ٹوٹی" کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں ۸ نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالک رام خزانچی، چھنامل، بھیش داس ان تین شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ لگا ہو (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۱)

پس جب یہ محصول ۸ نومبر سے شروع ہوا تو چھ ماہ قبل ۸ مئی کے خط میں اس کا ذکر کیسے ہو سکتا ہے۔

اب ایک لطیفہ سنیئے۔ آپ نے دیکھا کہ دونوں جگہ میرزا نے ایک لفظ "پون ٹوٹی" لکھا ہے لیکن رسا صاحب والے خط میں یہ لفظ موجود نہیں۔ مجھے قوی شبہ ہے کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ یہ لفظ کیا ہے ورنہ وہ ضرور اسے بھی لکھ دیتے (اور اگر رسا صاحب والا خط واقعی میرزا کا لکھا ہوتا تو اس میں بھی آپ یہ لفظ ضرور پاتے) یہ لفظ "ٹاؤن ڈیوٹی" ہے۔ میرزا نے کسی سے یونہی سنا اور لکھ دیا۔ ورنہ وہ خود بھی نہیں سمجھے کہ یہ کیا بلا ہے۔ اسی لیے میر مہدی کے خط میں لکھتے ہیں: "پون ٹوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے"

خط نمبر (۵)

دہلی۔ ۲۵ راکتوبر ۱۸۵۹ء

جان غالب! یہ دن مجھ پر برے گزرتے ہیں۔ میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں کہ غم والم کا ہجوم ہے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو صہیل بوزن دلیل کہتے ہیں، صیہہ بوزن بعینہ عموماً بمعنی ہر صدائے ہولناک مہیب آتا ہے کیونکہ فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں اور کیونکر کاتبوں

(۱)...... یہ دن مجھ پر برے گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً تموز میں کہ غم والم کا ہجوم ہے۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

(بنام انوار الدولہ شفق۔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۲)

(۲)...... تمہارا محبوب بوہرہ دکنی شین منقوطہ مع التحتانی کے بیان میں شیہہ کو گھوڑے کے ہنہنانے کی فارسی بتاتا ہے۔ عربی میں گھوڑے کے ہنہنانے کو

کے املا کو مصحف مجید کی طرح مہر بہ مہر دوں۔ یہ تو عجب
ہو سکتا ہو کہ میں اپنے کو جاودنبات فرض کروں۔
میں نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی
کی ہو پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز
اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہو نظم ونثر فارسی کا عاشق
اور مایل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی
کا گھایل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان
میں بہت کچھ بکا۔ اب نہ فارسی کی فکر نہ اردو کا ذکر۔
نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید میں ہوں اور اندوہ
ناکامی جاوید جیسا کہ خود قصیدہ نعت کی تشبیب میں
کہتا ہوں ؎ چشم کشودہ اند بہ کردار ہائے من
زاینده ناامیدم واز رفته شرمسار
نجات کا طالب غالب

سہیل بوزن دلیل کہتے ہیں۔ جیسے بوزن بغضہ عموماً بمعنے
ہر صدائے ہولناک و ہیبت آتا ہو۔ کیونکہ فرہنگ نگاروں
کے اور اون کے مددگاروں کے قیاس کو وحی سمجھوں
اور کیونکر کاتبوں کے املا کو مصحفِ مجید کی طرح سربہ
مہر دوں۔ یہ تو عجب ہو سکتا ہو کہ اپنے کو جاودنبات فرض
کروں...... (نامۂ غالب بنام میرزا رحیم بیگ نوشتہ
۱۸۶۵ء۔ عود ہندی صفحہ ۱۲۵)

(۳)۔ ... تم دانائے رموز اردو زبان ہو۔ سرمایۂ نازش
قلمرو ہندوستان ہو۔ خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں
اردو زبان میں سخن سرائی کی ہو پھر اوسط عمر میں بادشاہ
دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہو
نظم ونثر فارسی کا عاشق اور مایل ہوں۔ ہندوستان
میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھایل ہوں جہانتک
زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا۔ اب نہ فارسی
کی فکر نہ اردو کا ذکر۔ نہ دنیا میں توقع نہ عقبیٰ کی امید میں
ہوں اور اندوہ ناکامی جاوید جیسا کہ خود قصیدہ نعت
کی تشبیب میں کہتا ہوں ؎

چشم کشوده اند به کردار ہائے من
زاینده ناامیدم واز رفته شرمسار

(بنام عبدالغفور خاں بہادر نساخ ۱۸۶۲ء اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۶)

اس خط کے تین ٹکڑے ہیں۔ یہ تینوں زبان حال سے اپنے مرتب کے جعل کی گواہی دے رہے ہیں۔ شروع ہی

میں "گرمی" اور "تموز" کی شکایت ہے۔ رسا صاحب کو معلوم رہے کہ ممکن ہے بہار میں دسمبر جنوری آموں کا موسم ہو لیکن دہلی میں یقیناً ۲۵ راکتوبر گرمی کا زمانہ نہیں کہ میرزا یوں بے تابی کا اظہار کرتے۔ شفق کے جس خط سے یہ ٹکڑا لیا گیا ہے اس کا سال تو میں متعین نہیں کر سکا ہوں غالباً ۱۸۶۳ء ہے لیکن مہینہ جون یا جولائی ہے اس میں ہرگز شبہ کی گنجایش نہیں۔ جون جولائی واقعی گرمی کا زمانہ ہے اور وہاں غالب کی شکایت بجا ہے۔

دوسرا ٹکڑا اس سے عجیب تر ہے۔ میرزا رحیم بیگ کو تصیل اور شیشہ اور صیحہ وغیرہ کے متعلق لکھنے کا کچھ تک بھی ہو کیونکہ وہاں میرزا مولف برہان قاطع محمد حسین دکنی اور دوسرے ہندوستانی فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں، سعادت علی خاں مولف محرق قاطع اور امین الدین پٹیالوی مولف قاطع القاطع اور خود میرزا رحیم بیگ مولف ساطع برہان اور اسی قماش کے دوسرے بزرگوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں لیکن کیا رسا صاحب بتا سکتے کہ چھ برس قبل جب قاطع برہان طبع بھی نہیں ہوئی تھی اور "فرہنگ نگاروں اور ان کے مددگاروں" کا وجود بھی نہیں تھا۔ یہ سطریں کرامت مرحوم کو لکھنے کا کون موقع تھا۔

پھر ان دونوں عبارتوں کے بعد اپنی صلاحیتوں اور حسرتوں کے بیان کا کون مقام ہے اور یہ جواب کس سوال کا ہے؟

میرے خیال میں مزید بالمقابل عبارت نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے مضمون بیکار لمبا ہو جائیگا جن اصحاب کو تصدیق منظور ہو وہ میرے درج کردہ حوالے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

خط نمبر ۶ اور ۷ کی پوری عبارتیں بھی اسی طرح اردوئے معلےٰ اور عود ہندی میں موجود ہیں خط نمبر ۶ دو خطوں سے مرتب ہوا ہے۔ یہ دونوں خط چودھری عبدالغفور سرور کے نام ہیں۔ پہلا حصہ عود ہندی صفحہ ۲۹ پر ہے اور آخری حصہ صفحہ ۲۶ پر۔ خط نمبر ۷ کی عبارت دو تین جگہ تقسیم ہو کر چھپی ہوئی موجود ہے۔

خط نمبر ۸ ذرا زیادہ دلچسپ ہے اس لیے اسے نقل کرتا ہوں:

دہلی، بلی ماران۔ ۷ راکتوبر ۱۸۵۳ء

"جان غالب مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شاہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا

> برسات کا حال کیا پوچھتے ہو. خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں. مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلمدان سب توشہ خانے میں فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔ ایسی حالت میں اگر خط کے جواب میں دیر ہوا کرے تو خیال نہ کرو۔ (اس کے بعد نقش فریادی ہے الخ کی شرح درج ہے)

"بلی ماران" کے متعلق اوپر لکھ چکا ہوں. قارئین حیران ہو گئے کہ سنہ ۱۸۵۹ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے خطوں کے بعد یہ سنہ ۱۸۵۳ء کا خط کہاں سے ٹپک پڑا لیکن تعجب بے جا ہے جب یہ خط تصنیف ہوا ہے تو واقعی اس پر تاریخ سنہ ۱۸۶۰ء تھی لیکن جب میں نے خط دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ قبلہ غدر کے بعد سنہ ۱۸۶۰ء میں قلعہ اور شاہزادگان اور ان کے مشاعرہ اور میرزا کے وہاں جانے کا ذکر کچھ بے محل سا معلوم ہوتا ہے تو حضرت متنبہ ہوئے اور تاریخ سنہ ۱۸۵۳ء کر دی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ پہلا ٹکڑا لفظ بلفظ خان بہادر قاضی عبدالجمیل صاحب جنون بریلوی کے خط میں موجود ہے۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵۴)

پہلے ٹکڑے کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے سنہ ۱۸۶۰ء کی جگہ سنہ ۱۸۵۳ء تو لکھ دیا لیکن یہ خیال میں نہ آیا کہ دوسرے ٹکڑے کے طوفان نوح کی تاریخ کا کیا بنے گا. یہ عبارت حرف بہ حرف میر مہدی مجروح کے خط کی ہے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳۳) اور یہ خط جولائی سنہ ۱۸۶۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ میرزا کے متعدد خطوں میں اس برسات کا ذکر ہے۔ اسی موقع پر انھوں نے نواب علاؤالدین احمد خاں سے کہہ کر مکان مانگا تھا جس کے متعلق ان کا صاحب بہادر رادھیم اور بابا لوگ والا لطیفہ مشہور ہے۔ نیز جناب رسؔا کو معلوم ہونا چاہیے کہ دہلی میں اکتوبر میں ایسا برسات کا موسم نہیں کہ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ یہ خزاں کا زمانہ ہے اور ان دنوں شدید بارش تو درکنار عموماً ایک بوند تک نہیں گرا کرتی۔

ایک اور بات۔ اس خط کے دو فقرے "عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا" اور "مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا" ظاہر کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ میرزا کے مکان سے خوب

واقف ہو۔ مجروحؔ کے متعلق تو کسی قسم کا شبہ نہیں۔ کیا رسا صاحب کے پردادا کبھی دہلی تشریف لائے تھے؟

خط نمبر ۹ بہ تاریخ "دہلی ۲ر دسمبر ۱۸۶۶ء" درج ہو اور اس میں وہ لطیفہ لکھا ہو جو حالیؔ نے یادگار غالب میں بیان کیا ہو کہ میر مہدی نے میرزا کے پاؤں اس شرط پر داب‌ے کہ وہ اس کی اجرت قبول کریں گے اور بعد میں میرزا نے کہا "بھیا اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں داب‌ے میں نے تمھارے پیسے داب‌ے چلو حساب برابر سرابر" رسا صاحب خط شروع کرتے ہیں :-

"سنو صاحب! ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ رات میں پلنگ پر پڑا کراہ رہا تھا میر مہدی پاس بیٹھے تھے اٹھ کر پاؤں دابنے لگے الخ"

نہ صرف یہ کہ دسمبر ۱۸۶۶ء میں ان کے کراہنے کے لیے ہمارے پاس کوئی وجہ اور ثبوت نہیں۔ دسمبر کی ان تاریخوں میں میر مہدی مجروحؔ دہلی میں تھے ہی نہیں اور یہ اردوئے معلےٰ کے مطبوعہ خطوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

خط نمبر (۱۰)

دہلی۔ ۹ر جنوری ۱۸۶۶ء

"شاہ صاحب! یہ جو تم نے شکایت نامہ بھیجا ہو اس کے بعد ایک خط میرا ابھی تم کو پہنچا ہوگا۔ یہ خط آج آیا ہو آج ہی اس کا جواب لکھتا ہوں۔ اپنا حال کیا لکھوں۔ ایک بی بی دو بچے تین چار آدمی گھر کے۔ کلو۔ کلیان ایاز یہ باہر۔ مداری کے جورو بچے بدستور رگیا مداری موجود ہو۔ میاں گھمن گئے گئے مہینہ بھر سے آگئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود مقام معلوم سے کچھ آئے جاتا ہو وہ بھی بقدر رسد رمق ہو۔ محنت وہ ہو کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہو۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہو۔ آدمی ہوں بھوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیونکر کروں۔ بڑھاپا ضعف قویٰ۔ اب مجھے دیکھو تو جانو کہ میرا کیا رنگ ہو۔ صاحب فراش ہوں نہ کہیں جانے کا ٹھکانا نہ میرے پاس کوئی آنے والا۔

چلبچی کے متعلق جو تم نے دریافت کیا ہو تو یہ لفظ صحیح ہو غلط نہیں۔ ابھی ابھی میں نے حبلدلرزاق شاکر کا قصیدہ دیکھا ہو اور ان کا مطلع درست کیا ہو وہ مطلع یہ ہو ؎

ہے تمھارا آفتابہ آفتابِ آسماں　　دیکھ لو اپنی چلمچی میں حبابِ آسماں

دیکھو اس میں چلمچی ہو سلفچی نہیں۔ نجات کا طالب غالب

اس خط کا پہلا فقرہ یوسف مرزا کے خط میں موجود ہے جو ۵ رنومبر ۱۸۵۹ء کا نوشتہ ہے (اردوے معلی صفحہ ۲۵۴) "ایک بی بی دو بچے" سے لے کر آخر تک پورا پیرا اس سے اگلے خط میں ہے۔ (اردوے معلی صفحہ ۲۵۶) جو ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کی تحریر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس خط کا لب ولہجہ اور مضمون بھی حد درجہ واقف کارانہ ہے اور مکتوب الیہ کے لیے میرزا کے خانگی معاملات کے نشیب و فراز سے پوری واقفیت لازمی ہے۔ اور کرامت مرحوم کے متعلق ہمارے پاس ایسی کوئی شہادت موجود نہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے کہ اگر ۲۸ رنومبر ۱۸۵۹ء کو کمشن کو واپس آئے ایک مہینہ ہوا تھا تو ۹ رجنوری ۱۸۶۰ء کو بھی جو رسا صاحب کے خط کی تاریخ ہے یہ مدت ایک ماہ ہی نہیں ہو سکتی لیکن زیادہ پُرلطف چلمچی والا ٹکڑا ہے۔ اس خط کے آخر میں رسا صاحب نے ایک نوٹ بھی لکھا ہے فرماتے ہیں:-

"عودِ ہندی کے صفحہ ۱۰۴ میں میرزا غالب کا خط عبدالرزاق شاکر کے نام چھپا ہوا موجود ہے۔ اس میں میں نے یہ مطلع اپنی آنکھوں سے دیکھا چلمچی کا لفظ چھپا ہوا ہے۔ سلفچی نہیں ہے۔ رسا ہمدانی"

آمنا و صدقنا! جناب رسا صاحب کو اتنی تاکید کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے پہلے ان کی کونسی تحریر پر شبہ کا اظہار کیا ہے جو اب چلمچی پر کرتے کہ وہ تصدیق کے لیے عودِ ہندی کو ملاحظہ فرماتے اور پھر ہمیں یقین دلانے کے لیے اپنی آنکھوں کا واسطہ دلاتے ہیں۔ آخر اتنی زحمت کشی کی کیا ضرورت پیش آئی تھی! ان کے قسمیں کھانے سے شبہ گزرتا ہے کہ اس میں پس پردہ کوئی راز ہے۔ کیا وہ اس پر روشنی ڈالیں گے؟

لیکن حیرت ہے تو اس بات پر کہ انھیں شاکر کے خط میں چلمچی کا لفظ تو نظر آ گیا لیکن اس کی تاریخ نظر نہ آئی حالانکہ چلمچی اور سلفچی کی بیکار بحث سے یہ کہیں زیادہ اہم بات تھی کیونکہ یہ دونوں لفظ صحیح ہیں اور خود غالب نے ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ شاکر کے نام میرزا کا خط شروع ہوتا ہے:-

"قبلہ آپ کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ۸ رجنوری کو فقیر دلی پہنچا۔ تھکا ماندہ، خستہ و رنجور، ہنوز افاقت کلی نہیں پائی الخ۔

جناب رسا کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرزا یہاں رامپور کے دوسرے سفر سے واپسی کا ذکر کر رہے ہیں وہ اس سفر سے ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء کو دہلی پہنچے تھے۔ رسا صاحب نے اپنے خط پر تاریخ ۹ر جنوری ۱۸۶۱ء دی ہے۔ اب وہ یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے :۔

"ابھی ابھی میں نے عبدالرزاق کا قصیدہ دیکھا ہے اور ان کا مطلع درست کیا ہے"

گویا میرزا ۹ر جنوری ۱۸۶۱ء کو حوالہ دے رہے ہیں ۱۸۶۶ء کے ایک خط کا اور "ابھی ابھی" لکھ کر۔ یا للعجب۔ رسا صاحب یہ نہیں فرما سکتے کہ یہ کتابت کی غلطی ہے کاتب نے ۱۸۶۶ء کی جگہ ۱۸۶۱ء لکھ دیا ہے۔ اول تو جب میں نے سودہ دیکھا ہے اس وقت بھی خط پر سال ۱۸۶۱ء ہی لکھا تھا اب بھی وہی ہے۔ دوسرے اگلے خطوں پر بھی ۱۸۶۱ء کے بعد کی تاریخیں ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کا کوئی خط ۱۸۶۲ء کے بعد کا ہے ہی نہیں۔ چونکہ انھوں نے کتاب میں خطوط کو تاریخ وار درج کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی اس خط کی تاریخ ۱۸۶۱ء ہی ہے ورنہ یہ سب سے آخر میں ہوتا۔

ممکن ہے کہ رسا صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق کتابت کی غلطی پر اصرار کریں اس لیے میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ شاگرد والا خط ۹ر جنوری کا لکھا ہوا نہیں بلکہ اس سے بہت دن بعد کا ہے اس سے ان کے لیے "ابھی ابھی" درست ثابت کرنے کے لیے کتابت کی غلطی کا عذر چنداں مفید نہیں ہوگا۔

خط نمبر ۱۱ کا مضمون رباعی کے متعلق ہے جو بعینہٖ چودھری عبدالغفور سرور کے خط میں موجود ہے (عود ہندی صفحہ ۲۶۵)

خط نمبر ۱۲ کی عبارت جوں کی توں منشی شیونراین کے خط میں موجود ہے (اردوئے معلی صفحہ ۲۹۵) فرق صرف اتنا ہے کہ آرام کے خط کی تاریخ ۲۳ر اکتوبر ۱۸۵۸ء ہے جو موضوع عبارت کے لحاظ سے زیادہ قرین قیاس ہے اور رسا صاحب نے "دہلی بلی ماران ۲۰ر جولائی ۱۸۶۱ء" لکھی ہے۔

خط نمبر ۱۳ ذرا زیادہ اہم ہے اس لیے اسے نقل کرتا ہوں :۔

دہلی۔ بلی ماران ۱۲ر اگست ۱۸۶۳ء

"بھائی ! تم جیتے رہو اور مراتب عالیہ کو پہنچو۔ تمھارے خط میں پچاس پچاس روپے کے دو نوٹ پہنچے۔ میں مسہل میں ہوں یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظ صحت کے لیے مسہل لے لیا ہے۔ تمھاری غزل غور

سے دیکھ کر تمھارے پاس بھیجتا ہوں ؂

بلبل نہ جا قریب کہ لپٹے ہیں خار دیکھ　　ہو کر الگ تو باغ سے گل کی بہار دیکھ

اس مطلع کے دوسرے مصرع کو یوں بنا دو گے۔ تو دور ہی سے باغ میں گل کی بہار دیکھ۔

تمھارے اشعار کی کاپی دیکھی، ہائے کیا بُری کاپی ہوا پنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے۔ تمھاری مثنوی ایک معشوق خوبرو ہو مگر بدلباس ہو اور بھائی تمھاری مشق چشم بددور صاف ہو گئی۔ مطلب و ایہام تمھارے کلام میں نہیں رہا اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہو کہ اصلاح ضرور ہو تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے۔ نجات کا طالب غالب

اس خط کا مضمون چار مطبوعہ خطوں سے مرتب ہوا ہو لیکن میں اس کے متعلق صرف دو باتیں عرض کروں گا۔

اوّل جب میں نے مسودہ دیکھا ہو تو اس خط پر سال ۱۸۶۱ء درج تھا۔ میں نے کہا کہ ۱۲ راگست ۱۸۶۱ء تک پچاس پچاس روپے کے نوٹ جاری ہی نہیں ہوئے تھے اس لیے یہ خط جعلی معلوم ہوتا ہو۔ یہ کہیں ۱۸۶۲ء میں جاری ہوئے تھے اب چھپنے کے بعد اس کا سنہ ۱۸۶۳ء ہو گیا ہو۔

دوم۔ اشعار کی کاپی والا مضمون حرف بہ حرف تفتہ کے نام ایک خط میں ہمارے پاس موجود ہو۔ جو میرزا نے انھیں "سنبلستان" کی اشاعت پر لکھا تھا (اردوئے معلیٰ صفحہ ۵۱) اس خط پر تاریخ ۹ اراپریل ۱۸۶۱ء ہو۔ ممکن ہو میرزا نے بالکل وہی لفظ ڈھائی سال بعد جناب کرامت ہمدانی مرحوم کو بھی لکھے ہوں لیکن اس کا فیصلہ آسانی سے ہو سکتا ہو۔ جناب رسا صاحب کے پاس اپنے پردادا کی جملہ تصنیفات تو ہوں گی۔ وہ بتائیں کہ اس خط میں کرامت کی کونسی مثنوی کا ذکر ہوا ہو اور اس کا سال اشاعت کیا ہو اور کیا یہ مثنوی ایسے ہی بھدے کاغذ پر چھپی ہو؟

خط نمبر ۱۴ کا ابتدائی حصہ حضرت صاحب عالم مارہروی کے ایک خط سے ماخوذ ہو جو عودِ ہندی کے صفحہ ۳۳ پر موجود ہو۔ آخری حصہ جو ایطا کی بحث سے متعلق ہو وہ بھی ان ہی کے نام دوسرے خط میں ہے (عودِ ہندی صفحہ ۹۱)

خط نمبر ۱۵ کا مضمون جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یادگار غالب میں ہے لیکن چونکہ یہ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں اس لیے میں نہ تصدیق کر سکتا ہوں نہ حوالہ دے سکتا ہوں۔

خط نمبر ۱۶ کا ابتدائی حصہ بھی "یادگار غالب" میں ہے اور آخری شفق کے خط میں ہے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۲) نمبر ۱۷ سے لے کر ۲۰ تک چاروں خط بعض اشعار کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ چونکہ یہاں میرے پاس کوئی شرح نہیں اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ یہ نکات و معارف کسی شارح نے بیان کیے ہیں یا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا ماخذ یا یادگار غالب ہے یا بجنوری مرحوم کا "محاسن کلام غالب"۔

خط نمبر ۲۱ میں شعر کی تشریح کو چھوڑ کر باقی پورا مضمون چودھری عبدالغفور سرور کے نام نوشتہ دو خطوں میں ہے (عود ہندی صفحہ ۱۹۱ و صفحہ ۲۳۲)

آخری دو خطوں میں کچھ تصوف ہے اور کچھ شرح اشعار۔

یہ ہے سرگزشت ان ان ۲۴ خطوں کی جو جناب رسا صاحب ہمدانی مدظلہ نے نادر خطوط غالب کے عنوان سے مداحین غالب کے سامنے پیش کیے ہیں۔ معلوم نہیں شائع شدہ خطوط کو دوبارہ چھاپ دینے میں کیا ندرت ہے اور انھوں نے ایسی جرأت کیونکر کی۔ کیا انھیں خیال تھا کہ لوگوں نے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے یا یہ دونوں کتابیں دنیا کے صفحے سے ناپید ہو گئی ہیں کہ کوئی ان کی کارگزاری پر مطلع نہیں ہوگا

ایک اور قرینہ ان خطوں کے جناب مرتب کے دماغ کی پیداوار ہونے پر یہ ہے کہ یہ غالب کے طرز نگارش کی بعض نمایاں خصوصیات سے عاری ہیں۔ مثلاً میرزا کی یہ عام روش ہے کہ جہاں ان کا مکتوب الیہ مسلمان ہے وہاں وہ اکثر عیسوی تاریخ کے ساتھ ہجری تاریخ بھی لکھ دیتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں مرتبوں کی غلطی سے بہت کم خطوں کے ساتھ تاریخیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر میں دونوں عیسوی اور ہجری تاریخیں موجود ہیں۔ نیز ان کی عام عادت ہے کہ وہ تاریخ کے ساتھ دن کا بھی اظہار کر دیتے ہیں۔ بہت شاذ حالتوں میں دن کا ذکر نہیں۔ ان ۲۴ خطوں میں ایک بھی خط ایسا نہیں جہاں ہجری تاریخ یا دن کا ذکر ہو۔

الغرض میں پورے وثوق کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب خط جعلی ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ غالب کی تحریریں نہیں بلکہ جیسے کہ میں لکھ چکا ہوں جناب رسا نے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی

نے کنبہ جوڑنے کے اصول پر عمل کیا ہے اور انھوں نے مطبوعہ خطوں کے مختلف ٹکڑوں کو یکجا کر کے یہ خط مرتب کیے ہیں۔ مدعا یہ کہ میرزا غالب نے یہ کبھی ان کے پردادا جناب کرامت مرحوم کے نام نہیں لکھے اور اس کا ثبوت مختصراً یہ ہے کہ

اول۔ جملہ خطوط ہمارے پاس شایع شدہ موجود ہیں جو بعض دوسرے اصحاب کے نام لکھے گئے تھے۔ میرزا ان ہی خطوط کو جناب کرامت مرحوم کو نہیں بھیج سکتے تھے جب تک ان کی نقول ان کے پاس نہ ہوں اور اس کے متعلق ہمیں علم ہے کہ وہ خطوں کی نقل نہیں رکھتے تھے۔

دوم ان خطوں میں متعدد مقامات پر بعض ایسے واقعات کا ذکر ہے جو مندرجہ تاریخ تک وقوع پذیر ہی نہیں ہوئے تھے اور یہ ان کے جعل پر برہان قاطع ہے۔

سوم بعض خطوط میں ایسی باتیں درج ہیں جن سے لازم آتا ہے کہ میرزا کے ساتھ مکتوب الیہ کے تعلقات نہایت گہرے اور بے تکلفانہ ہوں اور وہ ان کے خانگی حالات سے پوری طرح آگاہ ہوں ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں جس سے ثابت ہو کہ جناب کرامت مرحوم میرزا کے ایسے ہی بے تکلف دوست تھے۔ اور

چہارم۔ یہ خطوط میرزا کے اسلوب تحریر کی بعض ضروری خصوصیات سے معرا ہیں۔

مالک رام ایم، اے

ہماری آبادی

گزشتہ تیس سال سے ہندوستان کی مردم شماری میں ہر مرتبہ افسوس ناک اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ مردم شماری کے ساتھ کئی اور اعداد و شمار جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ جن کا مردم شماری سے کوئی تعلق نہیں ہو۔ علمی نقطۂ نظر سے کسی ملک کی آبادی کا اندازہ لگانے کا مقصد یہ ہو کہ اُس ملک میں وقت اور رقبہ کے لحاظ سے آبادی کی رفتار ترقی معلوم ہو سکے۔ مردم شماری سے معلوم ہو سکتا ہو کہ ملک کے ایک حصہ سے نقل وطن کرکے لوگ دوسرے خطوں میں کس رفتار سے آباد ہو رہے ہیں۔ شہروں کی تعداد اور وہاں کے باشندوں کی تعداد میں رفتار ترقی کا تخمینہ لگایا جاسکتا ہو۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کی تعداد سے مستقبل کے متعلق اہم نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ ہوتا ہو اور اس طرح فلاح و بہبود کے لیے لائحۂ عمل تیار کیا جا سکتا ہو کہ مفید اثرات کو قایم رکھا جائے اور تباہ کن اثرات کو روکا جائے لیکن ہندوستان کی مردم شماری میں مذہب، نسل، قومیت، فرقہ، زبان اور اسی طرح کے اور امور کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معلومات مفید ہیں لیکن مردم شماری سے ان کا بہت کم تعلق ہو۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مردم شماری کے اس وسیع مفہوم کے ساتھ صحیح اعداد و شمار کا مہیا کرنا نہایت دشوار ہو گیا ہو۔

ہندوستان کی سلسلہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری نہایت پرآشوب زمانہ میں ہوئی۔ نہ ہندوستان میں امن و چین ہو نہ دنیا میں صلح و آشتی۔ اس وقت ہندوستان اور دنیا کے تمام ممالک سخت اقتصادی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ موجودہ جنگ کے باوجود اکثر ممالک میں بیکاری کا مسئلہ پریشان کن ہو۔ اکثر ممالک نے زراعت کی کمی کو صنعت و حرفت اور بیرونی تجارت کے فروغ سے پورا کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس دور میں زندگی کے ہر شعبہ میں سائنس کی برکات نمایاں ہیں۔ صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہو رہی ہو۔ دنیا کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہو۔ لیکن بین الاقوامی معاشی نظام اور سرمایہ داری کی بندشوں نے افراط اور فراوانی کے باوجود تفریطا اور

فلاکت کو ساری دنیا پر مسلط کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی آبادی میں بھی بہت اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اگر تمام دنیا کی اجناس، دولت اور خدمات کی تقسیم اور تبادلہ ایک معقول طریقہ سے بغیر کسی مصنوعی رکاوٹ کے ہو اور اگر زرعی، نباتی اور صنعتی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے تو دنیا کے باشندے آرام و آسایش سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی میں صنعتی سرگرمیوں میں زبردست انقلاب واقع ہوا ہے۔ مشینوں کی تیز رفتاری نے دنیا کی دولت میں بہت اضافہ کر دیا ہے لیکن دولت کی مناسب تقسیم میں کئی رکاوٹیں حایل کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ معدودے چند ملک اپنی تمام ضروریات کے لیے بالذات کافی ہیں۔ اکثر ممالک ایسے ہیں جنھیں اپنی ضروریات کے لیے دوسرے ممالک کا شرمندۂ احسان رہنا ضروری ہے لیکن قومیت کے جنون نے "اقتصادی کفایت" کی آواز کو دنیا کے تمام ممالک میں عام کر دیا ہے۔ ہر ملک انتہائی کوشش کر رہا ہے کہ اپنی تمام ضروریات زرعی، صنعتی اور معدنی خود مہیا کرے۔ موجودہ جنگ نے اس تحریک کو تقویت پہنچائی ہے۔ بین الاقوامی تجارت کے راستے میں غیر معمولی زاید محصول عاید کیے جاتے ہیں تاکہ درآمد و برآمد کو روکا جائے۔ اس طرح دنیا سے آزاد تجارت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع اور اشیائے خام آلاتِ حرب کی تیاری میں صرف کیے جا رہے ہیں۔ زرتبادلہ کی مشکلات کی وجہ سے اکثر ممالک نے آپس میں ایسے معاہدے کیے ہیں جن سے ان ممالک کی تجارت صرف مختلف اشیا کے تبادلہ کی حد تک رہ گئی ہے۔ دنیا کے موجودہ معاشی نظام کی ان پیچیدگیوں اور مشکلوں میں دنیا کی روز افزوں آبادی کو دیکھ کر دو اہم سوال سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق دنیا کے تمام ممالک پر یکساں ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ان اقتصادی مشکلات میں موجودہ معیار زندگی کس طرح قایم رکھا جا سکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر دنیا کی آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو محدود ذرائع اور دولت کے ساتھ موجودہ معیار زندگی برقرار رہ سکے گا؟

ہندوستان کی آبادی کے مسائل کو بھی ہم ان دو سوالات کی روشنی میں دیکھیں گے۔ ہندوستان میں اوسط ماہانہ آمدنی کا اندازہ چار روپے فی شخص کیا گیا ہے۔ اس قلیل آمدنی میں معمولی ضروریات زندگی حاصل نہیں کی جا سکتیں ہمارا معیار زندگی اس قدر گرا ہوا ہے کہ دنیا کے اور ممالک سے اس کا کسی طرح مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے آبادی کے متعلق پہلا سوال ہندوستان کے لیے ذرا تبدیلی کے ساتھ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ کن ذرائع کو

اختیار کرنے سے ہندوستان کا معیار زندگی بلند کیا جا سکتا ہے"؟

ہندوستان کی آبادی تمام دنیا کی آبادی کے پانچویں حصہ کے برابر ہے۔ یہ دنیا کے اہم ترین صنعتی ممالک میں شمار کیا جاتا ہے حالانکہ ۷۰ فی صدی باشندے زراعت پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ بین الاقوامی کاروبار میں ہندوستان کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے معاشی نظام میں ہندوستان اہم حیثیت کا مالک ہے۔ یہاں کے حالات کا مطالعہ اور مستقبل کے متعلق غور و فکر نہ صرف ہندوستان کے لیے ضروری ہے بلکہ تمام دنیا کے لیے بھی اہم ہے

ایک ملک کا معیار زندگی وہاں کے اقتصادی حالات، باشندوں کی صحت و تندرستی اور صلاحیت کا مظہر ہوتا ہے۔ معیار زندگی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ (جو دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند ملک ہے) کے مفکرین پریشان ہیں کہ وہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ذرائع آمدنی اور قومی دولت کو کس طرح فروغ دیا جائے کہ معیار زندگی پست نہ ہو جائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آبادی ہندوستان کی آبادی کے ایک تہائی سے کم ہے۔ ہندوستان میں چالیس کروڑ نفوس آباد ہیں اور ریاستہائے متحدہ میں تقریباً تیرہ کروڑ لیکن اس کا رقبہ ہندوستان سے تین گنا زیادہ ہے۔ وہاں دولت کی فراوانی ہے چین اور جاپان کی مسلسل جنگ اور یورپ کی موجودہ جنگ سے اس کی مالی حالت اور سونے کے ذخیرہ میں خطرناک حد تک ترقی ہوئی ہے۔ وہاں غیر ممالک کے باشندوں کی آمد اور ان کے شہری حقوق حاصل کرنے پر متعدد پابندیاں ہیں ضبط تولید کے مصنوعی طریقوں کے کثیر استعمال سے وہاں کی آبادی کی رفتار ترقی کم ہے۔ ان حالات کے باوجود ریاستہائے متحدہ کے ارباب حل و عقد ایک ایسا نظام عمل مرتب کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے معیار زندگی پر مضر اثر نہ پڑے۔ ہندوستان کے حالات ریاستہائے متحدہ کے مقابلہ میں حد درجہ مایوس کن ہیں۔ مثلاً ایک ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۶ سال ہے اور ریاستہائے متحدہ کے باشندے کا اوسط ۶۲ سال۔ ہمارا معیار زندگی حد درجہ پست ہے اس لیے ہمارے سامنے موجودہ معیار کو برقرار رکھنے کا سوال نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کس طرح ہمارے رہنے سہنے کے طریقہ کو مناسب بنایا جا سکتا ہے۔

جب ہم ہندوستان کے حالات پر غور کرتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری آبادی بہت زیادہ نہیں ہے؟ یہ سوال اگر کسی دوسرے ملک میں وہاں کی آبادی کے متعلق کیا جائے تو مختلف مفاد کے نمائندے مختلف جواب

پیش کریں گے مثلاً جاپان، جرمنی اور اٹلی میں فوجی طاقت کے بڑھانے کا جنون کارفرما ہے۔ اور وہاں آبادی کو ہر طریقہ سے زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوششیں جاری ہیں۔ موجودہ جنگ سے قبل فرانس کی آبادی کی رفتار ترقی بہت کم تھی۔ روس کی موجودہ حکومت نے جرمنی سے سبق لے کر وہ تمام تدابیر اختیار کی ہیں جن سے آبادی میں سرعت سے اضافہ ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ میں فوجی نمائندے آبادی میں اضافہ کے طرفدار ہیں لیکن مزدور طبقہ کے رہنما اس کے مخالف ہیں۔ موجودہ جنگ سے قبل برطانیہ میں بھی یہی حال تھا لیکن اب رائے عامہ چاہتی ہے کہ وہاں کی آبادی تیزی سے بڑھے۔ بالعموم ہر ملک میں سرمایہ دار چاہتے ہیں کہ آبادی میں ترقی ہو تاکہ سستی مزدوری پر زیادہ کام کرنے والے آدمی دستیاب ہو سکیں لیکن مزدور طبقہ کے بہی خواہوں کا خیال ہے کہ آبادی میں غیر معمولی ترقی سے معیار زندگی پست ہو جائے گا اور وہ سرمایہ داروں سے اس معاملہ میں سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے حالات مذکورہ بالا ممالک سے مختلف ہیں۔ یہاں بڑے کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد کا اندازہ صرف پچیس لاکھ کیا جاتا ہے۔ جو آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ہماری آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے اور ۷۰ فی صدی سے زیادہ باشندے زراعت پر بسر اوقات کرتے ہیں کسانوں کی اقتصادی حالت مزدوروں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اس لیے صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ آبادی دیہاتوں سے نقل وطن کر کے شہروں کی طرف رجوع ہو رہی ہے۔ بہرحال ہندوستانی مزدور ہو یا کسان، اس کا معیار زندگی انتہائی پست ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ہماری آبادی ذرائع آمدنی کے لحاظ سے زیادہ ہے اور آبادی کی رفتار ترقی میں تخفیف کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً موجودہ آبادی کے حساب سے ہندوستان میں اوسط سالانہ آمدنی فی شخص تقریباً پچاس روپے ہے اگر آبادی بڑھتی گئی تو لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس اوسط میں جو یوں بھی بہت ادنیٰ ہے مزید تخفیف ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے ساتھ ذرائع آمدنی میں بھی ترقی ہوگی لیکن آبادی اور ذرائع آمدنی کی رفتار ترقی متناسب نہیں ہوتی۔ گزشتہ پچاس سال کے اعداد و شمار اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ دونوں ایک تناسب سے نہیں بڑھتے۔ اگر ہماری آبادی اور ذرائع آمدنی کی رفتار وہی رہی جو گزشتہ پچاس سال میں تھی تو کہا جا سکتا ہے کہ معیار زندگی اور زیادہ پست ہو جائے گا۔ اور سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام میں کئی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

سب سے پہلے مالتھس نے تقریباً ایک سو پچیس سال قبل یہ نظریہ پیش کیا کہ جب کسی ملک کی آبادی بہت بڑھ جاتی ہے اور ذرائع آمدنی ضروریات زندگی کے کفیل نہیں ہو سکتے تو زائد آبادی جنگ، وبا اور قحط سے دور ہو جاتی ہے۔ گزشتہ ۱۲۵ سال میں یورپ اور امریکہ میں صنعتی تبدیلیاں ہوئیں جن کے اثر سے آبادی میں نمایاں اضافہ ہوا لیکن ساتھ ہی تعلیم کی اشاعت نے آبادی کی رفتار کو کم رکھنے میں بڑا حصہ لیا۔ وہاں مجموعی طور سے آج کل آبادی اس سرعت سے نہیں بڑھ رہی ہے جو چند سال پہلے نمایاں تھی۔ معیار زندگی کو بلند کرنے یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو بحالہ قایم رکھنے کی کوشش نے آبادی کی رفتار ترقی پر بندشیں پیدا کیں۔ مثلاً ضبط تولید کے مصنوعی طریقے عام ہوئے اور شادی کی عمر کا اوسط بڑھ گیا۔ مذہبی رہنماؤں کے زبردست احتجاج اور مخالفت کے باوجود مصنوعی طریقوں سے پیدائش کو روکا گیا۔ مغرب کے اثر سے ہندوستان میں کئی اور معاشی تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن ہماری آبادی جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اس کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ مالتھس کے نظریہ کا اطلاق بڑی حد تک ہندوستان پر ہوتا ہے۔ طاعون، ہیضہ، ملیریا، چیچک اور دوسرے امراض جن کا قطعی علاج ہو سکتا ہے ہندوستان کے لیے بے انتہا مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ ملک کے کسی نہ کسی گوشے میں وبا کا زور رہتا ہے اور لاکھوں اموات واقع ہوتی ہیں۔ دراصل یہ اموات غیر طبعی ہیں اور ہمارے ہم وطنوں کی جسمانی لاغری اور افلاس کو ظاہر کرتی ہیں۔ ملک میں قحط نہیں ہے اور حکومت کسی ہندوستانی باشندے کو قحط کی وجہ سے موت کا شکار نہیں ہونے دیتی لیکن اقتصادی حالات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں غربت اور افلاس سے قحط کی ایک مستقل کیفیت طاری ہے۔ یہ حالات گزشتہ ایک صدی سے نمودار ہیں اور واقعات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دن بدن حالات زیادہ خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۸۷۵ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان پچیس سال میں قحط کی وجہ سے دو کروڑ تیس لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان صرف طاعون سے نو کروڑ اور ملیریا سے ایک کروڑ اسی لاکھ اموات واقع ہوئیں۔ سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۱۹ء میں انفلوئنزا سے ۸۰ لاکھ انسان ہلاک ہوئے۔ ہندوستان میں اموات کا اوسط ۳۲ نفوس فی ہزار ہے۔ ہندوستان پر مالتھس کے نظریہ کے اطلاق کے جواز میں اس سے زیادہ بہتر ثبوت نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس نظریہ کے لحاظ سے ہماری آبادی ذرائع آمدنی کی نسبت زیادہ ہے۔ زائد آبادی کو دور کرنے کے لیے فطری قوتیں رونما ہوتی ہیں اور ہندوستان میں ان کا مظاہرہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے برابر جاری ہے۔

برطانوی عہد حکومت میں امن و امان کی برکات کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں صنعت و حرفت بڑھ رہی ہے۔ تجارتی درآمد و برآمد کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ دنیا کی اقوام کے ساتھ ہماری تجارت روزافزوں ہے۔ دنیا کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ہندوستان کا نام زیادہ سے زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ ان ہمت افزا حالات کے باوجود ہماری آبادی غربت و افلاس، قحط اور مختلف امراض سے کم ہو رہی ہے۔ ہمارے ذرائع آمدنی پوری آبادی کے کفیل نہیں ہو سکتے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے؟ کیا ہندوستان کی دولت اس کے باشندوں کے لیے ناکافی ہے؟۔

اگر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اعداد و شمار کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری آبادی اوسطاً ہر دس سال میں سات فی صدی بڑھ گئی۔ یہ اوسط دنیا کے اور ممالک سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر حالات مناسب اور موافق ہوں تو آبادی کی رفتار ترقی کا دس سالہ اوسط نو یا دس فی صدی تک بھی تشویشناک نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ہندوستان میں سات فی صدی اوسط کو خطرناک خیال کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی آبادی غیر معمولی سرعت کے ساتھ نہیں بڑھ رہی ہے اور صرف آبادی کا اس رفتار سے بڑھنا خطرہ کا باعث نہیں ہے۔ ہماری آبادی کی رفتار ترقی کو فکر و تشویش کی نظر سے دیکھنے کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہندوستان میں دولت کے ذرائع محدود ہیں۔ ہماری قومی آمدنی کا ماہانہ اوسط فی شخص پانچ روپے سے کم ہے۔ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اس اوسط کو نکالنے میں آبادی کے مختلف طبقات مثلاً کسان اور مزدور، ساہوکار اور سرمایہ دار کا خیال نہیں رکھا گیا۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ ہندوستان کی زرخیزی کے باوجود اسے دنیا کا غریب ترین ملک کہا جاتا ہے درحقیقت یہ ادنیٰ اوسط آمدنی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان دنیا کا غریب ترین ملک کہلاتا ہے۔ اسی اوسط کی بنا پر نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ ہندوستان کی آمدنی کے مقابلہ میں اس کی آبادی بہت زیادہ ہے اور آبادی کی موجودہ رفتار ترقی کو خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔ ہماری آبادی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر اس میں مزید اضافہ ہوا اور موجودہ حالات قائم رہے تو معیار زندگی نہایت پست ہو جائے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری جسمانی اور دماغی صلاحیت اور زیادہ کم ہو جائے گی فی الحال صرف زندہ رہنے اور بسراوقات کا سامان مشکل سے بہم پہنچتا ہے۔ آبادی میں اضافہ کے ساتھ قحط کا سامنا کرنا پڑیگا کسی ملک کی آبادی کے مسائل کا مطالعہ حسب ذیل اقتصادی اصول کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اقتصادی ترقی کا موجودہ دور۔

(۲) موجودہ ذرائع پیداوار۔

(۳) ملک کی کل پیداوار۔

(۴) جملہ پیداوار اور دولت کی آبادی کے مختلف طبقات میں تقسیم کی نوعیت

(۵) مزدوروں کا آبادی میں تناسب۔

(۶) مختلف طبقات آبادی کی تعلیمی حالت۔

(۷) آبادی میں مختلف پیشوں کی تقسیم

ہندوستان میں صنعتی ترقی ہو رہی ہے اور موجودہ جنگ کی وجہ سے صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے لیکن ہمارا ملک اس وقت کسی طرح اپنی تمام صنعتی مرودیات پوری کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہندوستان میں اشیائے خام کی کمی نہیں ہے۔ بین الاقوامی تجارت میں ہندوستان کا درجہ اس منڈی کا ہے جہاں سے اشیائے خام حاصل کی جاتی ہیں اور جہاں تیار شدہ مال کی کھپت ہوتی ہے۔ یہاں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے مواقع ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں ہم ان تمام مشکلات کا ذکر نہیں کر سکتے جو ہندوستان کی صنعت و حرفت کے راستے میں حائل ہیں لیکن رہا۔ سوتی کپڑا، شکر سیمنٹ، ادویات اور صابون سازی کی صنعت کی قابل اطمینان ترقی کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشکلات دور کی جا سکتی ہیں۔ صنعت و حرفت کے لحاظ سے ہندوستان ابتدائی مدارج میں ہے۔ ہندوستان کی ۷۰ فی صدی آبادی زراعت پر بسر اوقات کرتی ہے اور یہی پیشہ اہم ہے لیکن تعلیم سے محرومی، غربت اور قرض، نہروں کی کمی، ماوراں سون پر دار و مدار اور زراعت کے جدید طریقوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ہندوستانی کسان اپنی زمین سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہمارے ملک میں وسیع قطعات ارض جن سے فصلیں حاصل کی جا سکتی ہیں بنجر پڑے ہیں۔ دیہات کے باشندے مویشیوں سے وہ فائدے حاصل نہیں کرتے جو اور ممالک میں حاصل کیے جاتے ہیں۔ ملک کی پیداوار بہت کم ہے اور یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں کہ ہندوستانی کسان اپنی زمین اور مویشیوں سے وہ تمام فوائد حاصل کرے گا جو اس کا حق ہے۔

ہندوستان میں دولت کی تقسیم اس قدر غیر مساوی ہے کہ شاید دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہے۔ یہاں دنیا کا

سب سے زیادہ دولتمند باشندہ ہے اور وہ بھی جس کا دنیا کی دولت میں کوئی حصہ نہیں۔ یہاں کے زمیندار، ساہوکار کارخانوں کے مالک سرمایہ دار اور تجارت پیشہ دولت کے بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ اگر تمام مزدوروں اور کسانوں کو ایک ساتھ شمار کیا جائے تو تقریباً ۸۰ فی صدی آبادی انتہائی غربت اور فلاکت میں دم توڑ رہی ہے جس مختصر طبقہ کے پاس دولت سمٹ چکی ہے وہ اس پر سختی سے قابض ہے اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں تعلیمی لحاظ سے حالات اور زیادہ افسوس ناک ہیں۔ مثلاً اگر صرف ان بالغوں کا شمار کیا جائے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تو پوری آبادی کا دس فی صدی حصہ ایسا ملے گا جو لکھ پڑھ سکتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ پڑھنے لکھنے والے زیادہ تر اسی طبقہ میں ہیں جس کے پاس دولت ہے کسان اور مزدور تعلیم کی برکات سے قریب قریب محروم ہیں۔

اگر یورپ، امریکہ اور جاپان سے ہندوستان کا مقابلہ مندرجہ بالا اصولوں کے ماتحت کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان ہر اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔ مثلاً ان ممالک نے صنعت و حرفت اور زراعت میں سائنس کی جدید اختراعات کو اختیار کیا ہے اور زیادہ پیداوار حاصل کر کے ملک کی دولت میں کثیر اضافہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کئی وجوہات کی بنا پر وہی طریقے رائج ہیں جو ایک صدی یا اس سے قبل عام تھے صنعتی کاروبار کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کی ہندوستان میں گنجایش ہے صنعت و حرفت کے ایسے کئی شعبے ہیں جن سے ہمارا ملک محروم ہے اور موجودہ حالات میں آئندہ کئی سال تک ان کے رواج پانے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان میں صنعت اور زرعی پیداوار کا اوسط یورپ اور امریکہ کے مقابلہ میں کم ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کام کرنے والوں کی صلاحیت بڑھائی جا سکتی ہے اور جدید انکشافات کو اختیار کر کے پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یورپ، امریکہ اور جاپان کی طرح ہندوستان میں بھی ممکن ہے کہ کیمیائی کھاد اور نہروں سے سال میں ایک سے زیادہ فصلیں حاصل کی جائیں۔ اس طرح زراعت پیشہ اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہماری آبادی کا بہت بڑا حصہ زراعت پر بسر اوقات کرتا ہے۔ ہماری سب سے بڑی صنعت "زراعت" ہے۔ امریکہ اور یورپ کے حالات ہم سے مختلف ہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک صنعت و حرفت میں بہت آگے ہیں اور زرعی پیداوار اس قدر محدود ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ ممالک بین الاقوامی تجارت میں صنعتی اشیا باہر بھیجتے ہیں اور اشیائے خام اور غلہ خریدتے ہیں۔ ایسے تمام ممالک کی مالی حالت زراعتی ممالک سے بہتر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں صنعت و حرفت کی ترقی کا سب سے بڑا فائدہ یہ

ہوگا کہ غیر مالک کو وہ تمام دولت نہیں جائے گی جو اس وقت ہر سال ہم دیتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا بھی امکان ہے کہ بنجر اور بیکار زمین سے فصلیں حاصل کر کے زراعت کو مزید توسیع دی جائے۔ ہمارے کسان غربت اور گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے زراعت سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ ہندوستانی کسان سال کا ایک حصہ بیکاری میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مناسب انتظامات کے ماتحت دیہاتی صنعتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ کسانوں کو فرصت کے اوقات میں کام مل سکے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہماری آبادی کی کثیر تعداد کا پیشہ زراعت محض برائے نام ہے۔ ان کے پاس نہ زمین ہے نہ مویشی اور نہ انہیں موقع ملتا ہے کہ زراعت کر سکیں۔ یہ آبادی ایک لحاظ سے بیکار کہی جا سکتی ہے اور ہمارے ملک پر بار گراں ہے۔ ان میں وہ اشخاص بھی شامل ہیں جو خاندان میں مشترکہ زندگی گزارتے ہیں۔ ایک ایسے خاندان کے لیے جس کے افراد کی تعداد سال بہ سال بڑھتی جا رہی ہو، محدود قطعۂ ارض کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ ایسے خاندانوں میں تمام افراد کام نہیں کرتے۔ بلکہ ذمہ داریوں سے بری ہونے کی وجہ سے وہ ایک لاابالی طریقۂ زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پورے خاندان کی ملکیت ایک محدود زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ ایک مختصر اور محدود اراضی پورے خاندان کے لیے نہ کام مہیا کر سکتا ہے اور نہ اس کا کفیل ہو سکتا ہے۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ خاندان کے اراکین کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی ہو۔ اس غیر ذمہ دار طریقۂ زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا تقریباً ۴۰ فی صدی حصہ دراصل کام کرتا ہے اور باقی حصہ کسی نہ کسی طرح بیکاری میں وقت صرف کرتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یورپ میں کام کرنے والوں کی تعداد ۵۵ اور ۶۰ فی صدی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہاں مشترکہ خاندان نہیں ہیں اور باشندوں میں وہ غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا نہیں ہوتا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم کے فقدان کی شکایت بارہا کی جا چکی ہے۔ یورپ، امریکہ اور جاپان میں تعلیم قریب قریب تمام طبقات آبادی میں عام ہو چکی ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان میں ۹۵ فی صدی تعلیم یافتہ ہیں۔ برطانیہ اور جرمنی میں سو فی صدی آبادی تعلیم سے مستفید ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں تمام جد و جہد کے بعد صرف دس فی صدی لکھنے پڑھنے سے واقف ہیں۔ تعلیم سے محرومی کا لازمی نتیجہ — سیاسی جمود سے قطع نظر — یہ ہے کہ ہندوستانی کسان اور مزدور اپنے بنیادی مسائل، زندگی کی پیچیدگیاں، حفظان صحت کے اصول اور جدید اختراعات سے بے خبر رہتا ہے۔ دوسرے ممالک میں تعلیم کی وجہ سے کسانوں میں نہ صرف سیاسی بیداری

ہو بلکہ وہ اپنے تمام مسائل کو سمجھتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہمارے ملک میں مایوس کن بے حسی اور بے بسی پائی جاتی ہو۔ قدیم روایات، مذہبی پابندیوں اور رواج کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتے۔ سیاسی رہنماؤں اور اصلاحی کام کرنے والوں کو رسم و رواج کے خلاف زبردست جنگ کرنی ہو۔ ہندوستان کے ان تمام ناسازگار حالات کا ایک نتیجہ جس کا تعلق مسئلہ آبادی سے ہو یہ ہو کہ اوسط زندگی ۲۷ سال ہو۔ دنیا کے اور ممالک میں یہ اوسط بہت زیادہ ہو۔ یہ اعداد و شمار ہندوستانی آبادی کی لاغر صحت کو ظاہر کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے باب چہارم میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا گیا ہو:۔

"گذشتہ دس سال کے عرصہ میں ہماری آبادی میں تین کروڑ چالیس لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس مزید آبادی کے بسر اوقات کا سامان مہیا کرنے کے لیے مزروعہ زمین پر اور زیادہ بار ڈالنا پڑے گا تاکہ گذشتہ نفوس کے ساتھ وہ اس اضافہ کی بھی کفیل ہو سکے۔ ہمارا معیار زندگی یوں بھی بہت پست ہو۔ ہماری زمین پر اس مزید بار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معیار زندگی اور زیادہ پست ہو جائیگا۔ ہندوستان کا کوئی ہمدرد معیار زندگی کی پستی کو بغیر خطرہ کے احساس کے نہیں دیکھ سکتا۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی قومی دولت میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا اور نہ مستقبل میں امید ہو کہ ہماری دولت میں (آبادی میں اضافہ کے تناسب سے) ترقی ہوگی۔ معیار زندگی کی پستی کا ایک مایوس کن نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ آبادی کی رفتار ترقی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوگا۔ اس غیر معمولی اضافہ کی وجہ سے ہندوستانیوں کے ہمت و حوصلہ اور مستعدی و آمادگی میں نمایاں کمی ہو گی۔ سالہا سال سے ہندوستان کے باشندے انتہائی عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو کہ مایوسی و ناامیدی اور بے بسی و کاہلی اجزائے زندگی بنتے جا رہے ہیں۔ ہم میں سکت باقی نہیں رہی کہ معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ معیار زندگی کو بلند کرنے کی جدوجہد میں پہلا قدم یہ ہو کہ خاندان کے افراد کی تعداد کو محدود کیا جائے۔"

اس رپورٹ میں ہندوستان کی آبادی اور اس کے مستقبل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ

مد درجہ حوصلہ شکن ہیں لیکن بہر صورت ہمیں تلخ حقایق اور واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صرف یہ کہہ کر خاموشی نہیں اختیار کی جا سکتی کہ ہم مجبور ہیں۔

کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی رجائیت پسند ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کی موجودہ دولت اور قومی مدنی چالیس کروڑ نفوس کی ضروریات زندگی کی کفیل ہو سکتی ہے۔ اگر یہی حالات قایم رہے اور مستقبل کے خطرات کا اندازہ نہیں کیا گیا تو اور زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مستقبل کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے سامنے تین راستے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ راہ عمل اختیار کرنے سے مستقبل کے متعلق ل خوش کن امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ ہندوستانیوں کو دنیا کے اور خطوں میں نقل وطن کے لیے تیار کیا جائے۔ کئی ممالک ایسے ہیں جہاں فی مربع میل اوسط آبادی بہت کم ہے اور کافی انسانوں کی نمایش ہے۔ مثلاً سلطنت برطانیہ میں ایسے علاقے ملتے ہیں جہاں نہ صرف باشندوں کو آباد کرایا جا سکتا ہے بلکہ ان علاقوں کی معدنی اور زرعی دولت کو فروغ دینے اور اس سے پورا فایدہ اٹھانے کے لیے بھی مزید آبادی کی ضرورت ۔ آسٹریلیا اور کنیڈا میں وسیع قطعات ارض غیر آباد ہیں۔ برطانوی افریقہ میں بھی مزید آبادی کی گنجایش ہے۔ ہندوستان کے گنجان شہروں اور اضلاع سے آبادی کو ہٹا کر ان خطوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ہم واقف ہیں کہ آسٹریلیا کے غیر آباد خطوں پر جاپان کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ چین کی آبادی بہت گنجان ہے اور چینیوں کے لیے نئی سرزمین کی ضرورت ۔ لیکن آسٹریلیا، کنیڈا اور برطانوی افریقہ کی حکومتیں ایشیائی باشندوں کو ان ممالک میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔ سلطنت برطانیہ کو مختلف اقوام کی مشترکہ حکومت کہا جاتا ہے۔ اس مشترکہ حکومت میں ہندوستانیوں کو آسٹریلیا، کنیڈا اور افریقہ سے نسل کے بے بنیاد اور لغو تعصب کی وجہ سے علیٰحدہ رکھنا حد درجہ ناانصافی ہے۔ بالخصوص اس حالت میں کہ ہندوستان میں غیر ممالک کے باشندوں پر کوئی قید نہیں ہے۔ بظاہر برطانوی حکومت کے وسیع طول و عرض میں ایک ملک کی آبادی کو دوسرے خطوں میں نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ آبادی کے نقل و حرکت کا مسئلہ دراصل بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کی طرح ایشیا کے دوسرے ممالک اور بعض قومیں نسلی امتیاز کا شکار ہیں۔ دنیا کے موجودہ نظام میں اور خرابیوں کے ساتھ نسلی امتیاز ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ آج کل مدبرین اور سیاستداں دنیا کے لیے ایک نئے نظام کی تشکیل کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ دنیا کا نیا نظام اس وقت تک ناکام اور

غیر مکمل رہے گا جب تک خدا کی وسیع زمین اور اس کی دولت میں تمام انسانوں کے لیے مساوات کا درجہ نہیں ہوگا نقل وحرکت پر مصنوعی پابندیاں دنیا کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مشکلیں پیدا کرتی ہیں اور ان کا دور کرنا نہایت ضروری ہو لیکن موجودہ حالات میں یہ بات ہماری قوت سے باہر ہو کہ ان قیود کو ہٹا سکیں اس لیے ہمارے باشندوں کو ہندوستان سے باہر نوآبادی کا ملنا ناممکن ہو۔ ہندوستانی مزدور اور تجارت پیشہ لوگوں کی ایک محدود تعداد سیلون اور برما جاتی تھی لیکن وہاں کی حکومتوں کے رویہ سے آیندہ یہ دشوار ہو جائے گا۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہو کہ ہم نقل وطن کے ذریعہ ہندوستانی آبادی کو اور ممالک میں منتقل نہیں کر سکتے۔

ہمارے معیار زندگی کو بلند کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہو کہ قومی دولت میں اضافہ کی کوشش کی جائے۔ مثلاً آبپاشی، کیمیائی کھاد اور مشینوں کے استعمال سے زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہو۔ ہندوستان میں وسیع قطعات ارض بنجر پڑے ہیں جن میں کاشت ہو سکتی ہو لیکن ہندوستانی کسان کی مفلوک الحالی کو دیکھتے ہوئے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ زراعت میں سائنس کے جدید انکشافات سے فایدہ اٹھائے گا۔ قرض کے بار سے دبے ہوئے کسان نہ کیمیائی کھاد خرید سکتے ہیں نہ مشینوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ آبپاشی کا انتظام حکومت کی طرف ہو اور گزشتہ حالات کو دیکھتے ہوئے فی الحال امید نہیں کی جا سکتی کہ حکومت نہروں اور آبپاشی کے دوسرے انتظامات کے لیے خرچ کا انتظام کرے گی۔ بالخصوص اس لیے کہ کسانوں میں سکت نہیں ہو کہ آبپاشی کے مزید محصول کو برداشت کریں۔ مالی مشکلات کی وجہ سے وہ عمدہ بیج حاصل نہیں کر سکتے کہ فصلوں سے بہتر قسم کی اجناس حاصل کریں۔ امداد باہمی کی تحریک سے کسانوں کو فایدہ ہوا ہو اور آہستہ آہستہ اس تحریک کو فروغ دیا جا رہا ہو لیکن اس کی رفتار بہت سست ہو اور نتائج زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ چند اضلاع میں اس تحریک کو کامیابی ہوئی لیکن بعض علاقوں میں سخت ناکامی ہوئی اور نقصان اٹھانا پڑا۔ ہندوستان میں صنعت وحرفت کے غیر معمولی امکانات ہیں لیکن سرمایہ ماہرین فن اور مشینوں کا حاصل کرنا دشوار ہو۔ بیرونی سرمایہ سے صنعتوں کو فروغ دینے سے زیادہ فایدہ نہیں ہو سکتا لیکن صنعتی ترقی کے سلسلے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ ہندوستان کی قومی دولت کو صحیح معنوں میں ترقی دینے کے لیے ضروری ہو کہ کسانوں کی مالی حالت کو سدھارا جائے۔ صرف صنعت وحرفت کی ترقی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگی کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ دس فی صدی آبادی حصہ لے سکے گی اور آبادی کا بڑا حصہ اس ترقی سے

محروم رہے گا۔ دوسرے یہ کہ صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ آبادی کی رفتار ترقی بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس کی بہترین مثال صنعتی ممالک کی تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد وہاں کی آبادی نہایت سرعت سے بڑھی اس لیے صنعت وحرفت میں ترقی ہماری مشکلات کو صرف ایک حد تک دور کرسکتی ہے لیکن اس خطرہ کے ساتھ کہ آبادی زیادہ سرعت سے بڑھے گی۔

ہندوستان کی آبادی کے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو حل کرنے کی تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے آبادی کی رفتار ترقی کو کم کیا جائے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں آبادی کی تخفیف پر بہت زور دیا گیا ہے۔ آبادی کو مصنوعی طریقوں سے روکنے کے خلاف مذہب کے علمبرداروں نے ہمیشہ جہاد کیا۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی حیات مشیت ایزدی ہے اور انسان کو کوئی حق نہیں کہ نئی زندگی کو وجود میں آنے سے روکنے کی کوشش کرے۔ اخلاق کا درس دینے والے کہتے ہیں کہ افزائش نسل کو مصنوعی طریقوں سے محدود کرنے کے بعد بداخلاقی اور غیر ذمہ داری کا ایک نیا دور شروع ہوگا جس کو روکنا نہایت دشوار ہوگا اور یہ دنیا کے لیے ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہوگا۔ بعض ماہرین طب کا دعوی ہے کہ افزائش نسل کو روکنے کے مصنوعی طریقے صحت کے لیے مضر ثابت ہوتے ان سب کے علاوہ معاشیات کے علما میں ایک گروہ ایسا ہے جس کا خیال ہے کہ دنیا کی دولت لامتناہی ہے اور ہمیں محض اس خیال سے آبادی کو محدود نہیں کرنا چاہئے کہ دنیا کی دولت بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ اس مختصر مقالہ میں ہم "اختیاری تناسل" کے مسئلہ پر بحث نہیں کرسکتے لیکن یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ آبادی کی رفتار ترقی کو کم کرنے کا یہ واحد طریقہ نہیں ہے۔ تعلیم کے عام ہونے اور معیار زندگی کے بلند ہونے کے بعد پیدائش کی رفتار میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ اگر شادی کی اوسط عمر بڑھا دی جائے تو اس کا اثر بھی آبادی پر پڑتا ہے۔ ان سب کے علاوہ ضبط نفس سے بھی بڑی حد تک پیدائش کی رفتار کو کم کیا جاسکتا ہے اور مذہب واخلاق کا کوئی نام لیوا اس کی مخالفت نہیں کرسکتا۔

بظاہر یہ بات تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں جب کہ دنیا کی اکثر اقوام اپنی آبادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہم ہندوستان کی آبادی کے اعداد وشمار کو خطرہ کے احساس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں اور ان میں تخفیف کی ضرورت ظاہر کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے حالات دنیا کے دیگر ممالک

سے بالکل مختلف ہیں۔ یورپ کی اقوام میں ملک گیری کی ہوس اور صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی دینے کے جنون نے فوجی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ فوجوں کو میدان جنگ میں مصروف کار رکھنے کے لیے کارخانوں میں مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ میدان جنگ کے ہر سپاہی کے لیے اوسطاً پانچ اشخاص کی ضرورت ہوگی۔ کارخانوں اور شہروں سے سامان حرب، رسد اور دوسری ضروریات فراہم کریں۔ موجودہ جنگ کے بعد بیکاری کا مسئلہ دنیا کا مشکل ترین مسئلہ بن جائے گا۔ او رجو مدبرین اس وقت آبادی میں روز افزوں ترقی کے لیے کوشاں ہیں جنگ کے بعد بیکاری کے سوال کو کسی طرح حل نہیں کر سکیں گے۔ گزشتہ جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۸ء) اور اس سے قبل کی جنگوں کے بعد دنیا جن اقتصادی مشکلات میں پڑی ان سے ہمارے دعویٰ کو پورا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس وقت جب کہ ہر قوم اپنی عظمت کا دعویٰ کر رہی ہے۔ جنگ میں فتح اور اس کے بعد ایک عظیم الشان مستقبل کے دل خوش کن وعدے پیش کر کے افراد کو بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار کر رہی ہے۔ تلخ حقایق کی یاد دہانی نہ صرف مشکلات میں اضافہ کا مترادف ہوگی بلکہ ایک ناقابل معافی جرم بھی قرار دی جائے گی۔ ہندوستان میں محض اس بنا پر کہ جرمنی، اطالیہ، جاپان اور دوسری اقوام آبادی کو فروغ دے رہی ہیں یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمیں اس کے خلاف آواز بلند نہیں کرنی چاہیئے۔

ہندوستان میں آبادی کو محدود کرنے کے بعد جو اہم اور مفید نتائج مرتب ہوں گے ان کا پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ معیار زندگی بلند ہو جائے گا۔ تعلیم عام ہوگی، ہندوستان کے باشندوں میں اپنے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی، اور سیاسی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوگا ہندوستانیوں کی صحت میں خوشگوار تبدیلی ہوگی۔ متعدی امراض جسمانی لاغری اور قحط کی موجودہ مستقل صورت میں بدرجۂ اتم کمی ہوگی جسمانی اور دماغی نشو و نما پوری طرح ہوگی اور ہماری قابلیت اور صلاحیت میں نمایاں ترقی ہوگی۔ ہندوستان میں مسرت کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جائے گا۔

اختر حسین

مولانا شبلی نعمانی

بحیثیت مورخ اور سوانح نگار

مغربی اسلوب اور تصور سے اردو ادب کی اصناف میں سوانح نگاری اور تاریخ نویسی نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے

ہندوستان میں مغربی تخیل پھیلنے سے قبل سوانح نگاری کا طرز بالکل فارسی اور عربی کے مطابق تھا اردو زبان و ادب فارسی اور عربی کی اصلیت اور ڈھانچے سے ماخوذ ہے۔ اس لیے اس نے قدرتی طور پر تصورات اور اشکال و اسالیب بھی انہیں زبانوں سے لیے اور سوانح کی قدیم کتابیں جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے انہیں زبانوں کے طرز اور اسلوب پر لکھی گئیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عربی لٹریچر تذکرے کی اہم کتابوں سے مالا مال ہے اور ان کی اہمیت صرف مواد اور معلومات کے لحاظ ہی سے نہیں ہے بلکہ اسلوب کی دلآویزی اور عمدگی کے نقطہ نظر سے بھی ہے مگر اس کے باوجود موجودہ زمانے کی سوانح عمریوں سے مقابلہ کرنا مضحکہ خیز بات ہوگی ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں کہ قدیم سوانح عمریوں میں سچائی اور صداقت کا بہت خیال رکھا جاتا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کی اہمیت جاتی رہی اور اب اصلیت، آزادی اور سچائی کی جگہ رسمیت اور تصنع نے رواج پالیا ہے۔ محدثین کے تذکروں میں خاص طور پر سچائی اور صداقت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا لیکن بدقسمتی سے ایسی کتابیں اردو اور فارسی مصنفین کے قلم سے بہت کم ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل سوانح عمری کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے اس لحاظ سے اردو لٹریچر دور انقلاب سے پہلے بالکل خالی تھا اور مغرب کے اثرات جن کے لانے میں سر سید کا بڑا ہاتھ تھا اس کو وجود میں لایا۔ یہ واقعہ ہے کہ صرف مشرق ہی میں نہیں بلکہ مغرب میں بھی موجودہ سوانح نگاری اٹھارویں صدی کے بعد وجود میں آئی۔ سر ایڈمنڈ گاس کا قول ہے کہ "زندگی کے مختلف واقعات کی سچی تصویر کا نام سوانح حیات ہے" چنانچہ بعد میں سچی زندگی اور صحیح واقعات پر زیادہ زور دیا جانے لگا چنانچہ مسٹر ہیرالڈ نکلسن کا قول ہے کہ تمام

جذبات میں مذہبی غلو صحیح اور سچی سوانح حیات کے لیے سم قاتل ہے۔"

موجودہ دور میں سوانح نگاری نئے طریقہ سے ترقی کر رہی ہے۔ نفسیات کو ترجیح دی جاتی ہے اور انسان کی شخصیت اور اس کی انفرادیت سے دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور اس نے لٹن اسٹریچی کے غیر معمولی اثر سے ترقی کر کے سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اردو کے اولین سوانح نگار مولانا حالی اور مولانا شبلی گو انگریزی سے اچھی طرح واقف نہیں تھے لیکن ان تبدیلیوں اور ترقیوں سے بے خبر بھی نہیں تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں سوانح نگاروں سے پہلے جنھیں ہم نے اولین سوانح نگار کہا ہے سرسید نے آنحضرت صلعم کی سیرت پر ایک مختصر کتاب لکھی تھی جس میں مغرب کے فن سوانح نگاری کو پوری طرح برتا تھا لیکن یہ واقعہ ہے کہ سرسید سوانح نگار نہیں تھے اور نہ انھوں نے کبھی سوانح نگار ہونے کا دعویٰ کیا۔

"حیات سعدی" کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی بھی سوانح نگاری کے جدید تصور سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ

> زمانہ حال میں یورپ کے مورخوں نے خاص کر سترہویں صدی سے بوگرفی کو بے انتہا ترقی دی ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ کی طرح بیوگرفی نے بھی فلسفہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ حال کی بیوگرفی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے کلام پر غور کیا جاتا ہے اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ اکثر ایک ایک شخص کی لائف کئی کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے۔

گو چونکہ شبلی نے مغرب کے اثرات حالی سے زیادہ قبول کیے اس لیے ان کی سوانح نگاریاں نسبتاً زیادہ مکمل اور عمدہ ہیں شبلی سے قبل تاریخ کی کتابیں تحقیق سے بالکل کوری اور فن کے نقطۂ نظر سے بالکل ناقص تھیں۔ ان میں جدید ذوق اور رجحان کا بالکل خیال نہیں کیا گیا تھا اور وہ یا تو اتنی خشک تھیں کہ کوئی پڑھنے کی ہمت نہ کر سکے یا ان میں دلچسپی کا سامان اس قدر پیدا کر دیا گیا تھا کہ وہ تاریخ کے پایہ سے گر گئیں۔ مولانا شبلی نے ان تمام خرابیوں

کو دورکیا اور تحقیق اور صحت کے لحاظ سے ایک معیار قایم کردیا۔اسی کے ساتھ لطافت ودلچسپی کو اس طرح نبھایا کہ عوام وخواص کسی کو بھی شکایت نہ رہی اور زبان تو بقول سرسید رشک دلی ولکھنو تھی۔"

شبلی کے متعلق اردو کے ایک لایق ادیب اور فاضل نقاد کی رائے ملاحظہ ہو۔

"اردو لٹریچر کے پیدا کرنے والے تھوڑے ہیں ان میں بھی تھوڑے ہی ایسے ہیں جو آج کل کے وسیع معیار قابلیت کے لحاظ سے اہل قلم کی صف اول میں شامل ہونے کے لایق ہوں۔ سرسید سے قطع نظر کرنے کے بعد جن کو باستحقاق اولیت کا فخر حاصل ہے میرا خیال ہے شبلی بلحاظ فن صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی دنیا میں کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں ہیں اس کو میری قاصر النظری یا علمی فرومائگی پر نہ محمول کیجیے۔فلسفہ تاریخ جو آج کل تمام علوم میں سرفہرست ہے ایک مستقل فن ہو گیا ہے اور اس قدر اہم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فاضل مورخانہ موشگافیوں کو بہترین مشغلہ ہستی سمجھتے ہیں۔مصری اور ترکی لٹریچر میں تاریخی مذاق جس حد تک موجود ہے میں اس سے بیگانہ نہیں ہوں۔مجھ کو معلوم ہے کہ دونوں زبانیں خاص کر اول الذکر اس قدر مغربیت سے مانوس ہو گئی ہے کہ وہاں کے روشن خیال علما مغربی طرز تحریر کی خصوصیات کے ساتھ عربی اور ترکی زبانوں میں نہایت شائستگی سے داد سخن دے رہے ہیں لیکن جن مضامین پر ان کے ہاں منقولانہ اور معقولانہ سرگرمی سے طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں وہ شبلی کے ہاں فرسودہ اور مسایل ابتدائی ہیں جس کو فاضل مورخ کی سرسری جنبش قلم مدت ہوئی ایک سے زیادہ موقعوں پر طے کر چکی ہے۔ ملک کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں کہ مصر کے مشہور رسالہ "الہلال" کے نامور ایڈیٹر علامہ جرجی زیدان اپنی تاریخ تمدن اسلام میں جو متعدد جلدوں میں ختم ہوئی،علامہ شبلی کی تحقیقات سے بے نیاز نہ رہ سکا اور اس نے سنداً اقتباس کیے۔

بہرحال ہم میں اب شبلی ایسا شخص ہے جو بلحاظ جامعیت اور وسیع النظری مورخانہ تدقیق اور مذاق فن کی حیثیت سے آج یورپ کے بڑے سے بڑے مورخ کے پہلو بہ پہلو ہو سکتا ہے۔"[1]

---

[1] افادات مہدی صفحہ ۱۰۱۔

کا. لائل کا مشہور فقرہ ہو کہ "تاریخ عالم صرف اس کے بڑے بڑے اشخاص کی تاریخ کا نام ہو" غالباً شبلی کے سامنے یہی فقرہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے "ہیروز آف اسلام" یعنی مشاہیر اسلام پر قلم اٹھایا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب "المامون" شائع ہوئی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ترتیب خلافت، مامون الرشید کی تعلیم و تربیت، ولیعہدی، تخت نشینی، خانہ جنگیاں، فتوحات ملکی اور وفات تک عام حالات ہیں اور دوسرے حصہ میں ان مراتب کی تفصیل ہو جن سے اس عہد کے ملکی حالات اور مامون الرشید کے اخلاق و عادات پر روشنی پڑتی ہو۔ نیز ان تمام کارناموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو جن کی وجہ سے مامون الرشید کا عہد عموماً شاہان عالم کے عہد سے علمی حیثیت سے ممتاز کیا گیا ہو۔ شروع میں سرسید کے قلم سے ایک مختصر سا دیباچہ بھی ہو جس میں شبلی کے طرز تحریر کی بڑی تعریف کی گئی ہو اور کتاب کی خوبیوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہو جس میں موصوف نے اجمال کے ساتھ شبلی کی تاریخ نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہو۔ وہ لکھتے ہیں

> "پہلے حصہ میں انھوں (شبلی) نے تاریخانہ واقعات لکھے ہیں اور نہایت خوبی اور اختصار سے دکھایا ہو کہ خلافت کا سلسلہ کیونکر اور کیوں خاندان بنی امیہ کو برباد کرکے عباسی خاندان میں پہنچا اور کیا اسباب جمع ہوئے جس سے امین اس کا بھائی محروم اور مقتول اور خود مامون الرشید تمام مملکت اسلامی کا مالک الملک لاشریک لہ بن گیا۔"
>
> جابجا واقعات دلچسپ سے بھی اس حصہ کو آراستہ کیا ہو جس کے سبب یہ سوکھا پھیکا تاریخانہ حصہ دلچسپ ہو گیا ہو۔ دوسرے حصہ میں انتظام سلطنت آمدنی مملکت، فوجی انتظام و عدالت اور اس کی جزئیات کو جہاں جہاں سے ملیں چن چن کر ایک جگہ جمع کیا ہو اور مامون کی فضیلت اور اس کی سوشل حالت، اس کی پرائیوٹ زندگی اس کے شغلوں اور اس کی مجلسوں کا ذکر کیا ہو اور اس زمانہ کی زندگی اور طرز معاشرت کا نقشہ کھینچ دیا ہو۔ یہ حصہ نہایت ہی دلچسپ ہو شان اور عظمت و جلال خلافت کے ساتھ ایسی ایسی سادہ اور بے تکلف باتوں سے بھرا ہوا ہو کہ اس سے اس کو اور اس سے اس کو رونق ہوتی ہو۔
>
> اس حصہ میں لطائف و ظرائف کے ساتھ علمی اور خصوصاً علم و ادب کے ایسے ایسے نکتے مذکور

ہیں جو ادیب کے لیے سرمایۂ ادب اور ظریف کے لیے سرمایۂ ظرافت ہیں۔

یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو رشک آتا ہوگا۔

اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لیے زبان طرزِ بیان جداگانہ ہے تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت اور بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے............

.... ہمارے لایق مصنف نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے اور جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے نہ بھونڈے پنے کو زیادہ بھونڈہ اور در اصل یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔

سرسید نے آخری پیرے میں جو خصوصیت بیان کی ہے وہ محض المامون کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ شبلی کی تمام تاریخی تالیفات میں یہ خصوصیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے اور یہی خصوصیت جس کی وجہ سے شبلی کو ان کے معاصرین پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہے۔

اس کے بعد سیرۃ النعمان شایع ہوئی اس کی تالیف کی وجہ خود مصنف کے الفاظ میں یہ ہے "امام ابوحنیفہ کے اجتہادی مسایل قریباً بارہ سو برس سے تمام ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عظیم الشان سلطنتوں میں ان ہی کے مسایل قانونِ سلطنت تھے اور آج بھی ہیں۔ اسلامی دنیا کا غالب حصہ ان ہی کے مسایل کا پابند ہے۔ عربی، فارسی، ترکی بلکہ یورپ کی زبانوں میں ان کی متعدد سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ظلم تھا کہ ان کے حالاتِ زندگی خود اردو میں نہ لکھے جاتے۔ جو لحاظ غالب ان ہی کے پیرو کی زبان ہے۔"

یہ کتاب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصہ کے شروع میں ایک تمہید ہے اس کے بعد قدما کی ان کتابوں کی فہرست ہے جو امام ابوحنیفہ کے حالات کے متعلق لکھی گئی ہیں پھر امام کی ولادت اور نسب، تابعیت کی تحقیق ہے

لامزید علیہ۔ امام کا سن رشد او تعلیم ان کے شیوخ حدیث کی تفصیل اور مختصر تراجم تعلیم اور افتا، بقیہ زندگی اور شاہی تعلقات، وفات اور ان کی اولاد کی تفصیل۔ ان کے اخلاق و عادات، طرز معاشرت اور عام حالات، ان کے مناظرات اور افتا دسے اور علمی مجلسیں، ان کی شہرت اور ہم عصروں کی ان کی نسبت رائیں۔ دوسرے حصہ میں صرف ان کے علوم و ترتیب و فقہ و طریقۂ اجتہاد کی تفصیل ہے اور آخیر میں ان کے مشہور شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

پہلے حصہ میں ظاہر ہے مولف کو کچھ بہت زیادہ زحمت پیش نہیں آئی ہوگی۔ امام صاحب کے حالات پر ہر زبان میں جیسا کہ خود مولف نے دیباچہ میں لکھا ہے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ صرف مطالعہ اور تحقیق کی ضرورت تھی اور معلوم ہے کہ یہ جنس شبلی کے بازار میں بہت ارزاں ہے۔ دوسرے حصہ کی تالیف و ترتیب میں مولف کو زیادہ محنت کرنی پڑی ہوگی کیونکہ ان مسایل سے جو دوسرے حصہ میں بیان ہوئے ہیں قدیم کتابیں یکسر خالی ہیں۔ یہاں مولف کو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کی مثال پیش کرنی پڑی ہوگی اور حقیقت میں یہ مولانا کی کوششوں اور محنتوں کا خود ان کے الفاظ میں "تماشاگاہ" ہے۔

جس زمانہ میں مولانا کو "ہیروز آف اسلام" کا خیال پیدا ہوا تھا، اسی زمانہ میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مصر و روم کے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ حالات جوں ہی مساعد ہوئے مولانا سفر پر روانہ ہو گئے۔ واپسی پر ایک کتاب مرتب کی جس میں سفر کی عام اجمالی حالت، تاریخی اور مشہور جگہوں اور عمارتوں، سررشتۂ تعلیم، مدارس اور بورڈنگ کی زندگی، طریق تعلیم و تربیت، تعلیم نسواں، مصنفین، کتب خانے، اخبارات و رسایل اور ترکوں اور عربوں کے اخلاق و عادات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ تمہید میں مولف نے بتلایا ہے کہ "اس کتاب کو پڑھ کر ناظرین کے دل میں ترکوں کی تہذیب و شائستگی کا جو درجہ قایم ہوگا وہ اس سے مختلف ہوگا جو یورپ کے عام لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے۔" اس کے بعد فاضل مولف نے یورپین مصنفین اور مستشرقین کے عام تعصب کا ذکر کیا ہے اور ان سفرناموں کی غلطیوں کے اسباب لکھے ہیں جو یورپ کی تاریخی تحقیقات کا سرمایہ ہیں اور جن کی بنیاد پر یورپین مورخین اپنی تصنیفات کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف کے بعد مولانا نے الفاروق کی تالیف کی طرف توجہ کی جس کے لیے مصر و روم اور شام کا سفر کیا تھا اور جو نہ صرف مولانا کی تصانیف میں گل سر سبد کی حیثیت رکھتی ہو بلکہ اردو زبان کے لیے سرمایۂ فخر و ناز ہو۔

یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر مولانا الفاروق کے علاوہ ایک کتاب بھی بلکہ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک مضمون بھی نہ لکھتے جب بھی انہیں ہندوستان کے مورخوں اور محققوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز جگہ ملتی۔ یوں تو مجموعی حیثیت سے کتاب تحقیق و زبان کے لحاظ سے بے نظیر ہو لیکن دوسرا حصہ خصوصیت کے ساتھ مولانا کے گہرے مطالعہ اور ان کے غیر معمولی دل و دماغ کا آئینہ دار ہو۔ مولانا نے ان مسایل پر بحث و گفتگو کی ہو جو آج کل کے مسایل سمجھے جاتے ہیں اور جنھیں مولانا کے معاصرین میں سے کسی نے بھی چھیڑنے کی جرأت نہیں کی۔ مسلمانوں نے ایک عرصہ تک معمورۂ ارض کے ایک بڑے حصہ پر نہایت شاندار حکومت کی ہو۔ ان کا طریق حکومت اور ان کا معاشی نظام اور اقتصادی نظام اس قدر کامیاب رہ چکا ہو کہ موجودہ ترقی و تمدن کے زمانہ اور جدید مشکلات میں بہت کچھ رہبری کر سکتا ہو لیکن یہ حقیقت کس قدر افسوسناک ہو کہ اس دور کی ابھی تک کوئی مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی۔ ہمیں یقین ہو کہ آیندہ جب کبھی بھی لکھی جائے گی تو مرتب الفاروق سے امداد لیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ الفاروق کے متعلق ملک کے ایک ممتاز اہل قلم کی رائے ملاحظہ ہو۔

> یہ عمروں کی کمائی ہو بڑی کاوش اور اہتمام سے سالہا سال کی مورخانہ تلاش اور تحقیق کے بعد ناموران اسلام کے سلسلہ میں خلیفۂ دوم (حضرت عمرؓ) کی لائف پر یہ ضخیم تالیف تیار کی گئی ہے مورخ نے محض تحقیق واقعات کے لیے ممالک غیر یعنی ٹرکی اور مصر وغیرہ کے مصائب سفر برداشت کیے۔ سینکڑوں قدیم اور نایاب تاریخوں کے ہزاروں ورق الٹنے پڑے اور جہاں تک دسترس تھا اصل ماخذ کی چھان بین میں یورپ کا تاریخی سرمایہ بھی بچنے نہیں پایا۔
>
> غرض معلومات کا جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہو وہ میرے خیال میں تاریخ فاروقی کے مہمات مسائل ہیں جن کی نسبت یہ عام دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ کسی زبان میں اس قدر مواد یکجا نہیں مل سکتا۔

خود مولانا شبلی کو اس کتاب پر بڑا ناز تھا مصر کے ایک مشہور مورخ رفیق بک العظیم نے "اشہر مشاہیر الاسلام" کا سلسلہ مولانا

کے ہیروز آف اسلام کی طرح شروع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق اعظم کی سیرت شائع ہوئی اس کے متعلق مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں "آج کل مصر میں سیرت فاروق لکھی گئی۔ بڑا اہتمام کیا گیا ہے مشہور مصنف نے لکھا ہے لیکن دیکھا تو الفاروق کے عشر عشیر بھی نہ تھی" مولانا الفاروق کو اپنی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایڈیٹر رسالہ زمانہ کا نپور کے سوال کے جواب میں انہیں لکھا تھا "میں اپنی تصانیف میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں" کتاب کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے فارسی، ترکی اور انگریزی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں اور غالباً عربی میں بھی۔

اس سلسلہ کی مولانا کی آخری تالیف سیرۃ النبی ہے۔ یوں تو دنیا کی ہر زبان میں آنحضرت صلعم کے حالات اور ان کی تعلیمات پر کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس عظیم الشان تالیف کی مثال نہ تو عربی میں مل سکتی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں آنحضرت صلعم پیدا ہوئے اور نہ دنیا کی کسی اور ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ زبان میں۔

یہ واقعہ ہے کہ مستشرقین یورپ ہمارے خالص مذہبی علوم و فنون کا مطالعہ اور اس کی ریسرچ کرتے ہیں اور پھر ان پر جس کثرت سے کتابیں لکھتے ہیں۔ اس کی مثال عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں سے کوئی زبان بھی پیش نہیں کر سکتی لیکن اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ معلوم نہیں اس عناد اور دشمنی کی بنا پر جو انہیں اسلام اور مسلمانوں سے ہے یا ناواقفیت اور عربی علوم و فنون پر پوری دسترس نہ رکھنے کی بنا پر ان کی تحقیقات بے شمار فاش غلطیوں سے پر ہوتی ہیں۔ عموماً واقعات بھی غلط نقل کرتے ہیں۔ صحیح اور موضوع روایات میں فرق نہیں کر پاتے اور استنتاج تو بلا مبالغہ ۹۰ فی صدی غلط ہوتے ہیں اور "ظلمات فوقہا فوق بعض" کا جامہ ٹھیک ٹھیک ان کی تحقیقات پر فٹ آتا ہے خصوصاً آنحضرت صلعم کی سیرت کو مستشرقین یورپ نے جس طرح پیش کیا ہے وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ رہا ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ آنحضرت صلعم کے نورانی چہرہ سے اس بدنما پردہ کو ہٹایا جائے اور آپ کی صحیح سیرت اور صحیح شکل دنیا کے سامنے پیش کی جائے۔ شبلی کو اس ضرورت کا پورا پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے عمر کا آخری حصہ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے ایک ایسی سیرت کی تالیف کا قصد و ارادہ کیا جس میں صحیح نقل اور صحیح عقل کے ذریعہ مستشرقین یورپ کے اعتراضات کا ابطال کیا جائے۔ ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے اور آنحضرت صلعم کی سیرت و تعلیمات کو اصلی شکل میں پیش کیا جائے مگر ظاہر ہے یہ کام تھا مشکل۔

عربی کی وہ تمام کتابیں جو یا تو اس موضوع پر تصنیف کی گئی تھیں یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی تھیں شبلی کے ناخن علم میں تھیں لیکن انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی کتابوں پر عبور حاصل کرنا مشکل تھا کیونکہ شبلی ان زبانوں سے ناواقف تھے۔ مگر تھے دھن کے پکے جس چیز کا ارادہ کر لیتے اسے پورا کر کے چھوڑتے اور مکمل بھی اس طرح کرتے کہ تحقیق اور تفتیش کا کوئی گوشہ تشنہ نہ رہتا۔ پھر سیرت کے متعلق تو ظاہر ہے کہ تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کے جتنے ممکن طریقے تھے انھیں اختیار کرتے محض اسی وجہ سے نہیں کہ یہ ان کی آخری تصنیف تھی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ کتاب اس کی متقضی تھی۔ چنانچہ انھوں نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی ان کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جو آنحضرت کی سیرت پر لکھی گئی تھیں اور ان کے ضروری حصوں کے ترجمے کرائے۔ جہاں مفید مطلب بات ملی اسے لے لیا اور جہاں غلطیاں نظر آئیں ان کے مدلل جواب لکھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا اسے ذیل کے خط سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

> "سیرت نبوی جو زیر طبع ہے میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں۔ نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔
>
> اس بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آنحضرت کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے اس لیے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو ان کے پاس ایک کتاب بھیج دی جائے۔ وہ مطالعہ فرما کر قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔"

گو مولانا اس کتاب کو اپنی حیات میں مکمل نہ کر سکے لیکن اس کے لیے اتنا مواد اور مکمل خاکہ تیار کر دیا تھا کہ ان کے بعد بھی یہ کام اسی خوبی اور حسن کے ساتھ جاری رہ سکا۔

مولانا کی یہ کتاب محض تحقیق و تفحص کے لحاظ ہی سے اہمیت نہیں رکھتی بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ان کا شاہکار ہے۔ خود مولانا کو اس پر بڑا فخر تھا ایک قطعہ میں تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ اسے اگر کوئی لکھ سکتا تھا تو ہمیں لکھ سکتے تھے فرماتے ہیں

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حالِ سرورِ عالم | دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامیں لکھتے
صدا یہ بارگاہِ عالم قدس سے آئی | کہ "یہ ہے اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے۔"

حالی نے مسدس لکھ کر ایک طرف اپنے لیے اردو دنیا میں ابدی جگہ حاصل کر لی تو دوسری طرف آخرت میں نجات کا سامان کر لیا شبلی نے سیرت النبی کی تالیف کا آغاز کر کے ایک طرف تو یورپ کے مورخین و محققین کی صف اول میں اپنے کو لا کھڑا کیا تو دوسری طرف اپنی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ایک مبارک موضوع پر کیا خود فرماتے ہیں

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی | مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم | خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا ہے مولانا کے بہت سے تاریخی مضامین بھی ہیں جو ان کے کارناموں میں شامل کیے جا سکتے ہیں یہ مضامین گو مختصر ہیں اور تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتے مگر تحقیق تفحص اور تلاش و جستجو کے لحاظ سے ان کی حیثیت کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہے۔

مولانا کے چند مضامین کا مجموعہ ان کی حیات ہی میں رسائل شبلی کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جرجی زیدان جیسے مشہور اہل قلم نے بھی ان سے استفادہ کیا چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کی ذیل کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کی تیسری جلد علوم و فنون کی تاریخ پر ہے۔ بدگمانی نہیں کرتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسایل اس کے سامنے تھے اور انھیں کو دیکھ کر اسی رنگ سے واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسایل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے، اس نے یہ مرقع تیار کیا تھا"

انھیں مضامین میں ایک مضمون کتب خانہ اسکندریہ پر بھی ہے منجملہ ان افسوسناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق کسی زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں اور اب تک قایم ہیں ایک کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا واقعہ ہے......اس واقعہ کو یورپ نے جس بلند آہنگی سے مشہور کیا ہے حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ تاریخیں، ناولیں، حکایتیں، مثلیں، افسانے، قصہ طلب حوالے، روزمرہ کے محاورے ایک چیز بھی اس صدا سے خالی

نہیں۔ ادب اور لٹریچر کا کیا ذکر ہے منطق و فلسفہ بھی اس کے اثر سے محروم نہ رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کو اس کی صحت کا یقین ہو چلا تھا مگر مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسلمانوں پر سے اس الزام کو دور کیا۔ اس مضمون میں مولانا کی تحقیق و تلاش پوری طرح نمایاں اور ممتاز ہے۔ عربی کی کتابیں تو مولانا کے ناخنِ علم میں تھیں ہی لیکن اس مضمون میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتابوں سے اس کثرت سے استفادہ کیا گیا ہے کہ اس کی مثال اردو کی کوئی تصنیف پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مولانا کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب جس قسم کی رائے رکھتے ہیں اس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے لیکن اس مضمون کے متعلق ان کی رائے ملاحظہ ہو۔

"طالب علمی کے زمانے میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تھا تو بےحد رنج اور صدمہ ہوتا تھا لیکن جب شمس العلما مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلایل اور پُرزور شہادتوں سے اس کی تردید کی، تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ یہ محض فسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے۔"

مولانا کا ایک اور مضمون ان کی تحقیق و تفتیش اور ان کی تنقیدی قوت کے لحاظ سے نہ صرف مولانا کے مضامین میں بلکہ اردو زبان میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کا ابھی ذکر آ چکا ہے۔ اس میں مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصبانہ حملے کیے ہیں لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی مگر مولانا شبلی عقاب کی سی نظر رکھتے تھے ان سے کیوں کر بچ سکتی تھی انھوں نے ان تمام اعتراضات کی جو مسلمانوں پر علانیہ یا خفیہ طور پر کیے گئے تھے نہایت مدلل تردید کی اور مصنف کی فریب کاریوں اور خیانتوں کو آشکارا کیا۔ یہ رسالہ پہلے عربی میں تھا مگر اردو جاننے والوں کی واقفیت کے لیے خود ہی اردو میں ترجمہ کیا مگر اردو میں مختصر اور خود مصنف کے الفاظ میں طرزِ تحریر بھی معمولی ہے۔"

عبداللطیف اعظمی

بہاری ست سئی

آج ہم چاہتے ہیں کہ اردو پبلک کو ایک ہندی شاعر سے روشناس کرائیں ہمیں توی امید ہو کہ وہ اس نئے تعارف سے خوش ہوں گے ممکن ہو بعض لوگوں کے لیے یہ تعارف نیا نہ ہو مگر ہمیں یقین ہو کہ زیادہ تر اصحاب کے لیے یہ کچھ نیا ہی ہوگا۔

جس شاعر کا ہم ذکر کیا چاہتے ہیں وہ ہندی کا غالب بہاری لعل، وہی باریک بینی، وہی نکتہ سنجی، وہی مشکل پسندی اور معنی آفرینی، وہی شوخی، وہی سادگی، وہی متانت اور اس کے ساتھ ساتھ وہی انداز بیان فرق صرف یہ ہو کہ ایک نے اردو میں غزلیں اور اشعار کہے دوسرے نے بھاشا میں دوہوں سے اپنا مطلب بیان کیا۔ غالب نے تغزل میں نئی روح پھونک دی۔ بہاری نے شرنگار رس میں اچھوتے مضامین بیان کیے کہ بھاشا کی شاعری کو چار چاند لگ گئے۔

مگر پہلے شرنگار رس کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری ہو جس طرح اردو میں لفظ تغزل سے ذرا ہم نفس شعر کو سمجھ جاتے ہیں ہماری نگاہوں کے سامنے اس ایک لفظ کی برکت سے رنج فرقت، شوق وصال یا لطیف چھیڑ چھاڑ معاملہ بندی، معشوقانہ شگفتگی، عاشقانہ نیاز، مختصر یہ کہ حسن و عشق کے واردات قلبی کی ایک جیتی جاگتی دنیا آباد ہو جاتی ہو، اسی طرح شرنگار کا لفظ جدائی کے صدموں، ساون اور بسنت میں پردیسی پیا کی یاد، چاندنی راتوں کا دہکتا ہوا درد، دل کی تڑپ جسم کی پیاس پکار پکار ساجن کے ملنے پر روح کی تازگی، عضو عضو میں ایک پھرتی تمنائے ہم آغوشی کا جوش، ساز جذبات کا شیریں ارتعاش۔ بس یوں سمجھیے کہ رنج و ملال، یاس و امید، سرور و انبساط کی ایک ایسی دلفریب رنگ بھومی تیار کر دیتا ہو کہ دل و دماغ مست ہو کر رہ جاتے ہیں۔

شرنگار رس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ بیوگ شرنگار اور سنجوگ شرنگار۔ بیوگ شرنگار میں حزن و ملال کے ان جذبات کا اظہار ہوتا ہو جو ہجر یا فرقت میں پیدا ہوتے ہیں۔ سنجوگ شرنگار مسرت کے ان جذبات سے بھرا ہوتا ہو جب بچھڑے ہوئے پریمی آپس میں مل جاتے ہیں۔ ایک اور نکتہ اسی سلسلہ میں عرض کر دینا ضروری ہو اور وہ یہ کہ

ہندی یا بھاشا کی شاعری میں جذبات عشق کا اظہار اردو شاعری سے ذرا سا مختلف ہے۔ اردو شاعری میں اظہار عشق یا تو مرد کی طرف سے عورت کے لیے ہوتا ہے یا کبھی کبھی مرد کی طرف سے حسین لڑکے کے لیے۔ ہندی شاعری میں زیادہ تر عورت عاشق ہوتی ہے اور اظہار عشق اس کی طرف سے مرد کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ عورت کا دل زیادہ لطیف جذبات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ مرد کے دل میں درد نہ ہوتا ہو مگر وہ عورت کے دل کے سوز و گداز کو کہاں پہنچ سکتا۔ مثال کے لیے ایک دوہا لیجیے۔

کاگا سب تن کھائیو چن چن کھیو ماس دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

ایک فرقت نصیب اپنے ساجن کا انتظار کرتے کرتے زندگی سے مایوس ہو چلی ہے اسے یقین ہو گیا ہے کہ اب عمر زیادہ وفا نہ کرے گی مگر آنکھیں ہیں کہ تشنگیٔ دیدار کی حسرت بھری کہانی دہرا رہی ہیں۔ امید ہے کہ بار بار چھوٹ جانے پر بھی بڑھ کے دامن تھام لیتی ہے۔ آخر کار وہ سمجھ لیتی ہے کہ وہ زندہ نہ رہ سکے گی۔ مگر مرنے کے بعد بھی اسے یقین ہے کہ آرزوئے دید اس کی آنکھوں سے نہ جائے گی کوّے اس کے جسم کو نوچ نوچ کے کھائیں گے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آنکھوں کو بھی کھا جائیں پھر کیسے وہ اپنے ساجن کو دیکھ سکے گی۔ لہذا اس کی التجا ہے کہ سب کچھ کھا لینا مگر اے کاگا۔ ،، دو نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس ،، یہی دو آنکھیں پیا سے ملنے کی امیدیں ہیں مرد نہ تو اس انداز سے عورت کا انتظار کر سکتا ہے نہ کبھی اس کے جذبات میں سوز و درد اور صبر و تحمل کی ایسی لطیف آمیزش پائی جا سکتی ہے۔ اس مثال سے صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ بھاشا کی شاعری چونکہ جذبات عشق کے اظہار میں عورت کے دل کی ترجمانی کرتی ہے لہذا سوز و گداز اس میں اردو کی شاعری سے کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم آپ کا تعارف بہاری سے کرائے دیتے ہیں۔ بہاری لعل ذات کے ماتھر چوبے تھے۔ گوالیار کے قریب بسوا گوبند پور گاؤں میں سمبت ۱۶۶۰ بکرمی مطابق سنہ ۱۶۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے ان کا بچپن بندیلکھنڈ کی خوشنما پہاڑی فضا میں گزرا۔ جوانی کے بیشتر دن جے پور میں اور بڑھاپا انھوں نے اپنی سسرال متھرا میں گزارا۔ جوانی کے آغاز ہی میں ان کا تعلق جے پور دربار سے ہو گیا تھا وہاں اس وقت مرزا راجہ مہاراج جے سنگھ حکمراں تھے کہا جاتا ہے جس وقت بہاری لعل جے پور پہنچے مہاراجہ اپنی چھوٹی رانی

کے عشق میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ ریاست کے کاموں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، سارا وقت محلوں میں گزارتے تھے۔ ریاست کو اس سے کافی نقصان پہنچ رہا تھا چنانچہ سرداروں نے صلاح کی کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اتفاق سے ایک شاعر بھی ان کی مدد کو حاضر تھا۔ بہاری نے صرف ایک دوہا لکھ کر ان کو دیا اور سرداروں نے کسی طرح اس دوہے کو زنانے محلوں میں مہاراجہ کے پاس پہنچا دیا۔ اس دوہے نے بالکل وہی اثر کیا جو رودکی کی مشہور غزل نے کیا تھا۔

مہاراج نے جوں ہی اس دوہے کو پڑھا محل سے نکل آئے اور اسی دن سے ریاست کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ دوہا یہ تھا۔

نہیں پراگ نہیں مدھر مدھو نہیں وکاس ہی کال   الی کلی ہی میں بندھیو آگے کون حوال

یعنی ابھی کلی چٹکی تک نہیں، نہ اس میں خوشبو ہے نہ میٹھا رس مگر بھونرا ہے کہ اسی پر متوالا ہو رہا ہے۔ آگے چل کر جب کلی کھل کر پھول بنے گی اور خوشبو اور رس کی دولت سے مالا مال ہوگی اس وقت خدا جانے بھونرے کا کیا حال ہوگا

ابھی سے عشق میں بیٹھے ہیں سر کو پھوڑ کے ہم   ابھی تو ان پہ جوانی کی آب و تاب نہیں

اس واقعہ کے بعد بہاری کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ مہاراج نے انھیں اس قسم کے دوہے بنانے کا حکم دیا۔ بہاری دوہے لکھ لکھ کر سنانے لگے۔ ہر دوہے پر انھیں ایک اشرفی بطور انعام ملتی تھی۔ اس طرح کل سات سو دوہے بنے جو مجموعے کی شکل میں "بہاری ست سئی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ بہاری کی زندگی کے مفصل حالات نہیں ملتے۔ آج سے تین سو برس پہلے بہت کم سوانح حیات لکھی جاتی تھیں اس لیے سوائے اس کے کہ کچھ شارحین نے ان کے دوہوں کی شرحیں لکھیں اور کوئی بات ہیں ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ دوہوں سے کہیں کہیں کچھ حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک دوہے میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے بڑھاپے کے دن سسرال میں اچھی طرح نہیں کٹے۔

بہاری کی شاعری میں غضب کا سوز و گداز ہے۔ ان کے تمام دوہے جذبۂ درد سے جو شاعری کی روح ہے لبریز ہیں۔ حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں اور ان کی باریکیوں پر جتنے پہلوؤں سے انھوں نے نظر کی ہے اتنی کسی دوسرے ہندی کے شاعر نے شاید ہی کی ہو۔ ان کے کلام میں جذبات نگاری اور وسعت تخیل کے ساتھ ساتھ ندرت، لطافت

اور شوخیٔ بیان کی خوبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جہاں کہیں حسن و عشق کی چاشنی کے ساتھ ظرافت اور شوخی کا چٹخارہ بھی موجود ہے ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ بہاری کی شاعری کیا ہے مصوری ہے۔ انھوں نے اکثر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں کبھی کبھی مصوری کا لطف آجاتا ہے۔

بہاری کے کلام میں غیر فصیح الفاظ تلاش کرنے پر بھی نہیں ملتے۔ الفاظ کی دل آویز ترکیب، عبارت آرائی زبان کی سلاست اور شیرینی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ درحقیقت برج بھاشا میں سورداس اور تلسی داس کو چھوڑ کر اتنا شیریں زبان اور فصیح بیان شاعر پیدا نہیں ہوا۔

بہاری کے دوہے بے تکلفی، زندہ دلی، سادگی، روانی اور ایسی فضائیں پیدا کرنے میں جو معنویت سے تھرتھرا رہی ہوں اپنا جواب نہیں رکھتے کہیں ادب لطیف کی روح اور رنگینی ہے کہیں شباب نو کی پہلی دھیمی کروٹیں کہیں حقیقت کی جھلک اور کہیں نازک احساسات کا ظہور کہیں نرم رو ہواؤں کی تازگی، دوشیزگی اور اچھوتا پن ہے۔

زیادہ تر بہاری نے اپنے دوہوں میں گاؤں کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور اسی کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیہاتیوں کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے تھے۔ دیہات کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اکثر وہ دیہات کی فضا میں کھو سے جاتے تھے۔ ان کے نزدیک گاؤں خوشیوں اور دلچسپیوں سے پر ہے گاؤں ان کی طفلی کی یاد اور ان کے عالم شباب کا سنہرا خواب ہے جس کی فضا محبت کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے جہاں نشۂ جوانی میں مخمور تندرست اور حسین عورتیں اپنے پریتم کے عشق میں متوالی ہیں اور جھوم جھوم کر گا رہی ہیں۔ پریتم پاس ہیں تو ان کے نغمے خوشی سے لبریز ہیں اور اگر پریتم پردیس چلے گئے تو ان کے گیت بلا کے درد انگیز ہو جاتے ہیں۔

اب ہم بہاری کے کلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں جس سے ان کے سوز و گداز، ویوگ اور سنجوگ شرنگار مصوری، نازک خیالی اور معنی آفرینی، طنز، اخلاق اور پند و نصائح کا کچھ رنگ ظاہر ہوا اور اردو داں سخن شناس بھی ان کے کلام کی داد دے سکیں۔

سوز و گداز:۔

ہوں ہی بوری برہ بس کے بورو سب گاؤں   کہا جان یے کہت ہیں سسنہی سیتکر ناؤں

گاؤں کی کھلی ہوئی فضا ہے چاند اپنی کامل رعنائیوں سے جگمگا رہا ہے۔ چاروں طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ایک فرقت نصیب دوشیزہ ہے کہ اس کے دل میں درد و غم کا دریا موجیں لے رہا ہے اور یہ چاندنی تو اس کے دل میں اور آگ لگائے دے رہی ہے۔ گاؤں والے سب خوش نظر آتے ہیں اور چاندنی کی تعریفیں کر رہے ہیں۔ ان کے لیے اس چاندنی میں کتنا سکون کتنی ٹھنڈک ہے اور اس دوشیزہ کے لیے کتنی آگ۔ وہ کہتی ہے یا تو جدائی کے صدمے کی وجہ سے میں پاگل ہو رہی ہوں یا سارا گاؤں پاگل ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ چاند کو ٹھنڈک پہنچانے والا کیوں کہہ رہے ہیں میرے دل میں تو یہ اور آگ بھڑکا رہا ہے۔ ایک اردو کے شاعر نے ایک رباعی میں اس دوہے کا ترجمہ کیا ہے۔ خوب ہے۔

چاندنی درد کو بڑھاتی ہے ۔۔۔ آگ فرقت کی یہ لگاتی ہے

میں ہوں پاگل کہ وہ جو کہتے ہیں ۔۔۔ اس سے دنیا سکون پاتی ہے

ان دکھیاں انکھیاں کو سکھ سرجوہی ناہیں ۔۔۔ دیکھت بنے نہ دیکھتے بن دیکھے اکولاہیں

آنکھوں کا سکھ اسی میں ہے کہ اپنے پریتم کے جی بھر کے درشن کریں۔ ایک عورت اپنی سکھی سے کہہ رہی ہے کہ میری دکھی آنکھوں کی قسمت میں آرام و سکون ہے ہی نہیں کیونکہ جب وہ ہوتے ہیں تو شرم کچھ ایسی دامنگیر ہوتی ہے کہ میں انھیں نہیں دیکھ پاتی۔ ہرچند چاہتی ہوں کہ میں ان کو دیکھوں مگر حیا مانع ہوتی ہے اور نگاہیں نہیں اٹھتیں جب وہ چلے جاتے ہیں تو آنکھیں ان کے دیدار کے لیے بےچین ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یوں دیکھا نہیں جاتا اور بغیر دیکھے چین نہیں آتا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کی قسمت میں ہی سکون و آرام نہیں ہے۔

یوگ شرنگار رس۔ غالب کا بہت مشہور شعر ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔

بالکل اسی خیال کو بہاری نے بھی ایک دوہے میں ادا کیا ہے۔

جو واکی تن کی دسشا دیکھیو چاہت آپ ۔۔۔ تو بلی نیکو بلو کے لیے چلی اچکاں چپ چاپ

عاشق کے دل پر جدائی میں جو کچھ گزرتی ہو معشوق کے سامنے آتے ہی بیتابی و اضطراب کی تمام کیفیات اس کے چہرے سے مٹ جاتی ہیں۔ بیمار چہرہ میں روح بہار کی شگفتگی دوڑ جاتی ہے اور معشوق اس کی حالت کا صحیح اندازہ

نہیں کر سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ عاشق مزے میں ہے، خوش ہے اب یہ کیونکر اس سے کہا جائے کہ یہ عارضی مسرت کی جھلک محض اس کے روبرو ہونے کا کرشمہ ہے اور کیسے اس پر عاشق کی وہ حالت ظاہر کی جائے جو اس کی عدم موجودگی میں ہوتی ہے۔ ہندی شاعر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو میں نے شروع ہی میں عرض کر دیا ہے کہ ہندی شاعری میں بیشتر عورت عاشق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دوہے میں بھی عورت ہی عاشق ہے وہ ہجر کے صدمے برداشت کر رہی ہے اور اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس کا پریتم آتا ہے اور اس کی سکھی سے دریافت کرتا ہے کہ اس کا کیا حال ہے۔ وہ جواب دیتی ہے یوں تو آپ کو اس کی صحیح حالت کا اندازہ کبھی نہ ہو سکے گا جب آپ سامنے جائیں گے اس کا چہرہ فرطِ انبساط سے کھل اٹھے گا اور آپ اس کے جسم کی مایوس پکار نہ سن سکیں گے ہاں طریقہ صرف ایک ہے اور میں آپ کی بلائیں لیتی ہوں کہ آپ چپ چاپ چلیں اور چھپ کر خاموشی سے اس کی حالت دیکھیں تب آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ غالب کے شعر میں عاشق کی پریشانی یہ ہے کہ معشوق پر اس کا حال ظاہر نہیں ہو پاتا۔ یہاں عاشق (عورت) اس سے بے نیاز ہے مگر حالت اس کی اتنی نازک ہے کہ اس کی سکھی کو رحم آتا ہے۔ اور بلائیں لے کے مرد سے درخواست کرتی ہے کہ آپ چھپ کر اس کی حالت دیکھ لیں کہ جدائی میں اس غریب کا کیا حال ہوتا ہے۔

دِس دِس کُسُمت دیکھیئے اپبن اپبن ساج　　　　منو ہیوگن کو کیو سرپنجر رتی ...... راج

بسنت رُت ہے۔ فضائے عام میں ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ پھول کھل رہے ہیں، کلیاں چٹک رہی ہیں سرسوں پھولی ہے۔ آم بور سے لدے ہوئے ہیں۔ کائنات پر رنگ و بو کا نشہ سا چھایا ہوا ہے۔ انسانوں پر بھی سرخوشی کا عالم ہے۔ مگر ایک فرقت نصیب کے لیے یہ ہنگامۂ کیف و نشاط کوئی معنی نہیں رکھتا یہی نہیں بلکہ اس کے دل میں درد کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ یہ تمام پھول اور ہرے ہرے پات اسے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کام دیو کے تیر ہیں ان تیروں سے کام دیو نے اس بیوگن کے لیے ایک پنجرا تیار کر دیا ہے بہار، جوشِ شباب، دلوں کے ولولے، کام دیو کی شرارتیں اور پھر ایسی حالت میں فرقت کا غم۔

بھری بہار کے دن ہیں خیال آ ہی گیا　　　　اُجڑ نہ جاتا تو پھولوں میں آشیاں ہوتا

سنجوگ شرنگار:۔

دہیں نگوڑے نین یہ گہیں نہ چیت اچیت　　　　مین کس کے رسیں کروں یہ نرکھے ہس دیت

عورت چاہتی ہو کہ اپنے ساجن کے آنے پر بے اختیار اظہارِ مسرت نہ کرے بلکہ کچھ خودداری کچھ مان قایم رکھے نیز یہ کہ دیر تک انتظار کرنے کے بعد جب وہ آئے تو اس سے کچھ اظہار ناراضگی بھی ہو۔ وہ سوچتی ہو کہ خوب کھنچی رہوں گی۔ ترش رو ہو کے بات کروں گی۔ غرض یہ کہ طرح طرح کے منصوبے ہیں مگر آنکھیں کم بخت اس کے قابو میں نہیں۔ جہاں ساجن آنکھوں کے سامنے آئے یہ مسکرا دیں اور خودداری اور اظہار ناراضگی کے وہ تمام حوصلے دم بھر میں مٹ کر رہ گئے۔ لہذا کہتی ہو کہ یہ آنکھیں جل جائیں تو اچھا کیونکہ میں تو چاہتی ہوں کہ کچھ غصہ کروں مگر یہ نہیں مانتیں اور بے قابو ہو کر ہنس دیتی ہیں اور میرے جی کی جی ہی میں رہ جاتی ہو۔

یا ہیں سے زیادہ لطیف پیرایہ میں قریب قریب اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہو۔

موہیں لجاوت نلج یہ کیس ملت سب گات بھانو ادرے کی اوس لوں مان نہ جانیو جات

یعنی کیا بتاؤں جب وہ آتے ہیں تو میں چاہتی ہوں کہ کچھ مان کروں مگر مرے تمام اعضائے جسم مرے کہنے میں نہیں رہتے۔ کان ان کی باتیں سننے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں آنکھیں انہیں جی بھر کے دیکھنے کے لیے بے قرار باہیں ان کے گلے کا ہار بننے کے لیے پھڑک اٹھتی ہیں۔ غرضیکہ مرے تمام اعضا مجھے شرمندہ کراتے ہیں اور مری خودداری یا مان اس طرح فنا ہو جاتا ہو جیسے کہ طلوع صبح سے قطرۂ شبنم۔ یہاں تشبیہ کی دلکشی اور رموزونیت دیکھنے کے قابل ہو۔ اپنے مان کو قطرۂ شبنم اور پریتم کے آنے کو طلوع صبح سے تشبیہ دی ہو۔ کیا اس سے لطیف تشبیہ دماغ میں آسکتی ہو؟

مصوری :۔ مصوری میں بہاری کا آرٹ اس مصور کا سا ہو جس کو ایک بڑے قرطاس پر تصویر بنانی ہوتی ہو۔ کہیں اسے ایک پورا سین دکھانا ہو کہیں ایک دلکش منظر قدرت کی عکاسی کرنی ہو۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمام جزئیات کو نمایاں کرے۔ مصور کامل ہو۔ ایک تصویر کے بنانے میں اپنے برش کو وہ صرف چھ سات مرتبہ حرکت دیتا ہو اور تصویر اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ مکمل نظر آتی ہو۔ بہاری الفاظ سے مصوری کرتا ہو چنانچہ کہیں کہیں صرف آدھے درجن لفظ ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں ملاحظہ ہو۔

کہت نٹت ریجھت کھجت ملت کھلت لجیات بھرے بھون میں کرت ہیں نینن ہی سوں بات

بھرا گھر ہو بات کرنے کا موقع نہیں۔ مگر محبت بھرے دل ہیں کہ بے چین ہیں کہ کچھ کہا ضرور جائے۔ قدم

قدم پر بھرے گھر کی پاسبانی کا بھی خیال ہے۔ با آخر آنکھیں دل کی ترجمان بنتی ہیں۔ سب کی نظریں بچا کر عاشق آنکھوں ہی آنکھوں میں عورت سے کچھ درخواست کرتا ہے۔ عورت بھی صرف آنکھوں کے اشارے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس انکار کی ادا عاشق کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور عورت کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ پھر نگاہیں ملتی ہیں، ہنستی ہیں اور شرم سے جھک جاتی ہیں۔ چہرہ گلنار ہو جاتا ہے۔ اس طرح بھرے گھر میں بھی آنکھوں آنکھوں میں بات ہو لیتی ہے۔ یہاں شاعر نے ایک پورا سین نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا ہے اور محض چند الفاظ میں۔ یہ واقعی کمال مصوری ہے۔

یا ایک دوسری جگہ۔

سن پگ دھنی جیتی اتے نہات دیئی بیٹھ　　　چکی جھکی، سکوچی، ڈری ہنسی لجیلی دیٹھ

ایک عورت تالاب پر نہا رہی ہے کہ یکایک اپنے پریتم کے قدم کی چاپ سنتی ہے۔ اس کے خیالات میں ایک عجیب تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ اسے اس بات کی تو خوشی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پریتم کے درشن کرے گی مگر اپنی حالت پر غور کر کے وہ چونک اٹھتی ہے۔ ادھر اشتیاق دید اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ مڑ کر پریتم کی طرف دیکھ لے۔ ایسا کرتے ہی فوراً اسے اپنی بے حجابی کا احساس ہوتا ہے وہ جھک جاتی ہے، شرما جاتی ہے اور اپنے جسم کو سکوڑتی ہے مگر جذبہ مسرت اسے ہنسائے بغیر نہیں چھوڑتا۔ ایسی حالت میں بھی چنانچہ نہ جانے کیا سوچ کر کچھ بے باک سی ہو کر وہ ہنس دیتی ہے شاعر نے یہاں صرف سات لفظوں سے (چکی جھکی سکوچی۔ ڈری ہنسی لجیلی دیٹھ) ایک واقعہ کی مکمل تصویر کھینچ دی ہے جس میں کیفیات مادی کی مصوری کے ساتھ ساتھ کیفیات ذہنیہ کی مصوری بھی شامل ہے۔

نازک خیالی:۔

مانو بدھ تن اچھ چھبی سو چھ راکھیے کاج　　　درگ پگ پونچھن کو کیے بھوشن پا بنداج

یہاں بہاری نے عورت کے حسن کی تعریف میں بڑی لطیف بات کہی ہے۔ اس کا حسن اتنا نازک اور صاف ستھرا ہے کہ پائے نگاہ سے اس پر گرد آ جانے کا احتمال ہے اس لیے شاید صانع قدرت نے اس کے جسم پر زیوروں کا پاانداز بنا دیا ہے کہ نگاہ پہلے زیوروں پر پیر صاف کر لے تب اس کے حسن کے فرش شفاف پر قدم رکھے۔ صفائی حسن کا یہ عالم ہے کہ نگاہ سے میلی ہو جاتی ہے۔ اور زیور اس لیے نہیں ہیں کہ حسن نکھر جائے بلکہ پائے نگاہ کی گرد پونچھنے کے لیے ہیں۔ "پائے نگاہ (درگ پگ) غالب نے بھی استعمال کیا ہے۔ اکثر بہاری نے اردو اور

فارسی کے لفظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں آخری لفظ "پا انداز" فارسی ترکیب ہے۔ اسی طرح ایک اور دوہے میں جس میں بہاری نے نازک خیالی کا کمال دکھایا ہے شبیہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

لکھن بیٹھ جا کی سبیہ گہہ گہہ گرب گرور ۔۔۔ بھئے نہ کیتے جگت کے چتر چتیرے کور

اس کی تصویر بنانے کے لیے دنیا کے بہت سے قابل مصور آئے اور کمال فن کے غرور میں اس کی تصویر بنانے کے دعوے پیش کیے اور کوششیں بھی کیں مگر سب کو بیوقوف بننا پڑا کیونکہ اس حسن و لفریب کی صحیح تصویر وہ نہ بنا سکے۔ انھوں نے تصویر بنائی اور بنانے کے بعد جب اسے دیکھا تو فوراً محسوس کیا کہ تصویر اس کی نہیں اس کے حسن کی دلکشی کہیں زیادہ ہے۔ انھوں نے پھر کوشش کی مگر ہر مرتبہ دلکشی حسن زیادہ ہی ہوتی جاتی تھی۔ اور ان کو آخر کار منہ کی کھانی پڑی۔ تصویر وہ کیا بناتے :

کاگد پر لکھت بنت کہت سندیس لجات ۔۔۔ کہیے سب تیرو ہیو میرے ہیے کی ... بات

ایک عورت اپنے پریتم کے پاس پیغام بھیج رہی ہے کہ جو کچھ دل میں ہے اسے کاغذ پر لکھ نہیں سکتی کہنا چاہتی ہوں تو حیا مانع آتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر سندیس بھیجوں۔ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تم خود اپنے دل سے پوچھ لینا کہ میرا کیا پیغام ہے۔ تمھارا دل میرے دل کے تمام راز، میری سب آرزوئیں۔ میرا سارا پیغام مختصر یہ کہ میرے دل کا سب حال تمھارا دل تمھیں بتلا دے گا یہی میرا سندیسہ ہے۔

معنی آفرینی :-

درگ ارجھت ٹوٹت کٹم جرت چتر چت پریت ۔۔۔ پرت گانٹھ درجن ہیئے دئی نئی یہ ریت

قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز الجھتی ہے اسی کو ٹوٹنا چاہیئے۔ اسی کو جڑنا چاہیے اور اسی میں گانٹھ پڑنی چاہیئے مگر محبت کے آداب اور آئین نرالے ہیں آنکھیں ملتی ہیں اور نگاہیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ تار نگاہ ٹوٹیں یا آنکھوں پر کوئی مصیبت آئے۔ ٹوٹتے ہیں خاندان اور خوش مذاق طبیعتوں میں محبت کا رشتہ جڑ جاتا ہے۔ براطوار لوگوں میں یہی آنکھ کا ملنا دشمنی کا باعث ہوتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ صرف ایک ذرا سی بات کے اتنے مختلف اور متضاد نتیجے رونما ہوتے ہیں۔ دور حاضر کے ایک ہندی کے شاعر لالہ بھگوان دین لعل بہار گیہی نے اسی مضمون کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔

لڑیں نین پلکیں جھکیں جیت تڑپت دن رات ۔۔۔ اٹھت سول ار پریت یہ عجب انوکھی بات

یعنی لڑتی ہیں آنکھیں جھکتی ہیں پلکیں، او محبت میں بے چین ہوتی ہیں آنکھیں۔ درد دل میں اُٹھتا ہے کیسی عجیب بات ہے۔

ڈرنہ بڑے نیند نہ پرے ہرے سنکال بہاک ۔۔۔ جھنک جاک اچکے نہ پھر گھر دشم چھپی چھاک

یعنی یہ وہ نشہ نہیں جو خوف کی وجہ سے اتر جائے۔ یہ وہ نشہ نہیں جس کی غنودگی سلا دے اس نشہ کا تو شاید خار بھی نہیں۔ ایک مرتبہ تھوڑا سا چڑھ جانے کے بعد یہ نشہ اترتا تو جانتا ہی نہیں یہ حسن اور جوانی کا نشہ بھی کتنا عجیب اور کس بلا کا ہوتا ہے

پوچھ مت نشۂ شباب حسن ۔۔۔ اتنا کا سرور ہوتا ہے

نیھ نہ نینن کو کچھ اپجی بڑی بلا ئے ۔۔۔ نیر بھرے نت پرت ہیں تو نہ پیاس بجھائے

ان آنکھوں کو محبت نہیں کوئی بیاری لگ گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی پیاس کیوں نہیں بجھتی۔ ہر وقت تو یہ پانی میں ڈوبی رہتی ہیں۔

کہا کند کہ کو مودی کینک آرسی جوت ۔۔۔ جاکی اجرائی لکھے آنکھ اُجیری ہوت

اس کے حسن کی آب و تاب کے سامنے کند (ایک سفید رنگ کا پھول) کی آب چاندنی کی دلکشی اور آئینہ کی چمک سب ہیچ ہیں۔ اس کے حسن شفاف کو دیکھ کر تو آنکھوں میں روشنی بڑھ جاتی ہے کس سادگی سے کتنی لطیف بات کہدی ہے۔

طنز و۔ بہاری کے یہاں طنز میں نازک خیالی اور کنایہ کا وہ انداز نہیں ملتا جو اردو شاعروں کے یہاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندی میں عمدہ اور لطیف پیرایہ کا طنز کم پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں کنایۃً بات کہی جاتی ہے۔ ہندی میں نہایت بے باکی کے ساتھ اور یہی سبب ہے کہ اس میں وہ خوبی پیدا نہیں ہو پاتی۔ داغ کا مشہور شعر ہے۔

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے ۔۔۔ پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

ہندی شاعری میں اسی بات کو صاف طریقہ پر کہدیا جاتا ہے کہ آپ غیر کے گھر سے آرہے ہیں یہی نہیں بلکہ غیر کے ساتھ اخلاص کا ایک پورا مرقع پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اظہار عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ عورتیں دل میں کوئی بات نہیں رکھ سکتیں اس لیے ان کے بیان میں لطیف اشارے کم ہوتے ہیں۔ مرقع خوشنا ضرور ہوتا ہے۔ بات صاف ضرور ہوتی ہے مگر طنز کی خوبی مٹ جاتی ہے۔

پلن پیک۔ انجن ادھر۔ دھرے مہاور بھال ۔۔۔ آج ملے سو بھلی کری بھلے بنے ہو لال

تغافل شعار عاشق ایک عرصہ سے اپنی معشوقہ کو بھلائے ہوئے ہے۔ بالآخر اسے بھولے بسروں کی یاد آتی ہے اور ایک صبح وہ اس کے پاس پہنچتا ہے جو اس کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ اتنی مدت کے بعد اس تجدید ملاقات سے عورت کو خوش ہونا چاہیے تھا مگر خوش ہونے کی بجائے اس کی کچھ اور حالت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ مرد کی آنکھوں میں پان کی ہلکی سرخی لگی ہوئی ہے۔ ہونٹوں پر جا بجا کاجل کے نشانات ہیں اور ماتھے پر مہاور لگی ہوئی ہے۔ ایک لمحے میں وہ سمجھ گئی کہ رات کن رنگینیوں میں گزری ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آنکھوں میں پان کی سرخی صرف اس طرح آسکتی تھی کہ کسی نے اس کی آنکھوں کو چوما ہو۔ اس کے ہونٹوں پر کاجل کے نشانات صاف غمازی کرتے تھے کہ اس نے کسی کی کاجل آلود آنکھوں کے بوسے لیے ہیں اور ماتھے پر مہاور کی سرخی اس کا قطعی ثبوت تھی کہ اس نے کسی کے قدموں میں گر کر خوشامد کی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عاشق متمنی ہے کہ عورت کی طرف سے کچھ خوشی کا اظہار بھی ہو چنانچہ وہ کہتی ہے۔ آنکھوں میں پان کی سرخی، ہونٹوں پر کاجل ماتھے پر مہاور آج آپ تشریف لائے ہیں اور اس سج دھج سے۔ واقعی آپ نے میرے ساتھ آج بڑا اچھا سلوک کیا ہے۔

اج اگر ب۔ اس، امنگ بھرے نین مسکیات رات رمی رت دیت کہہ اور ے پر بھا پر بھات

صبح کے وقت معشوقہ دلنواز کی آنکھیں شرم اور غرور، امنگ اور تھکان سے ایک عجیب پھیکی ہنسی ہنس رہی ہیں۔ یہ ہنسی رات کی رنگینیوں کی داستان کو صاف صاف کہہ رہی ہے۔

یہ اُڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

پند و نصائح۔ حسن و عشق کے سوائے کسی اور رنگ میں بہاری نے بہت کم فکر سخن کی پھر بھی کہیں کہیں اخلاقی پند و نصائح کے بے نظیر مضمون دوہوں میں کہہ دیے ہیں۔

بڑھت بڑھت سمپت سلل من سروج بڑھی جائے گھٹت گھٹت پھر نا گھٹے بروسمول کمھلائے

دولت پانی کی طرح ہے اور انسان کا دل کنول کا پھول۔ پانی بڑھتا ہے تو کنول کا پھول اونچا ہو جاتا ہے۔ بڑھ جاتا ہے مگر پھر پانی کم ہو جاتا ہے کنول کا پھول نہیں گھٹ سکتا اور جڑ سمیت کمھلا جاتا ہے۔ اسی طرح دولت کے بڑھنے سے دل کی خواہشات بڑھ جاتی ہیں۔ دولت کم ہو جانے پر خواہشات میں کمی نہیں ہو پاتی اور انسان کو ہر خواہش پر شکست آرزو کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ دولت کے بڑھ جانے پر بھی انسان اپنی خواہشات میں اضافہ نہ کرے۔

دیو سو سیس بڑھاے لے اپچی بپانت بپیر   جا پے سکھ چاہت لیوتا کے دکھیں نہ پھیر

خداوند کریم جو کچھ بھی دے آنکھوں پر لو۔ اگر تمھیں کبھی تکلیفیں بھی ملتی ہیں تو ان کے قبول کرنے سے گریز نہ کرو۔ یہ تو سوچو کہ تمھاری زندگی کی گوناگوں مسرتیں۔ دلچسپیاں عیش وعشرت بھی تو سب وہی دیتا ہے پس اگر زندگی میں کبھی ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں تو بھی شکر بجا لاؤ اور انھیں قبول کرو

ان مثالوں سے بہاری کی شاعری کی عظمت کا کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا۔ بعض دوہے اردو فارسی کے اشعار کے اتنے ہم رنگ ہیں کہ توارد ہی کہنا چاہیے۔ کیونکہ سرقہ کا کسی پر گمان نہیں ہوسکتا۔ بہاری کا دوہا ہے۔

جن دن دیکھے وے سمن گئی سو بیت بہا   اب الی رہی گلاب کی اپت کٹیلی ڈار

اردو کا شعر ملاحظہ

بہاریں ہم کو بھولیں یاد اتنا ہے کہ گلشن میں   گریباں چاک کرنے کا بھی ایک ہنگام آیا تھا

فارسی کا مشہور شعر ہے۔

چہ می پرسی زحال ما دل غمدیدہ ات چوں شد   دلم شد خوں وخوں شد آب وآب از چشم بیروں شد

بہاری نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے۔

تجوا نچ اتی برہ کی رہیو پریم رس بھیج   نینن کے مگ جل بھئے ہرئے لیسیچ لیسیچ

خامیاں کس کے یہاں نہیں۔ لغزشیں تو ہوتم تک سے ہوئیں ہیں۔ بہاری کے یہاں بھی لغزشیں ہیں مگر وہ ایسی ہیں کہ آسانی کے ساتھ نظر انداز کی جاسکتی ہیں کیونکہ زیادہ تر لغزشیں النکار (صنایع بدایع لفظی ومعنوی) کے استعمال کی ہیں جن کی کثرت اور بے تکاپن اکثر ناگوار ہوتا ہے کبھی کبھی مضمون اتنا شوخ ہو جاتا ہے کہ اس میں عریانی آجاتی ہے اور کہیں یہ بھی ہے کہ دوہے کا مطلب سمجھنے کے لیے ایک پہیلی سی بوجھنی پڑتی ہے مگر ایسے دوہے بہت کم ہیں زیادہ تر ان کے دوہے عمدہ تراشے ہوئے ہیروں کی طرح ہیں جو آج بھی ان کے نام کو چمکا رہے ہیں۔

میں نے بہاری کے کلام کے کچھ محاسن بیان کیے ہیں بہت کچھ اب بھی باقی ہیں مگر مضمون یونہی طویل ہوگیا ہے۔ لہذا ختم کرتا ہوں ؎

دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو زداماں گلہ دارد

ایس۔ این سنہا

تاثرات

سر پہ اپنے پہاڑ دھر لوں گا　　اور کانٹوں سے جیب بھر لوں گا
حرف آئے نہ تیری رحمت پر　　میں تو دوزخ قبول کر لوں گا

اونچے محلوں کے سرد سائے میں　　لہلہاتے ہیں رنگ رنگ کے پھول
چند مفلس سڑک کے دونوں طرف　　سوتے ہیں پھانکتے ہیں تپتی دھول

میرے دیوانہ وار ہنسنے پر　　میرے بدخواہ مجھ سے بدظن ہیں
یہ مرے قہقہے نہیں لیکن　　یہ مرے آنسوؤں کے مدفن ہیں

گو ضرورت نہیں مجھے اس کی　　دل کو اک بار پھر ابھرنے دے
موت کا وقت جب مقرر ہے　　زندگی سے مذاق کرنے دے

تو نے جب التفات سے دیکھا　　پرزے یوں اڑ گئے مرے دل کے
جیسے ٹوٹی ہوئی کوئی کشتی　　ڈوب جائے قریب ساحل کے

احمد ندیم قاسمی

ریسرچ

(شاعر کے نقطۂ نظر سے)

(میں نے ایک ایسے رسالے میں جسے بہر حال، جدید کہنا چاہیئے ایک اہم مضمون دیکھا تھا۔ یہ مضمون بھی بہر حال جدید کہا جا سکتا تھا۔ اس کے مطالعہ کے چند تاثرات نظم ذیل میں پیش ہیں) باقی

ایک مضموں پُر شکوہ و رعب دار ناظرِ مجبور کے سر پر سوار
ایک دریا سرد مفروضات کا ایک طوفاں خشک معلومات کا
ہر ورق پہ فلسفے کی تیز دھار ہر سطر میں علم منطق کا غبار
ہر جگہ خانے پُر از تفصیلِ علم کاغذی اسٹیج پر تمثیلِ علم
یاں حوالے، واں تقابل یاں ثبوت علم کے بھوکوں کی قوت لایموت
ہر سطر باریک ہر جملہ طویل اکتسابِ علم و فن کی سلسبیل
چپے چپے پر مسائل کا ہجوم گوشے گوشے میں تماشائے علوم
موٹی موٹی عینکوں کی اک نگاہ تجرباتِ عقل کی پیچیدہ راہ
لفظ میں تاریکیاں معنی میں راز بے سُرا نغمہ، مگر خوش رنگ ساز
اصل مضموں ایک سطر اولیں باقی سب لٹ لوٹ وہ بھی دلنشیں!
اصطلاحیں، نام، شرحیں، واقعات گرم رو لفظوں کی اک لمبی برات
سن، مقولے، بحث، مطلب، اقتباس وہم، اندیشہ، تصور اور قیاس
کاتبوں، مہروں، خطوں کی جستجو ماضیٔ مدفون کی اک ہائے ہو!
الغرض کاغذ پہ اک جوشِ دماغ جلوہ گر الفاظ کے دھیمے چراغ
اس کے پیچھے ظلمتِ قلب و نظر بے فروغِ آہ، بے سوزِ جگر
بے اثر الفاظ میں معنی کی لاش موت کے پہلو میں دل کا ارتعاش
سرد سوز و ساز، شورِ جاں خموش چین سے سوئی ہوئی بزمِ سروش
نزع کے عالم میں دل کی زندگی محو چشمِ ذوق کی تابندگی
سرد شوخیٔ تخیل کے شرر روح اک صیدِ شکستہ بال و پر
موت ہر تخلیق کو آئی ہوئی زندگی جینے سے شرمائی ہوئی
گو بہ ظاہر صبر کر جاتا ہوں میں جب اسے پڑھتا ہوں مر جاتا ہوں میں

باقی

رنج میرٹھی

(حکیم فصیح الدین رنج طبیب میرٹھ کے سربرآوردہ بزرگ تھے ان کی شاعری میں جدت پسندی وندرت کاری کی متعدد مثالیں موجود ہیں" صاحب خمخانہ جاوید" رنج کے حال میں صرف اتنا لکھ سکے "حکیم فصیح الدین رنج شاگرد میرزا غالب مرحوم قاضی خلیل کی بیاض میں ایک شعر قابل انتخاب نظر آیا۔ میرٹھ میں ان کی شاعری کا اچھا چرچا تھا۔ مگر کلام باوجود تلاش کے نہ ملا۔ رنج کے حالات سے آگاہی تو پھر بھی نہ ہو سکی البتہ کلام مل گیا ہے جس کا انتخاب درج ذیل ہے حکیم مرزا محمد علی بیگ عاقل کے دیوان میں جو سنہ ۱۲۹۶ھ میں طبع ہوا ہے۔ رنج کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پا گئے تھے۔ ان کا کلیات مخزن الفصاحت مطبع ہاشمی میں سنہ ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا تھا۔)

یارب مرے گناہ کی تعذیر اور کیوں
بس ہے یہی کہ لطف نہ پایا گناہ کا

عشق میں ہم نے کیا اپنوں کو غیر
تم نے کیوں غیر کو اپنا کیا

کیوں چھوا دامن کو وہ چھپنے لگے
تو نے اے دست تمنا کیا کیا

جس نے دیکھا مجھے مرا تم پر
میں ہوں جوہر تمہارے خنجر کا

اللہ رے خیال ملال شب فراق
وہ آئے تو بھی چین نہ آیا تمام رات

بے فائدہ آنکھوں سے بہاتے نہیں آنسو
ہم رشتۂ الفت میں پروتے ہیں گہر آج

بتخانہ سے گھبرائے تو کعبہ سے بندھا دھیان
بت ظلم جو کرتے ہیں تو آتا ہے خدا یاد

حوروں کی مرے آگے صفت کرتا ہے واعظ
اس بت کی دلاتا ہے یہی مرد خدا یاد

ناچار دل سے تنگ، بتوں کی جفا سے ہم
فریاد ایک ہو تو کریں بھی خدا سے ہم

لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کی
لاکھوں بگاڑ ایک مرے اضطراب میں

سوز غم میں مجھے یاد اپنی دلا دیتے ہیں
شعلہ رو اور بھی ایک آگ لگا دیتے ہیں

معلوم نہیں کچھ کہ میں آیا ہوں کہاں سے — جاؤں گا کہاں؟ آیا تھا کیوں؟ کون ہوں کیا ہوں

بہار آئی ہو پھر وحشت کے ساماں ہوتے جاتے ہیں — بڑھیں کیوں ہاتھ خود ٹکڑے گریباں ہوتے جاتے ہیں

کبھی اس چشمِ تر کے بھی الٰہی اشک سوکھیں گے — مرے دامن کے مجھ پر مفت احساں ہوتے جاتے ہیں

دکھا کر اپنی صورت کرتے ہیں آئینہ کو حیراں — اور آئینہ کی صورت خود بھی حیراں ہوتے جاتے ہیں

کسی کا کیا گلہ اے رنج جب قسمت بگڑتی ہے — تو اپنے دوست اپنے دشمنِ جاں ہوتے جاتے ہیں

کیوں در بدر پھروں مری قسمت میں کیا نہیں — بت آشنا نہیں ہو مرا یا خدا نہیں

ڈر ہے کہ وہ نہ طعنۂ آرام دے مجھے — میں موت تک خدا سے کبھی مانگتا نہیں

دن کاٹنے کو خوب تو ہے دل لگی کی راہ — اچھا ہے جی لگا جو کسی سے برا نہیں

افسانہ ہوں زبانِ صغیر و کبیر پر — میں نے مٹا دیا ستمِ روزگار کو

جنوں ہے کچھ مرے دستِ فغاں کو — کہ سمجھا ہے گریباں آسماں کو

نسیمِ صبح دیکھو چھیڑتی ہے — تمہاری کاکلِ عنبر فشاں کو

تم اور نازکی گراں بارِ محبت — اٹھاؤ دیکھ کر بارِ گراں کو

کب کیا کرتے تھے اس طرح سے پامال مجھے — کب چلا کرتے تھے تم ایسی ادا سے پہلے

دل سے جاتا رہے گا خوفِ گناہ؟ — مجھ کو اللہ پارسا نہ کرے

نظر آتی نہیں اپنے میں برائی اپنی — آئینہ دوسرے کا عیب نما ہوتا ہے

تیر پہلو سے وہ نکالتے ہیں — ہائے جاتی ہے دل لگی دل کی

روکے گا خاک جسم مری روح کو طبیب — نکہت ہوں گل کی روک تو لے گلستاں مجھے

ہم تو کہے ہی جائیں گے یہ ماجرائے دل — تم مسکرا کے دیکھ لو قصہ تمام ہے

قاصد گیا ہر طرح سے تسکیں ہوئی لیکن — اب دل کو یہ دھڑکا ہے کہ کیسی خبر آئے

دل یہ کہتا ہے کہ اٹھیے نہ صنم خانہ سے — لوگ کہتے ہیں کہ کعبہ کا ارادہ کیجے

مرسلہ حبیب کیفوی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اسلام کے حقیقی و بنیادی خط و خال (جلد دوم) ترتیب نزول قرآن کریم:-

مصنف پروفیسر محمد اجمل خاں ایم۔اے ملنے کا پتہ. کتاب گھر سرائے گڑھا الہ آباد قیمت پانچ روپے۔

کتاب کا موضوع جتنا اہم اور دشوار ہے اس سے کہیں بڑھ کر مصنف کی کوشش جو اس سلسلہ میں انھیں کرنا پڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اب یہ کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا ناکام رہے اُنھوں نے خود اقرار کیا ہے کہ سنیوں کا عقیدہ سا ہو گیا ہے کہ موجودہ قرآن کی تاریخی ترتیب محال ہے بڑا ظلم ہوگا اگر ایک سنی مصنف کی ایک محال بات کو ممکن ثابت کرنے کی کوشش حیرت و تعجب کے قابل نہ سمجھی جائے مصنف نے اعلان کیا ہے کہ یقیناً یورپ کے محققین قابل داد ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ قرآن کی سورتوں کو ایک قسم کی تاریخی ترتیب دیں لیکن ان میں سے بلا استثنا، ہر ایک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور انھوں نے سچے محققوں کی شان کو قایم رکھا اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ یورپ کے ان محققین میں ایک مسٹر واٹل بھی ہیں جن کی کوشش اس نظریہ کے ماتحت تھی کہ یہ تعلیم اس شخص نے دی تھی جو اپنے ابتدائی دور میں جوش و خروش میں بھرا ہوا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے بلکہ وہ اپنے آپ کو صرف ایک مصلح سمجھتا تھا۔ اس کے متعلق مصنف نے جو قابل داد بات تحقیق فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت کو صرف مصلح قرار دینے میں واٹل نے صحت کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صرف جوش و خروش اس چیز کی بنیاد قرار دینے میں اس نے سخت غلطی کی ہے...... ہر شفلڈ نے اس نظریہ کے متعلق جو کہا ہے وہ نہایت معقول معلوم ہوتا ہے ہر شفلڈ نے خود کیا کیا۔ مصنف نے صفحہ ۲۲ پر تصریح کی کہ اس نے (ہرشفلڈ) قرآن کے مختلف اجزا کی تفسیر بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی نظریات کی تائید میں بعض مہمل نظریات وضع کر لیے ہیں۔ واٹل کے نظریہ کے متعلق ہر شفلڈ کی رائے جسے مصنف نے معقول بتایا ہے۔ صفحہ ۲ پر دیکھیے ہر شفلڈ جذبات کے جوش پر اعتماد نہیں رکھتا۔ پھر آپ نے اے منگانا کی ان مستشرقین کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے ہمارے خیال

میں وہ قرآن کی ترتیب نزول سے کے مطابق جمع کرنے والوں کے متعلق ایک آخری فیصلہ کا حکم رکھتی ہے "جو کوشش یورپیوں نے کی ہے کہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب کریں وہ اتنی ہی ناکام ہیں جتنی کہ مقامی لوگوں کی"، کیا اے منگانا کے فیصلہ سے ہم مصنف کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں؟ مصنف نے خود جن اصولوں سے مدد لی ہے اور جن سے صحیح اور یقینی نتائج مستنبط ہو سکنے کا ادعا کیا ہے ان میں پہلا اصول ارتقا ہے۔ فرماتے ہیں تاریخ واحادیث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آنحضرت اپنے ابنائے وطن کی اخلاقی اور سیاسی پستی دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے آپ نے ان کی اصلاح کرنا چاہی تھی۔ یکہ میں تعقل و تفکر اور تواریخ کی روشنی میں اخلاقی اصلاح پیش نظر تھی۔ آپ ان مکانیکی اور جامد قوانین کو جو سوسائٹی میں مذہب اور سماج کے نام پر رائج تھے دور کر دینا چاہتے تھے اس مقصد کے لیے آپ نے ایک انقلاب پیش فرمایا الخ اس عبارت کو پڑھ کر ہم حیران ہیں کہ مصنف کے متعلق کیا رائے قائم کریں۔ ظاہر ہے کہ مسلم اور غیر مسلم واقعوں کی کوششوں کے درمیان صرف یہی فرق ہے کہ مسلمان قرآن کو غیر مسلمان کی طرح آنحضرت کی تصنیف نہیں مانتا۔ پھر یہ کیا ہے؟ یا للعجب۔ ہم مصنف کے اس نظریہ کے متعلق صرف اسی رائے کا اعادہ کافی سمجھتے ہیں جو انہوں نے اے منگانا کے حوالہ سے سپرد قلم کیا ہے۔ "رسول اللہ کی مفروضہ نفسیاتی ارتقا پر ہی سورۃ کی تاریخ کو منحصر سمجھنا فطری طور پر ایک غیر علمی طریقہ ہے اور نہ یہ اس طرح ممکن ہے کہ آپ کے علم کی ترقی کو اس ترتیب کی بنا قرار دے کر کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔"

مصنف نے ایک دوسرا اصول اور بھی اپنی کوشش کی بنیاد قرار دیا ہے، جسے آپ ادبی اصول کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں "اگر آپ کسی مصنف کی تصنیف کو سامنے رکھیں اور اس کا تجزیہ کریں تو آپ کو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اپنی ادبی زندگی کے کسی مخصوص زمانے میں وہ چند مخصوص لفظ اور جملے زیادہ استعمال کرتا ہے لیکن دوسرے زمانے میں اس کثرت سے ان کا استعمال نہیں کرتا یہ چیز قرآن کریم میں زیادہ نمایاں ہے۔ آنحضرت ایک مخصوص زمانے میں بعض ایسے جملے اور الفاظ استعمال فرماتے تھے جو دوسرے دور میں نہیں پائے جاتے اس کی مثال قرآن کے وہ الفاظ ہیں مثلاً اسمائے الٰہی، کلا، حروف مقطعات وغیرہ" اگرچہ اس عبارت سے یہ نتیجہ کہ مصنف کو قرآن آنحضرت کی تصنیف نظر آتا ہے کسی فکر کا محتاج نہیں لیکن بایں ہمہ معلوم نہیں کیوں جناب نے یہ تحریر فرمایا کہ اس بنا پر وحی کے مختلف دور قائم کیے جا سکتے ہیں...... پھر آپ نے اور بھی تصریح سے کام لیا

ہو تیسری چیز جو قرآن کریم کی تاریخی ترتیب سمجھنے میں معاونت کرسکتی ہو وہ رسول کریم کی سیرت بحیثیت ایک انسان کے ہو۔ ایک ایسے انسان کی سیرت جنھوں نے نہایت غور و خوض اور الٰہی روشنی (وحی) کی مدد سے اس چیز کو اپنا مقصد حیات بنا لیا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی اصلاح ہونا چاہیئے معلوم نہیں کہ ایک انسان جو اپنے ابنائے وطن کی اخلاقی وسیاسی ومذہبی اصلاح کے درپے تھا تمام دنیا کے انسانوں کی اصلاح کے لیے کیوں بے چین ہوگیا۔ قرآن تو یہ کہتا ہو کہ (ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ: تبارک الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ لیکون للعالمین نذیرا) ان حقایق کے اظہار کے بعد مصنف نے آنحضرت کی سیرت نگاری فرمائی ہو۔ فرماتے ہیں "اسلام کی اصطلاح میں رسول اللہ اسے کہتے ہیں جو اس خدائی جوش سے معمور کیا گیا ہو جس کے ذریعہ انسانیت کی اصلاح ہوسکتی ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ اصطلاح کون سے اسلام کی ہو۔

آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ سے (جس کا اقتباس سپرد قلم فرمایا ہو) حقیقت نبوت میں بھی تحقیق فرمائی آنحضرت کی سیرت کے سلسلے میں آپ نے تصریح کی کہ آپ نے ان اقوام کے قصے بھی سنے ہوں گے جو کسی زمانہ میں ان مقامات میں آباد تھیں...... کیا اس کا وہی مطلب ہو جو میور وغیرہ مشنری مصنفین کے یہاں ہم پاتے ہیں کہ یہی قصے بعد کو قرآن کا ایک جزو بن گئے۔ پھر آپ نے مسائل واوہام وشکوک کے متعلق اسلام زیر عنوان اہم سوال سپرد قلم فرمائے ہیں لیکن ان کے حل کے متعلق پڑھنے والے کو منتظر رکھا ہو ہم اس کتاب کے متعلق اہم نکات سے اختلاف رکھتے ہیں۔

(۱) منجملہ ان کے ہمارے نزدیک یہ قطعی ثابت ہو کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب آنحضرت نے ہی متعین فرمائی اور عہد رسالت میں کامل قرآن مرتب ہوچکا تھا۔

(۲) حضرت ابوبکر کی جمع قرآن کی روایت شیخ زہری یا زہری پھر اس روایت کے پڑھنے والوں کی غلط فہمی پر مبنی ہو۔ واقعہ صرف اتنا ہو کہ ایک قرآن دربار خلافت میں محفوظ رکھنے کے لیے لکھوایا گیا تھا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضرت نے قرآن مرتب نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ مطلب ہو کہ قرآن اپنے لیے نہیں لکھوایا کہ دربار رسالت میں محفوظ رہے۔

(۳) صفحہ ۸۷ پر سورہ الحج کی آیت کو والنجم کی آیتوں سے متعلق بتانا ایک یہودی تفسیر اور بے سروپا

قصہ ہے جس کی تردید اسی آیت سے ہوتی ہے۔ سورۂ حج کے مکی یا مدنی ہونے کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا سیروا فی الارض سے حبشہ کی طرف ہجرت کا اشارہ قطعی ثبوت کا محتاج ہے وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کریم کی ترتیب نزولی کے معنی یہ ہیں کہ ہم سورتوں اور سورتوں کی جملہ آیات کے متعلق صحیح آثار و روایات کی بنا پر صرف یہ طے کر سکیں کہ یہ مکی ہے اور یہ مدنی ہے تو ہمیں اعتراف ہے کہ یہ ممکن ہے لیکن یہ کہ کونسی آیات کس کے بعد آئیں اور کون سورت کس کے بعد تو ہمیں صحیح و ضعیف روایتوں کے انبار میں سے ریزہ چینی کرنا پڑے گی، اور نقد روایت کے اصول کو استعمال کیے بغیر ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مصنف نے کئی اصول بنائے ہیں جن میں سے اصول ارتقاء اور اصول ادبی قطعی صحیح نہیں ہیں۔

(۱) اگر یہ تسلیم کیا جا سکتا کہ قرآن آنحضرت کی تصنیف ہے تو دونوں اصول مانے جا سکتے تھے لیکن وہ قطعی دلائل جو قرآن کے منجانب اللہ وحی منزل من اللہ پر دال ہیں جب تک مصنف باطل نہیں کر سکتے آنحضرت کے نفسیاتی ارتقاء اور ادبی مدوجزر کی بنا پر ایک حرف نہیں لکھ سکتے علمی بحث میں فاسد اوہام سے کام لینا غیر علمی طریقہ ہے مصنف کو اس سلسلے میں اپنا خیال علمی طریقہ پر پیش کرنا تھا کہ قرآن آنحضرت کی تصنیف ہے جس طرح دیگر انسانوں کے کلام میں اصول ارتقاء جذبات و ادب کی بنا پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت کی اس تصنیف لطیف میں بھی انہیں اصولوں سے کام لیا جا سکتا ہے مصنف اس بات کو ثابت کرنے میں ناکام رہے اس لیے انہیں اپنے دونوں اصولوں کو آپ ہی قلمزد کرنا پڑے گا۔

(۲) اصول ارتقاء یوں بھی باطل ہے کہ اگر آنحضرت اپنی قوم کا کوئی تدریجی ارتقاء چاہتے تھے تو پہلے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا نظریہ پیش کرتے کہ یہ چیز خون خرابے کا باعث نہ ہوتی عقیدہ کی اصلاح یقیناً قتل و خونریزی کا پیغام ہے اس لیے پہلے ہی توحید کا وعظ اور بتوں کے خلاف لب کشائی نہ کی جاتی لیکن سورۂ مدثر کی دوسری آیت کا طرز خطاب اور تیسری کا اسلوب بیان اس خیال کے قطعاً منافی ہے۔ قم فانذر کے معنی صرف یہ ہیں کہ مخاطب کو ہولناک مصیبت سے ڈرائے لیکن وہ کیا ہے یہ ابھی صاف صاف نہیں بتایا۔ تیسری آیت میں کہدیا وربک فکبر عربی ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ تقدیم مفعول حصر کے لیے ہے اور ربک واحد ہے جمع نہیں، اس لیے آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صرف اپنے پروردگار کی بڑائی بول جو

صرف ایک ہی ہے۔ اب ہمیں ان احادیث کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جن سے یہ معلوم ہو کہ مشرکین کن خداؤں کی بڑائی بولتے اور جسے پکارتے تھے خصوصاً وہ روایت جو غزوۂ احد میں ابوسفیان کے اعل ہبل اور عزی لنا ولا عزی لکم کہنے اور حضرت عمرؓ کے آنحضرت کے ارشاد کے مطابق جواب دینے میں اللہ اعلیٰ واجل اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم فرمانے کے متعلق ہے، قطعاً ماننا پڑے گا کہ ایک رب کی بڑائی بولنا مشرکین کے خلاف تھا۔ اب یہ فیصلہ آسان ہے کہ یہ توحید کا اعلان ابتدائی وحیوں میں موجود تھا اور ابتدا ہی میں پیش کر دیا گیا تھا۔

(۳) حضرت عائشہ سے مروی حدیث پر کئی حیثیت سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے آپ کے گمان کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ احکام کی آیات میں تدریجی ارتقا پیش نظر تھا اور شراب کے متعلق شروع ہی سے اگر ممانعت آجاتی تو کوئی نہ چھوڑتا اور یہ کہ چھوٹی سورتیں یا بیانیہ آیتیں پہلے آئیں اور قصصا یہ آیتیں بعد کو آئیں۔

(الف) اس حدیث عائشہ کے مقابل وہ احادیث بھی ہیں جن سے نزول وحی کی کیفیت ان کا چشم دید واقعہ ہے۔

(ب) اس حدیث کی رواۃ کی جرح و تعدیل اگر نظر انداز کی جائے تو یہ صرف خبر احاد ہے اور ہرگز مفید یقین نہیں

(ج) اس حدیث کا مضمون صرف حضرت عائشہ ہی سے روایت کیا گیا ہے لیکن کسی صحابی نے اس قسم کے تدریجی ارتقا کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے محض ایک راوی کا خیال کوئی حجت نہیں۔

(د) یہ حدیث مرفوع نہیں اور اس کے علاوہ اس حدیث میں اور بھی گفتگو ہو سکتی ہے اس لیے اس حدیث کی بنا پر کسی کتاب کی تصنیف صحیح نہیں

اب رہا اصول ادبی تو یہ اصول اس قدر غلط ہے کہ اگر مصنف قرآن کی فصاحت و بلاغت پر نظر اور عرب کے اسالیب کلام پر توجہ فرما سکیں تو اس بنا پر ایک حرف نہ لکھ سکتے۔ ان کے نقشہ میں بعض آیات مکی ہیں اور سورتیں بھی لیکن ان میں نہ تو کلا ہے اور نہ حروف مقطعات بعض مدنی ہیں اور ان میں مقطعات ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ انداز بیان تو ہر سورت و آیت کا مختلف ہے لیکن کہیں کلام میں پستی درکاکت نہیں اگر

کہ میں کلام بلند اور مدینہ میں پست درجہ کا ہے تو اسے صفائی کے ساتھ پیش کرنا اور جواب لینا تھا۔ آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قصائیہ مضامین اور مواعظ کے بیان میں اختلاف ہے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ بلاغت کے معنی ہی یہ ہیں کہ کلام کا اسلوب اقتضائے حال کے مطابق ہو۔ دریافت طلب یہ ہے کہ اگر حالات کے اقتضا کے مطابق کلام ہے تو یہ کلام کی بلاغت کا اختلاف ہوگا یا عین بلاغت؟ اس لیے حالات کے اختلاف سے کلام بلیغ کے مد و جزر کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا گمان فاسد سے بیش کچھ نہیں۔ اس لیے اصول ادبی کی بنا پر سورتوں کے نزول کے زمانے کا تعین کرنا ایک غلط اقدام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حالات مدینہ میں بھی کچھ اسی قسم کے پیش آئے ہوں کہ جن کی بنا پر پھر کلام میں مواعظ کے ساتھ ساتھ قصائیہ مضامین بھی ہوں اور سب جانتے ہیں کہ ایسے حالات پیش ہوئے۔ یہ خیال کہ الفاظ و محاورات کا ایک اسٹاک ختم ہو جانے پر اس قسم کے قصائیہ مضامین یوں مدون کرنا پڑے گمان کی حد سے زیادہ کچھ نہیں۔

تیسرا اصول تاریخی جس سے آپ نے بزعم خود کام لیا ہے بہت زیادہ تصحیح طلب ہے۔

(۱) آپ نے عیسائیوں سے مناظرہ اور مذہب عیسوی سے متعلقہ آیات کو مدنی قرار دیا لیکن ابن ہشام جلد ا صفحہ ۲۱۳ میں مکہ میں عیسائیوں کا آنا اور آنحضرت کا قرآن سنانا اور پھر ان کا ایمان لانا موجود ہے۔ اس کے مطابق ضروری ہے کہ مکی آیات و سورتوں میں مذہب عیسوی کے متعلق ایسے دلائل موجود ہوں جن سے کسی عیسائی کو مطمئن کیا جا سکے۔ جب تک آپ ابن ہشام کی اس روایت کو باطل قرار نہ دیں اس کے خلاف رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اب ہم ان چند نکات کے متعلق لکھتے ہیں جن پر ہمیں اختلاف رائے ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) قرآن آنحضرت کے عہد میں جتنا نازل ہوتا جاتا تھا آنحضرت لکھاتے جاتے تھے۔ بخاری مجمع الزوائد صفحہ ۹) اور یہ بتاتے جاتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں لکھو (اتقان احمد ابو داؤد ترمذی، نسائی ابن حبان۔ حاکم)

بخاری میں اگرچہ انسؓ سے روایت ہے کہ چار (ابو درد۔ معاذ ابن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید) کے سوا اور کسی نے قرآن آنحضرت کے عہد میں جمع نہیں کیا اور ابو زید کے قرآن کا وارث میں ہوا لیکن

استیعاب میں حافظ ابن عبد البر نے تصریح کی کہ یہ گفتگو اوسی وخزرجی کی مفاخرت کے سلسلہ کی ایک کڑی ہو بعض اوسیوں نے کہا کہ ہم میں حنظلہ غسیل ملائکہ ہو، خزرجیوں نے کہا کہ ہم میں سے چار نے آنحضرت کے زمانے میں قرآن لکھ لیا تھا۔ کیونکہ تہذیب التہذیب اور علامہ ذہبی کی طبقات القراء (طبقات ابن سعد قسم ثانی جلد ۲ صفحہ ۱۱۲) میں درجنوں صحابیوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے کل قرآن لکھ لیا تھا۔ آنحضرت نے سورتوں کے فضائل بتائے ہیں۔ آیات اور آوائل سور کا ذکر کیا ہو نیز یہ کہ اس کی قراءت کا یہ ثواب ہو اور اس کا یہ۔ اور اواخر و اوائل سور ہو نہیں سکتے جب تک آیتوں میں ترتیب اور آیتوں کی بنا پر سورتیں مرتب نہ ہوں۔ اس لیے جب عہد نبوت میں سورتوں کی بھی ترتیب ہو چکی تھی تو اب ترتیب نزولی کی کسی قطعی شہادت کی تلاش بادر ہوا اور نتیجہ بے سود۔ اس کے علاوہ جب نزول کے لیے آنحضرت کا ارشاد کافی حجت تھا۔ اور ترتیب سور میں بھی ارشاد نبوی موجود ہو کسی سورت کی آیات کے متعلق قطعی حکم لگانا کہ یہ اس کے بعد ہو اور یہ اس کے بعد ہر جگہ کام نہیں دے سکتا اور بعض جزئی واقعات کی بنا پر کلیہ قایم نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) آپ نے حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں قرآن کا مرتب ہونا بعض روایات کی بنا پر تسلیم کیا ہو۔ حالانکہ زید بن ثابت کی وہ روایت جو بخاری میں درج ہو گئی ہو، صرف زید کی روایت بواسطہ عبید ابن السباق شیخ زہری کی ہو تنہا زہری اور ان کے شیخ اس روایت کا راوی ہو اور واقعہ اتنا اہم۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس روایت کے بے اصل ہونے کے متعلق کتنے اہم شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ با ایں ہمہ ہو سکتا ہو کہ زید نے حضرت ابو بکرؓ کے لیے قرآن لکھا ہو کہ دربار خلافت میں ایک نسخہ محفوظ رہے (کنز العمال) لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرؐ کے عہد میں جمع نہیں ہوا تھا۔ علامہ ابن عبد البر نے بھی زہری کی اس روایت کی مخالفت کی ہو۔ (استیعاب جلد اول صفحہ ۱۸۲)

(۳) حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جمع قرآن کے متعلق جو روایت آپ نے نقل کی ہو وہ بھی صرف زہری ہی سے مروی ہو۔ اگرچہ ترمذی میں ہو "ہذا حدیث حسن صحیح" لیکن اس کے بعد ہی لکھا ہو کہ "وہو حدیث زہری ولا نعرفہ الا من حدیثہ" کہ ہم اسے زہری کی حدیث کے سوا اور کسی سے نہیں پہچانتے۔ یہ روایت بھی درایتاً صحیح نہیں اور ایک محقق کی شان سے بعید تھا کہ اسے نظر انداز کرتا۔ ہم اس روایت کو کئی وجوہ سے صحیح نہیں جانتے۔ اس حدیث کا ترمذی میں زید کا حضرت عثمان کے حکم سے قرآن لکھنا اور آیت احزاب کو صرف خزیمہ کے

کے پاس پانا ذکر ہو یا ابو خزیمہ کے۔

(۱) زید نے (بروایت زہری جس کو بخاری نے روایت کیا ہو) قرآن حضرت صدیق کے عہد میں لکھا اس وقت ان کو وہ آیت کیوں یاد نہیں آئی جو نسخہ حضرت حفصہ میں درج ہونے سے رہ گئی۔ اس روایت میں سورۂ توبہ کی آخری آیت "لقد جاءکم" انھوں نے گم شدہ ابو خزیمہ کے پاس پائی اور ترمذی میں وہ احزاب کی آیت "رجال صدقوا ما عاہدوا" خزیمہ یا ابو خزیمہ کے پاس پاتے ہیں اور تین سال تک قرآن صدیقی کو یونہی ناتمام چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی ایک بات اس روایت زہری کے بے اصل ہونے کی کافی شہادت ہو۔

(۲) اس روایت میں ہو کہ حضرت حذیفہ نے غزوۂ آرمینیہ و آذربائیجان کے بعد حضرت عثمان سے اختلاف قرآن کی شکایت کی۔ حضرت عثمان نے ۲۳ھ میں ولید بن عقبہ کو آذربائیجان والوں کی بغاوت فرو کرنے اور معاہدہ شکنی کی سزا دینے کے لئے بھیجا تھا جس نے دوبارہ آذربائیجان کو فتح کیا اور ۳۵ھ میں حضرت عثمان شہید ہوئے۔ پھر یہ قرآن کب لکھے گئے اور کب بھیجے گئے۔ ہمارے خیال میں حضرت عثمان نے جو نسخے ضرور نقل کرائے لیکن کسی اختلاف کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے کہ ہر شہر میں جہاں قرآنی حافظ پہنچے ہیں وہاں ایک دربار خلافت کا مستند قرآن لکھا ہوا بھیج دیا۔ واقعہ صرف اتنا تھا۔ زہری کی روایت میں اسے کچھ کا کچھ بنا دیا گیا کیونکہ حضرت زہری کے شیخ جو اس روایت میں ہیں وہ جناب عروہ ہیں جن کے متعلق یہ تصریح ہو کہ وہ قدری شیعی تھے اور عام شیعہ کے خیال کی تائید کے لیے یہ روایت تصنیف ہوئی ہو اس لیے حجت نہیں۔

بہر حال زیر نظر کتاب بہت اچھی لکھائی چھپائی کا نمونہ ہو۔ جن لوگوں کو تحقیق کی طلب ہو انھیں ضرور دیکھنا چاہیئے۔ (محمد یعقوب بخش راغب البدایونی)

تجلیات: مجموعہ کلام جناب خواجہ محمد حسن صاحب کوکب مرادآبادی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۳۰ صفحات کاغذ دبیز کتابت و طباعت صاف اور روشن۔ قیمت (۲) ملنے کا پتہ اسلامیہ مسافرخانہ مرادآباد۔

زیر نظر مجموعہ میں وہ سب ہی کچھ ہو جو کوکب صاحب نے ستمبر ۱۳۱۹ء سے جنوری ۱۹۴۳ء تک خالبا لکھا ہو۔ یعنی غزلیں، مستزاد، تظمین، نظمیں (جذباتی، عقیدتی، قومی) سہرے، تہنیت نامے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں غزلوں کا پھیلاؤ سب سے زیادہ ہو۔

شاعری کوکب صاحب کا شغل فرصت ہے اس لیے ان کی شاعری وہی ہے جو اسے ہونا چاہیے تھا۔ کوکب صاحب کے کلام میں قدامت و روایت کا رنگ غالب ہے تاہم کوکب صاحب کا کلام دنوعیت سے قطع نظر اپنے اندر ایک ہمواری رکھتا ہے اور جذبات و سادگی جہاں مل جاتے ہیں وہاں اچھا اثر پیدا ہو جاتا ہے بعض نظموں میں بعض بند اچھے ہوگئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر کوکب صاحب "تجلیات" کو بحیثیت کلیات شائع کرنے کے بجائے صرف اس کا انتخاب شایع کرتے اور کلام کی ترتیب میں خواہ ردیف کا خواہ تاریخ تصنیف کا لحاظ رکھتے۔

سائنس اور اسلام: — حافظ محمد طیب صاحب کی تقریر ہے جو انھوں نے ۲ اگست ۱۹۳۹ء کو انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی دعوت پر فرمائی تھی۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۹۲ صفحات گیٹ اَپ خاصا۔ قیمت پانچ آنے۔

سائنس کی ترقی روایتی مذہب کے لیے ایک شدید خطرہ تھی۔ یورپ میں مذہب سے فایدہ اٹھانے والوں نے اس خطرہ کا احساس کچھ اس کے پیدا ہوتے ہی کر لیا تھا۔ چنانچہ بہت احتیاط کے ساتھ سائنس اور مذہب کے راستوں میں رسم و تعلق پیدا کرنے کی سعی و کاوش کی گئی۔

قاری طیب صاحب کی کوشش بھی اسی نوع کی کوشش ہے۔ قاری صاحب کے نزدیک سائنس کی جستجو مادہ پر ختم ہو جاتی ہے اور مذہب کی دنیا روحانی عظمت و جلال سے شروع ہوتی ہے۔ اس عنوان پر جس بحث و گفتگو اور زاویۂ نظر کی توقع ہو سکتی تھی وہ افسوس ہے قاری صاحب کی تقریر میں موجود نہیں۔ قاری صاحب کی تقریر میں خالص مذہبی رنگ زیادہ ہے اور سائنس کے متعلق جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اسے سائنس سے واقفیت رکھنے والے شاید ہی قابل قبول سمجھیں۔ ان کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحث و گفتگو شروع کرنے سے پہلے ہی اپنے ذہن میں ایک نتیجہ مرتب فرما چکے تھے۔ اس لیے ان کی حیثیت اس مصنف کی سی نہیں رہی جو جاتا ہے جہاں حقایق اُسے لے جاتے ہیں بلکہ انھوں نے اس شخص کی حیثیت اختیار کر لی جو حقایق کو گھسیٹ لے جاتا ہے جہاں خود جانا چاہتا ہے۔

بہرحال قاری صاحب ایک اہم موضوع کو سامنے لائے ہیں جس کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔

فردوس گم گشتہ: — یہ بھی انجمن اسلامی تاریخ و تمدن علی گڈھ میں پڑھا ہوا ایک مقالہ ہے۔ سائز [illegible] حجم [illegible] قیمت ۴ر

مقالہ نگار جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے نہایت شگفتہ انداز میں انسانی جبر و اختیار، آفاقی نظامِ معاشرت کی ضرورت اور اسلامی معاشرت کی آفاقیت سے بحث کی ہے۔ مقالہ ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

اردو زبان کی نئی تحقیق :- ادیس احمد صاحب ادیب ایم اے صدر شعبۂ اردو حلیم انٹر کالج کانپور کا مقالہ ہے جو انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کے اجلاس شانزدہم میں پڑھا تھا۔ قیمت ۳؍

ادیس صاحب کے مقالہ کو ایک ریسرچ کے طالب علم کے نوٹس سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ادیس صاحب کے نزدیک لشکر کی زبان ہونے کی حیثیت سے سنسکرت ہندوستان کی "پہلی اردو" تھی۔ موجودہ اردو ہندوستان کی دوسری بڑی اردو ہے اور وہ زبان جس کا زمانہ کے تقاضوں سے متاثر ہو کر جنم لینا باقی ہے ہندوستان کی تیسری بڑی اردو ہوگی۔

مقالہ دلچسپ ہے اور اس کی تیاری میں بعض اچھے حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔

اسلامی تہذیب :- شائع کردہ دائرہ مطبوعات ملیہ، جونپور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۴۰ صفحات قیمت ۲؍

مقالہ میں اسلامی عقائد اور اسلامی آداب و اخلاق کا سادہ اور مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے (ف۔ا۔ا)

آغاز و انجام :- از جمیل احمد کندھاپوری۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۶۲، قیمت عہ؍ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ جمیل احمد صاحب کے سات افسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ابتدا میں افسانہ نگاری پر ایک مضمون بھی ہے۔ اپنے افسانوں میں جمیل احمد صاحب نے ہندوستان میں غربت اور سرمایہ دارانہ نظام کی جو برکتیں ہیں ان کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جمیل صاحب یہ چیز حسبِ رواج زمانہ کر رہے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ وہی پلاٹ ڈھونڈے گئے ہیں جو اس قسم کی باتوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس آورد کی وجہ سے وہ خوبی و خوشنمائی نہیں پیدا ہونے پائی جو افسانہ کی جان ہوا کرتی ہے۔ اگر اس امر سے قطع نظر بھی کر لیا جائے کہ محض غریبی اور مظلومیت کا پروپیگنڈا ہی افسانہ کی جان نہیں ہے یا زندگی صرف اسی سے مراد نہیں ہے تب بھی جمیل صاحب کے افسانوں میں ابھی فن کارانہ پختگی اور رعنائی نہیں آئی ہے۔ سچی باتیں بھی جب تک [illegible] سے بیان کی جائیں محض بھونڈی تصویریں بن کر رہ جاتی ہیں۔ [illegible] زندگی کا ایک

جز دہی لیکن جمیل صاحب کا فن ابھی جمیل نہیں ہوا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں ابھی بھونڈا پن نظر آتا ہے
مگر ہمیں امید ہے کہ موصوف آیندہ اور ترقی کریں گے اور ان ابتدائی کوششوں کی منزلوں سے بہت دور
آگے جا سکیں گے۔

شکستہ دل:۔ از روشن پٹیالوی بی۔ اے۔ ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ
لاہور صفحات ۱۰۷، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۱۲ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ روشن صاحب پٹیالوی کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے جن کا تانا بانا انھوں نے زیادہ تر اپنے تخیل
کی مدد سے قایم کیا ہے۔ پلاٹ میں کوئی ندرت نہیں ہے نہ افسانے ہمیں زندگی کے قریب لاتے ہیں۔ ان میں
رومان ہے اور اخلاقیات، اور دونوں ایسے افسانوں کے ذریعے ظاہر کیے گئے ہیں جو زیادہ تر تصور پر مکمن معلوم
ہوتے ہیں اور تخیل بھی انیسویں صدی کا۔ روشن صاحب کو چاہیے کہ دوسرے کامیاب افسانہ نگاروں کا مطالعہ
کریں اور زندگی کو فن کارانہ طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کریں۔ (م ح)

رسالہ **ہندستانی ادب** (ٹیگور نمبر) ایڈیٹر غلام محمد خاں ایم۔ اے (عثمانیہ)، قیمت ٹیگور نمبر ۸ر سالانہ چندہ للعمر
ملنے کا پتہ چنچل گوڑہ، حیدرآباد دکن۔

ہندستانی ادب، جون ۱۹۴۱ء میں جاری ہوا ہے اور اردو ادب کی مفید اور قابل قدر خدمات انجام دے
رہا ہے اس کا مقصد نام سے ظاہر ہے یعنی ملک میں ہندستانی کے نام سے جو لسانی تحریک کچھ مدت سے جاری ہے اس کی
تائید و حمایت اور اس کی نشر و اشاعت اس کا اولین مقصد ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب ہے
پیش نظر اشاعت ٹیگور سے متعلق ہے اب تک متعدد ٹیگور نمبر شایع ہو چکے ہیں مگر یہ فخر صرف "ہندستانی ادب"
کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اور نہایت مختصر مدت میں یہ نمبر مرتب کر کے پیش کیا ہے گو عجلت کی وجہ سے اس قدر
مبسوط اور مفصل مضامین پیش کیے نہ جا سکے جو اس شاعر اعظم کے صحیح مقام اور حیثیت کو متعارف کرنے کے لیے ضروری
تھے لیکن پھر بھی اس قلیل عرصہ میں ادارہ نے جو مضامین پیش کیے ہیں۔ اس پر وہ مبارکباد کے مستحق ضمیمہ میں شاعر
مرحوم کے متعلق ملک کے رہناؤں اور قائدوں خصوصاً حیدرآباد کے عظیم المرتبت لوگوں کے بیانات اور اخبارات و
رسایل کے خیالات و افکار بھی پیش کیے گئے ہیں شاعر مشرق کا آرٹ اور ان کی متعدد تصویریں بھی شامل ہیں۔
(ع۔ ل)

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہزہائنس نواب صاحب بھوپال — عالیجناب ہزہائنس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپے ۶۰۰۰۰۰۰

جاری شدہ سرمایہ ...... بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ ۲۲۴۴۰۶۰

اداشدہ سرمایہ ...... گیارہ لاکھ چھ ہزار چھ سو پانچ ۱۱۰۶۶۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے، ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل ورسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

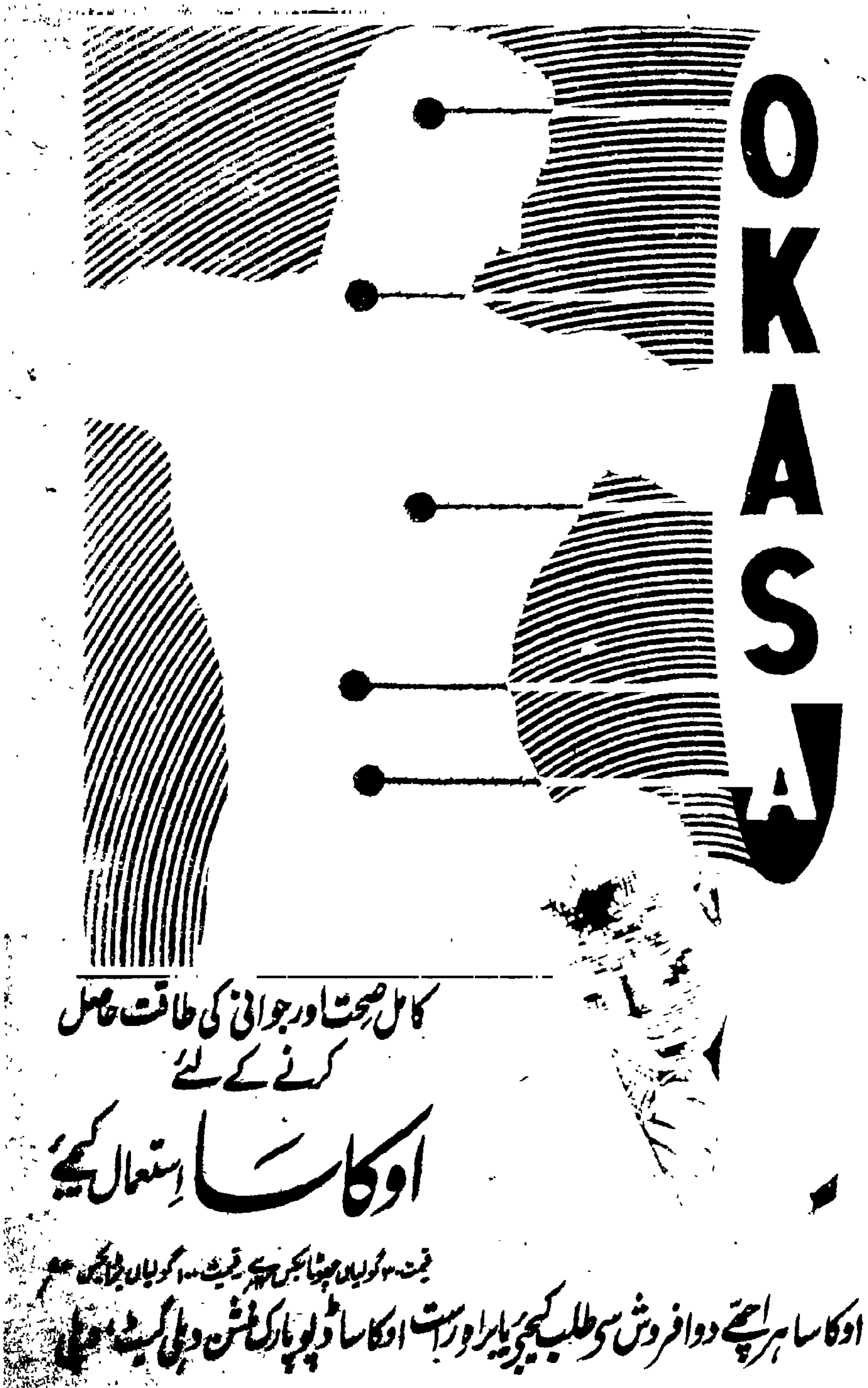
گذارشِ احوال واقعی

جو حضرات مدت درازسے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۳۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی، اُنھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے مدافعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کیئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لیے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنابلڈنگ لکھنؤ


OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوافروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک کاشن دہلی گیٹ دہلی

جامعہ

زیرِادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۶ نمبر ۴ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد، دائرۂ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی انڈین پریس الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

یادگارِ حسینؑ

(۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو یادگارِ حسینی کے جلسے میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی)

ہندوستان کی سرزمین پر جہاں ہر مذہب اور ہر ملت کے اہلِ دل ہمیشہ سے کثرت میں وحدت دیکھتے اور دکھاتے رہے ہیں یہ بات کہنے کے لئے کچھ بہت دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کا نور ایک ہے مگر دیکھنے والے ان میں جیسی اور جتنی دیدار کی طاقت ہے اس کا جلوہ اپنے اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس کی کیفیت اپنی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی بات اس طرح کہنی ہو کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے سمجھ سکیں، اور اس سے اپنے دل پر ٹھیک ٹھیک اثر لے سکیں تو ملتوں اور مذہبوں کی جدا جدا بولیوں اور الگ الگ مخصوص اصطلاحوں کو چھوڑ کر اسے انسانیت کی عام زبان میں کہنا ہوتا ہے۔ یادگارِ حسینی کی تحریک کا مقصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ فخرِ انسانیت اور مایہ نازشِ بشریت حسینؑ کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے عام معیاروں پر پرکھا جائے اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں بیان کیا جائے سب جانتے ہیں کہ ایک محاورے سے دوسرے محاورے میں ترجمہ کرنا بڑا کٹھن کام ہے اور جب اس کے ساتھ یہ شرط ہو کہ ترجمے کی زبان وہ ہو جو انسانوں کے دل کی زبان ہے تو یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے جو امام حسینؑ کا حال مذہبی رنگ میں سننے اور سنانے کا عادی ہے اسے اس نئے رنگ میں اس طرح بیان کرنا کہ اس ذکر سے جو کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہی دوسروں کے دل میں پیدا ہو جائے بہت مشکل ہے مگر یہ بات ہمت بندھاتی ہے کہ جب سننے والوں کے دل ہمدردی اور محبت سے سمجھنے پر آمادہ ہوں تو وہ ادھ کہی بات بلکہ بن کہی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔

صاحبو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس عام انسانیت کے لئے حسینؑ کی روداد شہادت کیا محض طلبی کی بس ایک ایسی ناکام کوشش ہے جس میں آپ کو ناکام فریق سے تاریخی ہمدردی کا ہے؟ یا یہ بس ایک مغرور المزاج سردار کی ضد یا ناعاقبت اندیشی ہے جس میں ضد کرنے والا

اتفاق سے آپ کے محبوب اور مخدوم آقا کا جگر گوشہ ہے اس لئے آپ اس کی پچ کرتے ہیں۔ کیا یہ ہمدردی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹنے کی دل ہلانے والی کہانی ہے جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور آنسوؤں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرف داریوں کے لئے اتنے اور مواقع ہیں اور وہ شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور نامرادیوں، بیدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اتنی پر ہے کہ صرف ان کے لئے تو دنیا کو حسینؑ کی داستاں کی خاص ضرورت نہیں۔ لیکن نہیں حسینؑ کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستاں ہے۔ شرف انسانیت کی کہانی ہے۔ انسان کے پستی سے بلندی کی طرف ارتقار کی روداد ہے۔ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے۔ یہی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے۔ وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے۔ اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی حربے سے نہ ٹوٹنے والی شہادت ہے۔ وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ کا چراغ ہے۔ اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہیں تو حسینؑ کی یاد اس کی لو کو روشن کر دیتی ہے جب راہ حق وحریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور کیسے کیسے نہیں ڈگمگاتے۔ تو حسینؑ کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت وقوت واقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمیعتوں پر عرصۂ زندگی تنگ کرتی ہے اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے کا وسوسہ دل میں ڈالتا ہے تو حسینؑ ہی کی مثال انھیں ثبات قدم کا سبق دیتی ہے اور یاس کی کفر آفرینی سے بچاتی ہے جب جماعتی زندگی کا فساد فرد کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے تو حسینؑ کی مثال اس فرد کو اس کی یہ ذمے داری یاد دلاتی ہے کہ جماعت کو اخلاقی جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اس پر عائد ہوتا ہے۔ چاہے اس کی کوشش میں جماعت اسے زہر کا پیالہ پلائے یا سولی پر چڑھائے سنگسار کرے یا سرتن سے جدا کر کے شہادت کے خون سے زمین کو لالہ زار بنا دے۔

کے حریص انسانوں کو حسینؑ یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جئے جانے کا نام نہیں ہے اور جتلاتے ہیں کہ ؎ کبھی جاں اور کبھی تسلیم جانِ زندگی۔ جب کامیابی کے طلائی بچھڑے کی پرستش ہر سو ہو رہی ہو تو حسینؑ ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے اور حسینؑ کی ناکامی کے روبرو باطل کی ساری فتح مندیاں سرنگوں و شرمسار نظر آتی ہیں۔

لیکن آخر یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ حسینؑ نے اپنی جان دے کر خدا کی خدائی اور انسان کی شرافت پر شہادت دی ہے اور اس دستاویز پر اپنے خون سے مہر ثبت کی ہے۔ یہ انسانی شرافت کیا ہے؟ بہائم پر انسان کو کون سی چیز برتری کا مرتبہ دیتی ہے؟ اس کے سینے میں قانون و اخلاق کا وجدان یہ جستجو کے خوب سے ہے خوب تر کہاں؟ اس کے ذہن میں اعلیٰ اقدار کا آنا۔ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کا فطری قصد ہے۔ اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر قناعت سے اس کی فطری بیزاری۔ پھر ان اقدار اعلیٰ کا مطلق اور کامل حیثیت میں یقین اور اس پر اس کے قلب و ضمیر کی تصدیق۔ یہی صفاتِ اخلاقی کے وہ مکمل نمونے ہیں جن پر ہر چیز کی قدر و قیمت پرکھی جاتی ہے۔ مثلاً عدل، حق، خیر، حسن۔ انھیں سے اس کی شب تار حیات میں روشنی کی جھلک ہے۔ انھی سے اس کی بے چینی میں سکون اور پراگندگی میں دل جمعی کا سامان ہے وہ بھٹکتا ہے تو یہی دلیلِ راہ ہوتی ہیں۔ زندگی کے دوراہے پر جب یہ کفر کی طرف جاتا ہے تو یہی اسے شکر کی طرف کھینچتی ہیں۔ اسفل سافلین میں یہی احسن تقویم یاد دلاتی ہیں انھیں بھلایا جاتا ہے مگر یہ پھر بار بار یاد آتی ہیں انھیں دبایا جاتا ہے مگر یہ پھر ابھرتی ہیں۔ ان سے بدکنے والے وحشی بھی پھر پھر کے ان کو جاتے ہیں تکتے، یہ اقدارِ مطلقہ حواس ظاہری سے محسوس نہیں ہو سکتیں۔ ان کا تصور کیا جا سکتا ہے چشم ظاہر ان کے نظارے سے محروم ہے صرف چشم باطن ہی کو ان کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر ملک میں ایسے خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں جو ان اقدار کو بے حجاب اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم چاند سورج، ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کے نور سے وہ دنیا کی ہر چیز کو زندگی کے ہر شعبے کو۔ انفرادی ہو کہ اجتماعی منور کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قول سے ان اعلیٰ قدروں کی تلقین

کرتے ہیں اپنے عمل سے ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ انھیں اپنے پر طاری کرتے ہیں اپنے اندر بچاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی روشنی سے دوسروں کی نظریں ان تک پہنچاتے ہیں اور دوسروں کے دل ان کی طرف جھکتے ہیں۔ اور جب انسان کی ہمیت ان پر نرغہ کرتی ہے تو ان کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہوجاتے ہیں۔ حفاظت میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں لیکن ان کا اصلی رنگ ناکامی میں نکھرتا ہے۔ ان کی ظاہری کامیابی سے ان کی پیش کردہ اقدار پر یقین اتنا راسخ نہیں ہوتا جتنا اس وقت ہوتا ہے جب باطل کی یلغار اتنی شدید ہوتی ہے کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی شکست یقینی ہوتی ہے اور یہ ناکامی اور شکست کے یقینی ہونے کے باوجود اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے ساتھی نہیں بنتے۔ ان کی گالیاں کھاتے ہیں۔ ذلتیں سہتے ہیں تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اگر یہ مرتبہ بلند نصیب میں ہوتا ہے تو آخر کار جان کی نذر پیش کرکے اپنی سچائی کا آخری ثبوت دیدیتے ہیں۔ اور انسانیت کو جتا دیتے ہیں کہ کامیابی اور اقتدار کی لاگ سے وہ کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ ان اقدار مطلقہ کی سوا لیس اسی وقت تک ہے جب تک فتح مندیاں ہیں۔ نہیں ان کے ساتھ رہ کرناکامیابی دوسروں کے ساتھ کی کامیابیوں سے اعلیٰ کی خاطر بدنامیاں ادنیٰ کے ساتھ کی نیک نامیوں سے بہتر ہیں ان کی جلو کی رسوائیاں بڑی بڑی کامرانیوں سے زیادہ وقیع اور ان کی سنگت کی تنہائیاں، لشکروں اور جیشوں پر قابلِ ترجیح ہیں جیسین انھیں اقدار مطلقہ کے علم بردار تھے۔ انھیں کے لئے جیے۔ انھیں کے لئے لڑے۔ اور انھیں پر اپنی جان نثار کر گئے اور اپنی زندگی اور اپنی موت دونوں سے انسانیت کے لئے ایک دائمی شمع ہدایت روشن فرما گئے اس شمع کی روشنی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نما ہے لیکن جماعتی زندگی کی گمراہیوں میں اس شمع سے اکتساب نور کی طرف آج خاص طور پر توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اسلام کے نزدیک دین کی بنا اقدار کی وحدت پر ہے۔ بنیادی اقدار حکم، حکمت اور حق ہیں۔ حکمت اور حق بنیادی اقدار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ میں صرف حکم کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے مراد ہے حکومت۔ اقتدار اعلیٰ۔ ذرا سوچئے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے

کہ نوع انسانی کی اچھی سیاسی تشکیل عدل اور انصاف پر مبنی حکومت کا قیام۔ انسان کی اخلاقی زندگی کے لئے ناگذیر ہے۔ اس لئے اچھی حکومت بھی ایک اخلاقی قدر رکھتی ہے اور اس کا ایک مکمل نمونہ ہماری ہدایت کے لئے ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا حکمت اور حق کا۔ اس کا نام حکم ہے۔ حکم۔ حکمت اور حق کو ایک ماننا اسلام کی تعلیم ہے۔ یعنی اسلام یہ کہتا ہے کہ حکم بھی اسی ذات کے لئے ہے جو عین حق اور عین حکمت ہے۔ عبادت یعنی غیر مشروط اور غیر محدود اطاعت صرف اسی کی کرنی چاہئے اور کسی کی نہیں۔ شرطوں کے ساتھ اور حدوں کے اندر دوسرے کی اطاعت بھی کی جا سکتی ہے مگر شرط اور حد یہی ہے کہ مجازی حکم، حقیقی حکم اور حکمت اور حق کے خلاف نہ ہو۔ اگر دنیا میں حکم حقیقی قائم ہو تو انسان کا کھلا ہوا فرض ہے کہ بغیر کسی شرط کے اس کی اطاعت کرے لیکن اگر حکم مجازی کا دور دورہ ہے تو اطاعت کے لئے شرطیں لگانی پڑتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو کوئی کام اس حکم کے خلاف نہ کرنا پڑے جسے وہ حکم حقیقی جانتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب حکم مجازی سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہو اور انسان کو اس کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مشکل جس کے تصور تک سے حق پسند کا دل کانپ اٹھتا ہے یہ ہے کہ باطل کی حکومت یہ مطالبہ کرے کہ اسے حکم حقیقی سمجھا جائے جب دنیا پر یہ مصیبت آئے تو آدمی کا فرض ہے کہ وہ قول سے فعل سے یہ اعلان کرے کہ یہ باطل کی حکومت سراسر حکم حقیقی کے خلاف ہے میں اس کے آگے ہرگز سر نہ جھکاؤں گا اور کوئی اس کے آگے سر نہ جھکائے۔ اس اعلان کا نام شہادت ہے۔ اس شہادت پر باطل کی قوتیں ٹوٹ پڑتی ہیں مگر اس کے سارے ظلم سہہ کر ہی مرد حق دوسروں کو حق و باطل کا فرق دکھا سکتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ قدر اعلیٰ کو بے حجاب دیکھنے والے کم ہوتے ہیں اب یہ مرد حق جو حکم حقیقی بے حجاب دیکھ رہا ہے دنیا کے کم نگاہوں کو کس طرح دکھائے۔ سوائے اس کے کہ اس راہ میں قربانیاں کرے اپنے عقیدے کی قوت سے اپنے دلوں کو گرمائے۔ کبھی کبھی اس راہ میں جان دے کر آخری قربانی دینی پڑتی ہے۔ جو شخص جان دے کر باطل کے مقابلے میں آخر دم تک حق کا اعلان کرے وہی شہادت کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہوتا ہے اور عام طور پر شہید صرف اسی کو کہتے ہیں۔

اب آپ تاریخ کے صفحات پلٹ کر دیکھئے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ جسے مسلمان سب سے زیادہ اچھا زمانہ سمجھتے ہیں گذر چکا ہے۔ حکم حقیقی یعنی خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوتا ہے حکم مجازی یعنی ملوکیت کا دور آتا ہے۔ حکم حقیقی کے خلاف ملک کے محاصل ذاتی ملک بنتے ہیں اور بادشاہ بہت بڑا خزانہ جمع کرکے دولت کے بل پر اپنی قوت بڑھاتا ہے اور عالم اسلامی کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ کچھ لوگ ڈر سے کچھ لالچ سے سر جھکا دیتے ہیں۔ بعض سر ایسے ہیں جو نہیں جھکتے۔ انہی میں رسولؐ کے نواسے حسینؑ کا سر ہے۔ لالچ، دھمکی، فریب سب سے کام لیا جاتا ہے مگر حسینؑ یزید کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں۔ بھلا حسینؑ جن کی رگوں میں علیؑ فاطمہؓ اور محمدؐ کا خون تھا۔ جن کے دل میں حق کا خون اور حق کا عشق تھا حکم باطل کو حکم حق کیسے کہہ دیتے۔ حسینؑ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا اعلان کر دیا کہ یزید کا حکم، حکم باطل ہے یہ پہلی شہادت تھی۔

ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ مکے میں بھی چین نصیب نہ ہوا۔ ترک وطن کرکے عراق کا قصد کیا یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مجھے یزید کے حکم کے باطل ہونے پر اس درجہ یقین ہے اور اسے قبول کرنے سے اس شدت سے انکار ہے کہ ترک وطن کی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں یہ دوسری شہادت تھی۔

کوفے کی راہ میں کربلا کے مقام پر یزید کے لشکر نے حسینؑ کی راہ روکی اور ان کا چھوٹا سا لشکر گھر گیا۔ اب آخری قربانی اور آخری امتحان کا سامنا تھا۔ حسینؑ نے آخری قربانی پیش کی، آخری امتحان میں پورے اترے ان کے ساتھیوں اور عزیزوں میں سے ایک ایک مارا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے قتل ہوئے آخر خود حسینؑ زخموں سے چور چور زمین پر گرنے مگر ان کے دل میں یہی تھا۔ ان کی زبان پر یہی تھا۔ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ یہ تیسری اور آخری شہادت تھی۔

کہتے ہیں کہ جب لشکر شام والے حسینؑ کے اہل بیت کو اسیر کرکے اور کربلا کے شہیدوں

کے سر نیزوں پر چڑھا کرے چلے تو راہ میں ہر جگہ حسینؑ کا سر اللہ کی وحدت اور بڑائی اور اس کے حکم کی شہادت دیتا تھا۔ مذہبی عقیدت اس بات کو لفظاً بھی صحیح مان سکتی ہے مگر اس سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو واقعی حسینؑ کا سر جہاں کہیں جاتا ہوگا زبان حال سے حکم حق کی شہادت دیتا ہوگا۔ آج تیرہ سو سال بعد بھی حسینؑ کی مثال بلکہ حسینؑ کا نام اس کی شہادت دیتا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا کہ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔

جب کبھی دنیا میں حکم حقیقی کی قدر کا تسلط ہوگا تو دنیا ضرور یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسن کے نواسے نے کس طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر دی تھی۔ جب دنیا میں افراد اور اقوام ان اقدار اعلیٰ کے سیوک کی حیثیت سے ارتقار روحانی و ذہنی کے منازل سبک رفتاری سے طے کرتی ہوگی اور ان قدروں کے حاملوں کو ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا تو وہ ضرور یاد کرے گی کہ صدیوں پہلے ایک بے یار و مددگار حق پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان اقدار اعلیٰ کی حمایت کی ہمت کی تھی اور جس دنیا کی طاقت و جبروت اس کے خلاف تھی تو انھیں کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ جب دنیا ایک خدا سے ڈرے گی اور اس طرح سب اوروں کے ڈر سے نجات پا چکی ہوگی تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہ کے لال نے میدان کربلا میں اپنا سر کٹوا کر اس اطاعت اور اس سر بلندی کا مظاہرہ کیا تھا اس وقت یہ بے نوا حکمرانوں کا حکمراں دکھائی دے گا۔ یہ ناکام دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا اور اس کا خاک و خون میں لتھڑا ہوا سر الٰہی سطوت و جبروت کا علم معلوم ہوگا اور عارف اجمیری کے لفظوں میں سب پر روشن ہو جائے گا کہ

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ | دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دست یزید | حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

تمدن انسانی کا انتشار

(یہ مقالہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر عابد حسین صاحب انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں پڑھا گیا)۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین ہ	اور اگر بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کو کرسی حکومت پر سے نہ ہٹاتا رہے تو ملک کا انتظام درہم برہم ہو جائے لیکن اللہ دنیا جہان کے لوگوں پر بڑا مہربان ہے۔

جنگ کے آتشیں شعلوں نے بالآخر تمام کرۂ ارض کو گھیر لیا۔ یورپ میں یہ آگ بھڑکی اور اس نے مغرب و مشرق، جنوب اور شمال کو خاکستر کر دیا۔ فرانس، روس، یونان، پولینڈ غرضکہ کوئی ملک اس کی دسترس سے بچ نہ سکا۔ یورپ سے یہ افریقہ پہنچی اور لیبیا کو اپنا ہدف بنایا اور اس کے شعلوں کی گرمی مصر اور نہر سوئز تک بھی پہنچنے لگی۔ افریقہ اور یورپ کے دو براعظموں کے بعد ایشیا کی باری آئی ایران، عراق اور شام اس کی نذر ہو گئے۔ نئی دنیا ایک عرصہ تک اس سے بچی رہی لیکن ابھی دو برس ہی کا عرصہ ہوا تھا کہ جاپان اور امریکہ میں بھی جنگ چھڑ گئی۔ آسٹریلیا کا براعظم تو برطانیہ کی نوآبادی کی حیثیت سے اس میں پہلے ہی سے شریک تھا۔ غرضکہ آج دنیا کے چپہ چپہ پر خون اور آتش کی ہیبت ناک بارش ہو رہی ہے۔ پانچوں براعظموں پر انسانیت کا قتل و خون جاری ہے۔ مہیب دبابے ایک دوسرے سے دیووں کی طاقت سے بھی زیادہ ٹکراتے ہیں اور انسانوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔ مشین گنیں بارش سے بھی زیادہ تیزی سے گولیوں کو برساتی ہیں اور انسانوں کے سینوں میں پیوست ہو کر انھیں بے روح کر دیتی ہیں۔ ہوائی جہازوں سے بموں کی بارش ہوتی ہے وہ بم جس میں انسان کی تباہی اور ہلاکت کے تمام آتشیں سامان پوشیدہ ہیں جو اپنے شکم میں تمدن انسانی کی تباہی کیلیے تمام زہریلا مادہ چھپا رکھتے ہیں۔ یہ انسانی آباد

بستیوں میں برس کر ان میں آگ لگا دیتے ہیں۔ عالیشان عمارتوں کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ غریب، امیر، جوان، بوڑھے، مرد، عورت، بچوں وغیرہ سب ہی کو لقمۂ اجل بنا دیتے ہیں۔ ہری ہری کھیتیاں ویران ہو جاتی ہیں اور شاداب فصلوں اور شگفتہ پھولوں کی جگہ جانوروں اور انسانوں کی لاشوں کے انبار کے انبار لگ جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ زمین پر انسان دوسرے انسان کا خون پی رہا ہے اور اس کے گوشت کے لوتھڑے نوچ رہا ہے بلکہ اس کے ظلم و بربریت سے سمندر بھی محفوظ نہیں ہیں۔ عظیم الشان جہاز اور آبدوز کشتیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں ہزاروں میل کی دوڑ لگاتے ہیں اور بالمقابل ہوتے ہی اپنی توپوں کے دہانے کھول دیتے ہیں۔ توپوں کی گرج اور بموں کے پھٹنے سے سمندر میں قیامت کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ خدا جانے کتنی جانیں تباہ ہوتی ہیں اور بسا اوقات گولوں کے باعث جہازوں میں شگاف پڑتے ہیں جس میں سے پانی جہاز میں گھس جاتا ہے اور سمندر کی بے پناہ گہرائی جہازوں کو مع انسانوں کے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ جہاں موت ان کو ہمیشہ کے لیے سلا دیتی ہے۔ یہ خونیں کھیل اب نہ صرف بحر روم میں کھیلا جا رہا ہے بلکہ دنیا کے تمام سمندروں میں یہ ہولی اب دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل میں جرمنی، برطانیہ، امریکہ اور جاپان ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں، کسی قدر بحر عرب اور بحر ہند اب تک اس سے محفوظ ہیں مگر یہ مہلت بھی اب صرف چند دن کی ہے۔

غرضکہ انسانیت نے ان تمام آلات سے مسلح ہو کر جو جدید سائنس نے اسے مہیا کیے ہیں۔ اپنی تباہی پر کمر باندھ لی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت نے حیوانیت کا جامہ پہن لیا ہے حیوانیت کا کیا بلکہ شیطانیت سمجھا جائے تو بھی حقیقت کی پوری ترجمانی نہ ہوگی۔ لاکھوں انسان قتل ہو چکے، لاکھوں اپاہج ہو کر ہسپتالوں میں زندگی کے تلخ ایام گزار رہے ہیں۔ لاکھوں عورتیں بیوہ ہو چکیں۔ لاکھوں بچے یتیم اور لاوارث ہو کر حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں لیکن وہ انسان ہو کر ابھی تک قتل و غارت گری پر تلا ہوا ہے [illegible] اور [illegible] بستیاں جس پر ہمیں کو ناز تھا اب اس کے ہاتھوں تباہ ہو رہی ہیں لندن، برلن، پیرس اور روم پر ہوائی آتشیں بم ہزاروں کی تعداد میں برسائے جا رہے ہیں۔ تمدن [illegible]

کے وہ تمام مظاہر جو مدارس، عجائب خانوں، کلیساؤں اور محلوں کی شکل میں انسانی شہری زندگی کو قابل فخر بناتے تھے اب صرف مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل کیے جا رہے ہیں۔

یہ انسانی تباہی کیوں جاری ہے؟ یہ قتل و خون کیوں ہو رہا ہے؟ انسان نے بالآخر اپنی عقل خرد کو کیوں بالائے طاق رکھ دیا ہے؟ کیا وہ اس وحشت و بربریت سے باز بھی آئے گا یا اسی خوفناک کھیل ہی میں تباہ ہو جائے گا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو بار بار سامنے آتے ہیں اور ان کے جواب کے لیے ہمیں مجبور کرتے ہیں۔

(۲)

جنگ دراصل اس انتشار کا خارجی مظہر ہے جو اس وقت تمدن انسانی میں موجود ہے۔ تمدن انسانی کے تمام شعبوں میں ایک عرصہ سے ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس میں کوئی ہم آہنگی اور نظام نہیں پایا جاتا۔ انسانی تمدن کا ہر شعبہ چاہے وہ معاشی ہو یا سیاسی، قومی ہو یا بین الاقوامی، اخلاقی ہو یا مذہبی ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ ان میں کسی قسم کا ربط نہیں ہے۔ پھر تمدن انسانی کے ان مختلف شعبوں کے داخل میں بھی کسی قسم کا نظام، کسی قسم کا ربط، کسی قسم کا ایک مقرر کردہ لائحۂ عمل موجود نہیں ہے۔ انسان عمل کر رہا ہے لیکن اس کے اعمال کا کوئی مقرر کردہ انسانی نصب العین نہیں ہے۔ بعض مقاصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی جان کی بازی تک لگا دی ہے۔ مگر یہ وہ مقاصد ہیں جو بسا اوقات غلط اور انسانیت کی تباہی کا باعث ہیں۔ ہم عہد جدید کی تمدنی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس انتشار سے واقف ہو سکیں جو اس وقت تمدن انسانی میں موجود ہے۔ اس واقفیت کے بعد ہی ہم اس موجودہ ہیبت ناک جنگ کے اسباب جان سکیں گے۔ ان اسباب کے جاننے کے بعد ہم ان کو دور کرنے کی تدابیر پر غور کر سکیں گے۔ جب تک انسانیت کی راہ سے ان رکاوٹوں کو دور نہ کیا جائے احیائے انسانی کی تمام کوششیں محض بیکار ثابت ہوں گی۔ انسان کی نئی زندگی کے متعلق ہم تب تک کوئی امید قائم نہیں کر سکتے جب تک ہم اس تمام خس و خاشاک کو انسانیت کی راہ سے نہ ہٹا دیں جو ایک عرصے سے اس کی آئندہ راہ کو روک رہا ہے۔ کسی مریض کے علاج کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

پہلے اس کے مرض کی ٹھیک ٹھیک تشخیص کی جائے۔ مرض کی ان تمام علامتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے جو مریض میں پائی جاتی ہیں۔ پھران علامات کا کیا بنیادی سبب ہے اس کا پتہ چلانا ضروری ہے۔ پھر ان اسباب کا رفع کرنا از بس ضروری ہے۔ جب مرض کے تمام اسباب دور ہو جائیں اور مریض اپنی اصلی حالت پر آجائے تب اس کو مقوی غذائیں دینا ضروری ہیں تاکہ اس میں خون صالح پیدا ہو اور وہ آئندہ تمام امراض کا مقابلہ کر سکے۔ انسانیت آج مریض ہے۔ اس کا مرض نہایت خطرناک ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ لب گور ہو چکی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں بھی نہایت ضروری ہے کہ پہلے اس کے مرض کی تمام علامتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے پھران تمدنی امراض کا اصلی سبب کیا ہے۔ اس کی جستجو کی ضرورت ہے۔ جب اس سبب اصلی کا پتہ چل جائے تو اس کو دور کیا جائے۔ جب یہ دور ہو جائے گا تو انسانیت اپنی معمولی حالت پر واپس آجائے گی اس وقت پھر ایک صحیح انسانی نظام کے ذریعہ اس کو مادی اور روحانی غذا پہنچائی جائے گی تاکہ وہ صحتور ہو اور آئندہ تمدن انسانی کو فنا کرنے والی مہلک بیماریوں میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

تمدن انسانی کے مرض کی علامات کا پتہ تمدن انسانی کے مختلف شعبوں کے مطالعہ سے چل سکتا ہے۔ وہ شعبے کون سے ہیں؟ تمدن انسانی انسان کی معاشی، سیاسی، اجتماعی، قومی، بین الاقوامی فنی علمی، ادبی، جمالی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی زندگی پر مشتمل ہے۔ آج ہر اس شعبہ میں انتشار پایا جاتا ہے انسان کی معاشی زندگی میں سرمایہ دارانہ مزدور کی جنگ جاری ہے اس کی قومی زندگی مختلف طبقوں کی حرص و آز کی آماجگاہ ہے۔ اس کی بین الاقوامی زندگی جنگ کی صورت میں ہلاکت و تباہی کی تفسیر ہے اس کی جمالی زندگی میں حسن کی ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ اس کا ادب اعلیٰ انسانی جذبات کی بجائے سفلی جبلتوں کا نمائندہ ہے۔ اس کا علم شیطانی قوتوں کا مددگار ہے۔ اس کی اخلاقی زندگی وحشت و بربریت کے سبب پامال ہو چکی ہے۔ اس کی مذہبی زندگی تعصب اور کوتاہ نظری سے ملو ہے۔ اس کی روحانی زندگی الحاد اور دہریت کے باعث فنا ہوئی جا رہی ہے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم تمدن انسانی کے ان تمام شعبوں پر تفصیل سے نظر ڈالیں اس لیے

ہم صرف اس کے چند اہم شعبوں پر ایک نظر ڈالنے پر اکتفا کریں گے۔ مرض کی علامات کے بعد ہم ان علامات کے اصل سبب کو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس اصل سبب کے معلوم ہو جانے کے بعد کوشش کریں گے اس کو دور کرنے کے لیے اور انسانیت کو مکمل صحت اور طاقتور بنانے کے لیے حکما جو مختلف نسخے تجویز کر رہے ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ ان کے فواید اور نقائص کا باہم موازنہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ کون نسخہ انسانیت کی شفا کے لیے بہترین ہے۔ وہ کونسا نسخہ ہے جو انسانیت کے مادی، عقلی، جمالی اخلاقی اور مذہبی، روحانی قوی کی انتہائی ترقی کی راہ سے نہ صرف خس و خاشاک کو دور کرتا ہے بلکہ ان کی انتہائی ہم آہنگ ترقی کرتا ہے۔ اس کوشش کو ہم احیائے انسانی کی کوشش سے تعبیر کریں گے اسی مناسبت سے ہم نے اس کتاب کا نام بھی "احیائے انسانی" رکھا ہے۔ اس میں ان تمام مسائل سے بحث ہوگی جو انسانیت کی نئی زندگی کے لیے ازبس ضروری ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ انسانیت تباہی کے غار کے قریب آ گئی ہے اس قسم کی کوشش ازبس ضروری ہے۔ جب یہ جنگ ختم ہوگی اور جنگجو اقوام تنگ چکی ہوں گی اس وقت شاید انسانیت کو اپنے ظالمانہ افعال پر کچھ افسوس ہو اس وقت شاید ان کو یہ خیال پیدا ہو کہ گزشتہ جارحانہ قومی نظامات نے ان کو اور ان کے تمام انسانی ہمسایوں کو تباہ کر دیا ہے۔ اس وقت شاید وہ ایک ایسے نظام کی تلاش کریں جو ان کو اور تمام انسانیت کو امن و امان دے اور تمام انسانیت بجائے باہمی غارت گری کے انسانیت کی مادی اور روحانی ترقی میں مصروف ہو جائے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال درست ہو۔ ممکن ہے کہ یہ محض خواب ثابت ہو۔ بہرحال ایک امید افزا خواب میں زندگی گزارنا اس سے بہتر ہے کہ انسان عہد جدید کی وحشت اور بربریت کے حوصلہ شکن واقعات کا شکار ہو جائے۔ حالات چاہے کسی قدر حوصلہ شکن کیوں نہ ہوں لیکن افق پہ امید کی کرن اب تک دکھائی پڑتی ہے۔ اقوام پاگل ہو چکی ہیں ان کی حکومتیں اور ان کے ارباب حل و عقد اس سے بھی زیادہ پاگل لیکن آج بھی کڑوڑوں انسانوں کے گھر میں اکا دکا ایسا دکھائی پڑتا ہے جس کا دل انسانیت کی محبت سے لبریز ہے جس کی آنکھیں انسانیت کے درد و دکھ سے پرنم ہیں اور جس کے قوی انسانیت کو اس تباہی سے بچانے کے لیے مضطرب ہیں۔ شاید ان روحانی انسانوں کی آواز جبکہ انسانیت

کا موجودہ غصہ کم ہوگا کچھ اثر کر جائے اور انسانیت اپنی احیا کی کوشش میں مصروف ہو جائے اور اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم احیائے انسانی کے اصول اور ان پر مبنی نظام عمل پیش کریں ہم تمدن انسانی کے موجودہ انتشار کا ٹھیک ٹھیک مطالعہ کر لینا چاہتے ہیں۔ اس انتشار کا مطالعہ ہم کو اس کی معاشی، سیاسی، ادبی، علمی، جمالی، بین الاقوامی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں کرنا چاہیئے۔

(۳)

دنیا کی معاشی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ایک عجیب قسم کا انتشار دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی تقریباً دو سو کروڑ آبادی میں ایک طرف چین اور ہندوستان کی تقریباً سو کروڑ آبادی ہے جو فقر و فاقہ میں زندگی گزار رہی ہے تو دوسری طرف انگلستان اور امریکہ میں دولت کے چشمے بہہ رہے ہیں۔ ہندوستان کی روزانہ اوسط آمدنی بمشکل ایک آنہ فی کس ہے اور چین کی بھی کچھ اس سے بہتر نہیں ہے۔ اس کے برخلاف امریکہ میں دولت کا یہ حال ہے کہ ہر چھ آدمیوں میں سے ایک کے پاس وہاں موٹر کار موجود ہے۔ ہندوستان سے سونا اور چاندی برابر کھینچ کھینچ کے انگلستان کو پہنچ گیا۔ امریکہ کے پاس تو تمام دنیا کے ضعف سے زائد سونا ہے۔ اور اسی قدر چاندی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً دس کروڑ انسان ایسے موجود ہیں جن کو صرف ایک مرتبہ کچھ تھوڑی سی غذا میسر آتی ہے۔ اور دوسرے وقت وہ بھوکے ہی سوتے ہیں۔ چین کی غربت کچھ یہاں سے کم نہیں ہے۔ عالم اسلام کا بھی کچھ اس سے بہتر حال نہیں ہے۔ غربت کے باعث لوگوں کی صحت تباہ ہو گئی ہے اور دن بدن بد سے بدتر حال ہوا جا رہا ہے۔ غربت کے باعث لوگ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے ہیں جس کے باعث جہالت کا عام طور سے دور دورہ ہے۔ بچوں کی شرح اموات بہت زیادہ ہے۔ مشرق کی غربت کا باعث بہت بڑی حد تک یورپ کی سرمایہ داری ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں بیشتر مشرقی اقوام مثلاً ہندوستان، سماترا، جاوا وغیرہ یورپ کی تازہ دم اقوام کا شکار ہو گئیں ان مغربی اقوام نے ہر طرح ان مفتوح ممالک کو لوٹا اور ان کی معاشی زندگی کو تباہ کر ڈالا۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ظلم و ستم کی داستان کو کون نہیں جانتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تک بھی باوجود

ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے ہندوستان اپنی پارچہ کی صنعت کو دوبارہ زندہ نہ کر سکا اور تقریباً ساٹھ کروڑ روپیہ کا کپڑا وہ باہر کے ملکوں سے خرید رہا ہے۔ جاوا اور سماترا کو بھی اہل ہالینڈ نے خوب تباہ کیا چین کو تو جرمنی، انگلستان، فرانس اور امریکہ سب ہی نے مل کر اپنی حرص کا آماجگاہ بنایا۔ مغربی سرمایہ داری نے بہت جلد ان مفتوح ممالک میں اپنی حکومتیں بھی قایم کر لیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ معاشی لوٹ اور بھی زیادہ منظم اور مستقل ہو گئی جو اب تک بدستور قایم ہے۔ اسلامی ممالک بھی مغرب کی سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا شکار ہوئے جس کا نتیجہ وہاں غربت اور معاشی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مصر شام، عراق اور ایران کے کسان غریب ہوتے چلے گئے اور اب تک ان کی حالت درست ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مغربی سرمایہ داری کے علاوہ تمام مشرقی اقوام اس جاگیرداری نظام کا بھی شکار رہیں جو ان ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ دیہات کے دیہات اور قصبے کے قصبے صرف چند زمینداروں کی ملکیت ہیں۔ زمینداروں کی سالانہ آمدنی بغیر کسی مشقت کے لاکھوں کی ہے حالانکہ وہی کسان جو ان کے لیے ہل جوتتا ہے دن بھر تپتے ہوئے سورج کی گرمی میں اپنے خون کا پسینہ کرتا ہے ماہانہ چند روپیوں سے زائد نہیں کماتا یہ قلیل آمدنی نہ اس کی اور نہ اس کے اہل و عیال کی کفالت کرتی ہے۔ ہندوستان، ایران، عراق، مصر وغیرہ سب ہی میں اب تک زمین زمینداروں کے قبضہ میں ہے اور کسان فاقہ کشی کر رہے ہیں۔

دولت، دولت کو کماتی ہے۔ غریب عوام کے پاس دولت نہیں ہے اس لیے وہ کسی قسم کی تجارت نہیں کر سکتے تمام دولت سمٹ سمٹ کر بڑے بڑے تاجروں کے پاس مرکوز ہو رہی ہے۔ وہ دن بدن زیادہ دولت مند ہوتے جا رہے ہیں اور اپنی دولت کے باعث بیشتر تجارتوں پر ٹھیکوں Monopoly کے ذریعہ قابض ہوتے چلے جا رہے ہیں جس کے باعث چھوٹے چھوٹے تاجر برباد ہوتے جا رہے ہیں۔

مشرق کے مقابلہ میں مغرب کی معاشی حالت بہتر ہے وہاں کی حکومتیں چونکہ عوام کی بہت حد تک نمایندہ ہیں اس لیے انھوں نے عوام کی معاشی بہبودی اور بہتری کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پھر چونکہ انگلستان اور فرانس وغیرہ امیر ممالک ہیں اس لیے وہاں کا معیارِ زندگی بھی بلند ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں

نہ سرمایہ داری کی دست برد سے یہ ممالک محفوظ ہیں۔ معاشی زندگی میں اصول انفرادیت کی کارفرمائی کے باعث بعض افراد اور کمپنیوں نے بے حساب دولت جمع کر لی ہے۔ دولت ایک جگہ جمع ہو گئی ہے اس لیے بحیثیت مجموعی تمام ممالک کی صنعتی و حرفتی ترقی میں اس سے پوری مدد نہیں مل رہی ہے۔ بیروزگاری ان ممالک میں بھی موجود ہے تاہم یہاں غربت کا وہ حال نہیں جو مشرق میں ہے گزشتہ نصف صدی سے اجتماعیت کی تحریک ان ممالک میں برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس لیے اب یہاں غربت کم ہو گئی ہے اور بیروزگاری بھی گھٹ گئی ہے۔ معیار زندگی بھی کافی بلند ہو گیا ہے۔ تاہم ابھی تک عوام کی معاشی حالت میں ترقی کی گنجایش ہے۔ امریکہ کے تمول کے باوجود بھی وہاں کی تیرہ کروڑ آبادی میں سے اس وقت ایک کروڑ انسان بیکار ہیں جبشی امریکہ جو برائے نام غلامی سے تو آزاد ہو گیا ہے لیکن ممالک متحدہ کی جنوبی ریاستوں میں اس وقت اس کی حیثیت غلامانہ ہے۔ اور وہ سفید لوگوں کی معاشی دست برد کے لیے صرف ایک ذریعہ ہے۔ جنوبی امریکہ میں تو سفید اقوام نے سرخ ہندیوں کی پوری کی پوری قوم کو صرف ربڑ کے حصول کے لیے تباہ و برباد کیا۔ اُن پر دنیا کا کوئی ظلم نہیں ہے جو روا نہ رکھا گیا۔ یہی حالت افریقہ میں بھی ہوئی۔ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ نے اپنی سرپرستی میں چند کمپنیاں قایم کیں جنھوں نے ربڑ کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے بلجیم کونگو کی تمام آبادی کو برباد کر ڈالا۔ یہی فرنچ کونگو میں بھی پیش آیا۔ غرضکہ رنگین اقوام آج امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں سفید اقوام کی معاشی دست برد کا شکار ہیں۔

روس میں اجتماعی تحریک کی کامیابی کے باعث البتہ حالات بالکل مختلف ہو گئے ہیں وہاں سرمایہ داری کا مطلق خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ بالشویکوں کو چاہے اپنے مقاصد میں مکمل کامیابی نہ ہوئی ہو لیکن یہ بات ضرور ہے کہ انھوں نے روس جیسے عظیم الشان ملک میں جہاں کی آبادی تقریباً اٹھارہ کروڑ ہے بیروزگاری کا بالکل خاتمہ کر دیا ہے۔ وہاں اب ہر شخص کو کام میسر ہے اور ہر شخص کی احتیاجات زندگی پوری ہوتی ہیں بے شک وہ اس قدر آرام سے زندگی نہیں گزارتے جس قدر کہ اس کا ہمسایہ انگلستان اور جرمنی میں گزارتا ہے لیکن اب اس کو اپنے پیٹ کے لیے روٹی، اپنے جسم کے لیے کپڑے اور اپنے

تن کو چھپانے کے لیے مکان کی فکر نہیں ہے۔ اس معاشی تجربہ میں بہت خامیاں ہیں جس کے متعلق ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن انسانوں کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ سب سے عظیم الشان تجربہ ہے جو بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے۔

جرمنی اور اطالیہ میں اس معاشی مسئلہ کا ایک عجیب قسم کا حل پیش کیا ہے۔ یہاں نہ نظام معیشت میں پوری طور پر اصول انفرادیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور نہ اصول اجتماعیت کو۔ بیروزگاری کا انھوں نے خاتمہ کر دیا ہے لیکن سرمایہ داروں کا انھوں نے خاتمہ نہیں کیا ہے۔ حکومت سرمایہ دار اور مزدوروں کے نمایندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بناتی ہے جو تمام معاشی مسائل کا حل کرتی ہے۔ اس طریقہ سے ملک کی بیروزگاری کا تو خاتمہ ہو گیا ہے لیکن مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے معیار میں کوئی معتدبہ فرق نہیں پڑا ہے۔

دنیا کی پیدایش دولت چونکہ کسی نظام کے ماتحت نہیں ہوتی اس لیے اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض چیزیں اس قدر افراط سے پیدا ہوتی ہیں کہ اس کی دنیا کو ضرورت نہیں رہتی۔ ان چیزوں کی افراط کے باعث ان کی قیمت گھٹ جاتی ہے۔ ان قیمتوں کو مصنوعی طور پر باقی رکھنے کے لیے بالآخر ان چیزوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس طرح لاکھوں ٹن گیہوں اس وقت جلا دیا گیا جبکہ ہندوستان اور چین میں مخلوق خدا کے چند دانوں کے لیے ترس رہی تھی۔

دنیا میں چونکہ ایک سکہ رائج نہیں ہے اس لیے شرح مبادلہ کے باعث مفتوح ممالک کا کروڑوں روپیہ کا ہر سال نقصان ہوتا ہے۔ انگلش پونڈ سے ہندوستانی روپیہ کو وابستہ کر دیا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح جس سے انگلستان کو تجارت میں فائدہ پہنچے۔ اس کا یہ نتیجہ ہو رہا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کی تجارت میں انگلستان بغیر کسی محنت کے کروڑہا روپیہ سالانہ وصول کر رہا ہے۔ غرضکہ سکہ اور شرح مبادلہ کے باعث پس ماندہ اقوام اور بھی گھاٹے میں پڑ گئی ہیں۔

ہم نے اس وقت تک انسان کی معاشی زندگی کے خارجی مظاہرات پر صرف نظر ڈالی ہے۔ لیکن اگر یہ دریافت کیا جائے کہ انسان کیوں ضرورت سے زائد دولت جمع کرتا ہے؟ وہ کیوں حصول دولت میں اپنے جسم، جان، عقل، اخلاق اور مذہب تک کو گنوا دیتا ہے؟ وہ کیوں اس کے لیے ہر قسم کا

ظلم وستم بے ایمانی اور شقاوت قلبی کو روا رکھتا ہے؟ ان سوالات کے جوابات کے لیے ہم کو نفس انسانی پر ایک نظر ڈالنی ہوگی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حصول دولت کا بعض افراد میں کچھ فطری جذبہ موجود ہے۔ وہ ملکیت کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اسی جذبہ کے باعث وہ اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی کوشش کرتے ہیں تکلیفیں اٹھاتے ہیں ذلتیں سہتے ہیں۔ ہر قسم کے مکر و فریب سے کام لیتے ہیں، اخلاق اور مذہب کو قربان کرتے ہیں مگر ہر طرح ملکیت کے اس جذبہ کی بالآخر تسکین کرتے ہیں۔ یہ جذبہ انسان کی وراثت میں اس وقت سے چلا آرہا ہے جب وہ محض ایک کاشتکار رہتا۔ کاشتکار کو اپنی زمین، اپنا گھر، اپنے آلات بہت زیادہ عزیز ہوتے ہیں وہ ان پر ہر وقت قبضہ رکھنا چاہتا ہے ملکیت کا جذبہ اس میں فطری طور پر ہوتا ہے اسی جذبہ کا اظہار جب دوسرے معاشی شعبوں مثلاً تجارت یا صنعت و حرفت میں ہوتا ہے تو وہ معاشی تعصب کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ضرورت سے زائد حصول دولت کے اس جذبہ کو نفسیاتی طور پر اس طرح سمجھا یا جا سکتا ہے کہ بیشتر انسان اس وقت تک اس نفسیاتی بناوٹ سے آزاد نہیں ہوئے ہیں جو ایک کاشتکار کی مخصوص علامت ہے۔ پھر چونکہ انسانیت کے بیشتر افراد اسی جذبہ سے معمور ہیں۔ اس کی ہر کامیابی کو بھی اسی مال و دولت کے اجتماعی معیار پر جانچا جاتا ہے۔ اس دنیا میں وہ زیادہ کامیاب انسان ہے جو زیادہ دولت مند ہے چاہے یہ دولت اس نے ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو کر حاصل کی ہو۔ انسان اس کو پوجتے ہیں جس کے پاس زیادہ سیم و زر ہو چاہے وہ خود ان انسانوں کو ہلاکت کے غار ہی میں کیوں نہ ڈھکیل دے۔ اخلاقی محرکات سے زیادہ دولت انسانی زندگی میں فی الحال اثر رکھتی ہے۔ اور یہ انسانی زندگی کے انتشار کی بڑی علامت ہے۔ سیاسی وقار، سماجی عزت و احترام بہت بڑی حد تک آج کل دولت کے ذریعہ خریدا جا سکتا ہے۔ حکومتیں آج اہل زر کے قبضہ میں ہیں۔ نہ صرف ملکوں، قوموں بلکہ انسانیت کی قسمت کا فیصلہ بھی یہی اہل زر کر رہے ہیں۔ لندن اور نیویارک کے یہودی تاجران ملکوں کی سیاسی پالیسی میں بہت حد تک دخل انداز ہیں۔ ہندوستان کے مارواڑیوں کا اپنی دولت کے باعث ملکی معاملات میں کچھ کم اثر نہیں ہے۔

مختصراً یہ کہ بعض جگہ انسان کی معاشی زندگی میں ضرور کچھ نہ کچھ ظلم پایا جاتا ہے بعض جگہ

اجتماعی تحریکات کے باعث اس معاشی زندگی کی اصلاح بھی ہوئی ہے لیکن بحیثیت مجموعی انسانیت کا کوئی معاشی نظام نہیں ہے۔ اس میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے۔ اس کا کوئی پرزہ دوسرے پرزے سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے انسانیت کا بیشتر حصہ فقر و فاقہ میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی کی احتیاجات بھی پوری نہیں ہو رہی ہیں۔

(۴)

اقوام کی قومی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی زیادہ تسلی بخش دکھائی نہیں دیتی۔ تقریباً تمام ملکوں میں غریبوں اور امیروں میں ایک کش مکش جاری ہے۔ امرا کو اپنی دولت کے باعث اقتدار حاصل ہے۔ وہ اپنی دولت کے باعث حکومتوں پر قابض ہیں اور اپنے طبقہ کے مفاد کی حفاظت کے لیے ہر قسم قوانین بناتے رہتے ہیں۔ جن ملکوں میں غربا کو اپنی حالت کا احساس نہیں ہے وہ خاموشی سے اس تمام ظلم و ستم کو برداشت کرتے ہیں لیکن اب ایسے بہت ہی کم ممالک ہیں جہاں غریبوں کو اپنی حالت کا احساس نہ پیدا ہو گیا ہو۔ انقلاب روس نے تو یہ احساس نہایت شدت کے ساتھ دنیا کے مزدوروں اور کسانوں میں پیدا کر دیا ہے۔

ہندوستان میں غریبوں کی یہ تحریک برابر زوروں پر ہے۔ مختلف جماعتیں ان کے حقوق کی حفاظت اور نمائندگی کے لیے کھڑی ہو گئی ہیں۔ کانگریس ٹریڈ یونین اور کسان سبھائیں اس کام کو انجام دے رہی ہیں۔ چین میں بھی اشتراکی پارٹی اور مرکزی حکومت کے تعلقات اچھے نہیں ہیں گو کہ وہ جاپانی شہنشاہیت کے مقابلہ میں فی الحال متحد ہو گئے ہیں۔ عالم اسلام یعنی عرب، ترکی اور ایران میں اس وقت کوئی واضح اشتراکی تحریک موجود نہیں لیکن شعرا اور ادبا کے دلوں کو غربت اور فلاکت نے متاثر کر دیا ہے۔ اور غالباً وہاں بھی یہ مسایل بہت جلد قومی زندگی کے اہم ترین مسایل بن جائیں گے۔ یورپ میں مزدوروں کی غربت کافی زور پکڑ چکی ہے اور روس میں تو یہ کامیابی حاصل کر چکی ہے۔ نئی دنیا اور امریکہ میں امرا کا بڑا اثر ہے لیکن وہاں بھی اب اشتراکی تحریک پیدا ہو گئی ہے اور حبشی تو برابر اپنے حق کے لیے جد و جہد کر رہا ہے۔ افریقہ کی سیاہ اقوام تعلیم و تمدن میں اس قدر پست ہیں کہ ابھی ان میں شناخت

ذلت کا احساس ہے اور نہ اپنی غربت کا اس لیے امید نہیں ہے کہ ایک عرصہ تک ان میں کوئی تحریک پیدا ہو سکے۔

امیروں اور غریبوں کی اس باہمی خلیج کے باعث ہر جگہ قومی زندگی میں ایک انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ ایک کش مکش ہے جو برابر جاری ہے اور قومیں بجائے متحدہ طور پر انسانی بہبودی کے لیے تخلیقی کام کرنے کے آپس ہی کی طبقاتی جنگ میں اپنی طاقت صرف کر رہی ہیں

قوموں کے سامنے بحیثیت مجموعی انسانی فلاح و بہبود کا کوئی نصب العین نہیں ہے وہ خود صرف اپنی قومی زندگی اور اس کے مفاد ہی کو سب سے اعلیٰ نصب العین تصور کرتی ہیں۔ ہر قوم خود کو دنیا کی سب سے بہتر قوم سمجھتی ہے۔ جرمن سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بہتر قوم ہیں اس لیے انھیں دنیا پر چھا جانا چاہیے انھیں جرمن کلچر کو تمام دنیا پر حاوی کر دینا چاہیے۔ انگریز سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کی بادشاہت ان کا موروثی حق ہے جس کا اظہار اس قومی گیت میں ہوا ہے کہ

برطانیہ لہروں پر حکومت کرتا ہے۔

جاپان کا خیال ہے کہ وہ فطری طور پر مشرق کا راہ نما ہے اس لیے مشرق کو اس کا تابع فرمان ہونا چاہیے اور پھر اس قومی تفوق کے خیال کے ساتھ فسطائی تحریک کے باعث اب نسلی برتری کا خیال بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہٹلر اور اس کے ساتھی اوزن برگ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دنیا کی سب سے اعلیٰ اور برگزیدہ قوم آریہ ہے۔ جرمن قوم چونکہ آریہ ہے اس لیے وہ بھی سب سے اعلیٰ قوم ہے۔

آج کل جس قومیت کا یورپ میں دور دورہ ہے وہ میزنی، روسو اور فشٹے کی اخلاقی قومیت نہیں ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ قومیں آزاد طریقہ پر اپنے مادی، نفسی اور اخلاقی قویٰ کی اس طرح ترقی کریں کہ وہ انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوں بلکہ اس قومیت کا دور دورہ ہے جس کا امام میکاؤلی تھا۔ میکاؤلی نے اقوام کو سکھایا کہ سب سے اعلیٰ مقصد خود غرضی ہے اور اس خود غرضانہ مقاصد کے حصول کے لیے ہر قسم کے اخلاقی اور غیر اخلاقی ذرائع کو اختیار کرنا عین اخلاق ہے۔ انسانیت بحیثیت مجموعی کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ صرف اقوام کا وجود ہے۔ ان اقوام کو اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے اگر انسانیت کی بھینٹ

بھی اُٹھانا پڑیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہو

اس قومی تفوق اور نسلی برتری کے خیال نے اقوام میں شہنشاہیت کا جذبہ پیدا کر دیا ہو ہر قوم تمام کرۂ ارضی کو اپنے قبضہ و تسلط میں دیکھنا چاہتی ہو جس کا نتیجہ آج کل کی ہیبت ناک جنگ کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہو۔ برطانیہ اور فرانس نے آج سے دو صدی قبل ہی دنیا کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، ہندوستان، جنوبی افریقہ، کنیڈا، مصر وغیرہ سب انگریزوں کے زیر فرمان ہیں اور اب تو اس میں فلسطین، شام، عراق، اور ایران کا بھی اضافہ ہو گیا ہو۔ اسی طرح مراکش، ٹیونس چینی ہند وغیرہ پر فرانس کا تسلط ہو گیا تھا۔ جرمنی اور اٹلی میں قومی حکومتیں انگلستان اور فرانس کے بعد قایم ہوئیں اور ان میں شہنشاہیت کا جذبہ بھی ان اقوام کے بعد ہی پیدا ہوا لیکن یہ نوجوان قومیں اب اسی قدر طاقتور ہو چکی ہیں جس قدر کہ پرانی اقوام اس لیے اب وہ دنیا کی اس لوٹ میں اپنا بھی حصہ طلب کر رہی ہیں۔ جاپان مشرقی قوم ہونے کے باوجود بھی مغربی اقوام سے مشرق پر قبضہ حاصل کرنے میں پیچھے رہ گیا تھا اس لیے اب وہ اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہو۔ غرضکہ شہنشاہیت کے جذبہ نے دنیا کی ان طاقتور قوموں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر دیا ہو اور انسانیت کی قسمت کو تاریک بنا دیا ہو۔

مشرقی اقوام خصوصاً ہندوستان اور اسلامی قومیں آج کل اسی شہنشاہیت کا شکار ہیں۔ مراکش پر اسپین قابض ہو تو ٹیونس پر فرانس، طرابلس پر اٹلی کا قبضہ ہو تو مصر و فلسطین پر انگریز مسلط۔ اس کے علاوہ شام، عراق اور ایران پر انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا ہو۔ چین کے بڑے بڑے حصوں کو جاپان نے ہضم کر لیا ہو۔ اور مغرب کی بیشتر قومیں اب جرمنی کی تابع فرمان ہو چکی ہیں۔ مشرقی اقوام بیشتر کمزور ہیں اس لیے وہ خود اپنی بھی مدافعت نہیں کر سکتی ہیں۔ صرف ترکی ایک طاقتور قوم ہو جو اب تک جرمنی اور انگلستان کے درمیان خود کو بچائے ہوئے ہو اور دنیا کو امن کا سبق دے رہا ہو۔ لیکن ترکی بھی اپنی اس غیر جانبداری کو کب تک ان دو حریفوں کے درمیان بچا سکے گا یہ ایک ایسا سوال ہو جس کا فیصلہ صرف مستقبل ہی کر سکتا ہو۔ جن مشرقی اقوام نے کسی قدر اپنی آزادی کو محفوظ رکھا ہو

مثلاً چین و ترکی انھوں نے بہت حد تک یورپ کی تقلید کی ہے اور انھیں سے وہ سبق سیکھا ہے جس کے باعث وہ اب تک کسی قدر آزاد ہیں۔

قوموں کی داخلی زندگی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں طبقاتی جنگ جاری ہے اور ان کی خارجی بین الاقوامی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک عجیب خلفشار ہے۔ کوئی بین الاقوامی قانون موجود نہیں ہے اور اگر کسی قدر ادھورا سا موجود بھی ہے تو اس کی کوئی قوم پروا نہیں کرتی جمعیۃ الاقوام جو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد قائم ہوئی تھی اس نے خود اپنے آپ کو ہلاک کر لیا ہے۔ اس کے بانی پریزیڈنٹ ولسن چاہے کسی قدر بھی نیک نیت کیوں نہ ہوں لیکن پرانی دنیا کے سیاستدانوں لائڈ جارج اور کلیمنسو کے سامنے ان کی کچھ بھی نہ چل سکی جمعیۃ الاقوام بجائے اس کے کہ صحیح معنوں میں جمعیۃ الاقوام ہوتی جو مساوی طور پر سب کے ساتھ سلوک کرتی بڑی طاقتوں اور یعنی برطانیہ اور فرانس کا آلۂ کار ہو کر رہ گئی۔ امریکہ نے خود اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بالآخر جرمنی، جاپان اور اطالیہ بھی اس سے علیحدہ ہو گئے جب اطالیہ نے حبش پر حملہ کیا تو وہ خاموش رہی۔ جاپان نے جب چین کو ہضم کرنا شروع کیا تو اسے جنبش نہ ہوئی۔ بھلا ایسی جمعیۃ الاقوام کی پھر کس طرح دنیا کی نظروں میں عزت ہوتی اس لیے وہ ختم ہو گئی ایک بین الاقوامی ادارہ کا جو تمام اقوام سے برتر ہو بے شک اس نے تصور پیش کیا لیکن دنیا کی نفسی حالت ابھی اس قابل نہ تھی کہ اس تصور کو قبول کرے پھر بڑی طاقتوں نے جو اس پر حاوی تھیں کبھی بھی اس کو صحیح معنوں میں ایک انصاف پسند جمعیۃ نہ ہونے دیا۔

قومی زندگی میں معاشی کشمکش کیوں ہے؛ اس میں مختلف طبقات کیوں موجود ہیں؛ اس کی نفسیاتی تشریح ہم گزشتہ فصل میں بتا چکے ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ انسانیت اپنے عہد طفولیت میں بیشتر کاشتکار تھی اور زمین کی کاشت کے ساتھ ملکیت کا جذبہ لازمی طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ اسی باعث ملکیت اور حصول دولت کا جذبہ جبلی طور پر انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی جذبہ کی زیادتی کے باعث سرمایہ داری پیدا ہوتی ہے۔ بعینہ جارحانہ قومیت اور شہنشاہیت کی بھی ایک نفسیاتی تشریح ہے۔ وہ یہ کہ انسان اوائل ایام میں شکاری بھی تھا۔ وہ جانوروں کو مارتا اور اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ شکاری کسان کے مقابلہ میں کم کام

کرتا تھا وہ کسی خاص احول اور زمین سے اس قدر وابستہ نہ تھا۔ اس میں زیادہ جرأت اور ہمت پائی جاتی تھی۔ یہ اپنے لیے رزق زیادہ محنت سے نہیں بلکہ اپنی ہوشیاری، چالاکی اور بہادری سے کمایا کرتا تھا۔ یہ طبقہ تعداد میں اس قدر زیادہ نہ تھا جس قدر کہ کاشتکار۔ شکار کی یہ جبلت اب تک بعض انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی بہادری اور چالاکی سے دوسرے انسانوں پر حاکم ہو جاتے ہیں اور اُن کو اپنے لیے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جدید حکومتوں میں یہ لوگ حکومت کے ارباب حل و عقد بن جاتے ہیں اور اپنے اقتدار اور اعزاز کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے قوموں اور ملکوں کو جنگ میں ڈھکیل دیتے ہیں۔ غرضکہ شہنشاہیت کا نمایندہ انسانوں کا وہ طبقہ ہے جو نفسیاتی اعتبار سے اب تک شکاری ہے۔ البتہ اب یہ شکار صرف جانوروں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کو بے گناہ اور مظلوم انسانوں تک وسیع کر دیا گیا ہے۔

جارحانہ قومیت جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت ہوتا ہے انسانیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس جذبہ نے مغربی اقوام میں مذہب، اخلاق اور انسانیت کے تمام محرکات کو کمزور کر کے اپنا تسلط جمالیا ہے۔ شہنشاہیت کے جذبہ کی سب سے بڑی اقوام عہد جدید میں فرانس اور برطانیہ ہیں۔ فسطائیت بھی جارحانہ قومیت ہی کا نتیجہ ہے جس میں نسلی برتری کا خیال قومی برتری کے خیال سے ساتھ آکر مل گیا ہے۔ یہ تحریک انسانیت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ انسانوں اور قوموں کی مساویانہ حیثیت تسلیم نہیں کرتی اس تحریک کے سب سے بڑے نمایندے جرمنی، اطالیہ اور جاپان ہیں۔ شہنشاہیت اور فسطائیت نے غرضکہ انسانیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور انسان کی بین الاقوامی زندگی میں وہ انتشار پیدا کر دیا ہے جس کا رفع ہونا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ روس نے اپنی نئی زندگی کی ابتدا ایک بین الاقوامی نصب العین سے کی تھی مگر اسٹالن کے زمانہ میں بہت جلد اس نے بھی ایک قومی رنگ اختیار کر لیا اور اس جنگ میں پولینڈ پر قبضہ کر کے اور فنلینڈ پر چڑھائی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی دوسری جارحانہ اقوام سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

(۶)

انسان کی معاشی اور سیاسی زندگی کے علاوہ اگر ہم اس کی تعلیمی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی زندگی

پر بھی ایک نظر ڈالیں تو وہاں بھی ہمیں ایک عجیب قسم کا خلفشار، ایک عجیب قسم کی بے ہنگامی دکھائی دیتی ہے۔ وسیع معنوں میں ہم انسان کی تعلیمی، ادبی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی زندگی کو اس کی تعلیمی زندگی سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس تعلیمی زندگی کا نمایندہ معلم ہے۔ معلم بھی اس وقت اسی خلفشار میں پھنسا ہوا ہے جس میں کہ عام طور پر تمام انسانیت پھنسی لیکن نئی زندگی کے جو کچھ بھی آثار دکھائی دیتے ہیں اس کی بہرحال نمایندہ بھی معلم کی ذات ہے اور انسانیت کے مستقبل کی اگر کوئی راہ نمائی کرسکتا ہے تو وہ صرف معلم ہے۔ معلم سے ہمارا مفہوم صرف وہ مدرس نہیں ہیں جو مدرسوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کرتے ہیں بلکہ اس تصور میں تمام مدرسین قانون دان معلمین اخلاق، قومی راہنما اور مذہبی پیشوا اور پیغمبر شامل ہیں۔ انسانیت کی عہد طفلی ہی سے معلم کاشتکار اور شکاری کے دوش بدوش زندگی کی جولانگاہ میں مصروف عمل رہا ہے۔ ہندوستان میں برہمن اس کام کو انجام دیتا رہا۔ یونان میں بھی پریسٹ طبقہ موجود رہا۔ فلاطون نے اپنی مشہور عالم کتاب جمہوریت، میں فلاسفر کا اور اس نے یہ خیال پیش کیا کہ اگر حکومت اس طبقہ کے سپرد کردی جائے تو تمام نظام سلطنت بہترین ہوسکتا ہے۔ رومن کلیسا نے تو پادریوں کے ایک علیحدہ مستقل وجود کو تسلیم کرکے مذہبی راہنمائی کا کام کلیتاً ان کے سپرد کردیا۔ بہرحال پادری، پریسٹ، برہمن اور معلم کی نفسیاتی ساخت ایک ہی ہے اور یہ ہمیشہ سے انسانیت کی راہبری کا کام انجام دے رہے ہیں تعلیم و تربیت کا یہ جذبہ بھی بعض انسانوں کو اپنے آباؤ اجداد سے وراثتاً ملا ہے۔ اس لیے ان میں اس کام کے لیے نفسیاتی صلاحیت پائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اصلاح انسانیت کی کسی طبقہ سے امید کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہی طبقہ ہے لیکن اس کی حالت بھی آج قابل اطمینان نہیں ہے۔

انسانیت کے تعلیمی نظاموں پر اگر نظر ڈالی جائے تو جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تعلیم کا آج کل کوئی معینہ اور واضح مقصد ہی موجود نہیں ہے۔ مختلف قومیں اپنے قومی محدود مقاصد نسلی برتری، معاشی اور سیاسی اغراض وغیرہ کے لیے تعلیم دیتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کسی کو تعلیم نہیں دیتا۔ ہر قوم اپنے بچوں کو اس لیے تعلیم دیتی ہے کہ وہ ایک اچھا انگریز

جرمن، جاپانی، چینی نے لیکن کوئی قوم اپنے بچوں کو اس لیے تعلیم نہیں دیتی کہ وہ ایک اچھا انسان بنے۔ دنیا میں آج کل ہر مقصد کے لیے انسان کی تربیت کی جا رہی ہو حتیٰ کہ اسے جوان بنانے کے لیے بھی لیکن اگر اس کی کسی چیز کے لیے تربیت نہیں کی جا رہی ہو تو وہ یہ ہو کہ وہ انسان بنے۔ انسانیت کا ایک واضح مقصد نہ ہونے کے باعث اس کے تعلیمی مقصد میں بھی ایک عجیب انتشار پایا جاتا ہو۔ انسان کے جسمانی، ذہنی، جمالی اخلاقی اور مذہبی قویٰ کی ہم آہنگ تربیت نہیں ہو رہی ہو بلکہ بعض جگہ انسان کے صرف جسمانی قویٰ کی تربیت پر زور دیا جا رہا ہو تو بعض جگہ صرف اس کی ذہنی تربیت اس کی تمام دیگر صلاحیتوں کو قربان کر کے کی جا رہی ہو۔ پھر ذہنی تربیت بھی صحیح معنوں میں عقلی قویٰ کی کمل نشو و نما نہیں ہو بلکہ اس کی نشو و نما ہزاروں تعصبات کی بنیاد پر ہو رہی ہو۔ عقل کے ذریعہ ان تعصبات کو ابھارا جاتا ہو جن کو تباہ کرنا دراصل عقل کا سب سے اول ترین مقصد ہونا چاہیے۔ مثلاً عقل ہزار مرتبہ مابعدالطبیعاتی مسائل کے حل کرنے میں اپنی بے چارگی و درماندگی کو تسلیم کر چکی ہو لیکن آج تک بھی عقل کی منطقی نشو و نما کا یہی مقصد عام طور پر بتایا جاتا ہو کہ وہ ان تمام مابعدالطبیعاتی مسائل کو حل کرے اور صرف اسی کی کسوٹی پر ان مسائل کی نفی یا اثبات کیا جاتا ہے۔

اخلاقی تعلیم کا اثر آج کل کے نظامات تعلیم میں بہت کم ہو گیا ہو۔ ذہنی تعلیم پر جس قدر زور دیا جاتا ہو اس کی عشر عشیر بھی توجہ اخلاقی تعلیم پر نہیں دی جاتی۔ آج کل کی مغربی نسلیں عموماً ذہنی اعتبار سے کافی بلند ہیں لیکن اخلاقی اعتبار سے بہت گھٹیا درجہ کی ہیں۔ مشرقی نسلیں ذہنی اعتبار سے بھی کم تر ہیں اور اخلاقی اعتبار میں بھی فروتر ہیں گو کہ اخلاق کے بلند بانگ دعوے ان کی زبانوں پر اپنے مغربی بھائیوں کی بہ نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

مدرسوں میں ضرورت سے زیادہ انسان کی انفرادی زندگی پر زور دیا جاتا ہو اس کو بہت حد تک خود غرضی، مطلب پرستی اور انسان دشمنی کی تعلیم دی جاتی ہو اس کو یہ سکھایا جاتا ہو کہ وہ ہر طریقہ سے دنیا میں مادی کامیابی کرے چاہے اس کامیابی کے حصول میں اسے کوئی طریقہ بھی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ پھر چونکہ سماج میں انسان کی اصل ذہنی، اخلاقی اور روحانی صلاحیت کی قدر نہیں کی جاتی بلکہ

صرف مادی کامیابی کی توقیر کی جاتی ہو اس لیے مدارس اس معاملہ میں اور بھی لاچار ہیں وہ سوائے اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بھی اسی معیار پر پورا اتارنے کی کوشش کریں جو معیار کہ سوسائٹی اُن سے طلب کرتی ہو۔ مدارس بہرحال اپنے آپ کو کلیتاً اپنے سماجی ماحول سے آزاد نہیں کر سکتے۔ جب تک سماج میں بھی تبدیلی پیدا نہ ہو مدارس میں مکمل تبدیلی ہونا ناممکن ہو۔ غرضکہ مدرسے اور سماج عملاً اس کی تعلیم نہیں دیتے کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں بلکہ انہیں سکھاتی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں وہ انھیں آپس میں اشتراک اور تعاون کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کا سبق دیتا ہو۔ محبت، الفت، اخوت اور انسانیت کے جذبات ابھارنے کی بجائے عموماً نفرت، عداوت، رقابت اور حیوانیت کے جذبات کو اُبھارا جاتا ہو۔ مغرور مغربی اقوام تو اپنے بچوں کو یہ سکھاتی ہیں کہ دنیا کی دوسری اقوام مثلاً حبشی یا مشرقی اقوام کمتر درجہ کی ہیں۔ ہندوستان کے برہمنوں میں بھی غرور و نخوت کا مادہ کچھ کم نہیں پایا جاتا جو خود کو دنیا کی سب سے برگزیدہ قوم تصور کرتے ہیں اور دوسروں کو ملیچھ خیال کرتے ہیں یہ برہمن خود برہما کے منہ سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے مقدس ہیں۔ ان کا مقدس جسم ملیچھ انسانوں کے سایہ پڑنے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہو۔ اس قسم کے تصورات اخوت انسانی کی راہ میں سب سے زیادہ حائل ہیں ہندوستان میں کروڑہا اچھوت اس نسلی برتری کا شکار رہیں۔ اور ہزارہا برس سے نہایت ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں اس بیسویں صدی میں بھی معمولی انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ وہ پبلک کنوؤں پہ پانی نہیں بھر سکتے، وہ مدارس میں شریک نہیں ہو سکتے وہ مندروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ان کی جھولی میں باسی روٹی کا ٹکڑا دور سے ڈالا جاتا ہو۔ انسانیت کے اخلاقی نصب العین پر اس سے زیادہ اور کیا ضرب کاری لگائی جا سکتی ہے

ان تمام اخلاقی بیماریوں کے علاوہ انفرادی اخلاقی برائیاں بھی آج کل کچھ کم نہیں پائی جاتی ہیں جھوٹ، مکر، دغا، فریب، ریاکاری، جاہ پرستی، حب دولت، حسد، بغض، کینہ وغیرہ جیسی مہلک بیماریاں انسانیت کے جسم میں گھن کی طرح لگ گئی ہیں اور اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر رہی ہیں

انسان کی حالی دنیا میں بھی اسی قسم کا خلفشار پایا جاتا ہو۔ ذوق حسن اور احساس جمال کی جگہ لوالہوسی

اور شہوت پرستی نے لے لی ہے۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی　　　　اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

سینما، تھیٹر، رقص خانوں اور عام طور پر شہوت انگیز مناظر نے تو مغربی زندگی کو حیوانیت کی حد پر لاکر کھڑا کردیا ہے مشرق کی زندگی بھی کچھ مغرب سے بہتر نہیں ہے۔ وہاں جو مناظر برسر عام ہیں یہاں وہ ریاکاری کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں جنسی آزادی کے باعث وہاں یہ تعلقات فطری ہیں لیکن پردہ اور سخت سماجی پابندیوں کے باعث ان تعلقات کا اظہار مشرق میں غیر فطری اعمال میں بھی بکثرت ہوتا ہے۔ ایرانی اور اردو شاعری نے تو ان غیر فطری جذبات کو شاعرانہ رنگ دے کر اور بھی پروان چڑھایا۔

انسان کی اس سوقی شہوانی زندگی کا اظہار آج کل اس کی شاعری و ادب کے علاوہ اس کی دیگر جمالی تخیلات میں بھی ہو رہا ہے۔ مثلاً یورپ میں اب بے دودن اور باخ کی روحانی موسیقی کی جگہ جاز کی جنسی موسیقی مقبول ہو رہی ہے۔ امریکہ اور انگلستان کی موسیقی کا مذاق بہت ہی پست ہو گیا ہے ہندوستان میں بھی عموماً اعلیٰ روحانی موسیقی کی بجائے وہ غزلیں پسند کی جاتی ہیں جن میں کسی قسم کی عمدہ روحانی جذبات کا اظہار نہ ہو بلکہ صرف عشق و عاشقی کے شہوانی پہلو کا رنگین نقشہ کھینچا گیا ہو۔ غالب اور اقبال باوجود اپنی عظمت کے اس قدر مقبول نہیں ہیں جس قدر کہ داغ اور دیگر اہل تغزل۔

مغرب میں جدید مصوری بھی پست سطح پر اتر گئی ہے عہد متوسط کی مصوری جو ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نصب العین کی نمائندہ تھی اب مقبول نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ اب اس مصوری نے لے لی ہے جو انسان کے سفلی جذبات کو پیش کرتی ہے۔ ٹیگور اسکول کی مصوری باوجود اس ملک کی تخلیق ہونے کے بھی یہاں اس قدر مقبول نہیں ہے جس قدر کہ وہ تصاویر جو انسان کے مادی حسن کو پیش کر کے اس کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔

تمدن انسانی کے انتشار کا لیکن سب سے بڑا اظہار اس کی مذہبی زندگی کی تخریب میں ہوا ہے۔ آج کل عموماً انسانیت کے پیش نظر کوئی ایسا بلند و بالا نصب العین موجود نہیں ہے جو اس کی زندگی کے مختلف شعبوں کو مربوط و ہم آہنگ کر کے ان کو ایک معنی اور مقصد دے سکے۔ انسانیت اپنا وہ روحانی نصب العین

کم چکی ہے جو اس کو نہ صرف اس دنیا سے بلکہ کل کائنات سے وابستہ کرتا ہے۔ لہٰذا دہریت عام طور پر دنیا میں پھیل رہی ہے۔ خدا کے وجود پر لوگوں کو بہت کم یقین رہا ہے۔

روس کی اشتراکی تحریک تو کھلم کھلا ایک مادی تحریک ہے جو نہ کائنات کے کسی روحانی نظام پر یقین رکھتی ہے اور نہ کسی خالق کائنات کو تسلیم کرتی ہے۔ اشتراکیت کا حکومت پر قبضہ ہونے کے باعث وہ حکومت کی مدد سے بھی اپنے ان دہریانہ خیالات کو تمام نسلوں میں جاگزیں کر رہی ہے وہاں ایک اینٹی گاڈ یعنی خدا دشمن سوسائٹی قائم ہے جو اپنے خیالات کی تبلیغ میں حد درجہ سرگرم ہے اور حکومت اس سوسائٹی کی پوری مدد کرتی ہے۔ یورپ کی دوسری اقوام میں مثلاً جرمنی اطالیہ، برطانیہ اور امریکہ میں خدا کی ذات سے انکار تو نہیں کیا جاتا لیکن وہاں خدا سے بھی زاید قوم کی پرستش کی جاتی ہے صحیح مذہب کو جسے انسانیت کے نصب العین کا حامل ہونا چاہیئے قومی سیاست کا تابع فرمان بنا لیا گیا ہے اور اسے ہر جائز اور ناجائز قومی اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جاپان میں تو مذہب نے ایک عجیب قسم کی جارحانہ قومی شکل اختیار کر لی ہے۔ وہاں کے بادشاہ کو نہ صرف خدا کا نمائندہ بلکہ تقریباً خدا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے احکامات کی بلا چون وچرا اطاعت کی جاتی ہے۔ اس اندھے یقین کی بنا پر جاپانیوں میں حد درجہ قومیت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کا یہ جذبہ ایک انسانی نصب العین کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

ہندوستان میں مذہبی جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے لیکن اس جذبہ نے یہاں ایک غلط راہ اختیار کر لی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ باہم انسانوں کو متحد کرے جو دراصل مذہب کا مقصد ہے یہاں اس کے غلط تصور کے باعث لوگوں میں تعصب پیدا ہو گیا ہے۔ اس تعصب اور کوتاہ نظری کے باعث یہاں ہندو اور مسلمانوں میں آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ دیگر اسلامی ممالک مثلاً ایران اور ترکی وغیرہ یورپ سے بہت کافی متاثر ہو چکے ہیں اور غلط مذہبی تصور کے برخلاف وہاں اس قدر ردعمل ہوا ہے کہ مذہب کے صحیح تصور کا بھی اثر کم ہو رہا ہے۔

(۷)

تمدنِ انسانی پر ہم نے جو ایک سرسری نظر ڈالی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معاشی زندگی ہو

یا سیاسی، اخلاقی ہو یا جمالی، مذہبی ہو یا روحانی، اس وقت ایک عجیب خلفشار میں گھری ہوئی ہے۔ رات کی تاریکی اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہے۔ تمدن انسانی کے انتشار کی سب سے بڑی مظہر موجودہ ہیبت ناک جنگ ہے لیکن رات جب انتہائی تاریک ہو جاتی ہے تو اُس وقت سے اس کا زوال بھی شروع ہو جاتا ہے۔ نصف شب کے گزر جانے کے بعد صبح کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت گو کہ انسانیت شب کی انتہائی تاریکی میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے لیکن اسی تاریکی ہی میں سے اب کچھ طلوع صبح کے آثار بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔

طلوع صبح کے یہ آثار اس وقت عوام اور سیاستدانوں، حکام اور اہل زر کے دلوں میں نہیں پائے جا رہے ہیں بلکہ شعرا اور ادبا کے حساس دلوں میں پائے جاتے ہیں بعض بعض قومی رہنماؤں کے دلوں میں بھی یہ تصور اب جاگزیں ہونے لگا ہے۔ اس وقت ایک ایسی شاعری کی ابتدا ہو رہی ہے جو انسانیت کا تصور پیش کرتی ہے جو انسانیت کو دوبارہ اخوت اور بھائی چارے کا سبق دینا چاہتی ہے۔ جو اس کو دوبارہ اُس کی روحانی بنیادوں کی طرف رجوع کرنا چاہتی ہے جو انسانیت میں ظلم و سرکشی کی جگہ محبت و رفاقت کی کارفرمائی دیکھنا چاہتی ہے۔ اسی قسم کی شاعری کے سب سے بڑے نمایندے اقبالؔ اور ٹیگور ہیں۔ اقبالؔ نہایت بلند آہنگی اور جوش سے انسانیت کو محبت کی دعوت دیتا ہے۔ ٹیگور نہایت نرم اور میٹھے سروں میں اس کو اس طرف مایل کرنا چاہتا ہے۔ انگلستان میں ایک عالمگیر انسانیت کا تصور پیش کرنے والے ادیب برنارڈ شا اور ویلز ہیں۔ شا اشتراکیت کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ویلز دنیا کی ایک متحدہ ریاست کا خواب دیکھتا ہے۔ فرانس میں روماں رولاں، جرمنی میں ٹامس من، روس میں گورکی اسی تحریک کے حامل ہیں، ترکی ادب میں خالدہ ادیب خانم اسی انسانیت کے نصب العین کی ترجمانی کر رہی ہیں۔

اہل سیاست میں گاندھی جی اور ابوالکلام آزاد ہندوستان میں اسی نصب العین کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں لیکن ان کی کوششیں اس وقت تک عملاً بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہندوستان آزاد نہ ہو۔ ترکی کی موجودہ پالیسی کلیتاً انسانیت کی دوستی پر مبنی ہے وہ خود کسی لڑائی میں حصہ لینا نہیں چاہتا بلکہ اس کا خواہشمند ہے کہ وہ دنیا میں امن و امان قایم کرے جس طرح کہ اس کے صدر عصمت انونو کے اعلانات

سے ظاہر ہوتا ہے تقریباً تمام عالم اسلام کی پالیسی امن وامان پر مبنی ہے لیکن چونکہ وہ خود آزاد نہیں ہے اس لیے اس کی کوششیں زیادہ موثر نہیں ہیں۔

غرضکہ نفس انسانی میں موجودہ حیوانیت اور بربریت کے خلاف ایک ردعمل شروع ہوگیا ہے۔ اس کے نفس میں ایک انقلاب تدریجاً لیکن یقینی طور پر پیدا ہو رہا ہے۔ اسی نفسی انقلاب کے خارجی مظاہرات وہ عالمگیر ادب اور شاعری ہیں جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں اور جس کے حامل یہ چند صفحات بھی ہیں جو اس وقت پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کی مظہر وہ مختصر کوششیں بھی ہیں جو اس مقصد کے حصول کے لیے بعض جگہ کی جا رہی ہیں لیکن اس وقت تک کوئی عالمگیر تحریک کا منظم وجود نہیں ہے اور جو کچھ خفیہ کوششیں کی گئی تھیں وہ بھی اقوام کی خود غرضیوں کے باعث تباہ ہو چکی ہیں۔

انسانیت کی تحریک کو وسیع اور منظم کرنے کے لیے تمام دنیا کے انسانوں کی معاشی، سیاسی، تعلیمی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تنظیم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم ان خارجی مظاہرات کے داخلی محرکات کو نہ سمجھ لیں۔ ان تمام محرکات کا اصل اور حقیقی سرچشمہ نفس انسانی ہے۔ ہم جب تک نفس انسانی سے کلیتاً واقف نہ ہوں ہم اس میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتے اور جب تک داخلی انقلاب نہ ہو خارجی انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جدید انسانیت پیدا کرنے کے لیے زندگی کی ایک طرح نو ڈالنے کے لیے ہم کو نفس انسانی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس کی مختلف صلاحیتوں کو سمجھنا چاہیے۔ نفس انسانی کے اس علم کی بنیادوں پر ہم جدید انسانیت کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر سکیں گے اور اس کو ایک نئی زندگی دے سکیں گے۔ احیائے انسانی کے لیے نفس انسانی کے علم کی از بس ضرورت ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لا یغیر بقوم حتی یغیر بانفسہم	خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنے نفس میں انقلاب نہ پیدا کرے

ڈاکٹر عبدالحمید قاضی ایم اے پی ایچ ڈی

خطبۂ صدارت

(یہ خطبہ بیسویں ثانوی تعلیمی کانفرنس یو۔پی منعقدہ میرٹھ کے شعبۂ اردو میں پڑھا گیا)

خواتین وحضرات

میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی کانفرنس کی صدارت کے لیے یاد کیا۔ ہماری زندگی کچھ اس طرح خانوں میں بٹ گئی ہے کہ ایک ہی پیشہ اور ذوق کے لوگ بھی مشکل سے ایک جگہ جمع ہو پاتے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معلموں کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ اسکولوں اور مدرسوں کے استادوں سے مل کر تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ ان کی سن سکیں اور اپنی کہہ سکیں۔ تاکہ دونوں کو فایدہ ہو اور دونوں کا رشتہ مضبوط رہے۔ میں اسی خیال سے آپ کی دعوت قبول کر کے یہاں حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی مشکلوں اور آسانیوں، آپ کی پابندیوں اور آزادیوں کو بہتر طور پر سمجھ سکوں اور شاید اس میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تجربہ کی روشنی میں آپ کو کچھ مدد دے سکوں۔ مجھے آپ کو کوئی رائے نہیں دینا ہے میں اس کا حق نہیں رکھتا۔ آپ سے بعض گزارشیں کرنی ہیں۔ اگر آپ نے انھیں توجہ اور دلچسپی سے سنا تو میں آپ کا ممنون ہوں گا اور اپنے طور پر ان سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش کی تو یہ میری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

خواتین وحضرات

شاید آپ مجھے یہاں بلا کر تھوڑے سے پشیمان ہو رہے ہوں۔ آپ کو اندیشہ ہو کہ میں آپ کے سامنے اردو کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کر کے آپ کو اور الجھن میں ڈال دوں گا یا اردو، ہندی، ہندوستانی کے مسئلہ کے سلجھانے یا بالفاظ دیگر الجھانے کی کوشش کروں گا۔ یا تحقیق و تنقید کے مغربی اصولوں سے آپ کو مرعوب کرنے کی کوشش کروں گا لیکن آپ اطمینان رکھیے میرا یہ ارادہ نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کی کانفرنس کا کام یہ نہیں ہے کہ تحقیقی و تنقیدی مسائل کے حل تلاش

کرسکے یہ کام دوسرے ادارے بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔ آپ کا کام تو ہماری درسگاہوں میں اردو کی تعلیم کی بحیثیت زبان اور بحیثیت ادب کے نگرانی کرنی ہے۔ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ ثانوی مدارس میں جو زبان سکھائی جاتی ہے وہ سیکھی بھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ دوسرے الفاظ میں زبان سکھانے کا طریقہ صحیح ہے یا غلط، نصاب کی تدوین جن اصولوں پر ہوئی ہے وہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ جو طالب علم ان مدرسوں سے نکلتے ہیں انھیں صحیح اردو بولنا اور صحیح اردو لکھنا آتا ہے یا نہیں۔ وہ جب کسی سے اختلاف ظاہر کرتے ہیں تو یہ تو نہیں کہتے کہ اس میٹر میں آپ کے فادر کی اوپی نین Opinion کے Entirely against ہوں۔ وہ جب لکھتے ہیں تو ان کا املا غلط تو نہیں ہوتا۔ ان کی تحریروں میں موٹے موٹے ثقیل الفاظ میں اپنی کم فہمی کو چھپانے کی کوشش تو نہیں کی جاتی۔ وہ اپنی درسی کتابوں میں سے جملے کے جملے نقل کرنے کے عادی تو نہیں ہوتے۔ وہ قواعد کی موٹی موٹی غلطیاں تو نہیں کرتے۔ وہ اپنی زبان بولنے یا لکھنے میں شرم تو محسوس نہیں کرتے۔ اور آپ کا کام صرف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جب سے اردو ثانوی مدارس میں ذریعہ تعلیم اور ذریعۂ امتحان ہوئی ہے اس وقت سے آپ کے فرائض اور بڑھ گئے ہیں۔ اب آپ کو وہ سب کام کرنے ہیں جو در اصل شروع سے آپ کو کرنے تھے مگر ایک غلط ذہنیت کی وجہ سے آپ سے چھین کر انگریزی کے معلموں کو دے دئے گئے تھے۔ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ یا جغرافیہ اردو میں پڑھانے والوں کو کوئی دشواری اصطلاحات کی وجہ سے پیش تو نہیں آتی۔ آپ کو محض علمی نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیتے رہنا ہے کہ ذریعہ تعلیم اردو ہو جانے سے طلبا کی ذہنی استعداد پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ آپ کو ان لوگوں کو جواب دینا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اردو میں تعلیم ہونے سے انگریزی کمزور ہو جاتی ہے۔ مختصر طور پر اس انقلاب سے جو حال ہی میں ہوا ہے آپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ پہلے تو آپ کے مدرسوں میں اردو کی حیثیت ایک نیچ ذات یا اچھوت کی سی تھی۔ آپ کا کام یاد کر وہ بچے اور معنی اسے زیادہ نہ تھا۔ اردو کے استاد کی حیثیت سے آپ گویا سیڑھی کے سب سے آخری زینہ پر تھے اور پھر ذرا سی کش مکش ہوا ہے کہ زمین پر آ رہنا یقینی تھا۔ آپ کی تنخواہوں میں اور آپ کے دوسرے رفیقوں کی تنخواہوں میں کوئی نسبت نہ تھی۔ آپ کے کام میں اور دوسروں کے کام میں کوئی مناسبت نہ تھی۔ آپ فارسی اور عربی

کے استادوں سے بھی گئے گزرے سمجھے جاتے تھے۔ مگر اب یہ صورت بدل گئی ہے۔ یہ تو آپ کا کام ہے کہ جہاں جہاں اس تبدیلی کے اثرات پوری طرح محسوس نہیں ہوئے وہاں انھیں پھیلائیں اور ان کا احساس دلائیں۔ جہاں یہ تبدیلی ہی رونما نہیں ہوئی وہاں اس کے لیے جد وجہد کریں۔ اردو پڑھانے والوں کی تنخواہیں سارے صوبے کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں دوسرے مضامین پڑھانے والوں سے کم نہ ہوں۔ ان کا درجہ ان کی حیثیت، ان کی قدر و منزلت ویسی ہی ہو جیسی انگریزی کے اساتذہ کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے آپ کی کانفرنس کو عملی جد وجہد کرنی پڑتی ہوگی اور ابھی اور کرنی پڑے گی۔ مجھے امید ہے کہ اس میں آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ آپ کے مطالبے حق اور انصاف پر مبنی ہوں گے اور حق اور انصاف کو لوگ کچھ عرصے تک دبا سکتے ہیں کچل نہیں سکتے

مگر صرف قرار دادیں پاس کرنے اور حکومت کو توجہ دلانے اور جلسے کرنے سے یہ کام پورا نہ ہوگا اس کے لیے آپ کو بار بار اپنا بھی سختی سے احتساب کرنا ہوگا۔ اپنے پیشے سے محبت بلکہ اس سے عشق پیدا کرنا ہوگا۔ زبان و ادب کا علم ہی نہیں بلکہ اس کا ذوق بھی حاصل کرنا ہوگا۔ قواعد سے واقفیت اور عربی فارسی الفاظ کے معنی ہی نہیں، شعر و ادب کا اعلیٰ مذاق بھی سیکھنا ہوگا۔ ادب کی تعلیم کا مقصد کیا ہے اس تعلیم کا رشتہ دوسرے مضامین سے اور بحیثیت مجموعی ثانوی تعلیم کے نظام سے کیا ہے اور اسے کس طرح استوار کرنا ہے یہ اور اس قسم کے بہت سے سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوں گے اور آپ کو ان کا جواب دینا ہوگا۔ آئیے اس سلسلہ میں میں آپ کی کچھ مدد کروں اور اردو زبان اور اردو ادب دونوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو مسایل پیدا ہوتے ہیں ان کا نقشہ پیش کروں۔

اردو کی تعلیم کے سلسلہ میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ہم ثانوی مدارس میں کس قدر اردو سکھانا چاہتے ہیں۔ اگر ہمارے ابتدائی مدارس اچھے ہوتے تو ہمارا کام بہت ہلکا ہوتا۔ کیوں کہ طالب علم ثانوی مدارس میں داخل ہوتے وقت اپنے خیالات کا اظہار تقریر و تحریر میں کر سکتے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے اور اس لیے ثانوی مدارس میں آپ کو وہ کام بھی کرنا ہے جو اس سے پہلے کرنے کا تھا اور اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ آئندہ کے کام میں مدد ملے یا سہولت

ہو۔ اگر ہمارے نظام تعلیم میں ہر بچے کی صلاحیت دیکھی جاتی تو ثانوی مدارس میں بہت سے مضامین
بے ربط طریقے سے نہ پڑھائے جاتے بلکہ عمر اور استعداد کو دیکھتے ہوئے ان میں تفریق کی جاتی مگر شاید
پھر بھی ہمارے صوبے میں ان میں سے ہر مدرسے میں اُردو زبان اظہار خیال کے ایک ذریعہ کی حیثیت
سے ضرور پڑھائی جاتی کیونکہ یہی اس صوبے کی مادری زبان ہے۔ مگر موجودہ حالات میں بھی،
جبکہ سب ثانوی مدارس ایک قسم کے ہیں، اور کہا جاتا ہو کہ ان میں ایک قسم کی ادبی تعلیم دی جاتی ہو ہمارا
یہ ضرور فرض ہے کہ صحیح اور اچھی اُردو لکھنا اور بولنا سکھائیں۔ آپ کہیں گے کہ اتنی سی بات کے لیے اس
قدر تمہید کی کیا ضرورت تھی مگر ذرا غور سے دیکھیے تو یہ صحیح اور اچھی اردو اتنی آسان اور اتنی عام نہیں ہو
جتنی آپ سمجھے ہیں۔ یہ زبان آپ اسی وقت سکھا سکیں گے جب آپ اُردو زبان کو ایک آزاد،
مستقل اور ترقی یافتہ ہندوستانی زبان کی حیثیت سے دیکھیں۔ میرا خیال ہو کہ ہمارے مدرسوں میں
اب تک اردو کو فارسی، عربی کا ایک ضمیمہ سمجھا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہو کہ جب مشرقی زبانوں کو بچانے اور
محفوظ رکھنے کا سوال پیدا ہوتا ہو تو ان میں اردو بھی شامل کر لی جاتی ہو۔ ممکن ہو کہ آپ میں سے
بہت سے اسے ایک آزاد، مستقل اور ترقی یافتہ زبان سمجھتے ہوں اور اسی حیثیت سے اس کی تعلیم
دیتے ہوں مگر کیا آپ اسے ایک ہندوستانی زبان کی حیثیت سے بھی پڑھاتے ہیں۔ اردو کی تعلیم
اور اردو کی اشاعت کا مسئلہ ہندی کی مخالفت کے مترادف نہیں ہو۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہو وہ
ہندی اور متعلقہ زبانوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتی بلکہ ہندی سے ابھی اردو کو اور قریب ہونا چاہیے
ہندی سے قریب ہونے کے معنی ہندی میں ضم ہو جانے کے ہرگز نہیں ہیں اور کم از کم میں تو اس کا تصور
کر ہی نہیں سکتا کہ زندہ زبان کبھی بھی دوسری زبان میں ضم ہو سکتی ہو یا کی جا سکتی ہو۔ میرا مطلب تو صرف
یہ ہو کہ اردو کو ہندوستان کی ایک زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے صرف ایک فرقہ کی زبان کی
حیثیت سے نہ پڑھایا جائے۔ میرا عقیدہ ہو کہ یہ کسی ایک فرقہ کی زبان نہیں ہو بلکہ ہندوستان کے ان
تمام باسیوں کی زبان ہو جو اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں اور جو اسے بولنے اور لکھنے میں فخر محسوس
کریں۔ وہ لوگ ہمیشہ بدنصیب ہیں جنھوں نے ان کی گود میں آنکھ کھولی تو اسی زبان کی لوریاں

سنیں مگر جب آپ بڑے ہو کر اسے سمجھنے، بولنے اور لکھنے سے شرماتے ہیں۔ مجھے اس پر افسوس ہوتا ہے کہ اس صوبے میں کچھ ہندو روز بروز اس اردو زبان کو چھوڑتے جاتے ہیں جو ہم سب کی مشترکہ زبان ہے ایک حد تک اس کی وجہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اردو کو اب تک صحیح طور پر نہیں پڑھایا گیا اور درسی کتابوں میں اس کی ہندوستانی حیثیت پر زور نہیں دیا گیا۔ لیکن جب میں ہندوستانی حیثیت پر زور دینا چاہتا ہوں تو میری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ رہے اردو وہ بدل کر کوئی اور زبان نہ بن جائے۔ اچھی اور آسان اور عام فہم زبان سکھائیے اور پڑھائیے تو ممکن ہے کہ یہ بڑھتی ہوئی خلیج کم ہو جائے یا کم از کم اس کا بڑھنا رک جائے۔

مگر ان درسگاہوں میں آپ کا کام صرف زبان کی تعلیم دینا نہیں، ادب سے بھی آشنا کرنا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہم اب تک ادبی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے رہے ہیں اور ہمارے نئے ثانوی مدارس کو لازمی طور پر صنعتی یا حرفتی بننا ہے اس لیے ادب کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ادبی تعلیم پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ شاعروں، ادیبوں اور پرانے دیوانوں کے متعلق معلومات فضول ہیں اور آج کل جب سائنس کی جدید ایجادات نے دنیا کو قیامت کا نمونہ بنا رکھا ہے ہمارا فرض ہے کہ سائنس کے تمام نئے آلوں سے مسلح ہو جائیں تاکہ دنیا میں ہمارا بھی کہیں ٹھکانا ہو۔ یہ لوگ شاعروں کی کثرت دیکھ کر اقبال کے الفاظ میں کبھی کبھی پکار اٹھتے ہیں کہ

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

یہ اپنی گفتگو میں اکثر دہراتے رہتے ہیں کہ شاعری بیکاری کا مشغلہ ہے۔ کبھی یہ لوگ اخلاق کے دیوتا بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا ادب العالیہ (classics) مخرب اخلاق ہے۔ مگر آج جبکہ جنگ کے شعلے اتنی تیزی سے ہر طرف بھڑک رہے ہیں ہمیں بنیادی باتوں اور ضمنی باتوں میں فرق کرنا ہے۔ آج بھی بنیادی چیز ٹینک اور ہوائی جہاز تیار کرنا نہیں ہے بلکہ جذبۂ انسانیت کی توسیع و تہذیب ہے۔ آج بھی یہ بات یاد رکھنا ہے کہ یہ خون کی ہولی جو آج کھیلی جا رہی ہے اس ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ایک خاص ادب کے ذریعہ سے خاص خاص قوموں کو سکھائی گئی تھی۔ آج بھی یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ موجودہ جرمنی کو نیٹشے نے پیدا

سب سے پہلے نیٹشے کی کتابوں میں دی گئی تھیں اور ان کا اثر اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوا تھا کہ وہ بڑی جاندار اور دلکش نثر میں لکھی گئی تھیں۔ آج بھی اس کا اعلان کرنا ہے کہ ابدی قدریں محض سپاہیوں کی قواعد سے نہیں بلکہ ادب اور تہذیب انسانی کے دوسرے سرچشموں سے ملتی ہیں یعنی بڑی چیزیں وہ نہیں ہیں جو آج نظر آتی ہیں بڑی وہی ہیں جنھیں آج لوگوں نے چھوٹا بنا رکھا ہے اور ان بڑی چیزوں کا مقابلہ بھی انھیں بظاہر چھوٹی چیزوں سے کامیابی سے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے جب کہا تھا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

تو یہ محض شاعرانہ خیال نہیں تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی۔ اس ذوق یقین کو پیدا کرنے میں اور اقبال ہی کے الفاظ میں "سے نوائے سینہ تاب" بنانے میں اور اس سے زندگی میں گرمی پیدا کرنے میں ایک معلم ہی سب سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے اور معلموں میں خاص طور سے ادب کا معلم امتیازی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ابدی قدریں۔ ادب ہی ایک نسل سے دوسری نسل کو زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ منتقل کر سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ادب کی صحیح تعلیم دی جاتی اور ادبی ذوق عام ہو جاتا تو ہمیں کشمیر میں خدا کی بنائی ہوئی جنت میں انسان کی بنائی ہوئی دوزخ نہ دکھائی دیتی۔ ہمیں پھر دیہات کی صبح اور دیہات کی شام کا وہ حسن جو شتر نے اپنے مضامین بیان کیا ہے۔ ایک بے رحم طنز نہ معلوم ہوتا۔ ہم ایک بے رحم آسمان اور بے پروا زمین کے نیچے کھوئے کھوئے سے نہ پھرتے۔ ہم خوبصورت چیزوں کو بدصورت اور بدقوارہ نہ کر دیا کرتے۔ ہم اعلیٰ جذبات کو اس آسانی سے نہ ٹھکراتے۔ ہم انسانیت کو اس قدر ذلیل نہ سمجھتے اور طاقت، حیوانی طاقت سے اس قدر مرعوب نہ ہوتے۔ ہم ساحل پر بے بس اور لاچار کھڑے اس کا انتظار نہ تکتے ہوتے کہ دیکھیں کوئی موج آئے اور ہمیں بہا لے جائے بلکہ خود دریا میں اترتے، موجوں کو آزماتے، طوفان کو دعوت دیتے، ڈوبتے، اچھلتے اور شاید اسی طرح اس پار بھی پہنچ جاتے جہاں امن ہے اور آزادی اور سکون لیکن ہم نے تو ادب کی تعلیم کا حقیقی مقصد سمجھا ہی نہیں یا ہمیں تو اس کے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ ہم کو تو شاید اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ادب کے شاہکار زندگی کے مسائل اور محرکات کو سمجھانے میں سائنس اور تاریخ کے خشک اور

علمی بیانات سے کہیں زیادہ کامیاب ہوتے ہیں" ہم نے حالی کا مرثیہ غالب کے متعلق پڑھا مگر یہ خیال نہ آیا کہ اس میں یہ بھی بتا یا گیا ہو کہ ادیب کس طرح دوسروں سے زیادہ اثر رکھتا ہو

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

اگر ہمیں یہ اندازہ ہوتا کہ انسان میں خوبصورت چیزوں سے متاثر ہونے کا جو جذبہ موجود ہے ادب اس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اگر ہم یہ مانتے کہ ایک مرصع یعنی مکمل شعر یا نثر کا ایک قابل قدر ٹکڑا ویسا ہی حسن رکھتا ہے جیسا ایک دلنواز لے یا ایک حسین نقش یا ایک پیاری صورت۔ اگر ہم محض دھندلے دھندلے طریقے سے یہ نہ جانتے بلکہ اس پر ایمان رکھتے کہ تخلیق کا جذبہ جو بچوں میں فطرت نے ودیعت کیا ہے محض توڑ جوڑ سے نہیں بلکہ اچھی نثر لکھنے یا اچھا شعر کہنے سے بھی ترقی کرتا ہے اگر مذاق کی بلندی، اخلاق کی پاکیزگی، احساس کی بیداری، انسانیت کی تہذیب، ہمیں واقعی عزیز ہوتیں، محض مہدی افادی کے الفاظ ہی "زطیفہ لب" نہ ہوتیں تو ہم ادب کی تعلیم پر اور زیادہ زور دیتے اور زیادہ زور سے یہ مراد نہیں کہ ہم صرف ادب ہی کی تعلیم دیتے بلکہ ادب کی صحیح تعلیم پر اصرار کرتے اور محض یونہی برائے بیت الفاظ کے معنی بتا کر، محاوروں کا استعمال سکھا کر، قواعد کے اصول ذہن نشین کرا کے مطمئن نہ ہو جاتے۔ اگر ادب کی اچھی اور سچی تعلیم ہوتی تو سستے اور پست ناولوں سے جن میں کوئی حسن اور کوئی معیار نہیں ہمارے نوجوانوں کو اس قدر دلچسپی نہ ہوتی۔ وہ اتنی آسانی سے ہر آنے والی رو میں نہ بہہ جاتے۔ ان کا ذہن خالی اور دل اداس نہ ہوتا۔ وہ ہر عزیز شئے کو ذرا سے فائدے کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ پرانی نسلوں کے مقابلے میں نئی نسل ذہن اور احساس تو بہتر رکھتی ہے مگر ہے چھوئی موئی کا پیڑ۔ وہ ذرا سی سختی سے تلے اوپر ہونے لگتی ہے۔ اس کا خیال اس کا ایمان ایک اوپری تہہ سے زیادہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں پچھلی نسل چونکہ ریاضت پر زور دیتی تھی۔ اصول صحیح نہیں رکھتی تھی مگر چونکہ محنت زیادہ لیتی تھی اور کام زیادہ جانفشانی اور شاید زیادہ خلوص سے کراتی تھی اس لیے وہ اپنے طالب علموں میں ایک صلابت ضرور پیدا کر دیتی تھی کیا کوئی صورت ایسی نہیں کہ ہمارے ادب کی تعلیم خیال کے لیے پختگی کا طالب ...

زیادہ آزادی دلائے۔ جو آنکھ بند کر کے تقلید کرنے کی بجائے اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھائے گو بے راہ روی سے بچائے رکھے۔ وہ حُسن کو صرف جنس نسوانی میں تلاش نہ کرے بلکہ کائنات میں جہاں تناسب موزونیت، اعتدال، توازن نظر آئے۔ وہ اس سے متاثر ہو جو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو کرے جو کبھی پست چیز پر قانع نہ ہو اور کبھی بدصورتی سے راضی نہ ہو مگر جو صرف امیروں کے شیش محل کے جگمگاتے نظاروں میں نہیں، غریبوں اور مزدوروں کے گھروں میں بھی۔ سادگی اور صفائی اور حسن پا سکے۔ جو محض شاعر ہو کر نہ رہ جائے بلکہ دنیا میں ہر چیز کی شاعری دیکھے۔ برتے اور سمجھائے۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

شاید آپ ان خیالی باتوں سے اکتا جائیں اور پوچھیں کہ ایسی تعلیم ہمارے اسکولوں میں کیسے دی جا سکتی ہے؟ آپ کا یہ سوال کچھ ایسا بے محل نہ ہوگا۔ مگر شاید آپ بھی اس سے انکار نہ کریں کہ حال میں اردو ادب کی کتابیں اس نقطۂ نظر سے بھی لکھی گئی ہیں کہ وہ ادبی ذوق پیدا کر سکیں۔ آپ کی جماعت میں تو شاید ایسے لوگ نہ ہوں گے جو اردو ادب میں ان کی صلاحیت نہ سمجھتے ہوں کہ وہ اعلیٰ ادبی معیار کے مطابق تعلیم دے سکے۔ اگر ہیں تو میں انھیں یاد دلاؤں گا کہ ہم حالی۔ اسمٰعیل میر حسن، نظیر اکبرآبادی، شوق، اقبال، جوش کی منظر نگاری، سودا کا شہر آشوب اور تضحیک روزگار اکبر کی طنزیات، میر درد، غالب، حالی، حسرت، فانی، جگر، اصغر کی غزلیں، چکبست کی وطنی شاعری انیس کے مرثیوں کی اخلاقی تعلیم، اقبال کے کائناتی۔ آفاقی اور انقلابی زندگی کے تصورات پریم چند کے اعلیٰ درجے کے ناول اور افسانے، سرشار کی مضحک مگر جیتی جاگتی تصویریں، سرسید، حالی، عبدالحق وحیدالدین سلیم کی سنجیدہ متین اور دیمی نثر کے خزانوں میں سے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں مدارج کے لیے سرمایہ نکال سکتے ہیں۔ اردو ادب اب تقلیدی، مصنوعی اور تنگ نظر نہیں رہا۔ اس میں زندگی کی حرکت اور روانی ہے۔ اس میں ہر طرف دروازے کھلے ہیں اور ہر طرف سے ہوائیں آ رہی ہیں۔ اس میں ہر تجربے کی گنجائش ہے اور ہر ادب سے کوئی اچھی چیز لینے کی صلاحیت۔ مگر یہ صرف مانگنے پر مجبور نہیں ہے

کچھ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور یہی ایک اچھے ادب کی خصوصیت ہو سکتی ہے۔

پچاس ساٹھ برس سے برابر اردو ادب کی پستی اس کے انحطاط اس کی تہی مائگی کا رونا رو دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگوں میں ایک عجیب احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔ اب وقت ہے کہ اسے دور کیا جائے۔ ہر ادب میں قوت پھیلنے اور بڑھنے سے آتی ہے۔ اردو ادب کی قوت اور صلاحیت کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے کہ پھیلنے اور بڑھنے کے عناصر برابر کام کر رہے ہیں۔ خصوصاً جنگ عظیم کے بعد تو اس کا سرمایہ اس قدر بڑھا ہے جتنا شاید پہلے کبھی بڑی سے بڑی مدت میں بھی نہ بڑھا ہوگا اسی وجہ سے آپ کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو جدید رجحانات سے باخبر رکھیں اور ادب کو صرف کتاب میں بند نہ کر دیں بلکہ زندگی سے اس کا متاثر ہونا اور زندگی پر اس کا اثر ڈالنا دیکھیں۔ آپ کے مدرسوں میں بہت تھوڑی سی توجہ سے اردو ادب کی کتابیں پڑھائی جا سکتی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کی وجہ سے ذہنی کاہلی کا شکار ہو جائیں۔ آپ کو کتابوں میں آپ کی ہدایت کے لیے اب ہر قسم کی مشقیں۔ نمونے کے سوالات، دروس کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ یہ نہ سمجھیئے کہ آپ کا کام محض کتاب پڑھا دینا ہے۔ آپ کو کتاب سے متاثر کرنا ہے۔ لکھنے والے کی تصویر لا کر سامنے کھڑی کرنی ہے۔ دل و دماغ پر ایک غیر فانی نقش چھوڑنا ہے۔ آپ کو کتاب خواں نہیں بلکہ صاحب کتاب بنانا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود کتاب خواں یا کتاب کے کیڑے نہ ہوں بلکہ صاحب کتاب ہوں۔ صاحب کتاب ہونے کے لیے عمر نوح کی ضرورت نہیں۔ خلوص اور ذوق کی ضرورت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ موجودہ نظام تعلیم کی بے اصولی، بے مرکزی اور طبقاتی تقسیم، بہت جلد آپ کا خلوص آپ کا ولولہ، خدمت کا جذبہ، حُسن کا ذوق چھین لیتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اُن قدروں کو بچائے رکھیں جو آپ نے استادوں کے مدرسے میں یا اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران میں سیکھی تھیں۔ مگر زندگی کا سخت اور تیز دھارا آپ کو بہائے جاتا ہے اور پھر آپ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو جگر نے اپنے ایک مصرع میں بیان کی ہے ؏

سینہ خالی، آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیئے

مگر شاید آپ کو اس سے کچھ تسلی ہو کہ یہ ہم سب کا حال ہے۔ ہم سب کے دل ویران ہیں، کوئی اُمنگ نہیں، کوئی آرزو نہیں، کوئی ولولہ نہیں، اگر ہے تو یا تو ایک سیڑھی اوپر پہنچ جانے کا یا اپنی جگہ کی حفاظت کرنے کا، اس نظام تعلیم نے ہمیں اس حالت کو پہنچا دیا ہے۔ سماجی حالات کی وجہ سے ایک شریف پیشہ ذلیل ہوتا جا رہا ہے جس کی کہیں سائی نہیں ہوتی وہ اسکول میں مدرس ہو جاتا ہے۔ مگر کیا جب تک یہ حالات نہ بدلیں۔ کیا جب تک تعلیم کو اس کی اصلی جگہ واپس نہ ملے ہمیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہیئے۔ ادب کے ایک خادم کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ اس روش کے مضر اثرات سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ یہ ذہنی موت ہوگی اور اس سے اپنے آپ کو ہر حال میں بچانا ہی ہے۔

برٹرینڈرسل کا قول ہے کہ قوت، جرأت، ذکاوتِ احساس، ذہانت پیدا کرنا تعلیم کا مقصد ہے ادب کی تعلیم سے اور اپنے ادب کی تعلیم سے یہ مقاصد بہتر طریقے سے پورے ہو سکتے ہیں۔ آپ کا ادب اگر قوت اور شوکت کا پیام نہیں تو مایوسی اور پناہ گزینی کا پیام پیش کرے گا۔ اس پناہ گزینی۔ اس بےبسی سے آپ کی ذہنی غلامی کی زنجیریں کتنی استوار ہوں گی۔ آپ میں حق بات کہنے اور حق بات سکھانے کی جرأت نہ ہوگی تو آپ کی زندگی میں اور آپ کے خیالات میں ہم آہنگی کہاں سے آئے گی۔ آپ جو کہیں گے اس پر یقین نہ رکھتے ہوں گے تو دوسرے کو کیسے یقین دلائیں گے۔ حالات ایسے ہیں کہ اس یقین کو کمزور اور بیکار کرنے کے لیے ویسے ہی سینکڑوں طاقتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اقبال کے کلام میں فقر و قلندری کی کیسی شان نظر آتی ہے اور ان کی زندگی سے جو واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کے یہاں یہ تلقین رسمی نہیں بلکہ اُن کے خونِ جگر سے لکھی گئی ہے۔ مگر مجھے اکثر درس کے دوران میں ایسے طلبا سے سابقہ پڑا ہے جو سمجھتے تھے کہ بھوپال سے پانسو روپے ماہوار لے کر فقر کی تلقین بے معنی ہے۔ آپ کو بھی ایسے تجربے پیش آتے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی وجہ سے خود آپ میں (cynicism) کلبیت پیدا ہو جائے۔ اور آپ اچھے اور بُرے شعر کو ایک ہی لہجہ اور ایک ہی آواز سے پڑھتے ہوں اگر آپ کے دل میں کبھی اقبال یا حالی یا اکبر کے کسی اچھے شعر سے کوئی تھرتھری نہ پیدا ہوئی ہو، اگر آپ کی نگاہ کے سامنے خیالات کی دنیا پر اندھے نہ کھڑی ہوئی ہو اور آپ تھوڑی دیر کے لیے

اس دنیا سے بلند نہ ہوگئے ہوں تو آپ اپنے طالب علموں کے احساس کو کیسے بیدار کرسکیں گے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یہاں تک کہ خدا سے انکار کر دینا بہت آسان ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز کو برتنا اور اچھی طرح برتنا بہت مشکل ہے۔ کاش سہل اور دشوار کے اس معیار پر آپ غور فرمائیں۔

خواتین و حضرات

میں نے آپ کا کافی وقت ضائع کیا لیکن مجھے یہی خیال تھا کہ آپ کی محبت اور عنایت کا شکریہ اس طرح ادا کرسکتا ہوں کہ اپنی سب سے عزیز متاع میں آپ کو شریک کروں مجھے اپنے ادب سے محبت ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی اس سے محبت ہوگی۔ ہم اس سے زیادہ کیا کرسکتے تھے کہ اسی کے متعلق تبادلۂ خیالات کریں۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے خیالات ادب کی تعلیم کے متعلق پیش کر دیے ہیں۔ جہاں تک اُن کا تعلق اسکولوں اور ثانوی مدارس کی زندگی سے ہے شاید ان سے آپ کا جذبۂ خدمت اور بیدار ہو اور ہم سب اس آنے والی نسل کو جو ہمارے ہاتھوں میں تربیت پا رہی ہے، اُردو ادب کے خزانے سے زیادہ فیض یاب کرسکیں اور اس کی شخصیت زیادہ شاداب، زیادہ پُرسوز اور زیادہ روشن ہوسکے۔ اس شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں کیا اقبال کا یہ تصور ہماری مدد نہیں کرسکتا۔

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا   یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا   شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر   اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

آج کی کانفرنس میں آپ اپنی سال بھر کی کوششوں کا جائزہ لیجیے، آیندہ کے لیے تدبیریں سوچیے، کوشش کیجیے کہ آپ کے نصاب کے بنانے میں، اس کے چلانے میں، اس کی کامیابی اور ناکامی کے پرکھنے میں خود آپ کا زیادہ حصہ ہو۔ امتحانات محض روپیہ کمانے کا ذریعہ اور بھرے پیٹوں کو بھرنے کا آلہ نہ ہوں۔ بلکہ وہ لوگ بھی اس میں حصہ لے سکیں جو اس تعلیم سے زیادہ واقف ہیں پھر آپ ان لوگوں سے اور زیادہ ربط پیدا کیجیے جو ابتدائی مدارس میں زبان کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ان کو مشورہ

دیجیے اُن کی رہنمائی کیجیے، ان کی معلومات سے فائدہ اٹھائیے۔ ان سے بچیے نہیں جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ وہ آپ سے کسی طرح بلند نہیں ہیں۔ صرف ان کا کام دوسرے قسم کا ہے آپ کی تعداد خدا کے فضل سے کافی ہوگی۔ اسے اور بڑھائیے۔ اپنی جماعت کو نمائندہ جماعت بنائیے اس لیے نہیں کہ آپ عہدوں پر قبضہ کر سکیں بلکہ اس لیے کہ خدمت کے اور افادیت کے راستے وسیع ہو سکیں آپ چاہیں تو ہمارے سارے صوبے میں اُردو ادب کی تعلیم بہت اچھی ہو سکتی ہے۔ آپ غفلت کریں تو کسی کے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت بندیوں کا اثر آپ پر نہ پڑے تو اچھا ہے آپ کی اردو زبان کسی کی سیاست کی پابند نہیں ہو نہ کسی ایک فرقہ کی زبان ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کی بے توجہی سے اس کی عمومیت پر اثر پڑے۔ کسی زبان اور ادب کے خادم اُس زبان کا حق ادا کریں تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ بھی یہ حق ادا کر سکیں۔

آل احمد سرور ایم اے

تعلیم اور موسیقی

حیات انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہو کہ ہمارے معاشرہ کی ذہنی شعور پذیری کے ساتھ ہی تعلیم کی اہمیت بھی تسلیم کرلی گئی۔ اسی لیے صدیوں سے ماہرین تعلیم بچہ کی دماغی صلاحیتوں، اس کے اساسی رجحانات، اس کے فطری نشوونما اور اس کے تربیتی امکانات کے نئے نئے تجربات کرتے رہے۔ اس تحلیل نفسی سے ان کا یہ منشا رہا ہو کہ بچہ کی جبلی صلاحیتوں کی ساخت و پرداخت ایسے اعلیٰ طریقہ پر کی جائے کہ اس کی روحانی، جسمانی اور دماغی ترقیوں میں ہم آہنگی قایم رہے۔

تعلیم کو موثر اور بامقصد بنانے کے لیے اس کو بچہ کی نفسیاتی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہو۔ اس کے لیے جہاں اور وسایل اختیار کیے گئے وہاں موسیقی کا نام بھی کبھی کبھی زبان پر آیا لیکن جیسا کہ ظاہر ہو اکثر اس کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ موسیقی جس زمانے اور جس قوم میں جزو عبادت رہی ہو، مثلاً یونان اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں میں، وہاں بھی اس کا مقصد روحانی ضبط کی تعلیم دینا تھا۔ غالباً اسی اثر سے موسیقی نے تدریجی اور غیر شعوری طور پر رفتہ رفتہ اپنی جگہ سماج میں پیدا کرلی۔ اور ممالک کی طرح قدیم ہندوستان کے نظام تعلیم میں بھی موسیقی شامل تھی۔ اسی طرح قدیم یونان میں بچوں کی تعلیم کے لیے موسیقی اور رقص ضروری سمجھا جاتا تھا۔ فلاطون کی ریاست میں ابتدائی تعلیم کے دوران میں تمام تر زور ورزش اور موسیقی پر دیا گیا ہو اور موسیقی کا مدعا روحانی بالیدگی قرار دیا گیا۔ اس باب میں فلاطون "آرٹ برائے آرٹ" کا بالکل قایل نہ تھا اور اسی لیے اس کے نزدیک موسیقی میں ایسی راگ راگنیوں کو دخل نہ ہونا چاہیئے جو جذبات کے نسائی حد تک نرم و نازک پہلو کو چھو سکیں بلکہ صرف وہ راگ اور گیت شامل ہیں جو ضبط نفس اور شجاعت کی تعلیم دیں اسی نوع کی اور مثالیں دوسرے تعلیمی نظاموں سے پیش کی جاسکتی ہیں اگرچہ یہ ممکن ہو کہ وہاں موسیقی اپنی نوعیت اور اہمیت میں مختلف نظر آئے۔

موجودہ دور میں کچھ دنوں سے ماہرین تعلیم نے موسیقی کو تعلیمی نظام میں جگہ دی ہو۔ ہر چند کہ اس کی جگہ کا

صحیح تعین نہیں ہو سکا۔ اس سے ان کا منشا لڑکوں اور لڑکیوں میں محض جمالیاتی ذوق یا اضافی تزئین پیدا کرنا نہیں ہو بلکہ موسیقی کے ذریعہ بچہ کی فطری صلاحیتوں کو ابھارنا اور چمکانا ہو۔ انھوں نے اس تجرباتی مقصد میں موسیقی کے واسطے سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہو تا کہ اس کے اثر سے بچہ کی خصوصیات کو تربیت پانے اور کام میں آنے کا موقع ملے اور وہ اس کے مستقبل کی تعمیر میں امداد کر سکیں۔

تعلیمی مسایل کے حل کرنے میں اگر ہم اکثر بڑے انکشافات کرنے میں کامیاب نہ بھی ہوں تو کم از کم دوسروں کے تجربات کی آزمایش تو کر سکتے ہیں کیونکہ بہر صورت اس سے ہمارا مقصد ایک ہی ہو۔ ہماری سب کی تمنا یہی ہوتی ہو کہ بچوں کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کر کے انھیں پھلنے پھولنے کا ایسا موقع دیا جائے جو آگے چل کر ان کو بہترین شہری اور بہترین انسان بنا سکیں۔

کیا بچہ کی نفسیات میں موسیقیاتی تجربہ کی گنجایش ہو؟ کیا موسیقی بچہ کا مستقبل سنوارنے میں کسی طرح کی امداد کر سکتی ہو؟ روانی اور ترنم (RyThm) کی حس کو بچہ کے اولین محسوسات میں شمار کیا جا سکتا ہو۔ یہ بہت چھوٹے بچوں میں بھی پائی جاتی ہو۔ شاید اؤں پر اس کا انکشاف ابتدائے آفرینش ہی ہو ا جب دنیا خود اپنے دور طفلی میں تھی۔ یہ ہمیشہ دیکھا گیا ہو کہ شیر خوار بچہ گھڑی کی ٹک ٹک ڈھول کی دَم دَم گھنٹی کی ٹن ٹن بہت خوش ہو کر سنتا ہو۔ اگر اس کی ماں اپنی محبت بھری گود میں لے کر اسے لوریاں دیتی یا کوئی سادہ گیت سناتی ہو تو اس کو تسکین ہوتی ہے ترنم کے اس احساس کی پرچھائیاں اپنی مختلف صورتوں اور حالتوں میں بچہ کی ساری زندگی پر چھائی رہتی ہیں یہ شعور آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا اور بڑھتا رہتا ہو اور مدرسہ میں یہ طریق عمل جاری رہتا ہو۔ ہمارا تخیل ہمیں ایسے مذہبی اداروں کی تصویر پیش کر سکتا ہو جہاں آج سے نہیں صدیوں سے بچوں کا عقیدت مندانہ گروہ اپنی معصوم صداؤں کو موسیقی کے پگھلتے اور بہتے ہوئے آتشیں دھارے کی شکل میں فضا میں پھیلا دیتا ہو۔ اتار چڑھاؤ کی دوسری مثال جو روزانہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہو کسی بچہ کا ریاضی سیکھنے میں گننا، جوڑنا یا پہاڑے یاد کرنا ہو۔ ترنم کی یہ حس اسی طرح کی ادبیاتوں سے بھی ظاہر ہوتی ہو۔

اسی طرح تناسب اور موزونیت کا تجربہ فنون لطیفہ کے مضامین میں ہو سکتا ہو یعنی موسیقی، آرٹ اور ادب میں اگر موسیقی کو تعلیمی نصاب میں شامل کر لیا جائے تو ان صلاحیتوں کی نشو و نما ہو سکتی ہو جو بچہ کی زندگی

ہو رکام پر بڑا اثر ڈالتی ہیں، یہ نشو و نما کیا ہے؟ گویا ترنم کے جذبہ کو ابھارنا تناسب باضابطگی اور ہمواریت کی حس کو ترقی دینا ہے اور یہ سب نہ صرف ہماری جسمانی حرکت، دستکارانہ کام اور ذاتی خصائل کے لیے مفید ہے بلکہ ہمارے تخیل کے لیے اس کا وجود ضروری ہے۔

جب ماں بچہ کے سامنے گاتی یا گنگناتی ہے تو اس کا مقصد صرف بچہ کو خوش کرنا ہوتا ہے اگرچہ وہ اس کے ترنم کی حس کی تسکین کر رہی ہے لیکن ایسے موقع پر اس کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ اس کا اس وقت کا گانا بچہ کے لیے نفع رساں بھی ہو سکتا ہے گرچونکہ وہ اپنے بچہ کو خوش دیکھنا چاہتی ہے اس لیے گاتی ہے اگر وہ خوش رہا تو ہنسی خوشی کھیلے گا اور سکون کے ساتھ سو جائے گا اور اس طرح اس کے دماغ اور جسم کو بڑھنے کا بہترین موقع ملے گا۔ مدرسہ میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر بچہ خوش ہے تو وہ ان چیزوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوگا جنھیں وہ پسند کرتا ہے اور ان چیزوں کو استعمال کرنے میں زیادہ سرگرم نظر آئے گا جو باوجود ضروری ہونے کے کچھ زیادہ مسرت بخش نہیں ہیں۔

اگر ہم بچوں کی اچھی موسیقی کی قدر اور سمجھ میں امداد کریں تو ہم ان کو ایک ایسے انمول خزانہ کا کھوج دے سکیں گے جو ان کی زندگیوں کو مالا مال کر دے گا۔ وہ موسیقی جس سے ہم محظوظ ہوتے ہیں ماہرین فن کی زندگی اور خیال کے تاثرات کا نام ہے۔ انسانی دماغ کے ایک گوشہ میں کم یا زیادہ جمالیاتی احساس ضرور پایا جاتا ہے اور یہی شعور رفتہ رفتہ ترقی پاکر زندگی پر چھا جاتا ہے اور ایک بات اس احساس میں یہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک گوشہ ہمیشہ اشیائے محسوسہ سے ملا ہوتا ہے جیسے سمندر میں گہرا جو باوجود بلند ہونے کے سطح آب سے ملا ہوتا ہے۔ یہ احساس حسن کیا ہے؟ والٹر پیٹر کا قول ہے کہ "حسن محض ایک انفرادی کیفیت کا نام ہے جس سے عام قیاس نہیں کیا جا سکتا"۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن ایک روحانی کیفیت کو کہتے ہیں جو اس تخیل اور تفکر کے باہمی امتزاج سے مرتب ہوتا ہے پس ہم جتنا اس حسن کو جو دوسری زندگیوں کی رگ وپے میں جاری وساری ہے۔ دیکھ اور محسوس کر سکیں گے۔ اسی قدر ہماری زندگی میں بالیدگی اور نمو کے امکانات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔ ایک چیز میں حسن پا لینے سے ہم میں دوسری چیزوں میں حسن کی تلاش اور انکشاف کرنے کی اہلیت اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اس طرح ہم خود بھی حسن کاری کی تخلیق کر سکیں گے پھر شاید دوسروں کی زندگیوں کی بھی حسین بنانے میں مدد کر سکیں۔ ہمارے بچوں کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو ان میں اس روحانی مسرت کی کیفیت سے پیدا ہوگی جس کو ہم جذبۂ حسن کی بیداری کہہ سکتے ہیں۔

مددا نبساط ہی زندگی کی رگوں میں گرم خون دوڑا کے جسمانی اور دماغی قوتوں کو سرگرم عمل بنا دیتا ہے۔

بچے مدرسہ میں زیادہ دنوں نہیں رہتے اور اس لیے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اس مختصر زمانہ میں انھیں آیندہ زندگی کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا ہے ان کو بنیادی اور ابتدائی باتوں سے ایک ذہنی واقفیت رکھنا ضروری ہے جس میں لکھنا، پڑھنا معمولی تصویریں بنانا، رنگ بھرنا، ریاضی اور سلائی کا کام شامل ہیں۔ یہ استاد کا فرض ہے کہ ان کاموں کی نوعیت اور تناسب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درجے اور مدرسے کی نوعیتوں کا پورا لحاظ رکھے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچہ سبق یاد کرنے اور اپنا کام کرنے میں اپنی قوتوں کا بہترین استعمال اسی وقت کر سکتا ہے جب اس کا جسم و دماغ تندرست و توانا ہو۔ بعض غیر دلچسپ اور بے رنگ مضامین کی گرانباری سے نجات دلا کر موسیقی تھکے ہوئے اعصاب کے لیے آسودگی بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے بچہ کی جسمانی نقل و حرکت میں مناسب موقع پر کام لیا جا سکتا ہے جب وہ کسی ڈرامائی کھیل میں تال کی لہروں کے ساتھ بہا جا رہا ہو۔ جب بچہ کا دماغ اس خیال کو سننے اور تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو جس کی تصویر موسیقی کے پردہ پر کھینچی گئی ہے تو موسیقی سُر کے اور آواز کے زیر و بم کے دوران میں موزوں وقفہ کا کام بھی دے سکتی ہے۔ یہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹی عمر کے بچے اس میں لَے سے واقف ہو سکیں اور بڑے بچے سروں میں ہم آہنگی پیدا کر سکیں۔ پانچ سال کا ایک اوسط درجہ کا بچہ عموماً طور پر نغمہ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اور اس میں کسی سادہ گیت کو ٹھیک ٹھیک دہرا دینے کی خاصی صلاحیت ہوتی ہے اگرچہ بچوں کے گیت کے گانے میں غالباً اس کو امداد دینے کی ضرورت پڑے گی۔ مگر اس میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیوں کہ اس منزل پر استاد یا استانی بھی بچوں ہی میں سے ایک ہوتے ہیں اور مدد اس طرح دی جاتی ہے کہ بچہ کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

علاوہ ان اوقات کے جو اس کے لیے مخصوص کیے جائیں، موسیقی بعض غیر دلچسپ اسباق کے دوران میں چند منٹ کے لیے دماغ کو تر و تازہ کر سکتی ہے خصوصاً کنڈرگارٹن کے طریقہ تعلیم میں یہ بعض سنجیدہ اور خشک چیزوں کو ذہن سے تھوڑی دیر کے لیے ہٹا کر دماغ کو کام کے دوسرے دقفہ کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس وقت بچوں کے گیت اور گانے کے کھیل فایدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ گانے سادہ اور آسان ہوتے ہیں اور لَے حرکت کا تقاضا کرتی ہے گیت ایسے انتخاب کرنا چاہئیں جن کی ڈرامائی حرکت میں بہت زیادہ طوالت نہ ہو۔

اور اسی طرح لے ایسی اختیار کی جائے جس سے دوسرے کمروں میں اور جماعتوں کا حرج نہ ہو۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا موسیقی میں بچہ کو سب سے پہلے کشش اس کے ترنم کی وجہ سے محسوس ہوتی ہو اگر مدرس بھی تکمیل سے قطع نظر کرلی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہو کہ بچوں کے گیت ہی سے ترنم کی رنگا رنگ دلفریبیاں اپنے رنگین پردوں سے نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ ترنم میں رنگ آمیزیاں اور تاثر کی بڑی گنجایش ہو اور اس لیے اگر ترنم کی تعلیم نہ دی جائے تو بھی کسی گیت کا بار بار گایا جانا اور بچہ کا اس میں شریک ہونا بچہ کو اس قابل بنا سکتا ہو کہ وہ اپنی دلچسپی کے لیے گانے بنا سکے یہی وہ طریقہ ہو جس سے ایک ماں اپنے بچہ کو سکھاتی ہو اور اگر ہم موسیقیاتی واقفیت اور لطف اندوزی کا عکس گہرا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کم از کم ابتدائی منزلوں میں ماں کا یہی طریقہ کام میں لانا پڑے گا۔ بچوں کے گیت کو بڑی اہمیت حاصل ہو۔ وہ اپنی ایک روایاتی اور رواجیاتی جگہ پیدا کر چکے ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا انھوں نے زمانہ کے انقلاب انگیز تھپیڑوں کا مقابلہ کیا ہو جو موسیقی یا سماج کی کیا بلکہ قوموں اور ملکوں کی صورت بدل ڈالتے ہیں۔ ان سے ہر ملک کے بچوں میں ایک مشترک دابستگی اور محبت پائی جاتی ہو۔ ان میں تیز روانی اور سادی میٹھی لے موجود ہو اور انھیں ڈراما ئی صورت میں آسانی سے تبدیل کیا جا سکتا ہو۔

اس ڈراما ئی اظہار کی بڑی قدر و قیمت ہو کیونکہ اس اظہار سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ بچہ کے لیے موسیقی کیا معنی رکھتی ہو؛ یہ عضلاتی حرکت پر قابو پانے میں امداد کرتی ہو جو خود ایک بڑی تربیت ہو کیونکہ موسیقی کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کے زمانہ میں جو کچھ ضبط نفس اختیار کیا جاتا ہو اس کا اثر دوسرے زمانہ پر بھی پڑنا لازمی ہو۔

جس طرح اس نغمہ اور الفاظ میں خوبصورتی ہو جس کی تمثیل بچے پیش کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی کوشش ہوتی ہو کہ نقل و حرکت میں بھی خوبصورتی پیدا ہو جب نغمہ خاموش ہو ان کو لازمی ہو کہ وہ بغیر دوسروں کو چھوتے ہوئے یا ان کے کام میں گڑبڑ پیدا کیے ادھر اُدھر ہلنے جلنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد عوام کے ناچ اور گانے زیادہ خوشگوار کھیلوں میں منظم اور خوش اسلوب حرکت کی شدید ضرورت ہو۔ یہ تیاری ناچ خوش اسلوبی اور صحت افزا ڈراما ئی حرکات کی تربیت میں کافی امداد کر سکتے ہیں۔ اس طرح خاص طور پر لڑکیاں بغیر کسی الجھن اور دشواری کے آزادی اور خوشنمائی سے حرکت کر سکتی ہیں اور زیادہ بڑی اور بھدی لڑکیوں کی اس طرح بڑی ہمت افزائی ہوتی ہو۔ نغمہ اور خیال جس کا الفاظ میں اظہار کیا جاتا ہو ان میں خوش اسلوب اور منظم حرکت پیدا کرنے کا ولولہ پیدا کر دیتے ہیں۔

بچہ کے گیت کی منزل کے بعد بچہ کچھ اور انکشاف کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں کچھ کچھ موسیقی کی ماہیت اور ہیئت سے واقفیت حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہ لحاظ کر سکتا ہے اونچے اور نیچے پردوں کا، تیز اور ہلکی، بلند اور دھیمی موسیقی کا اور یہ کہ باجہ کی گت دوہری ہے یا تہری یا چوہری؛ بعد میں ہم آہنگ سروں کے میل کی قدر اور شکل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ بچہ پوری موسیقی سے اس وقت لطف اندوز ہو سکے گا جب اسے واقفیت ہو جائے گی کہ گیت کے ٹکڑوں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔

گیت بحیثیت سبق کے بھی موسیقیاتی نصاب تعلیم میں خود اپنی جگہ رکھتے ہیں مگر گیتوں کو بلا مقصد سامنے نہ لایا جائے بلکہ انھیں بچہ کی نفسیات کی روشنی میں دیکھ لینا ضرور ہے اور ساتھ ہی ساتھ حال کی ضرورت اور مستقبل کی مصلحت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے گیتوں کو ان کے موضوع کے خیال سے یا کسی شعر کو ٹھیک کرنے کی مثال کے طور پر یا گیت کی نظم کے لیے یا اس کے ڈرامائی تناسب کا لحاظ کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ گیت بچوں کے مفید اسی وقت ثابت ہوں گے جب ان میں اس قسم کی باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ بچوں کو گانے اور غل شور مچانے کی ممانعت کر دی جائے جو ہر بچہ کی فطرت کا تقاضا ہے۔ قدرتی طور پر ہم سب کو اور خصوصاً بچوں کو اپنے پرانے من بھاتے گیت گانے سے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اگر گیت گائے جانے کے لائق ہوں تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو سامنے رکھنے کے لیے ایک خاص سبب اور مقررہ وقت ہو۔

ساز کی موسیقی کی جو تجرباتی قیمت ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے مدرسوں میں کسی طرح کا آلہ موسیقی رکھنا یا اس طرح کا کوئی مستقل انتظام تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ آواز اولین اور قدرتی آلہ موسیقی ہے اور تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں شاید سب سے اہم بھی ہم سب آوازیں رکھتے ہیں اور ان سے بہت کچھ کام بھی لے سکتے ہیں اور بچوں کے سامنے نظموں اور گیتوں کو پیش کرتے وقت آواز کا استعمال بہت ضروری ہے مثلاً بچہ سے یہ توقع کرنا لایعنی ہے کہ وہ بچوں کا گیت اس وقت سیکھ جائے جب وہ پیانو پر گایا جا رہا ہو آواز اس کے لیے وسیلہ کا کام کرتی ہے اور پیانو سے اس میں ٹھہرانے کا کام لیا جاتا ہے پھر بھی آلات موسیقی کی اہمیت اپنی جگہ باقی رہتی ہے بچوں کے دلوں میں مسرت کی لہریں دوڑ جاتی ہیں جب کسی آلہ موسیقی پر کوئی نغمہ چھیڑا جاتا ہے جب کوئی گت بجائی جائے تو بچے اسے خاموش معروفیت سے سنیں گے اور اس طرح وہ ان مختلف آلات کا اثر محسوس کر سکیں گے۔ وہ موسیقی کے رنگین ٹکڑوں کے ترنم، روانی اور اعادہ کو بھی ان سمجھیں گے اور کچھ دریافت بھی کر سکیں گے۔

سازکی موسیقی میں بچوں کے لیے اظہار کا ایک اور امکان بھی کیا جاتا ہے اور یہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کے لیے موزوں ہوگا۔ حال میں انگلستان میں پرکشن بینڈ (ایک قسم کا سازوں کا نغمہ) نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے اور مدرسوں میں اس کے تعلیمی افادہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مجیرہ، ڈھول، دف اور طنبورہ کا استعمال کرکے ہر لڑکی مشترک نغمائی اظہار میں اپنا اپنا کام دکھا سکتی ہے۔ وہ جذباتی طور پر لطف اندوز ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایسے کام میں اتحادِ عمل کرتی ہے جس کی کامیابی کے لیے مجموعی طور پر دوسروں کو اس پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ضبط درکار ہے۔ جو انفرادی اظہار میں اتنا ضروری نہیں۔ یہ مشترکہ کام کی ابتدا ہے اور اس طرح بچہ متفقہ جذبہ کی اصلی قیمت کو سمجھنے لگتا ہے اسکولی زندگی میں اس اشتراکِ عمل کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جزو، باوجود اپنے وجود کے ایک بڑے کل میں مل کر ایک موج کی طرح دریا کے بہاؤ میں سما جاتا ہے۔

اگر موسیقی کے تار ہائے رنگین انسانی زندگی کے تار و پود سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتے تو کیا ضرورت تھی کہ مدرسہ کے نصاب میں اس کو کوئی جگہ دی جائے یا تعلیمی وقت کا کچھ حصہ اس پر صرف کیا جائے۔ لیکن نغمہ زندگی کا ساز اور روح کی آواز ہے۔ موسیقیاتی ارتقا اور نمو آہستہ آہستہ نہ صرف اسکولی زندگی میں اپنا افادہ ظاہر کرتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کے اثرات مستقبل تک پہنچتے ہیں۔ تربیتِ نفس کی ایک مستقل قدر و قیمت ہے اور ضرورت ہے کہ اس کی ضیاپاشی سے زندگی کا ایک ایک گوشہ روشن ہو۔ ترنم اور تناسب (Rythm) صرف موسیقی تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثریت کا دائرہ بہت وسیع ہے اس کے عناصر عالمِ خاکی کے موسیقار ذروں سے مرکب ہیں جن کا اثر عدد، خاکہ، شعر اور نثر اور ہمارے اسکولی نصاب کے ہر حصہ پر پڑتا ہے۔ موسیقی میں حسن کی قدر شناسی دوسری چیزوں میں احساسِ حسن کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ تخیل کی دنیا میں ہی نہیں بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی ہم رنگ، شکل، آواز اور حرکت میں حسن کی تلاش کرنے لگتے ہیں۔ پھر موسیقی کی رنگا رنگی کبھی ایک ملک تک محدود نہیں بلکہ ہر ملک کا ایک مخصوص انداز موسیقی ہے اور جدا اسلوبِ بیان جس طرح ہم نغمہ سے اپنی قوم کے افراد کے کچھ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ یہی نغمہ دوسری قوموں کے کچھ خیالات ہم تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی ہمیں دوسروں کی زندگیوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انھیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور واقفیت اور قدر شناسی کی مدد سے ان کے دھندلے نقوش کو ابھار کر انھیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمن ایم اے

قدیم مصری ادب

تمام تہذیبوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اپنے خیالات و افکار کو ضبط کرنے کی اختراع سب سے پہلے مصریوں نے کی اور اس اعلیٰ فضیلت کا سہرا ان کے سر ہے انہوں نے طویل کاوش فکر کے بعد ایک کتابت ایجاد کی جو پتھروں پر کندہ کی جاتی تھی لیکن جب اور آگے چل کر فکری دائروں میں وسعت پیدا ہوئی اور انسانی ذہن نے وہ علوم و آداب ایجاد کیے جن میں یہ صلاحیت دیکھی گئی کہ انہیں دوسروں تک پہنچایا جائے اور ان کا سلسلہ معرفت وسیع ہو تو اس وقت ضرورت اس کی داعی ہوئی کہ ان پتھروں کی جگہ صحیفے ہوں چنانچہ اس حاجت کے انسداد کے لیے نباتاتی اوراق ایجاد ہوئے جن سے کتابت کی ایک بڑی مشکل حل ہو گئی۔ اس اہم اختراع نے دنیائے علم و ادب کے لیے ایک وسیع میدان کھول دیا اور ہر عالم ادیب اور مفکر اپنے خیالات کو بڑی آسانی کے ساتھ ضبط اور مدون کرنے لگا اور یہاں سے تصنیف و تالیف کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصر کی تہذیب و تمدن کے ساتھ یہ ادب بھی ترقی کرتا رہا اور آخر میں آ کر اس ساری جد و جہد نے ایک مستقل ادبی عمارت کی حیثیت اختیار کی جس میں کچھ تو اپیکورس اور خیام اسکول کا حصہ ہے۔ جہاں سراسر بزم و تماشا، ساقی و خمر اور رندی و ہوسناکی کا وجود ہے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی تعمیر روایتوں کے طریقہ پر کی ہے اور ہر جگہ زہد و تقشف اور روحانیت و خدا کی تعلیم دیتے پھرتے ہیں۔

مصری آثار کے محققین نے بہت سے نباتاتی اوراق صحیفے پائے ہیں جن میں کچھ تو حکایات و قصص

میری جان تم جب دور ہوتے ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے [illegible] جیسا کہ

دراز ہوں اور ایسا کیوں نہ ہو! بتاؤ کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو!

نیچے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ فاختہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے صبح کو اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا۔

کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ نیز ان کا یہ عقیدہ تھا کہ علم الحساب کا موجد بھی توت ہی ہے اور شمس و قمر، نجوم و کواکب کے فاصلوں کی تحدید اور ان کے احوال و کوائف سے معرفت و آگاہی کی بنیاد بھی اسی نے رکھی ہے۔ اور علم الفلک کا پہلا عالم بھی وہی ہے۔ المختصر ان کے عقاید کے لحاظ سے توت تمام آداب و حکم اور سارے ارضی و سماوی علوم کا خدا تھا اور انسان کی ہر گفتگو اور ہر نقش و کتابت کا موجد۔ اس کے علوم لامحدود اور اس کے معارف بے پایاں تھے۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ حقایق پر پڑتی تھیں۔ اسی عقیدے کی بنا پر کہ توت عارف الحقایق بھی ہے انھوں نے اسے موت کا قاضی القضاۃ مان لیا تھا۔ قدیم ناولوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسے یہ منصب جنت میں ملا تھا جبکہ اوزیریس اور اس کے بھائی ست میں ایک طویل مناقشہ چھڑ گیا تھا جس کی بنیاد یہ تھی کہ ست نے اپنے بھائی اوزیریس پر یہ اتہام رکھا تھا کہ اس نے بعض اہم جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفتیش توت نے کی اور آخر میں اپنا اٹل اور حق فیصلہ تمام خداوندوں کے سامنے پیش کر دیا کہ ست کے دعاوی غلط اور بے بنیاد ہیں اور اوزیریس کے اقوال بالکل صحیح اور سچ ہیں۔ یہیں سے مصریوں نے توت کے متعلق ایک اور خیال قایم کر لیا تھا کہ وہ قیامت کے روز ان کے لیے بھی وہی فیصلہ کرے گا جو اس نے روز اول اوزیریس کے لیے کیا تھا۔ قدیم ناولوں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ توت کی بہت سی کتابیں بھی تھیں جو تمام علوم پر حاوی تھیں اور ان کے خیال میں انھیں کتابوں کی وجہ سے مصر کو عالمگیر علمی شہرت بھی حاصل تھی۔ ان کتابوں کی تعداد ۳۶۵۲۵ کے قریب تبلائی جاتی ہے۔

مصری اپنے مصنفین کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہر مصنف کے اندر توت کی روح حلول کر آتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک علما سے بڑھ کر کسی اور کا مرتبہ نہیں ہوتا تھا۔ توت کی شکل اس طرح منقوش ہے کہ ایک آدمی ہے جس کا سر ابیس کے سر جیسا ہے اور اس کے ساتھ ایک بیوی ہے جس

یہ بھی ممکن ہے کہ یہی نعمہ دوسری قوموں کی نامی بے ایسے اہم مسئلے پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی ہمیں دوسروں کی زندگیوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انھیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور واقفیت اور قدر شناسی کی مدد سے ان کے دھندلے نقوش کو ابھار کر انھیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمن ایم اے

جو آج کل نشانات کی شکل میں، اہرام کی دیواروں پر منقوش پائی گئی ہیں۔ یہ نشانات اصل میں ہیروغلیفی عبارتیں ہیں جو پانچ اہرام کی دیواروں پر مکتوب ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اہرام شاہ ونیاس (۲۳۵۰ ق م) کے لیے بنایا گیا تھا جو پانچویں شاہی خاندان کا فرد تھا۔ بقیہ چار تیتا، پیپی، مرنرا اور پیپی دوئم کے لیے بنائے گئے تھے۔

یہ عبارتیں دینی ادب کی سب سے پہلی تصویریں ہیں اس لیے کہ جن عقاید کی طرف اشارہ کرتی ہیں ان کا زمانہ چھٹے خاندان سے ہزاروں برس پہلے کا ہے۔ رائج خیال یہ ہے کہ اسے مصری پنڈتوں نے جب قدیم زمانوں میں جب کتابت ایجاد نہیں ہوئی تھی، صالح اموات کے لیے دعاؤں کے طور پر ایجاد کیا تھا اور اسے ہر بادشاہ کی موت کے وقت پڑھا کرتے تھے ان دعاؤں کو ان کے دینی علما نے خوب یاد کر لیا تھا اور نسلاً بعد نسلٍ زبانی یاد کراتے چلے آتے تھے۔ مگر جب کتابت ایجاد ہو گئی تو مصریوں نے اس خوف سے کہ کہیں بھول کر ضائع نہ ہو جائیں۔ انھیں اہرام کی دیواروں پر نقش کر دیا۔

ان ہیروغلیفی عبارتوں سے جس طرح اور دوسرے غیر معروف تاریخی حقایق معلوم ہوتے ہیں اسی طرح بعض اولین قدمائے مصر کے دینی معتقدات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بایں ہمہ ان میں زندگی کی ایسی تصویریں اور عجیب و غریب تہذیبوں اور طرز معاشرت کے ایسے اشکال بھی ہیں جو اب تک اس متمدن دور میں بھی نہیں حل ہو سکے۔ یہ عبارتیں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ بادشاہوں کے لیے موت کے وقت اور موت کے بعد دعاؤں کے طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ تاکہ اس عالم میں اسے راحت و سعادت حاصل ہو اور وہاں بھی اسی طرح شہنشاہ رہے جس طرح وہ اس سے پہلے زمین پر تھا چنانچہ ان کے بہت سے دعائیہ نغموں کا خلاصہ یہ ہے کہ "تو شہنشاہ کی زندگی کو برقرار اور صحیح و سالم رکھ! تاکہ وہ وہاں بھی [illegible] جب [illegible] ایسا محسوس ہوتا ہے [illegible] جیسا کہ [illegible] دراز ہو اور ایسا کیوں نہ ہو؟ بتاؤ! کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو؟

نیچے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ فاختہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے مجھ کو اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا۔

عہد انقلاب | قدیم حکومت کی تباہی اور نئی حکومت کی تعمیر کا وقت عہد انقلاب کے نام سے معروف ہے۔ درحقیقت اس وقت ملک کی ساری فضا ایک انقلابی روح سے معمور تھی اور اس وقت کا منظر ایک اجتماعی انقلاب کی سچی تصویر تھا۔ اسی انقلاب کے پردے میں ایک اجتماعی انقلاب بھی پوشیدہ تھا جس کا ممتاز وصف یہ ہے کہ اس وقت ادب دین کی لامحدود بندشوں سے آزاد ہو گیا اور دوسرے اس وقت کتابت کی ایک پریشان کن مشکل بھی حل ہو گئی یعنی اب پتھر کے نقش و تصویر کو چھوڑ کر نباتات کے اوراق علوم و آداب میں استعمال کیے جانے لگے۔

اس دور میں مصری قوم کی بھی وہی حالت تھی جو انقلاب کے زمانوں میں اور اقوام کی ہوتی ہے یعنی سطوت و جبروت اور جاہ و حشم اور دنیاوی الجھنوں اور مشکلوں کو دیکھ کر ہمیشہ قومیں مذہب سے انحراف اور دین سے کنارہ کشی اختیار کرتی ہیں۔ مصر میں بھی اُس وقت یہی حالت تھی۔ دینی روح دلوں سے زائل ہو رہی تھی اور مذہبی قیود سے انحراف پیدا ہو چلا تھا۔ ان انقلاب سے ادب کا متاثر نہ ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ مصر کے اس انقلاب عظیم سے وہاں کا ادب متاثر نہ ہو لیکن اس طرح کے غیر مذہبی ادب کو اس وقت نشو و ارتقاء کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ہیراکلیوپولس (شاہان اسرۂ تاسعہ و عاشرہ) کے عہد میں اس ادب کو اچھا خاصا فروغ و انتشار حاصل ہوا اور اس وقت دبا لنے دل کھول کر بے روک ٹوک اپنے غیر مذہبی خیالات کا اظہار کیا۔ شاہ مریکارع کی تعلیمات نقد تجارت، اور حکایت فلاح وغیرہ اسی عہد کی چیزیں ہیں اور یہ تمام قصے اُس وقت کے ان سیاسی اور اجتماعی حالات کی سچی تصویر ہیں جن سے کہ ملک دوچار تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ اس دور کا ادب انقلابی اور انقلابی دور کا ادب ہے ہم اسی میں محلسرائے شاہ آنتف کے نغمات جیسی صدائیں بھی سنتے ہیں جن سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں ہیں

یہ بھی ممکن ہے کہ انتہائی الملک دوسری قوموں سے کچھ نہ ... حوادث کا مشئوم عکس بھی نہیں ہے۔

... بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی بھی ان دونوں کی زندگیوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انھیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور واقفیت اور قدر شناسی کی مدد سے ان کے دھندلے نقوش کو ابھار کر انھیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمٰن ایم اے

ذکر اور حیاتِ ارضی میں اخلاق اور خوش خلقی کی تلقین ہونے لگی۔ اس دور میں ملک کے اندر بعض خاص ادبی اسکول بھی قائم ہو گئے جو زبان و ادب کے دلکش اور انوکھے اسالیب ایجاد کرتے تھے۔ اس دور کے بعض عمدہ عمدہ قصے بھی حاصل ہوئے ہیں جن میں سنوحی اور غرقی ملاح کی حکایتیں خاصی دلچسپ ہیں۔ اسی طرح کے بعض دوسرے ادب مثلاً مرثیہ، لغات اور گانے، مواعظ و حکم وغیرہ بھی دستیاب ہوئے ہیں جو اس وقت کے وزرا اور نوابوں کے نام سے معنون ہیں۔

جدید عہدِ شہنشاہیت | پھر جب اس درمیانی حکومت کا دور بھی اختتام کو آیا اور نئی شہنشاہیت کا عہد شروع ہوا تو اس وقت کے ادب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سوسائٹی کے لحاظ سے آگے کو بڑھ رہا تھا۔ قدیم طرز سے منقطع اور پرانے قیود سے آزاد ہو کر ایک دوسری راہ پر آ رہا تھا جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس وقت ایک شہنشاہیت کے قیام اور دینی اصلاح کے لیے جس میں شاہ اخناتون نے بھی حصہ لیا تھا، خود مصریوں نے بھی جد و جہد اور کوشش کی تھی۔ اس رجحان کی تخلیق کے لیے انھیں اپنے اشہب تخیل و فکر کی عنان دوسرے میدان کی طرف موڑنی پڑی اور رنگ و اسلوب میں تبدیلی کرنی پڑی جس سے ان کا ادب قدیم راستوں سے ہٹ کر بہت دور نکل گیا۔ اس عہد کے ادب کا ایک اچھا منظر ان قصوں میں نظر آتا ہے جو آثار میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ یہ بچوں کے لیے لکھے گئے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم انھیں پڑھتے ہیں تو ہمیں ان میں وہ لذت ملتی ہے اور ان سے وہ احساس پیدا ہوتا ہے جو اس سے پہلے کے ادب کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتا۔

اس دور کا دینی و اخلاقی ادب | مصری ادب و فکر پر دین و مذہب کا اثر ایک ایسی چیز تھی جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوئی چنانچہ اس دور میں بھی اس طرح کے دینی ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے لیکن چونکہ

[illegible] ایسا محسوس ہوتا [illegible] آگے [illegible]

دراز ہوں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ بتاؤ کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو؟

نیچے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ فاختہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے [illegible] اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا۔

ایک جگہ اپنے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے ماں کے فرائض و واجبات کی طرف منعطف کرتا ہے:-

"اپنی ماں کو روٹی کا برابر کا حصہ دو اور تم اپنی ماں کا بوجھ اس طرح اٹھائے رہو جس طرح کہ وہ تمہارا بار مدتوں تک اٹھائے رہی۔ اس نے تمہیں مہینوں حمل میں رکھا اور اس کے بعد جب جناتب ہی تمہیں اپنی گردن پہ لیے پھرتی رہی۔ تین سال تک تم اس کے پستان سے دودھ کی دھاریں پیتے رہے اور طرح طرح کی گندگیوں سے اس کے جسم کو ناپاک کرتے رہے مگر اس نے کبھی اس کو ناگوار نگاہوں سے نہ دیکھا اور تم سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے بعد اس نے تمہیں مدرسے بھیجا تاکہ وہاں پڑھنا لکھنا سیکھو اور ان دنوں وہ ہر شام تمہارا گھر پر اچھے اچھے کھانوں اور فرحت بخش پانی سے انتظار کرتی رہی۔ مگر تم جب بڑھ گئے اور خود صاحب عروس و خانہ ہوگئے تو دیکھو ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ماں کو بھول جاؤ تمہیں ہمیشہ چاہیے کہ تم ماضی پر ایک نظر ڈال لیا کرو تاکہ وہ زمانہ تمہارے سامنے آجائے جبکہ تم اس کی عنایتوں کا مرکز تھے۔ ——— کیا تم اسے جائز رکھتے ہو کہ اپنی ماں سے اس طرح بے تعلق ہو جاؤ کہ وہ تمہیں برا بھلا کہے اور خدا کے دربار میں اس کے ہاتھ تمہاری خاطر بددعاؤں کے لیے اٹھیں —"

اس طرح کا ایک اور دلکش اخلاقی قطعہ ہے:-

"شہر کی غیر معروف اور اجنبی عورت سے بچو! کیونکہ وہ ایک ایسی گہری ندی ہے جس کی کوئی حد نہیں اور نہ کوئی انسان اس کے حدود سے واقف ہو سکتا ہے۔ لہذا کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے قدم اس عمیق دریا میں جا پڑیں! ——— اگر کوئی عورت تنہائی میں جبکہ

[illegible] پنے میں کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی ہمیں دوسروں کی زندگیوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انہیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور واقفیت اور قدر شناسی کی مدد سے ان کے بند لے نقوش کو ابھار کر انہیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمٰن ایم اے

یہ اس ادب کا ایک نمونہ جو اس وقت کے علما اور اصحاب دانش و فضل کی کاوش کا نتیجہ تھا ہم آج ان شہپاروں کی قدر و قیمت نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ دیر کے لیے گزشتہ عہد کا ایک منظر لے آئیں جبکہ انسان حضارت و مدنیت کے ابتدائی درجوں میں تھا تو اس لحاظ سے یہ قطعے ادب و فکر کے اعلیٰ نمونے معلوم ہوں گے، اور ان کا اسلوب بیان اور بلاغت کی خوبیاں بہت دلاویز اور دلکش دکھائی دیں گی

عشقیہ نغمے | اس دور کے اس دینی ادب کے علاوہ اس کے اور دوسرے پہلو بھی تھے چنانچہ اس عہد میں عشقیہ نغمات بھی رواج پا گئے تھے اور ایسے گانے ایجاد ہو گئے تھے جن میں حسن و عشق اور واردات و کیفیات محبت کا ذکر تھا۔ مگر یہ نغمات غالباً محض ایک حظ و سرور حاصل کرنے کے لیے ایجاد ہوئے تھے اس لیے کہ مصر میں ان کے گانے کا رواج عود و رباب کے ساتھ تھا۔

یہ مصری نغمے مکالمہ کی طرز کے ہوتے تھے جس میں ایک مرد اور عورت باہم تبادلۂ کلام کرتے تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی اور بہن سے خطاب کرتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مصر قدیم میں بھائی اور بہن کی شادی نہ صرف جائز تھی بلکہ بہترین جوڑ سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ دستور تھا کہ پہلے مرد گانے کو شروع کرتا تھا اور جب اپنا ٹکڑا ختم کر لیتا تھا تو عورت اپنا بقیہ حصہ گاتی۔ ذیل میں ایک نغمہ درج کیا جاتا ہے جس میں مرد نے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نیل کے صفحات سے گزرتا ہوا ممفیس کے پاس جاؤں گا، اور وہاں اپنی بہن ممفیس سے ملوں گا اس کے دلنواز بوسوں سے اپنے اندر سعادت حسن کی ایک لہر پاؤں گا جو رگ رگ میں دوڑ گئی ہو۔ وغیرہ وغیرہ اصل یہ ہے:-

"میں نیل کے صفحات سے گزرتا ہوا ممفیس کے پاس جاؤں گا اور میرے کاندھوں پر چادر ہو
میری بہن جب تک دور رہتی ہو تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] یکسانی سے
دراز ہوں اور ایسا کیوں نہ ہو؟ بتاؤ! کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو؟

نیچے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ فاختہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے صبح کو اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا:-

بتاج کے سامنے ایک درخشاں اور چھلکتا ہوا جام رکھا ہے۔

"پھر جب میں اپنے گھر میں بیدار ہوں گا تو زخمی مریض کا سوانگ بھروں گا اس وقت میری عیادت کو میرے درمند ہمسایے آئیں گے۔ انھیں میں میری بہن بھی ہوگی جو میرے حق میں اطبا سے بڑھ کر شفا بخش ہے اس لیے کہ وہ مقام مرض سے خوب آشنا ہے۔ جب میں اسے آتا ہوا دیکھوں گا تو میرا دل بہجت و سرور سے مملو ہو جائے گا۔ میں اپنے ہاتھوں کو بڑھاؤں گا تاکہ اسے خود سے لگا لوں۔ جب وہ میرے پاس آجائے گی تو میرا دل پہلو میں مضطربانہ ڈھرکنے لگے گا اور اس وقت جبکہ میں اسے خود سے لگا لوں گا اور اس کے ہاتھ بھی میری طرف بڑھتے نظر آئیں گے تو مجھے ایسا محسوس ہوگا گویا میں 'بلاد ہنت' پہنچ آیا ہوں اور جب میں اس کے شگفتہ ہونٹوں کا بوسہ لوں گا تو معلوم ہوگا کہ میری رگ رگ میں شراب کی ایک سعید لہر دوڑ گئی ہے۔ حالانکہ میں نے شراب مس تک بھی نہیں کی ہے۔"

یہ مرد کا کلام ہے جو نہایت سادہ اور بے خم و پیچ محبت کے وجد و کیف کا آئینہ دار ہے۔ مگر آپ عورت کا کلام دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے کر و فن میں مرد سے مختلف ہے وہ اسے ابھارنے اور گرفتار عشوہ کرنے میں ہر اس وسیلے کو استعمال کر رہی ہے جس سے اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ ذیل میں جو نغمہ درج کیا جاتا ہے اس میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک عورت چڑیوں کے شکار کی عادی ہے اور ہر روز شام کو چڑیاں کو لے کر ماں کے پاس واپس آتی ہے مگر وہ محبت کے بعد اپنے محبوب کو چڑیوں اور ماں وغیرہ تمام پر ترجیح دے رہی ہے اور اس کے نزدیک یہ زیادہ افضل ہے کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ ہو اور صرف یہی نہیں کہ [illegible] یا کامیاب ہو سکے۔ اسی طرح موسیقی ہمیں دو محبوبوں سے علیحدہ نہیں کرتی بلکہ انھیں قریب سے قریب تر لے آتی ہے اور واقفیت اور قدر شناسی کی مدد سے ان کے نقوش کو ابھار کر انھیں اپنے اصلی روپ میں سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔

مقبول الرحمٰن ایم اے

اے محبوب بھائی! میرا دل تیری محبت کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے حالانکہ خود اپنے نفس سے کہتی ہوں کہ میں یہ کیا کر رہی ہوں؟ میں آتی ہوں اور اپنے ہاتھوں سے جال نصب کرتی ہوں صبح کو جنت کی تمام چڑیاں آسمان مصر پر نمودار ہوتی ہیں جن پر مُر کا خوشگوار روغن آویزاں ہوتا ہے۔ ان کے جھنڈ کا پہلا پرند دانے کی طرف بڑھتا ہے اور قریب آکر بادِ جنت کی ایک بہترین خوشبو ہوا میں بکھیر دیتا ہے۔ اس وقت میری پوری تمنا ہوتی ہے کہ کاش اس وقت ہم تم دونوں تنہا ہوتے اور اسے چھوڑ دیتے کہ نغمہ سرائی کرے اور ہم اس کے نغمات سے طرب اندوز ہوتے۔

میں اس وقت کتنی خوش وقت ہوتی کہ جب جال نصب کرتی تو تم بھی ہمراہ ہوتے تمہاری محبت مجھے اپنی طرف کھینچتی اور میں جال نصب کرنا بھی چھوڑ دیتی اور پھر جب میں شام کو اپنی ماں کے پاس واپس جاتی تو وہ مجھے چڑیوں سے خالی دیکھ کر پوچھتی کہ کیا آج تم نے جال نصب نہیں کیا؟ تو میں اسے کیا جواب دیتی! ـــــ نہیں میں تو خود تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ تمہارا بوسہ میرے دل میں حیات کے بے پناہ جذبوں کو بیدار کر دے گا۔ اس وقت میں آمون سے دعا مانگوں گی کہ اس حیات کو دائم رکھ!"

اے حبیب من! میرے دل کی تمنا ہے کہ میں تیرے مال و متاع کی سیدۂ منزلہ کی طرح مالک بنوں۔ میری باہیں تیری باہوں میں ہوں۔ اس وقت جب تیری محبت مجھ سے منقطع ہو کر دوسری طرف منعطف ہو جائے گی اور میں دل میں کہوں گی کہ آج میرا بھائی مجھ سے دور ہے تو مجھے ایسا محسوس ہو گا کہ گویا میں قبر میں ایک میت کی طرح دراز ہوں اور ایسا کیوں نہ ہو؟ بتاؤ! کیا تم میرے لیے زندگی و توانائی نہیں ہو؟

نیچے ایک دوسرا اور نغمہ ہے جس میں ایک دوشیزہ فاختہ کو خطاب کر کے کہہ رہی ہے جب اس نے اسے صبح کو اپنے میٹھے نغموں سے بیدار کیا۔

حامہ اپنی میٹھی صداؤں سے کہہ رہی ہے کہ کیا آج تو نہیں اُٹھے گی؟ نہیں اے حامہ! کیونکہ میں نے آج اپنے بھائی کو اس کے اپنے بستر پر پایا ہے۔ میرا دل سرور سے لبریز ہے اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ میں کبھی تجھ سے جدا نہ ہوں گا اور تیرا ہاتھ برابر میرے ہاتھوں میں ہوگا اور میں جہاں بھی جاؤں گا وہاں تو میرے ساتھ ہوگی۔ اس نے میرے دل کو بجائے الم کے لذت سے پُر کر دیا ہے۔"

ان نغمات کے علاوہ جو عشق و محبت کی کیفیات کے آئینہ دار ہیں ایسے نغمے بھی ملتے ہیں جو شکوہ و شکایت سے اور گلۂ جور و جفا سے پُر ہیں۔ ان کے علاوہ نظم کی ایک اور قسم پائی جاتی ہے جسے ہم تسبیب و تغزل سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس میں محبت کا بیان اور عورت کے حسن و جمال اور عضو عضو کی نسوانی نزاکت کی داستان سرائی ہے۔ اس تیسری قسم کے نغمات سے قدیم مصری مذاق کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاں عورت کے حسن و جمال کا معیار کیا تھا!

غنا اور حکایات نگاری | مصریوں نے جب کتابت ایجاد کی اس وقت سے ان کے کتاب اور مصنفین برابر اس کے اسالیب اور اسرار کتابت کے حامل رہے۔ انھیں حاملین کتابت کا ایک طبقہ ایسا ہوتا تھا جو حکومت اور ملکی ادارہ کے اعمال کا متولی ہوتا تھا۔ ٹیکس، زمینوں کی پیمایش و حساب اور حکومت کا میزانیہ نیز حکومت کے دیگر دفتری اُمور اسی سے متعلق ہوتے تھے۔ حکومت میں اس طبقہ کا ایک اہم درجہ اور مقام تھا اور وہ اپنے کاموں کو بڑی خوبی سے انجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ علما کا ایک طبقہ تھا جو اپنے فن کا خادم تھا اور علم و تدریس میں مشغول رہتا۔ ہمیں آج ایسے شواہد ملے ہیں جو قطعی طور پر ان کی خدمت علم و فن اور اس وقت کے بلند پایہ اسالیب پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جسے ہم مغنی اور حکایت گو کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ یہ طبقہ اپنی زندگی کو محض عام قوم کے لیے وقف کر دیتا تھا اس قسم کے ادب کا اثر ہمیں آج بھی جدید مصر میں نظر آتا ہے جبکہ رات کے پرسکون اور فرحت زا لمحات میں دیہات کے کسان حلقہ بنا کر اس قسم کے نغمات گاتے ہیں۔ اُن نغمات کو جسے ملاح اپنی کشتیوں میں اور کسان اپنے کھلیانوں میں گاتے تھے اور جن کو بعض قدیم مصری مورخوں نے

مقبروں کی دیواروں پر نقش کیا ہو اور مغنیوں کی تصویریں بھی ضبط کی ہیں جیسے "یوناموں کا سفر" میں جن مغنی رقاصاؤں کی تصویریں ہیں وہ بیشک وہی ہیں جو سربازار اپنے فن کا اظہار کرتی تھیں۔ اس طرح ایک شاعر کی تصویر ہو جو ایک شہر کے چوراہے پر منبر پر بیٹھ کر حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کر رہا ہے اس کے بارے میں اے آرمن صاحب کا خیال ہو کہ وہ ان شعرا کی تصویروں کا ایک نمونہ ہو جو اپنے فن شعر و غنا سے قوم کے عوام کو محظوظ کرتے تھے اور اپنے فن و کمال کی ستایش عامۂ قوم سے لیتے تھے نیز آرمن صاحب کہتے ہیں کہ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہو کہ مصر قدیم میں جن چیزوں کو ضبط کیا گیا وہ محض وہی ہیں جن کا تعلق شاہوں، نوابوں اور ان کے خواص اور حلقہ نشینوں سے تھا۔ وہ چیزیں نہ ضبط کی گئیں جو عوام کی زندگی اور ان کی دلچسپیوں کی آئینہ دار تھیں۔ اگر عوام کی زندگی کی تصویر ضبط کی جاتی تو یقیناً ان حکایت نگار شعرا کے نقوش بھی ہم تک پہنچتے جن کا مطمح و مقصود عوام ہوتے تھے اور وہ سڑکوں اور عام اجتماعوں میں ان کی زندگی کے واقعات اور گزشتہ ابطال و ملوک اور ساحروں کی حکایتوں کے ذریعہ ان کے جذبات و احساسات کو ابھارتے تھے۔ آرمن صاحب کا یہ بھی خیال ہو کہ مصر قدیم کے اکثر قصے جو ہم تک پہنچے ہیں وہ اس پر اچھی طرح دلالت کرتے ہیں کہ اس وقت بھی موجودہ طرز کے شعرا کا وجود تھا اس لیے کہ آج کل کے قبلی شعرا جن حکایتوں کو نظم کرتے ہیں وہ وہی ہیں جو ان تاریخی شخصیتوں سے متعلق ہیں جو شجاعت و کرامت اور اسی طرح کی دوسری خوبیوں میں مشہور تھیں اور یہ اغلب ہو کہ یہ واقعات جیلاً بعد جیل انھیں پرانے شعرا سے ان تک پہنچے ہیں۔ اس کے علاوہ بحث و آثار میں ایسے منظوم قصے بھی دریافت ہوئے ہیں جو تاریخی ہیں مثلاً عصر سیحی سے متعلق تمبیز کا قصہ، افریقیوں کے عہد سے متعلق نکتنبوس کا قصہ اور جدید شنشاہیت کے عہد سے متعلق قصے جیسے تحتمس سوم اور شاہ کوسی اپافیس کی حکایتیں اور پھر آخر میں مملکت متوسط کے قصے جیسے خوفو وغیرہ ان تمام سے معلوم ہوتا ہو کہ اس وقت ان حکایت نگار شعرا اور مغنیوں کا وجود تھا۔

قدیم مصری قصص | یہ ایک بہت وسیع موضوع ہو جس کی خاطر تنہا ایک کتاب درکار ہو اس لیے کہ مصر قدیم کے متعدد ادوار کے بے شمار قصے دریافت ہوئے ہیں جن میں بعض خدا اور ابطال و ملوک کے قصے ہیں۔

اور بعض خدائی جانور مثلاً گائے، سانپ اور مگر وغیرہ سے متعلق ہیں اور کچھ قومی زندگی کے واقعات قومی افراد کی داستانیں ہیں۔ ان میں سے ہر قصہ ایک جداگانہ نوع کی تحلیل و درس کا محتاج ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ مختصر الفاظ میں ان پر کچھ لکھا جا سکے۔ البتہ ایک چیز لائق ذکر اور قابل اہتمام نظر و فکر ہے وہ یہ کہ ادب مصر قدیم کے ایک مصری محقق جمال الدین الشیال لیسانس تاریخ (جامعہ مصر) کا خیال ہے کہ مشہور حکایات الف لیلہ ولیلہ اور مصر وسطیٰ کے عربی قصے قدیم مصری قصوں سے بہت حد تک متاثر ہیں صاحب مذکور نے بتلایا ہے کہ قدیم مصری قصۂ ملاح غریق اور قصہ سندباد البحری میں کہاں تک تشابہ ہے۔ اسی طرح الف لیلہ ولیلہ کا قصہ قمر الزمان یا قصۂ موسیٰ و یوسف قدیم مصری قصۂ دو حقیقی بھائی سے کس حد تک مشابہ ہے۔ اسی قسم کی انھوں نے ایک طویل فہرس تیار کی ہے اور کافی درس و تحقیق کے بعد قدیم مصری حکایتوں اور مصر وسطیٰ کے عربی قصوں میں باہم تعلق اور مماثلت کو واضح کیا ہے ہم یہاں پر اس فہرس کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتے ہیں۔

صدر الدین عظیم

سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء کا بجٹ

جمہوری حکومتوں کے ہر کام پر عوام یا ان کے نمایندوں کی جانب سے نکتہ چینی ہوا کرتی ہے مگر
نے سخت اعتراضات اور شدید نکتہ چینی بجٹ پر ہوتی ہے اتنی اور کسی چیز پر نہیں ہوتی۔ اور وجہ صاف ظاہر
لہ بجٹ کا سارا تعلق عوام سے ہوتا ہے اور وہ اس سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتے ہیں مثلاً نمک پر
ول بڑھا دیا جائے تو ہر وہ شخص جو نمک استعمال کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور دنیا میں شاید
ند مریضوں کے علاوہ جن کو ڈاکٹر یا طبیبوں نے نمک کھانے کی ممانعت کر دی ہو ہر مرد و عورت اور
پہ و بوڑھا نمک استعمال کرتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی مقدار بھی نمک استعمال کر رہا ہے غیر محسوس طریقہ پر حکومت
محصول بھی ادا کر رہا ہے۔ یہی حال اور دوسری چیزوں کا ہے۔ حکومت ہند کا بجٹ ہر سال مارچ کی پہلی تاریخ
وزیر مالیہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش کرتے ہیں۔ جہاں اس پر بڑا بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس زمانے
یں اخباروں، کانفرنسوں، انجمنوں اور جلسوں میں بھی اسی کا تذکرہ رہتا ہے۔ اس سال کا بجٹ اسمبلی میں
پیش ہو چکا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی بجٹ اور اس سال کے بجٹ پر ایک سرسری
نظر ڈالی جائے۔

ہندوستانی مالیہ مختلف درجوں اور منزلوں سے گزرتا ہوا موجودہ شکل تک پہنچا ہے۔ اس کی مختصر
کیفیت یہ ہے کہ سب سے پہلے سنہ ۱۸۵۹ء میں وزیر مالیہ کا تقرر ہوا اور سنہ ۱۸۶۰ء میں ہندوستان کا پہلا
موازنہ تیار ہوا۔ ابتدا میں برطانوی ہند کا کل موازنہ مشترک تیار ہوتا تھا اور ساری آمدنی اور خرچ
مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہتا تھا البتہ وہ صوبہ واری حکومتوں کو کچھ رقم خرچ کرنے کے لیے دیتی تھی جو
ان کو حسب ہدایت خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں چند محکمے اور سنہ ۱۸۷۷ء میں بعض اور نئے محکموں کا
انتظام صوبہ واری حکومتوں کے سپرد ہوا اور اس میں صوبوں اور مرکزی حکومت کے درمیان
پنج سالہ مالی معاہدے ہوا کرتے تھے جن میں صوبوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں کچھ مزید

اصلاحات ہوئیں اور اس کے بعد اہم اصلاح ۱۹۱۹ء میں ہوئی اور مرکزی حکومت اور صوبہ واری حکومتوں کی آمدنی و خرچ کی مدیں الگ الگ کر دی گئیں ۱۹۳۵ء سے یہ تقسیم اور زیادہ قطعی ہوگئی اور مرکزی حکومت نے بعض نئے صوبوں کو امداد دینے کا وعدہ بھی کرلیا ہے اور محصول آمدنی میں مرکزی حکومت صوبہ واری حکومتوں کو کچھ حصہ دیتی ہے چنانچہ اس سال صوبوں کو ۷۳۹ لاکھ اور آئندہ سال ۸۲۷ لاکھ روپیہ ملے گا ۱۹۲۵ء سے قبل ریل کا بجٹ مرکزی حکومت کے بجٹ کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا مگر اس سال پہلی مرتبہ ریلوے کا بجٹ علیحدہ پیش کیا گیا اور اب یہ الگ ہی پیش ہوتا ہے۔

جیسے جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں اور تمدن و معاشرت میں ترقی ہو رہی ہے اور لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے اس طرح حکومت کی آمدنی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے اخراجات دونوں بڑھ رہے ہیں۔ ذیل میں ہندوستان کے چند نمایاں سالوں کی آمدنی اور خرچ کے اعداد دیے گئے ہیں

(کروڑ روپیوں میں)

	آمدنی	خرچ	کمی یا بیشی
۱۹۱۴-۱۵ء	۷۶/۱۵	۷۸/۸۳	- ۲/۶۸
۱۹۱۶-۱۷ء	۱۱۸/۷۰	۱۰۶/۵۷	+ ۱۲/۱۳
۱۹۱۹-۲۰ء	۱۳۷/۱۴	۱۶۰/۳۹	- ۲۳/۶۵
۱۹۲۲-۲۳ء	۱۳۴/۸۷	۱۳۴/۸۶	+ /۰۱
۱۹۳۸-۳۹ء	۸۵/۹۲	۸۵/۸۳	+ /۰۹
۱۹۴۰-۴۱ء	۸۵/۴۳	۹۲/۵۹	- ۷/۱۶
۱۹۴۱-۴۲ء	۱۲۹/۶۲	۱۴۶/۸۹	- ۱۷/۲۷
۱۹۴۲-۴۳ء (تخمینہ)	۱۴۰/۰۰	۱۸۷/۰۷	- ۴۷/۰۷

جب سے جنگ شروع ہوئی ہے ہندوستان کی مدافعت کے اخراجات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ جنگ کے ان سالوں کا بجٹ حسب ذیل ہے۔

(کروڑ روپیوں میں)

	۱۹۴۰-۴۱ء	۱۹۴۱-۴۲ء	۱۹۴۲-۴۳ء (تخمینہ)
(۱) عام سالانہ بجٹ	۳۶/۷۶	۳۶/۷۷	۳۶/۷۷
(۲) قیمتوں میں اضافہ کی وجہ سے نمبرا میں اضافہ	۲/۰۰	۴/۲۴	۶/۵۲
(۳) ہندوستان کی مدافعتی تدابیر	۶/۵۹	۵۳/۰۳	۸۱/۳۰
(۴) دوسرے اخراجات	۸/۱۶	۸/۴۱	۸/۴۱
میزان	۵۳/۵۱	۱۰۲/۴۵	۱۳۳/۰۰

جنگ کی وجہ سے سارا مالیہ چوپٹ ہوگیا ہے۔ آمدنی کی مدات میں کمی ہونے لگی ہے اور اخراجات میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مرکزی حکومت کی آمدنی کی سب سے بڑی مد محصول درآمد و برآمد ہے اور اس کا انحصار تجارت کی کمی و بیشی پر ہے۔ مگر جنگ کی وجہ سے تجارت میں بڑی تخفیف ہوگئی ہے۔ بین الاقوامی نازک صورت حال، جہازوں کی کمی، ان کے کرایوں میں زیادتی اور بیمہ کی شرح میں اضافہ سے بہت کم مال ملک کے اندر آرہا ہے۔ پھر بیرونی ملکوں میں زیادہ تر آلات حرب تیار ہو رہے ہیں اور تجارتی سامان کی پیدائش میں تخفیف ہوگئی ہے۔ خود ہندوستان میں بھی جنگی اغراض کے لیے زیادہ سامان تیار ہو رہا ہے۔ جاپان کے جنگ میں شامل ہو جانے سے اور بالخصوص سنگاپور کے نکل جانے سے ہندوستان کی مشرقی تجارت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ مشرقی مجمع الجزائر اور ملایا وغیرہ پر دشمن کے قبضے سے ان ملکوں سے تجارت بالکل ختم ہوگئی ہے۔ رنگون کا بندرگاہ تو بالکل ہی ختم ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کلکتہ، چٹاگانگ اور مدراس کی بندرگاہی حیثیت کو بھی بڑا سخت نقصان پہنچ گیا ہے۔ اس نقصان کی تھوڑی بہت تلافی اس نئے راستے سے ہو جائے گی جو آسام سے گزرتا ہوا ہندوستان اور چین کو ملانے کے لیے زیر تعمیر ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے چین کے ساتھ آزادی سے تجارت ہو سکے گی مگر مجموعی حیثیت سے کروڑ گیری کی آمدنی میں بڑی کمی ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس سال اس مد کی آمدنی کا تخمینہ ۳۶ کروڑ کے بجائے ۳۰ کروڑ کیا گیا ہے۔ اس میں دو کروڑ کی وہ رقم بھی شامل ہے جو ایک نئے محصول کی صورت میں معمولی اور چھوٹے ریشہ والی روئی پر لگایا گیا ہے۔

مرکزی حکومت کی آمدنی کا دوسرا اہم ذریعہ ریلیں ہیں مگر جنگ کے زمانے میں زیادہ مسافروں اور زیادہ مال و اسباب منتقل کرنے سے فایدہ نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ جنگی اغراض کے لیے ریلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت انجنوں، مال اور مسافروں کے ڈبوں اور دوسرے ضروری سامان کی قلت محسوس ہونے لگی ہے چنانچہ اکثر مقامات پر بعض ریلوں نے اپنی چند گاڑیوں کو بند کر دیا ہے۔ مخصوص ریلوں اور میلوں، جاتراؤں اور عرسوں کے لیے جو اسپیشل چلا کرتی تھیں وہ بند کر دی گئی ہیں بعض رعایتیں جو کھلاڑیوں یا طالب علموں کو حاصل تھیں وہ واپس لے لی گئیں ہیں۔ "ویگنوں کو بیکار نہ رکھیے"۔ "ویگنوں سے پورا پورا فایدہ اٹھایئے"۔ "بلا ضرورت سفر نہ کیجیے"۔ اس قسم کی مانعتی اور حفاظتی تدابیر کی مختلف کڑیاں ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ حکومت اس ذریعہ سے جنگی اخراجات میں مدد بھی لینا چاہتی ہے چنانچہ اس کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ مسافر بھی کم سفر کریں اور ریلوں پر بار بھی زیادہ نہ پڑے اور حکومت کی آمدنی بھی کم نہ ہو یعنی مسافروں اور مال کے کرایوں میں زیادتی کر دی جائے۔ چنانچہ گزشتہ مہینہ جب ریلوے بجٹ اسمبلی میں پیش ہوا تو اکثر ریلوں نے کرایوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

تیسری اہم چیز محصول آمدنی ہے۔ ملک میں عام بے چینی اور تجارت میں تخفیف وغیرہ کی وجہ سے اس میں بھی کمی ہونے لگتی ہے مگر حکومت کے ہاتھ میں ہی ایک ایسا مجرب نسخہ ہے جو ایسے سخت اور کٹھن موقعوں پر آزمایا جا سکتا ہے یعنی حکومت ایسے وقت یا تو انکم ٹیکس کی شرح میں اضافہ کر دیتی ہے یا محصول عاید ہونے والی آمدنی کا معیار گھٹا دیتی ہے پھر بھی اگر خسارہ کی تکمیل نہ ہو سکے تو قرض لیکر کام چلایا جاتا ہے۔

دوسری طرف جنگ کی وجہ سے عام اخراجات اور بالخصوص جنگی اخراجات میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ اس مرتبہ کے بجٹ میں مدافعت کے سلسلے میں ۱۳۲ کرور روپیہ خرچ ہونے کا اندازہ ہے جو ہندوستان کے عام فوجی سالانہ اخراجات سے ۹۶ کرور کے قریب زاید ہے بقول وزیر مالیہ آج کل ہندوستان جنگ پر روزانہ ۴۰ لاکھ روپیہ صرف کر رہا ہے اور یہ صرف اس صورت میں ہے جبکہ حکومت برطانیہ ۴۰۰ کرور روپیہ کی سالانہ امداد کر رہی ہے (واضح رہنا چاہیے کہ اس رقم میں ہندوستان میں رہنے والے فوجی قیدیوں کے اخراجات بھی شامل ہیں)، اس کے علاوہ برطانیہ بلا کسی قیمت کے ہوائی جہاز

گاڑیاں، توپیں اور دوسرا فوجی سامان بھی فراہم کر رہی ہے۔ اب تک ایسا جو سامان آچکا ہے یا ۱۹۴۲ء کے اختتام تک جو سامان آسکے گا اس کی مجموعی قیمت ۶۰ کروڑ روپیہ کے قریب ہوگی۔

ان جنگی اخراجات کی وجہ سے اس سال کے بجٹ میں ۴۷ کروڑ کے خسارہ کا اندازہ کیا گیا ہے اس خسارہ کا کچھ حصہ پورا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

(۱) انکم ٹیکس کا معیار کم کر دیا گیا یعنی ان آمدنیوں پر جو ایک ہزار سے دو ہزار روپیہ سالانہ کے درمیان ہیں ان پر ۷۵۰ روپیہ کے بعد ۶ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس لگایا جائے گا لیکن اس میں یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ اگر ۵ روپیہ پر یا چار روپیہ سیکڑے کے حساب سے رقم سیونگ بینک کے ڈیفنس اکاونٹ میں جمع کر دی جائے تو یہ محصول ادا نہ کرنا پڑے گا۔ اس کھاتے سے رقم جنگ ختم ہونے کے ایک سال بعد واپس لی جاسکے گی اس اثنا میں اس پر ۲½ فی صدی کے حساب سے سود ملتا رہے گا مثال سے اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ زید کی آمدنی ۱۲۵۰ روپیہ ہے اس کو ۷۵۰ روپیہ پر کوئی ٹیکس نہ دینا پڑے گا اور بقیہ پانسو پر ۶ پائی کے حساب سے پندرہ روپیہ دس آنے ٹیکس ادا کرنا ہوگا لیکن اگر وہ چار روپیہ فی سیکڑے کے حساب سے پانسو کی رقم کے واسطے بیس روپیہ ڈاک خانے میں جمع کرا دے تو اس محصول سے بچ جائے گا۔ وزیر مالیہ کا خیال ہے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ دراصل روپیہ پس انداز کرانے کی ایک موثر تدبیر ہے۔ لیکن صاحب موصوف نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ اس میں جبر کا پہلو شامل ہو گیا ہے اور جب کسی تعمیری اور مفید کام میں جبر بھی شامل ہو تو عوام اس کی وہ افادیت محسوس نہیں کر سکتے جو بلا جبر ان کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

(۲) حکومت جو مزید (سرچارج) ٹیکس وصول کرتی ہے۔ اس کی شرح میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ رعایت رکھی گئی کہ حکومت اس مزید محصول کا کچھ حصہ جنگ کے بعد واپس کر دے گی

(۳) زاید منافع والے ٹیکس کی شرح کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن اس میں بھی یہ ترمیم کی گئی ہے کہ اس کا ⅒ حصہ جنگ کے بعد واپس کر دیا جائے گا۔

(۴) تمام درآمد اشیا پر موجودہ محصول کا ⅕ حصہ اضافہ کیا گیا البتہ خام روئی اور موٹر اسپرٹ

اس میں شامل نہیں، لیکن موٹر اسپرٹ کے محصول جنگی میں تین آنے فی گیلن کا اضافہ کر دیا گیا نیز برما سے درآمد ہونے والی چند اشیا تجارتی معاہدے کی بدولت اس اصول سے مستثنیٰ رہیں گی نمک کا درآمدی محصول ابھی موجودہ دیسی نمک کی جنگی کے برابر رہے گا۔

(۵) ڈاک کا لفافہ سوا آنے کے بجائے ڈیڑھ آنے، معمولی تار دس آنے کے بجائے بارہ آنے اور ایکسپریس تار سوا روپیہ کے بجائے ڈیڑھ روپیہ کا کر دیا جائے گا۔ ٹیلیفون کی فیس میں بھی اضافہ ہوگا۔ اور ٹرنک ٹیلیفون کی فیس میں بھی ۱۰ فی صدی سے ۲۰ فی تک اضافہ کیا جائے گا۔

ان تمام مدوں سے ۱۲ کروڑ کی آمدنی ہوگی اور پھر بھی ۷،۵۳ کروڑ کا خسارہ رہے گا جو قرض لے کر پورا کیا جائے گا۔

گویا اس ملک کے محصول میں ۱۲ کروڑ کا اضافہ ہوا جو کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔ مگر اس حیثیت سے اس کا بار بہت بڑھ جاتا ہے کہ پچھلے دو سالوں میں بھی ۲۰ کروڑ کا اضافہ ہو چکا ہے گویا آغاز جنگ سے اب تک نئے ٹیکسوں کی مقدار ۳۲ کروڑ ہو گئی ہے جو ہندوستان کی عام سالانہ آمدنی اور قیمتوں میں بہت زائد اضافے کی وجہ سے بہت شدید بار ہے مگر موجودہ بجٹ پر کوئی تنقید اس لیے نہیں کی جا سکتی کہ یہ جنگ کے زمانے کا بجٹ ہے اور جنگ میں حکومتوں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے باشندوں کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھانا پڑتی ہیں وہ ناگزیر ہیں۔ جرمنی جو اس وقت دنیا پر قبضہ کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اس کے قومی قرضہ کی مقدار ۱۰۷ ارب مارک یا ۴۳ ارب ڈالر یا ۱۲۹ ارب روپیہ کے قریب تھی۔ یہ قرضہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے آخر ستمبر ۱۹۴۱ء تک لیا گیا تھا گویا اب تو اس میں اور اضافہ ہو گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ عوام کی آمدنی کا بڑا حصہ ٹیکسوں کی صورت میں حکومت کی نذر ہو جاتا ہے۔ امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا اس سال کا بجٹ اپنی تاریخ میں آپ مثال ہے۔ نیوزیلینڈ جیسے چھوٹے جزیرے جنگ کے گزشتہ دو سالوں میں ½۶ کروڑ پونڈ مدافعت پر خرچ کر چکے ہیں اور اس سال ان کے مدافعت کا بجٹ ½۶ کروڑ پونڈ یا ۸۵ کروڑ روپیہ کے قریب ہے جنگ کے زمانے میں جنگی اخراجات میں کمی کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔

گزشتہ جنگ سے امریکہ کی متحدہ ریاستوں نے بہت زیادہ اور ہندوستان نے بھی تھوڑا بہت معاشی فایدہ حاصل کیا تھا لیکن موجودہ جنگ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں امریکہ نے ابتدا میں تھوڑا بہت فایدہ ضرور حاصل کیا مگر اب تو وہ خود ایک فریق ہے۔ ہندوستان نہ صرف سیاسی اعتبار سے خطرے کے قریب آگیا ہے بلکہ معاشی اعتبار سے بھی کافی نقصان میں ہے۔ جاپان کے جنگ میں شامل ہو جانے سے نہ صرف خطرہ بہت قریب آگیا ہے بلکہ صورت حال بہت کچھ بدل گئی ہے۔ بحرالکاہل سے ہماری تجارت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ سنگاپور وغیرہ کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے بحر ہند کی حالت بھی محفوظ نہیں رہی اس طرح ہماری تجارت کو بڑا بھاری صدمہ پہنچنے کا امکان ہے اور تجارت میں تخفیف کی وجہ سے محصول درآمد برآمد میں کمی ہوگی چنگی کی آمدنی کم ہو جائے گی۔ ریلوں کی آمدنی میں تخفیف ہوگی۔ اور خود لوگوں کی آمدنی کم ہو جانے کا بھی امکان ہے۔ دوسری طرف ملک میں عام اشیا کی قیمتوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور نئے اور پرانے محصولوں کا بار بڑھ رہا ہے۔ اس طرح معین آمدنی پانے والا طبقہ اور غریب و متوسط لوگ بڑی کشمکش میں گرفتار ہیں مگر اس کا علاج حکومت یا کسی ایک فرد کے بس میں نہیں لہذا ایسی صورت میں خطرات کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ ضرورت ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی کے ہر شعبہ میں کفایت سے کام لیا جائے۔ ہندوستان کو اور اس کے شہروں اور دیہات کو جس حد تک ممکن ہو خود کفیل بنانے کی کوشش کی جائے اور خود اپنے ذرائع پر بھروسہ کیا جائے اور اپنے آپ کو پورے سودیشی ماحول کا عادی بنا لیا جائے کیونکہ اسی میں ملک کی بہتری مضمر ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم۔اے

واسطی

منشی سید فضل رسول خاں واسطی سندیلہ (یو۔پی) کے رؤسا میں سے تھے۔ ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے جس کو آج ایک سو تئیس سال ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ علوم مروجہ میں پوری دستگاہ اور شعر و سخن سے خاص مناسبت تھی ایام جوانی میں ریذیڈنسی گوالیار میں ملازم تھے بعد میں تعلقدار ہو گئے ان کے زمانے میں اور ان کے بعد ابھی تک بھی سندیلہ میں سالانہ مشاعرے دھوم سے ہوتے رہے۔ سید اعزاز رسول صاحب ایم ایل۔اے (یو۔پی) ان کے پڑپوتے ہیں۔ بلحاظ کلام واسطی اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ ان کے کلام میں بے ساختگی، سادگی، گہرائی فکر اور اثر آفرینی کی عمدہ عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔ اسیر لکھنوی سے تلمذ تھا۔ ان کا کلام ۱۲۸۷ھ میں مطبع نولکشور میں دوسری بار شائع ہوا۔ ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے

حائل ہو زیست وصل ہو اس جان جاں سے کیا ۔۔۔ پردہ بغیر مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

کیوں نہ ساماں کروں بے سروسامانی کا ۔۔۔ جمع اسباب ہی باعث ہو پریشانی کا

خار دوڑے پئے تعظیم بگولے کی طرح ۔۔۔ جس جگہ تھک کے ترا آبلہ پا بیٹھ گیا

خامشی میں بھی اس کا نام لیا ۔۔۔ ہم نے دل سے زباں کا کام لیا

رات دن پی شراب عشق، مگر ۔۔۔ کبھی شیشہ لیا نہ جام لیا

فصل بہار آئی بنا میکدہ چمن ۔۔۔ ہر پھول ساغر مئے گلرنگ ہو گیا

تمنائیں ہزاروں، عمر تھوڑی ۔۔۔ جہاں میں کیا میں کرتا، کیا نہ کرتا

وابستہ چشم لطف سے تھی ہستی جہاں ۔۔۔ عالم تری نگاہ بدلتے ہوئے نہ تھا

وہی ہشیار ہے جو غیر کا احسان نہ لے ۔۔۔ وہی دیوانہ ہے پہنے جو پرائی زنجیر

ہوا سے اُڑ کے جو آئی ہے آنکھ پر گرد زلف ۔۔۔ سیاہ ابر گھرا ہے شراب خانے پر

پردہ انھیں تمام زمانے سے ہے مگر ۔۔۔ بے پردہ ہیں وہ طالب دیدار کے حضور

اس بزم میں ہو کون کسی کا شریک حال — کوئی بھی پونچھتا نہیں اشک رواں شمع

منظور میکشی ہو تو گلشن میں آئیے — ساغر لیے ہوئے ہے سر شاخسار پھول

نہ مجھے کفر سے مطلب ہے نہ اسلام سے کام — ہاں! تری ذات سے مطلب ہے ترے نام سے کام

ساقی ہے میکدہ میں بھی برسات کا سماں — شیشے میں ہے شراب کہ بجلی سحاب میں

شکر خدا کہ فصل گل آئی خزاں گئی — رُت پھر گئی چمن کی ہوائیں بدل گئیں

جاتا کہاں حوادث عالم سے بھاگ کر — کس جا یہ آسمان نہیں یہ زمیں نہیں

میں کہاں دید رُخ یار کہاں — شکر احسان نظر کرتا ہوں

سن سن کے بیاں ہے کوئی ششدر کوئی حیراں — کیا گزرے زمانے پہ جو وہ پیش نظر ہو

نہ دو ایذا اسیران بلا کو — پکار اُٹھیں نہ یہ بندے خدا کو

آنے سے جن کو ننگ ہے ان کو بلائیں گے — اے جذب شوق آج تجھے آزمائیں گے

صنم کدہ میں حرم میں چمن میں صحرا میں — کہاں کہاں تری ہم جستجو نہیں کرتے

سما گئی ہے جو اس میں خدا کی قدرت ہے — سبو ہے دل مرا مے یا ہے آرزو تیری

طریقہ ہے مرا تسلیم لیکن ظلم پیہم سے — زباں پر دوستانہ کچھ شکایت آ ہی جاتی ہے

مرنے کو تو مر جائے گا بیمار محبت — تم آؤ عیادت کو تو دو روز سنبھل جائے

عزلت گزیں جہاں سے جو قطع نظر کرے — مثل حباب چاہیے بند اپنا در کرے

کثرت ہو دشمنوں کی تو انساں کو چاہیے — کانٹوں میں گھر کے پھول کی صورت بسر کرے

ارادہ مسجد و میخانہ دونوں میں ہے جانے کا — تردد ہے دوراہے میں اگر جاؤں کدھر پہلے

مر کے راحت کا آسرا تو ہے — کوئی اپنا نہیں خدا تو ہے

عبادت بے حضور قلب کیا کام آئے گی زاہد — بنا جس کی نہ ہو مضبوط وہ تعمیر کیا ٹھیرے

شراب پیتے ہی رنج خمار دیکھیں گے — چنیں گے پھول تو ایذائے خار دیکھیں گے

قاتل کو جا کے دیکھیے قیامت کی دی خبر — دشمن سے اپنے ہم نے کبھی دوستی کی بات

مرسلہ مجتبیٰ کیفوی

غزلیات

اب اس کا ذکر ہی کیا جب دل تپاں نہ رہا — میں اور اس کے سوا کیا کہوں کہ ہاں نہ رہا
متاعِ عشق کے سودے میں کچھ زیاں نہ رہا — کہ دل کے بدلے یہ مال گراں گراں نہ رہا
کمال مشق تصور نے راہ پیدا کی — کوئی حجاب مرے ان کے درمیاں نہ رہا
مرے بیان کا انداز جان محفل تھا — کہ میرے اٹھتے ہی وہ رنگ داستاں نہ رہا
وجودِ غم سے جہاں میں ہے زندگی کا مزہ — وہ دل کی موت ہے جس دم یہ میہماں نہ رہا

یہ آفت آگئی اردو زبان پر ثاقب
کوئی کمال ہنر کا بھی قدرداں نہ رہا — (میرزا ثاقب قزلباش)

میری آواز کی رسائی دیکھ — موت نے وہ صدا لگائی دیکھ
جنگ میں جن کی تھی وفا مشہور — صلح میں ان کی بے وفائی دیکھ
جن کی تھیں پاکبازیاں مشہور — ان کی دنیا میں جگ ہنسائی دیکھ
داغ ہیں آستانِ آدم پر — آسمانوں کی جبہ سائی دیکھ
تجھے کرنا ہے اپنی سی اے دوست — کچھ برائی نہ کچھ بھلائی دیکھ
بن گئے ہیں گناہوں کے مدفن — پارساؤں کی پارسائی دیکھ
اے نظامِ کہن کچھ آہٹ لے — وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ
تجھ پہ ہے تنگ وسعت کونین — قید سے چھوٹ کر رہائی دیکھ

ہجر میں تو فراق روتا تھا
اس کو پاکے بغم جدائی دیکھ — (فراق گورکھپوری)

کبھی بھی ہو کشتی مراد، روک نہیں روانہ کر — حاجت ناخدا نہ رکھ، منت ناخدا نہ کر
اشکوں سے مضطرب نہ ہو جلووں کی التجا نہ کر — آنکھیں کہ زخم ہیں انہیں رسنے ہی دے دوا نہ کر

تجھ کو ملے خوشی کہ غم اپنی جگہ پہ ناتمام
ایسی امید و بیم کو حاصل مدعا نہ کر

تابش مہر و مہ کو چھوڑ جلوۂ لامکاں میں کھو
عشرت کم قیام کو عشرت جاوداں نہ کر

میرا مآل بھی ترے واسطے ایک درس ہے
تذکرۂ وفا نہ چھیڑ، حوصلۂ وفا نہ کر

نکہت حسن میں نہ ڈھونڈ عشق کے عجز کی جھلک
پھول کو اس کی شاخ سے توڑ نہیں جدا نہ کر

تیری تباہیوں پہ ہو اس کی نگاہ کیا ضرور
عشق کی راہ میں سحرؔ حرص کو رہنما نہ کر
(سحرؔ رامپوری)

پڑ گئی ہوں گی تری پرچھائیاں
ورنہ گل میں یہ کہاں رعنائیاں

عشق کی ہمت بڑھاتے جائیے
کیجیئے جی بھر کے ظلم آرائیاں

درد تیرا جان لیوا ہی سہی
کٹ تو جاتی ہیں مری تنہائیاں

کھینچ لی اپنی طرف سب کائنات
اُف رے کافر یہ تری انگڑائیاں

اور بھی گستاخ حیرتؔ ہو گیا
دیکھ کر تیری کرم فرمائیاں
(حیرتؔ لدھیانوی)

ہے ان سے مگر اب وہ ملاقات نہیں ہے
ہر بات میں پہلی سی کوئی بات نہیں ہے

ہر لمحہ نہیں سرخوشیٔ شوق کا عالم
اک کیف سا چھایا ہوا دن رات نہیں ہے

ابھی ہوئی سانسوں میں پریشاں ہے کوئی شے
اب روح میں تن میں وہ مساوات نہیں ہے

بیٹھے ہیں مگر بیٹھے ہیں ہم صورت تصویر
اب سلسلۂ حرف و حکایات نہیں ہے

ہر تار شکستہ سا ہے اب بربط دل کا
وہ لطف ہم آہنگی نغمات نہیں ہے

اس طرح رہ غم میں ہیں سب قطع امیدیں
جیسے مرے ہمراہ تری ذات نہیں ہے

آ جاؤ اسی طرح کہ جیسے نہیں آتے!
مل جاؤ یونہی جیسے کوئی بات نہیں ہے!!

ہلکی سی اک امید تھی منیرؔ غم دل سے
وہ ساز بھی سرمایۂ نغمات نہیں ہے
(مرزا منیرؔ بھوپال)

نعرۂ مزدور

نگاہ اہلِ معنی کو بھی حیراں کرکے چھوڑوں گا — چراغِ زندگی ہر داغِ حرماں کرکے چھوڑوں گا
لچک ہی میری فطرت میں دبے گی جب یہ ابھرے گی — مٹوں گا تو حیاتِ نو کے ساماں کرکے چھوڑوں گا
بنیں گے جل کے خاکستر امیروں کے یہ خس خانے — بہ رنگِ شعلہ گرمِ انجمن دہقاں کرکے چھوڑوں گا
جو ہنستے کھل کھلاتے مسکراتے ہیں غریبوں پر — انھیں بیدرد آقاؤں کو گریاں کرکے چھوڑوں گا
دلِ مزدور کیوں غمگیں ہو اپنی بے نوائی پر — میں اس کی جھونپڑی قصرِ سلیماں کرکے چھوڑوں گا
مجھے طعنہ نہ دو اے ہم صفیر دست کوشی کا — دو عالم کا یہ شیرازہ پریشاں کرکے چھوڑوں گا
نویدِ انقلاب نو مبارک بزمِ گیتی کو — پھر اس زندانِ غم کو میں خیاباں کرکے چھوڑوں گا
اجاڑے جس قدر چاہے ستمگر باغباں اس کو — وطن کے ذرے ذرے کو گلستاں کرکے چھوڑوں گا
یہ کس نے لکھ دیا پیشانیٔ مزدور بے کس پر — کہ "ہر دولت کدے کو اب میں ویراں کرکے چھوڑوں گا
اڑیں گی دھجیاں اب دامنِ سرمایہ داری کی — اسے ناکام عاشق کا گریباں کرکے چھوڑوں گا
وطن کی خاک کا ہر ذرہ شمعِ زندگی ہوگا — انھیں تاریکیوں میں پھر چراغاں کرکے چھوڑوں گا
کہاں تک دست بردِ اہلِ دولت گلشنِ دل پر — خزاں کب تک جلائے جانِ بہاراں کرکے چھوڑوں گا
چمن کی زندگی میں آندھیاں بھی ہیں بگولے بھی — انھیں میں شمعِ آزادی فروزاں کرکے چھوڑوں گا
اسی تاریک زنداں سے نمایاں روشنی ہوگی — اسی ہندوستاں کو انجمستاں کرکے چھوڑوں گا

کہاں تک بے کسوں کی آہ یہ حق تلفیاں محوی
میں دے کر جان، زندہ ذوقِ احساں کرکے چھوڑوں گا

محوی صدیقی لکھنوی

ایک خط کا جواب

(ا۔ن۔ج کے نام)

یہ خط حضور نے باغِ جناں سے بھیجا ہے — مری نگر کے حسیں گلستاں سے بھیجا ہے
جسے مرقعِ فردوس زار کہتے ہیں — سمن بدست و چمن در کنار کہتے ہیں
جہاں اُبھرتے ہیں جذبات کوہساروں سے — جہاں برستے ہیں نغمات آبشاروں سے
جہاں مناظرِ فطرت کی بزمِ رعنائی — فضائے حسن میں لیتی ہے مست انگڑائی
وہیں ہیں آپ ہم آغوشِ جنتِ کشمیر — وہیں سے آپ نے کی ہے یہ رحمتِ تحریر
نقوش ایسے کہ گلکاریِ چمن کہیے — خطوط ایسے کہ شاخِ گل و سمن کہیے
قسم ہے خط میں وہ تصویر دیکھتا ہوں میں — کہ جیسے وادیِ کشمیر دیکھتا ہوں میں
اب اپنی زندگیِ بے نوا سے دور ہوں میں — اب اپنے گھر کی فسردہ فضا سے دور ہوں میں
مجھے حیات کی لاچاریاں نہیں معلوم — سکوت اور یہ بے کاریاں نہیں معلوم
اب اپنی شاعریِ مردہ سے نہیں واقف — اب اپنے نغمۂ افسردہ سے نہیں واقف
اداسیوں کو نظارے نہیں سمجھتا ہوں — اب آنسوؤں کو ستارے نہیں سمجھتا ہوں
سیاہ بختی کو تابندگی نہیں کہتا — غمِ زمانہ کو اب زندگی نہیں کہتا
اب اپنی صبحِ پشیماں آب و تاب نہیں — اداس رات کا سایہ مرا شباب نہیں
کہ میرے بحرِ حوادث میں اک سکون ہے آج — مری خوشی کے لیے بس یہی شگون ہے آج
کہ دل کو آج کچھ ایسی خوشی میں پاتا ہوں — میں جیسے سارے جہاں کی طرف سے گاتا ہوں
کہ میری نظم نے آج ایک ساز پایا ہے — مرے خیال نے اک دلنواز پایا ہے
پئے جسارتِ تسلیم آنے والا ہوں — میں شکریہ میں یہی نظم گانے والا ہوں
حیات دھوپ میں ہے سایہ ڈھونڈ رہا ہوں میں — فضا غریب ہے سرمایہ ڈھونڈ رہا ہوں میں

سلام مچھلی شہری
۳۱۹

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کلیات میر (ترتیب جدید معہ مقدمہ و فرہنگ) مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ، سائز ۲۰×۳۰/۸ تعداد صفحات کلیات ۹۷۶، کاغذ، کتابت و طباعت بہت اچھی۔ قیمت ٥ر

نول کشور پریس لکھنؤ نے اردو زبان و ادب کی جتنی خدمت کی ہے وہ محتاج بیان نہیں بلکہ اردو اس سلسلہ میں اس پریس کی جس قدر مرہون منت ہو سکتی ہے اتنی کسی ایک ادیب کی نہیں۔ اس طرف عرصہ سے یہ مطبع کچھ ہندی کی طرف زیادہ راغب ہو گیا تھا اور خیال تھا کہ شاید اردو کو نصیب دشمناں بھلا نہ بیٹھے۔ لیکن کلیات میر کو شایع کر کے اس نے اس شبہ کو باطل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ اب تک جتنے نسخے کلیات میر کے ملتے رہے سب میں اغلاط کی کثرت سخت روحانی تکلیف کا باعث ہوا کرتی تھی لیکن موجودہ نسخہ ایسا ہے جو کتابت و طباعت کے لحاظ سے بہت روشن ہے۔ شروع میں ٥٥ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے جو عبدالباری صاحب آسی نے لکھا ہے۔ جس میں میر صاحب کے جملہ حالات ان کی سیادت و ولادت، تربیت و تعلیم وغیرہ کا حال تحقیق سے لکھا ہے لیکن ان کی شاعری پر تبصرہ بہت مجمل اور مختصر ہے۔ اس ترتیب میں اودھ کے باہر کے دیگر نسخوں سے بھی اگر مدد لیجاتی تو کم از کم اتنی تسکین ضرور رہتی کہ کوئی بات میر کے بیان میں تشنہ نہیں رہ گئی ہے اور ہر ممکن مواد سے فایدہ حاصل کر لیا گیا ہے۔ اغلاط باوجود دعوی کے باقی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ جگہ جگہ پر حواشی بھی دے دیے گئے ہیں۔ آخر میں مشکل اور پرانے متروک الفاظ کی ایک مفید فرہنگ دے دی گئی ہے۔ غرضکہ مطبع مذکور لائق ستایش ہے کہ اس نے کلیات میر کا یہ جدید اڈیشن نکال کر اردو کے سب سے بڑے شاعر کے کلام کو دیدہ زیب شکل میں پیش کیا۔

محاسن سجاد — مرتبہ مسعود عالم ندوی، ناشر الہلال بک ایجنسی بانکی پور پٹنہ، سائز [illegible]

صفحات ۱۰۷، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۸؍

مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ بہار کی وہ ہستی تھی جس نے اپنی زندگی مسلمانوں کی خدمت کے لیے تمامتر وقف کر دی تھی۔ وہ خاموش اور ٹھوس کام کرنے والوں میں سے تھے اس لیے شاید ان کا نام بہت سے لوگوں کے لیئے نامانوس ہو۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے بہار میں ایک مرکزیت قایم کرکے تمام مسلمانان بہار میں سیاسی، اخلاقی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے کا لائحہ عمل بنایا تھا۔ افسوس ہو کہ ایسے وقت میں جب کہ انکا ذوق عمل معراج پر پہنچ چلا تھا کہ دفعتاً یہ امانت مستعار واپس لے لی گئی۔ مولانا صرف متبحر عالم ہی نہ تھے بلکہ عالم باعمل تھے یوں تو مدرسہ انوار العلوم گیا جمعیۃ العلماء صوبہ بہار اور امارت شرعیہ کا وجود اور قیام ان کے شوق عمل کے نتائج ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کا وہ ولولہ اسلامی تھا جو انھیں سیاسی پلیٹ فارم پر لاکر معروف عمل رکھتا تھا۔ نہرو رپورٹ پر بحث و تنقید، سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید انڈیپنڈنٹ پارٹی کا قیام وغیرہ ان کے ایسے کارنامے ہیں جو مسلمانان بہار کبھی فراموش نہ کرسکیں گے۔ دماغ ایسا رسا اور ذہانت اس قدر خداداد پائی تھی کہ مختلف کمیٹیوں کے اہم اور پیچدار مسائل ایسے سلجھاتے تھے کہ بڑے بڑے ماہرین دنگ رہ جاتے۔

زیر نظر مختصر کتاب ان ہی کے اوصاف حمیدہ اور حالات کے بارے میں ترتیب دی گئی ہو۔ لکھنے والوں میں مولانا کے تمام دوستوں اور علمائے کرام نے حصہ لیا ہو آخر میں ایک باب لجول کا بھی دلچسپ اضافہ ہو یعنی مولانا چونکہ کانگریس کے اندر رہ کر مسلمانوں کے لیے کام کرنا چاہتے تھے اس لیے راغب احسن صاحب نے مسلم لیگی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہو ساتھ ہی اس مضمون کا جواب بھی شامل ہو آخر میں ہم یہ ایک تجویز ضرور پیش کریں گے کہ ان کے مضامین کی ترتیب کے علاوہ کوئی ایسا کام بھی شروع کیا جائے جو مولانا کی یادگار کو استحکم کرسکے۔

دین اسلام (حصہ اول) مصنفہ مولانا لطف الرحمٰن صاحب ملنے کا پتہ مکتبہ ترجمان القرآن۔ شہر مالدہ (بنگال) سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۱۰۷، قیمت ۱ ، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

مولانا نے یہ ایک بڑا مفید رسالہ آسان زبان میں ان لوگوں کے لیے ترتیب دیا ہو جو مغربیت

کی زد میں آکر اسلام کو ٹھیک طرح نہیں سمجھتے۔ رسالہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔ بے جا طول سے کام نہیں لیا گیا ہے لیکن مولانا سے عرض یہ ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح کے لیے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے انھیں ایسی کتابوں کے پڑھنے کی توفیق بھی تو ہو۔ اس لیے آج کل کتابوں سے بڑھ کر عمل کی ضرورت ہے جس سے ان میں اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت اور مادہ پیدا ہوسکے۔

فتح مبین (دوسرا حصہ تیسری جلد) مرتبہ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب رئیس علی گڈھ ملنے کا پتہ از مصنف ڈاک خانہ دتاؤلی ضلع علی گڈھ۔ سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۲۹۲ قیمت درج نہیں۔ کاغذ کتابت وطباعت اچھا

حاجی صاحب کی یہ کتاب ان کے ایک بڑے کارنامہ "اسلامی خلافت کا کارنامہ" کا ایک حصہ ہے۔ اس کتاب میں ۳۵ھ سے خلافت کے تاریخی کارناموں کے ساتھ رسول اللہ صلعم و دیگر خلفا کے اخلاقی و اصلاحی کارناموں کا بھی ذکر ہے۔ اصول دین بھی سمجھائے گئے ہیں۔ زبان سادہ اور طرز والہانہ ہے۔ خدا کرے حاجی صاحب اس مفید عام کتاب کی تمام جلدیں حسب خواہش اپنی حیات میں پوری کریں۔

رنگین لباس:۔ از مسز منیر الزماں صاحبہ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن اور دیگر ناشرین حیدرآباد۔ سائز ــــــ صفحات ۸۰ قیمت غیر مجلد ۱۲؍

زیر نظر کتاب عورتوں کے لیے ایک اچھا تحفہ ہے۔ اس میں رنگوں کی حقیقت۔ ان کے اصول تناسب وتوازن مدارج اور بیانوں کو اچھی طرح اور آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ موسموں اور عورتوں کی صورت ومزاج کے مطابق لباس کے رنگ اختیار کرنا۔ ان تمام مسائل پر غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔ قیمت ذرا زیادہ رکھی گئی ہے

(م۔ح)

نیا سال نمبر "ہندوستانی ادب" کا یہ دوسرا خاص نمبر ہے جو اکتوبر ۱۹۴۲ء میں فصلی سنہ کی آمد کی خوشی اور جشن سال نو کے موقع پر جو حیدرآباد میں مستقل طور پر منایا جاتا ہے شایع کیا گیا ہے فصلی سنہ سے متعلق متعدد مفید اور معلوماتی مضامین اور عمدہ نظموں کے علاوہ اہم عنوانات پر علمی مضامین بھی شریک اشاعت ہیں۔ ریزرو بنک، امرآباد کی نباتاتی سیر، سطح قمر پر عرب وعجم کے چند منجموں کے نام، سکندر اعظم فلسفہ اشراق، ہندی زبان کی تاریخ پر ایک نظر، فانی تلسی داس مختصر مگر مفید مضامین ہیں، بنگالی

اور نوجوانوں سے خطاب، اصلاحی اور قابل قدر ہیں۔ ممکن ہے آخر الذکر مضمون کے بعض حصوں سے کچھ لوگوں کو اختلاف ہو مگر اس کی افادیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

اس خاص نمبر میں انجمن ترقی اردو کا کچا چٹھا، دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا۔ انجمن ترقی اردو میں خرابیاں ہو سکتی ہیں اور اس کی شکایت بھی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا بہرحال خیال رکھنا چاہئیے کہ زیر تنقید ادارہ کو چاہے نقاد کے نزدیک کتنی ہی حقیر خدمات انجام دے رہا ہو نقصان پہنچنے نہ پائے۔ اردو اخبارات ورسائل اس ضروری پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقید اصلاحی منزل سے گزر کر تخریبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

اس خاص نمبر کی قیمت ۸ ہے مگر مستقل خریداروں کو مفت مل سکتا ہے۔ (ع۔ل)

چمنستان (سالنامہ)۔ مدیران آغا سرخوش قزلباش و گوردھن داس ایم اے۔ صفحات ۲۰۹۔ قیمت ۸ فی پرچہ سالانہ ۴ ملنے کا پتہ قصر شاعر نکلسن روڈ دہلی

رسالہ چمنستان کے اس سالنامے میں اچھے اچھے اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین فراہم کیے گئے ہیں مثلاً آصف علی بیرسٹر، سر رضا علی، حامد حسن قادری، بہزاد لکھنوی، خواجہ عبدالمجید، ایم اسلم، شائستہ اختر بانو، صالحہ عابد حسین، اشرف صبوحی، تابش دہلوی، شیو نرائن آہن لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ نظم کا حصہ بھی خاصا ہے۔ جوش۔ احسان دانش۔ ماہر القادری۔ آرزو لکھنوی۔ مرلی دھر شاد۔ انجم۔ تصدق و حامد علی خاں وغیرہ امید ہے شائقین اسے پسند کریں گے۔

بیداری۔ اڈیٹر ہادی نقشبندی سکرٹری مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن علی گڈھ سائز ۲۲×۲۰/۸ قیمت فی پرچہ ۲ سالانہ ۱۰ سرسید نمبر ۲

زیر نظر نمبر بیداری کا سرسید نمبر ہے۔ مدیر نے اپنے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ اس پرچہ کے ذریعہ طلبا میں جذبۂ اتحاد خودداری و قوت عمل پیدا کیا جائے گا اور یہ ان قہرمانی آمرانہ قوتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ ہوگا جو اقتدار کے نشہ میں طلبا کی خودداری اور واجبی اور جائز مطالبات کو ٹھکرا نا اپنی شان حکومت سمجھ کر ان کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔ شکر ہے کہ مسلم اسٹوڈنٹ ایسوسی ایشن علی گڈھ کا یہ پرچہ اپنے وعدہ کو قایم رکھ سکا اور غالباً علی گڈھ کے [illegible] سے یہاں کی قابل اصلاح حالت سے متعلق ابھی تک سرسید کی یہ تحریک کامیاب ہے یا [illegible] کے [illegible] آپ بھی گے [illegible] تحریک سے دلچسپی رکھتے ہیں

ایک معلم کی زندگی

شائع ہوگئی

اس کتاب کو ماسٹر عبدالغفار صاحب مدہولی اُستاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ محض ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہردل عزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔

یہ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد پانچ سو صفحوں کی اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں۔ خوب صورت گردپوش نے کتاب کے ظاہری حسن میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت (جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے) کاغذ کی گرانی کے باوجود محض پانچ روپئے (صہ ر) ہے۔ گو ترتیب کے وقت بچوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن یقین ہے کہ بڑے بھی پسند کریں گے۔ خصوصاً تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی جو حضرات جامعہ کے تعلیمی تجربوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے سنہ ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر جنابلڈنگ لکھنؤ

اگر آپ

سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی کا حال اپنی زبان میں پڑھنا چاہتے ہیں۔
سائنس کی نئی ایجادات اور انکشافات سے واقف ہونا چاہتے ہیں
سائنس کے ماہرین کے کارخانے اور موجدوں کی کہانیاں سننا چاہتے ہیں
سائنس کے علم اور عمل سے اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں
سائنس کی دنیا سے بے خبر رہنا نہیں چاہتے

تو

انجمن ترقی اردو کے ماہوار رسالے

سائنس

کے مستقل خریدار بن جائیے

اس رسالے کو سررشتہ تعلیمات حیدرآباد دکن، پنجاب، بہار، مدراس، سی، پی صوبہ سرحد اور سندھ نے اپنے مدرسوں اور کالجوں کے لئے منظور کیا ہے۔ یہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے اس میں ہر ماہ عام فہم زبان میں مختلف مضامین و تحقیقات سائنس سے متعلق سوال و جواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔

قیمت سالانہ پانچ روپیے (صہ) سکہ انگریزی پانچ روپیے چودہ آنے (ہ ۱۴) سکہ عثمانیہ
نمونے کا پرچہ آٹھ آنے سکہ انگریزی۔ دس آنے (۱۰) سکہ عثمانیہ

اگر آپ

اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو

سائنس

میں اشتہار دیجئے

یہ رسالہ ہندوستان کے ہر صوبے میں کالجوں اور اسکولوں میں جاتا ہے
ہر ماہ ہزاروں اشخاص بڑے شوق سے پڑھتے ہیں

المشتہر معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

سرحد کا سب سے پرانا حریت پسند اخبار

ترجمانِ سرحد (پشاور)

۱۔ جنوری ۱۹۱۶ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہی اور صوبہ سرحد کے صدر مقام پشاور سے شائع ہوتا ہی۔
۲۔ آزادیٔ وطن کا داعی اور اسلامی مفاد کا نگہبان ہے۔
۳۔ صوبہ سرحد اور ملحقہ اسلامی ممالک کی سیاست کا آئینہ ہی۔
۴۔ سرحد میں اصلاحات کا نفاذ اور سرحدی سیاہ قوانین کی منسوخی ترجمان سرحد کی مسلسل اور منظم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سرحد اور ہندوستان کی قومی تحریکات کا ہمیشہ علمبردار رہا ہے۔

سرحدی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے خریدار بن کر سرحدی تحریکوں اور خبروں سے صحیح طور پر آگاہ رہ سکتے ہیں! اور صوبہ سرحد علاقہ آزاد و افغانستان اور بلوچستان پنجاب کے ملحقہ علاقہ جات میں اشتہار پسندوں کے لئے تشہیر کا بہترین ذریعہ ہی۔ چندہ رعایتی للعہ ششماہی عہ

منیجر ترجمان سرحد پشاور

دنیا بھر میں اسلامی خدمت بجا لانے والا، ماہوار میگزین

ریویو آف ریلیجنز (انگریزی)

جو سنہ ۱۹۰۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہی اور ہر ماہ کی دس تاریخ کو شائع ہوتا ہی۔ اس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور جو غلطیاں اور غلط فہمیاں دیگر مذاہب نے اسلام کے متعلق پھیلائی ہیں۔ ان کو دور کر کے اس عالمگیر مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنا اور دیگر مذاہب پر تحقیقی تبصرہ اور موجودہ زمانے کے فلسفیانہ اور مذہبی رجحانات پر نظر رکھتا ہے۔

چندہ سالانہ صرف چار روپیے (للعہ)

نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جاتا ہی

دفتر ریویو آف ریلیجنز انگریزی قادیان (پنجاب)



OKASA
کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے
اوکاسا استعمال کیجئے
اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست اوکاسا ڈپو

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۶ - نمبر ۵	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۴۲ء	چندہ سالانہ لاصہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

سے

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندستانی اکیڈمی
الہ آباد، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی،
انڈین پریس الہ آباد اور دیگر تقریباً تمام اداروں کی
مطبوعات اصلی قیمت پر مل سکتی ہیں۔

اگر آپ اُردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہیں تو اُردو اکادمی کی ممبری قبول فرمائیے
اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے۔

"ایران بعہد ساسانیاں"

"ایران بعہد ساسانیاں":- یہ ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین پروفیسر السنہ شرقیہ کوپن ہیگن یونیورسٹی (ڈنمارک) کی فرانسیسی تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر فارسی اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اردو میں کیا ہے اور جسے انجمن ترقیِ اردو (ہند) دہلی نے سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع کیا ہے۔

ترجمہ کا آغاز دیباچۂ مترجم سے ہوتا ہے جس میں مصنف کے مختصر حالاتِ زندگی اور کتاب کے موضوع کی نوعیت اور اہمیت کا بیان ہے۔ ترجمہ کی ضخامت ۷۷۶ صفحات ہے۔

ڈاکٹر آرتھر کرسٹن سین ۱۸۷۵ء میں ڈنمارک میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کوپن ہیگن اور گوٹنگن (جرمنی) یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور آخر الذکر یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۰۳ء میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے کوپن ہیگن یونیورسٹی میں السنہ شرقیہ کے پروفیسر ہیں "ایران اور ایرانیات" میں اپنے وسیع مطالعہ کی بناء پر متعدد کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار علمی مضامین یورپ کے مختلف موقر جرائد میں شائع کر چکے ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ساسانی عہد (سنہ ۲۲۶ء تا سنہ ۶۵۲ء) کی لڑائیوں کے حالات پر مشتمل نہیں بلکہ یہ اُس عہد کے تمدن کی مفصل تاریخ ہے جس میں اس عہد کے اجتماعی اور تمدنی حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور اس ضمن میں بہت سی بیش قیمت معلومات علمی دنیا کے سامنے آگئی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے اس ضخیم کتاب کو اردو میں منتقل کر کے ادب اردو کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ایسی ضخیم اور علمی کتاب کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کی مشکلات کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے خود اس دشت کی وادی میں قدم رکھا ہو۔

اس سلسلہ میں علمی دنیا کو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سیکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جنھوں نے اس کتاب کو انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل کیا ورنہ بقول مترجم "اس کی اشاعت ممکن نہ تھی کیونکہ ایسی علمی کتابوں کے خریداروں کی تعداد ملک بھر میں بہت ہی کم اور حوصلہ فرسا ہے"۔

دیباچہ مترجم، فہرست مضامین اور فہرست تصاویر کے بعد ساسانی خاندان کا شجرۂ نسب بجناب مترجم کا ایک مفید اضافہ ہے۔

اصل کتاب کا آغاز مصنف کے مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کی تصنیف کے اسباب بیان کیے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے تیس برس پیشتر وہ ایک اور کتاب موسوم "شہنشاہی ساسانیاں" شائع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس طویل عرصہ میں بہت سا تاریخی مواد فراہم ہوا جو ساسانی عہد کے تمدن کی تاریخ کے لیے مفید ہونے کے علاوہ اس عہد کے فنون و مذاہب پر بھی روشنی ڈالتا تھا اس لیے انھوں نے یہ خیال کیا کہ بجائے اس کے کہ اسی پرانی کتاب کا نیا اڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد شائع کریں بہتر یہ ہے کہ ساسانی عہد کے تمدن کا از سر نو عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ایک مستقل کتاب تصنیف کریں مصنف نے صورتِ کتاب کی ایک دلچسپ مثال پیش کی ہے کہ یہ کتاب ساسانی ایران کی ایک عام تاریخ ہے جس میں سیاسی تاریخ بمنزلہ ایک فریم کے ہے جس کے اندر ساسانی تمدن کے مختلف پہلوؤں کی متعدد تصویریں ہیں۔

یہ کتاب تمہید (جس میں دو فصلیں ہیں) دس ابواب خاتمہ، دو ضمیمے، اضافات اور چار فہرستوں پر مشتمل ہے۔

تمہید کی فصل اول میں ساسانی خاندان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے تمدن ایران کی کیفیت ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول میں سلطنت اشکانی (۲۵۰ق م تا ۲۲۶ء) کی سیاسی اور اجتماعی ساخت کا بیان جس میں ایران کے خاندانی اور منصبداری نظام کی وضاحت کی گئی ہے حصۂ دوم میں ان اقوام کے حالات ہیں جنھوں نے سکندر اعظم کے حملۂ ایران (۳۳۰ق م) کے بعد ایران کے شمال مشرق میں

اپنی حکومتیں قائم کیں۔ حصہ سوم میں مذہبی افکار و عقاید کی تفصیل ہے جس میں ایران کے قدیم مذہب کے آغاز کے بعد زرتشتی مذہب پر تبصرے کے ضمن میں عہد اشکانی میں عیسائیت، عرفانیت اور بدھ مذہب کے متعلق چند اہم حقایق پیش کیے گئے ہیں۔ حصہ چہارم میں اس عہد کے ادبی اور عامیانہ زبانوں کا بیان ہے۔

فصل دوم میں ساسانی عہد کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کے ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ یہ فصل چھ حصوں میں منقسم ہے۔

حصہ اول میں خاص ایرانی ماخذ کے ساتھ ادبیاتِ پہلوی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ساسانی کتبوں، سکوں اور کتابوں کا ذکر ہے۔ حصہ دوم میں ساسانی روایات کا بیان ہے جو فارسی اور عربی ادبیات میں محفوظ ہیں۔ عربی اور فارسی مورخین نے جن پہلوی کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) خوذائے نامک (۲) آئین نامک (۳) تاج نامک (۴) نامۂ تنسر (۵) پیشینگان نامک (۶) مزدک نامک اور (۷) وہرام چوبین نامک۔

حصہ سوم میں یونانی اور لاطینی ماخذ کا بیان ہے۔ یونانی مصنفین کو ایران کے ساتھ صرف وہیں تک دلچسپی ہے جہاں تک کہ اس کے تعلقات سلطنت روم کے ساتھ تھے اور بالخصوص انھوں نے روم اور ایران کی باہمی جنگوں کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

حصہ چہارم میں ارمنی ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ ساسانی عہد میں تاریخ ارمنستان کا تاریخ ایران کے ساتھ خاص تعلق تھا اور ارمنی مورخین نے ساسانی بادشاہوں کے بہت سے قیمتی حالات اور ایران کے آئین و آداب، مذہب اور تمدن کے متعلق کافی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔

حصہ پنجم میں سریانی ماخذ کی تفصیل ہے۔ سریانی زبان میں متعدد تصانیف عیسائی مذہب پر ایسی موجود ہیں جن میں ساسانی عہد کے سیاسی اور تمدنی حالات ملتے ہیں۔ ان میں سے چار اہم کتابیں معاصر مصنفین کی تصنیفات ہیں۔

حصہ ششم میں چینی ماخذ کا ذکر ہے جو بدھ مذہب کے ایک زائر اور چینی سیاح کے سفرنامہ

مشتمل ہے جس میں ایران کے متعلق مختصر حالات ہیں۔

باب اوّل میں ساسانی خاندان کی بنیاد کے حالات ہیں جن میں اشکانی خاندان کا خاتمہ، ساسانی خاندان کے بانی اردشیر کی تاجپوشی اور اس کی شخصیت کا بیان ہے۔

باب دوم آٹھ حصوں میں منقسم ہے اور مضامین کی نوعیت سے بہت اہم ہے۔

حصہ اول میں ساسانی حکومت کی خصوصیات اور سیاسی اور معاشرتی جماعت بندی کا بیان ہے۔ سوسائٹی کی تقسیم چار طبقوں میں (۱) علمائے مذہب (۲) سپاہی (۳) عمال حکومت اور (۴) عوام الناس جن میں زراعت پیشہ اور اہل حرفت و تجارت بھی شامل ہیں۔ ہر طبقہ کے خاص حالات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

حصہ دوم میں مرکزی حکومت کے نظم و نسق کا بیان ہے جس میں وزیر اعظم (جس کا لقب "بزرگ فرمذار" تھا) کا عہدہ اور اس کے فرائض بتائے گئے ہیں۔

حصہ سوم میں نظام مذہب یا زرتشتی کلیسا کا بیان ہے۔ علمائے مذہب کا رئیس جس کا تقرر بادشاہ کے اختیار میں ہوتا تھا "موبذان موبذ" کہلاتا تھا اور تمام امور کلیسا کا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا آتش کدوں میں مراسم عبادت کے ادا کرانے کا انتظام "ہیربذوں" کے سپرد تھا اور ان کا رئیس "ہیربذان ہیربذ" کہلاتا تھا موبذان موبذ کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ زرتشتی کلیسا کے دوسرے عہدہ داروں کے حالات و فرائض بھی اسی حصہ میں بیان کیے گئے ہیں

حصہ چہارم میں مالیات اور ان کے ذرائع کی تفصیلات ہیں۔ مالیات کا اعلیٰ افسر "واستریوشان سالار" کہلاتا تھا۔ مالیات کے علاوہ دست کاری کے ٹیکس کی وصولی بھی اسی کے ذمے تھی۔

حصہ پنجم میں صنعت و حرفت، تجارت اور آمد و رفت کے ذرائع بیان کیے گئے ہیں۔ اس حصہ میں مختلف قسم کی صنعت و حرفت کے علاوہ ساسانی عہد کی تجارت اور ذرائع حمل و نقل کی بھی تفصیل ہے۔

حصہ ششم میں فوج اور فوجی تنظیمات کا بیان ہے۔ ایران کا سپہ سالار "ایران سپاہبذ" کہلاتا تھا اس کا حلقۂ عمل بہت وسیع تھا۔ سپہ سالار کے علاوہ وزیر جنگ کا عہدہ بھی اسی کے سپرد تھا اور صلح

کا لشکر تابعی اسی کے اختیار میں تھا۔ چونکہ ساسانی بادشاہ اکثر خود جنگوں میں حصہ لیتے تھے اس لیے جنگجو بادشاہوں کے ماتحت اس کو اپنے اختیارات میں کچھ زیادہ آزادی نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ کی محافظ فوج کا اعلیٰ افسر پشتیگ بان سالار کہلاتا تھا۔

حصہ ہفتم میں سلطنت کے دبیروں (جو دِبہیران کہلاتے تھے) اور مرکزی حکومت کے دوسرے عہدہ داروں کا بیان ہے۔ دبیری کے فرائض کی وضاحت میں مصنف نے چہار مقالہ عروضی سمرقندی کی وہ عبارت نقل کی ہے جس میں نظامی عروضی نے دبیروں کے فرائض اور دربار شاہی میں اس کی اہمیت بتائی ہے۔ شاہی دبیروں کا رئیس "ایران دِبہیربذ" یا "دبہیران مہشت" کہلاتا تھا

• مرکزی حکومت کے دوسرے عہدہ داروں میں علاوہ ہزاربذ، موبذان موبذ، ہیربذان ہیربذ، داستریوشان سالار، ایران سپاہ بذ، پشتیگ بان سالار، اور ایران دبہیربذ کے استبذ (میر تشریفات)، اندرزود اسپرگان (معلم اہل بیوتات)، اندرزبذ (منتظم دربار)، مغان اندرزبذ (معلم مغاں)، سگستان اندرزبذ (معلم امور سیستان)، رئیس محکمہ اطلاعات، محافظ دفتر تاریخ بادشاہی تھے۔

حصہ ہشتم میں صوبوں کی حکومت کی تفصیل ہے۔ صوبوں کے حاکموں کا انتخاب اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا تھا اور وہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ سرحدی صوبوں کے حاکم "مرزبان شہر دار" اور اندرون صوبوں کے حاکم "مرزبان" کہلاتے تھے۔ ایام جنگ میں "مرزبان" سپاہ بذوں کے ماتحت سالاران لشکر کے فرائض انجام دیتے تھے۔

باب سوم میں دین زرتشتی کی تفصیل ہے جو حکومت کا مذہب تھا۔ ساسانی عہد میں حکومت اور مذہب کے درمیان گہرا تعلق قائم رہا۔ ساسانی خاندان کے بانی اردشیر اول کے حکم سے ہیربذان ہیربذ نے اشکانی اوستا کے پراگندہ اجزا کو جمع کیا اور یہ نئی تالیف مستند قرار دی گئی لیکن بعد میں شاپور دوم ([illegible] تا [illegible]) کے عہد میں موبذان موبذ کے زیر ہدایت اوستا کا متن قطعی طور پر معین کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مصنف نے عہد اسلامی میں ساسانی اوستا کے اکثر حصہ کے تلف ہو جانے کے وجوہ بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد نظام مذہب کے تحت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عناصر کی پرستش دین

زرتشتی کی اصولی خصوصیت رہی ہے اور ان عناصر میں آگ کا مرتبہ سب سے بلند ہے مسئلہ آفرینش مسلم کائنات اور مسائل معاد کا بھی مفصل بیان ہے۔ اسی باب میں مشہور آتشکدوں کا ذکر ہے جو ساسانی عہد میں ایران کے مختلف مقامات میں تھے۔ ساسانی عہد کی تقویم، مشہور موسمی تہواروں اور علم نجوم کا بیان بھی اسی باب میں ہے۔ زرتشتی سال کے بارہ مہینوں کے نام بڑے بڑے خداؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں (۱) فروردین (۲) اُرْدِوَہشت (۳) خورداد (۴) تیـــر (۵) امرداد (۶) شہریور (۷) مہر (۸) آبان (۹) آذر (۱۰) دَی (۱۱) وہمن (۱۲) سپندارمذ۔ ہر مہینہ تیس دن کا ہے اور دنوں کے نام بھی زرتشتی دیوتاؤں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ بارہ مہینوں کے تین سو ساٹھ دنوں کے بعد پانچ دن آخری مہینہ کے بعد بڑھا دیے جاتے ہیں۔ گاہان بار (موسمی تہوار) جو بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائے جاتے تھے تعداد میں چھ ہیں اور ان کی کیفیت بہت دلچسپ ہے۔

باب چہارم میں مانی پیغمبر اور اس کے مذہب کی تفصیل ہے۔ مانی ایرانی النسل اور ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ماں اشکانی خاندان سے تھی۔ اس کا باپ فاتک ہمدان کا رہنے والا تھا۔ مانی سنہ ۲۱۶ء میں پیدا ہوا تحصیلات علمی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے زمانے کے مشہور مذاہب (۱) زرتشتیت (۲) عیسائیت اور (۳) عرفانیت کا گہرا مطالعہ کیا جس کے نتیجہ میں ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی اور "فارقلیط" ہونے کا دعویٰ کیا جس کے آنے کی خبر حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔ مانی کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ سابقہ مذاہب کے اکمال کے لیے آیا ہے اور خاتم النبیین ہے۔ اس باب میں مانی کی تعلیمات، مانویوں کی مذہبی معاشرت اور ان کے کلیسا کے نظام پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مانوی تعلیمات کو شروع میں بڑی کامیابی ہوئی وہ اردشیر اول کے عہد ہی میں اس کے بیٹے شاپور کا مورد عنایت بن گیا تھا اور شاپور کے دو بھائی مہرشاہ اور پیروز بھی اس کے مرید تھے۔ تخت نشینی کے دس سال بعد شاپور اول مانی کا مخالف ہو گیا اور مانی جلاوطن ہو کر کئی سال تک وسط ایشیا میں سرگرداں رہا۔ شاپور اول نے سنہ ۲۷۲ء میں وفات پائی اور اس کا جانشین ہرمزد اول دوسرے سال فوت ہوا۔ ہرمزد اول کے بھائی بہرام اول کے عہد میں مانی ایران آیا۔ سنہ ۲۷۶ء میں مجمع عام میں موبذان موبذ اور مانی کے درمیان ایک مباحثہ ہوا جس

کو شکست ہوئی اور الحاد کے جرم میں قید کی سزا پائی اور قید خانے ہی میں مرگیا۔ مانی کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں (۱) کتاب الاسرار (۲) کتاب الاثنین (۳) رسالۃ الاصل (۴) انجیل زندہ (۵) کنز الحیوا ۃ (۶) کتاب المواعظ۔ باوجود ان اذیتوں کے جو مانویوں کو ایران میں موبدوں کے ہاتھ سے پہنچیں ان کا مذہب مٹ نہ سکا اور مخفی طور پر زندہ رہا۔ اسی باب کے آخر میں مانویوں کی صناعی کا بھی مختصر ذکر ہے۔

باب پنجم میں سلطنت شرق (یعنی شہنشاہی ساسانیاں) اور سلطنت غرب (یعنی رومن امپائر) کے تاریخی واقعات ہیں شہنشاہی ساسانیاں کے سلسلہ میں اس خاندان کے پہلے بارہ بادشاہوں کے مختصر حالات ہیں۔ اس باب کے آغاز میں ساسانی حکومت کی فوجی تنظیم کا بیان ہے جو اگرچہ قدیم منصبداری کے طریقے پر تھی لیکن نئے حالات اور نئی ضرورتوں کے مطابق اس میں مناسب ترمیمیں کی گئیں۔ فوج کا سب سے اعلیٰ حصہ زرہ پوش سواروں کا دستہ تھا جو اعلیٰ خاندانوں کے شہسواروں پر مشتمل تھا۔ میدان جنگ میں رسالہ فوج سب سے آگے رہتی تھی اور فتح و ظفر اسی کی قوت اور شجاعت پر موقوف ہوتی تھی۔ رسالہ فوج کے پیچھے ہاتھیوں کی صف ہوتی تھی جن کی ڈراؤنی صورتیں چنگھاڑیں اور جسم کی بدبو دشمن کے گھوڑوں کے لیے خوف کا باعث ہوتی تھی۔ ہاتھیوں کے پیچھے پیادہ فوج ہوتی تھی۔ پیادہ سپاہی جاگیرداروں کے خدام ہوتے تھے جو بغیر کسی معاوضے کے فوجی خدمات انجام دیتے تھے۔ ان کے علاوہ امدادی فوجیں بھی ہوتی تھیں جو اطراف سلطنت کی جنگجو قوموں کی طرف سے لڑنے کے لیے آتی تھیں۔ اور ان کو امتیازی درجہ حاصل تھے۔ ساسانی عہد میں ایران کا قومی جھنڈا "درفش کاویانی" تھا۔ اہم لڑائیوں میں جب بادشاہ بذات خود فوج کی کمان کرتا تھا تو اس کے لیے قلب لشکر میں ایک بڑا تخت نصب کیا جاتا تھا جس کے گرد بادشاہ کے قدم و حشم کھڑے ہوتے تھے اور فوج کا ایک خاص دستہ اس کی نگہبانی کے لیے مامور ہوتا تھا جس کا فرض تھا کہ تا دم زیست اس کی حفاظت کریں تخت کے چاروں کونوں پر جھنڈے گاڑے جاتے تھے اور ان کے باہر کی طرف تیراندازوں اور پیادہ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا۔ بادشاہ کی عدم موجودگی میں سپہ سالار ایران اسی تخت پر بیٹھتا تھا۔ ایک خاص خیمہ کے اندر مقدس آتشدان رکھے جاتے تھے کیونکہ شاہ آتشدانوں اور موبدوں کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا

ساسانی عہد میں ایرانیوں نے فنون محاصرہ رومیوں سے سیکھے تھے۔ چنانچہ محاصروں میں قلعہ شکن گرز، منجنیقیں اور متحرک برج استعمال کرتے تھے۔ قلعہ شکن ہتھیاروں کو کمند سے پکڑتے تھے اور ان پر پگھلا ہوا سیسہ اور آتش گیر مادے پھینکتے تھے۔ ایران پر حملہ ہونے کی صورت میں ایرانی اناج کے کھیتوں کو آگ لگا دیتے تھے تاکہ دشمن کو رسد نہ مل سکے جنگی قیدیوں کو غلاموں کے طور پر بھیجتے تھے یا ملک کے غیر آباد علاقوں کو آباد کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔

اس کے بعد اس باب میں ایران اور روم کی باہمی جنگوں کے مختصر تاریخی واقعات ہیں جن کا آغاز اردشیر اول کے عہد میں ہوا۔ شاپور اول کے عہد میں سنہ ۲۶۰ء میں قیصر روم ویلرین بذات خود ایران کے خلاف لشکر لے کر آیا اور شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ شاپور اول نے ویلرین پر اپنی فتح کو نقش رستم اور اصطخر میں بہت سی پتھر کی یادگاروں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ شاپور اول کے بعد کئی ساسانی بادشاہوں کے عہد حکومت میں ایران اور روم میں لڑائیاں جاری رہی ہیں جن میں زیادہ مشہور وہ لڑائیاں ہیں جو شاپور دوم (سنہ ۳۰۹ء تا سنہ ۳۷۹ء) کے عہد حکومت میں چالیس سال تک جاری رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنف نے ایک رومی مورخ امیتان کی واقعہ نگاری کی تعریف کرتے ہوئے اس کا ایک طویل بیان نقل کیا ہے اور اسی باب کے آخر میں شاپور دوم کی بلند شخصیت بہت تفصیل سے بیان کی ہے۔

باب ششم میں ایران کے عیسائیوں کے مفصل حالات ہیں۔ اس باب کے آغاز میں زرتشتی علما و امرا کی طاقت اور زرتشتی کلیسا کے عروج کا بیان ہے اور اس کے بعد ایران میں یہودیوں اور عیسائیوں کے عام حالات کے ساتھ ساتھ شاپور دوم (سنہ ۳۰۹ء تا سنہ ۳۷۹ء) اور بہرام پنجم (سنہ ۴۲۱ء تا سنہ ۴۳۹ء) کے عہد حکومت میں جو مظالم عیسائیوں پر روا رکھے گئے ان کی تفصیل ہے۔

جب تک سلطنت روم لامذہب رہی ایران کے عیسائی امن میں رہے لیکن جوں ہی قیصر قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کیا صورت حالات بدل گئے۔ اس وقت سے ایران کے عیسائی جن کی تعداد ان سرحدی صوبوں میں زیادہ تھی جو سلطنت روم کے متصل تھے ایک طاقت کے گرویدہ ہو گئے اور رومیوں کی حمایت کے شبہ میں عیسائیوں کے رئیس سائمن کو سنہ ۳۴۱ء میں قتل کیا گیا۔

مذکورہ بالا صوبوں میں بہت ۔۔۔ خونریزی اور قتل عام ہوا اور بہت سے لوگ جلا وطن کئے گئے۔ عیسائیوں پر جن مظالم کا آغاز سنہ ۳۳۹ء میں ہوا اس کا خاتمہ شاپور دوم کی وفات پر سنہ ۳۷۹ء میں ہوا۔

بہرام پنجم کے عہد حکومت میں عیسائیوں پر نئے مظالم کا آغاز ہوا جس کی تمام تر ذمہ داری موبذان موبذ مہر شاپور پر تھی اور مغربی سرحدی صوبوں کے عیسائی ایک کثیر تعداد میں بازنطینی علاقوں میں بھاگ گئے۔ بہرام پنجم کے بعد یزدگرد دوم (سنہ ۴۳۸ء تا سنہ ۴۵۷ء) کے عہد حکومت میں بھی عیسائیوں پر بہت سختی کی گئی اور سنہ ۴۴۶ء میں مغربی سرحدی صوبوں کے تمام سربرآوردہ عیسائیوں کو قید کرکے ترک مذہب پر مجبور کیا گیا جن میں سے اکثر ترک مذہب سے انکار کی وجہ سے سخت عذاب دے کر مارے گئے ان مقتولین میں یوحنا اسقف اعظم بھی تھا۔

اس باب کے آخر میں سلطنت ایران کے نظام عدالت کا مفصل بیان ہے۔ ملکی عہدوں میں حاکم عدالت کا عہدہ بہت ممتاز تھا چیف جج "شہر داذ ور" یا "داذوران داذور" کہلاتا تھا حکام عدالت کے علاوہ موبذ اور ہیربذ بھی ججوں کی حیثیت سے قانونی فیصلے صادر کیا کرتے تھے۔ صیغۂ عدالت کے انتہائی اختیارات خود بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ بادشاہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات ناقابل تنسیخ ہوتی تھی اگر مقامی عدالتوں میں کسی شخص کی داد رسی نہ ہوتی تو عدالت شاہی کا دروازہ اس کے لیے ہمیشہ کھلا تھا۔ ساسانی خاندان کے ابتدائی بادشاہوں کے ہاں یہ رسم تھی کہ سال میں دو مرتبہ یعنی جشن نوروز اور جشن مہرگان کے موقع پر دربار عام منعقد کرتے تھے جس میں ہر خاص و عام کو حاضر ہونے کی اجازت ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر منجملہ دیگر شکایات کے ایسی شکایات بھی پیش کی جاتی تھیں جو بادشاہ کے خلاف ہوتی تھیں اور عدل و انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس رسم کو ساسانی خاندان کے تیرھویں بادشاہ یزدگرد اول (سنہ ۳۹۹ء تا سنہ ۴۲۰ء) نے منسوخ کیا۔ اس سبب سے علماء مذہب کو اس سے بہت نفرت تھی۔

قانون میں تین جرائم کے جرم تسلیم کیے جاتے تھے (۱) جو خدا کے خلاف ہوں یعنی جب کوئی شخص مذہب سے برگشتہ ہو جائے یا مذہب میں بدعت پیدا کرے (۲) جو بادشاہ کے خلاف ہوں یعنی جب کوئی شخص

بغاوت یا غداری کرے یا میدان جنگ سے بھاگ جائے (۳) جو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہوں یعنی جب ایک شخص دوسرے پر ظلم کرے۔ عہد ساسانی کی ابتدائی صدیوں میں پہلی اور دوسری قسم کے جرائم کی سزا زیادہ تر موت تھی اور تیسری قسم کے جرائم کی سزا بھی جسمانی عقوبت اور کبھی موت ہوتی تھی ایسے ذی مرتبہ اشخاص کو جن کا وجود سلطنت اور بادشاہ کے لیے خطرے کا باعث ہوتا تھا خوزستان کے ایک قلعہ میں جس کا نام "گیل گرد" یا "اندمش" تھا قید کیا جاتا تھا۔ ایک بہت عام سزا جو باغی شہزادوں کو دی جاتی تھی یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروا کر یا کھولتا ہوا تیل ڈلوا کر اندھا کر دیا جاتا تھا سزائے موت کا اجرا عام طور پر بذریعہ شمشیر کیا جاتا تھا۔ ملحدوں اور باغیوں کو سولی پر چڑھایا جاتا تھا۔ بعض حالات میں زندہ کھال کھچوانے کا بھی دستور تھا۔ عیسائیوں پر مظالم کے زمانے میں شہدا کو کبھی کبھی سنگسار بھی کیا گیا ہے یا زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا ہے۔ بعض مجرموں کو ہاتھیوں کے پاؤں تلے بھی روندوایا جاتا تھا منجملہ دیگر جسمانی عذابوں کے جن کی تفصیل اس باب کے آخر میں دی ہوئی ہے سب سے دہشت ناک عذاب تھا۔ جس کا نام "نُہ موتیں" تھا اس کی صورت یہ تھی کہ جلاد سب سے پہلے ہاتھوں کی انگلیاں کاٹتا تھا اس کے بعد پاؤں کی، پھر کلائیوں تک ہاتھ کاٹتا تھا اور ٹخنوں تک پاؤں اس کے بعد کہنیوں تک بازو اور گھٹنوں تک ٹانگیں، پھر کان اور ناک کاٹتا تھا اور سب سے آخر میں سر اور مقتولوں کی لاشیں وحشی جانوروں کے آگے ڈال دی جاتی تھیں۔

باب ہفتم میں تحریک مزدکی کا بیان ہے لیکن اس باب کے آغاز میں ساسانی عہد میں ایرانیوں کی معاشرتی حالت، سوسائٹی کے مختلف طبقے اور قانون دیوانی کا بیان ہے۔ ایرانی سوسائٹی کی بنیاد دو چیزوں پر تھی ایک نسب اور دوسرے جائداد۔ امرا اور عوام الناس کے درمیان نہایت محکم حدیں قائم تھیں دونوں کی سواری، لباس، مکان، عورتوں، خدمت گاروں میں خاص امتیاز تھا۔ ساسانی سیاست کا ایک پختہ اصول یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے رتبے سے بلند رتبے کا خواہاں نہ ہو جو اس کو نسب کی رو سے حاصل ہے۔ امرا کے نسب کی پاکی اور غیر منقولہ جائدادوں کی محافظت قانون کے ذمے تھی جو عوام الناس

لـه نُہ موتوں کی سزا عہد حاضر میں گزشتہ انقلاب افغانستان کے دوران میں بچہ سقہ کے حکم سے کابل میں ایک شخص کو دی گئی تھی۔

امرا کی جائداد خرید نہیں سکتے تھے اور نہ ہی کوئی ادنیٰ طبقہ کا آدمی حکومت کا کوئی عہدہ پا سکتا تھا لیکن ادنیٰ طبقہ کا کوئی فرد اگر غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا مالک ہوتا تھا تو اسے ترقی دی جاتی تھی شہری بھی کسانوں کی طرح جزیہ دیتے تھے لیکن ان کو فوجی خدمت معاف تھی۔ کسانوں کی حالت خراب تھی کاشتکاری کے علاوہ اُن سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی تھی۔

دیوانی قانون کے مطابق خاندان کی بنیاد تعدد ازدواج پر تھی البتہ بیویوں میں سے ایک بڑی بیوی "ایک خدمت گار بیوی" ہوتی تھی۔ اور دونوں کے قانونی حقوق مختلف تھے۔ شوہر کو اس بات کا اختیار تھا کہ ایک قانونی وثیقے سے بیوی کو اپنی جائداد میں حصہ دار بنا لے۔ زرتشتی سوسائٹی میں متبنیٰ بنانے کی رسم بھی بہت عام تھی اور اس کی تین قسمیں تھیں (۱) متبنیٰ موجود یعنی بیوی یا اکلوتی کنواری لڑکی (۲) متبنیٰ معہود یعنی جس کو متوفی نے خود نامزد کیا ہو۔ اور (۳) متبنیٰ مامور یعنی جس کو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں نے انتخاب کیا ہو۔ وراثت کی تقسیم میں بیوی اور بیٹوں کو برابر برابر حصہ ملتا تھا اور کنواری بیٹی کا حصہ ان کی نسبت نصف ہوتا تھا۔

پانچویں صدی کے آخر میں مزدکیت نے مذکورہ بالا نظام معاشرت کی بنیادوں کو ہلا ڈالا اور سیاسی حادثات نے اس انقلاب انگیز تحریک کے لیے حالات کو بہت موافق بنا دیا۔

مزدکی فرقہ کے بانی کی شخصیت کے متعلق بہت سا اختلاف ہے لیکن اس فرقہ کا حقیقی بانی زرتشت ابن خورگان تھا جو شہر پسا صوبہ فارس کا رہنے والا تھا۔ مزدک زردشت کا خلیفہ تھا جس کی شہرت سے فرقہ کے اصلی بانی کا نام ماند پڑ گیا اور اس فرقہ کا نام "فرقہ مزدکیہ" مشہور ہوا۔ زردشت اور مزدک کی تعلیم مانوی مذہب کی اصلاح تھی۔ مصنف نے "مانویت" اور "مزدکیت" کا مقابلہ کرنے کے بعد مزدکیوں کے انقلاب انگیز عقاید تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ کواذ اول نے جو ۴۸۸ء میں تخت نشین ہوا مزدکی عقاید سے متاثر ہو کر مزدکی مذہب اختیار کر لیا اور مزدک کے اصولوں پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۴۹۶ء میں اس کے خلاف محل میں ایک انقلاب برپا ہوا اور وہ معزول کر کے قید کر دیا گیا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ قید سے نکل کر فرار ہوگیا اور ہیتالیوں کے بادشاہ کی مدد سے سنہ ۵۰۱ء میں بغیر جنگ کے اس نے اپنا تخت واپس لے لیا اور اپنی شاہانہ طاقت کو زیادہ استوار کیا۔ کواذ اول کے عہد حکومت کا دوسرا دور بہت کامیاب رہا اور مزدکیوں کی فتنہ پردازیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ اس کی مخالفت ہوگئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بادشاہ کی مرضی کے خلاف شہزادہ خسرو کو ولیعہدی سے محروم کرنے اور شہزادہ کاؤس بذشخوارشاہ (جو مزدکیوں کا طرفدار تھا) تخت ایران کا وارث بنانے کی کوشش کی جس سے بادشاہ کے صبر کا پیالہ لبریز ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۵۲۹ء کے آغاز میں ایک مذہبی کانفرنس منعقد کی گئی۔ فرقہ مزدکیہ کا اندرزگر (رئیس اعلیٰ یعنی خود مزدک) اور باقی پیشوا اور مزدکیوں کی ایک کثیر تعداد مباحثہ میں شریک ہوئی۔ اس کانفرنس کا پورا انتظام بادشاہ اور ولیعہد شہزادہ خسرو کے ہاتھ میں تھا۔ موبذان موبذ کے علاوہ بہت سے قابل موبذ مباحثہ میں شریک ہوئے۔ مزدکیوں کو شکست ہوئی اور ان کو قتل کر دیا گیا۔ مقتولین کی صحیح تعداد غیر معین ہے۔ اس کے بعد ان کو قانون کی حمایت سے محروم کیا گیا اور دوبارہ ان کا قتل عام شروع ہوا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کی مذہبی کتابیں جلا دی گئیں اور اس طرح اس خطرناک مذہبی تحریک کا خاتمہ ظاہراً طور پر ہوا اگرچہ اس کا وجود ایک خفیہ مذہب کی حیثیت سے باقی رہا اور عہد اسلامی میں دوبارہ ظاہر ہوا۔

باب ہشتم۔ کواذ اول کے جانشین خسرو انوشیرواں (سنہ ۵۳۱ء تا سنہ ۵۷۹ء) کے عہد حکومت پر ہے اور اپنے مطالب کی اہمیت کی بنا پر ایک سو نو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ خسرو اول تاریخ میں انوشیرواں (انوشگ رُواں یعنی روح جاوید کا مالک) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تخت نشینی سے ساسانی تاریخ میں درخشاں ترین عہد کا آغاز ہوا۔ مزدکیوں کی خطرناک بدعت کا خاتمہ ہوا اور ملک کے اندر دوبارہ امن و امان قایم ہوا۔ بادشاہ سلطنت کے تمام اختیارات جامع تھا اور امرا کے علاوہ علمائے مذہب بھی اس کے تابع فرمان تھے۔ خسرو اول کی اصلاحات کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس بدنظمی کا تدارک کیا گیا جو مزدکی فتنہ پردازوں نے پھیلائی تھی۔ بالخصوص ہر قسم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں جو مزدکیوں نے غصب کر لی تھیں اصل مالکوں کو واپس کرائی گئیں۔ تمام مزدو [illegible] کی [illegible]

کر کے لگان کی نئی شرحیں مقرر کی گئیں جو کاشتکاروں اور زمینداروں کی آسودگی کا باعث ہوئیں اور شاہی خزانہ میں مستقل آمدنی کا اضافہ ہوا۔ شخصی ٹیکس میں بھی اصلاح کی گئی۔

اصلاح مالیات کے محکمہ فوج میں اصلاح کی گئی۔ عرض سپاہ کا قاعدہ جاری کیا گیا۔ نادار سواروں کو گھوڑے اور ہتھیار مہیا کیے گئے اور ان کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ متعدد جنگجو قوموں کو مطیع کر کے نئے شہروں میں آباد کیا گیا اور ان کو فوجی خدمت پر مامور کیا گیا۔ ایران سپاہ بذ کا عہدہ منسوخ کر کے چار سپاہ بذ مقرر کیے گئے جو فوج کے مستقل سردار قرار پائے اور ان میں سے ہر ایک سلطنت کے چوتھے حصے کی فوجوں پر مقرر کیا گیا۔ اس تقسیم سے بادشاہ کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت کے ہر حصے میں باقاعدہ فوجیں موجود رہیں جن سے ایام جنگ میں کام لیا جا سکے۔

سنہ ۵۴۰ء سے سنہ ۵۶۲ء تک ایران اور روم میں مسلسل جنگ رہی اور سنہ ۵۶۳ء سے ۵۶۷ء تک خسرو اول نے ہپتالیوں کی سلطنت کا خاتمہ کیا۔ سنہ ۵۷۰ء میں یمن فتح ہوا اور سنہ ۵۷۲ء سے لے کر خسرو اول کی وفات (سنہ ۵۷۹ء) تک دوبارہ ایران اور روم میں مسلسل جنگ رہی۔

ان واقعات کے بعد مصنف نے خسرو اول کی شخصیت کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے عدل و انصاف کے متعلق متعدد حکایتیں نقل کی ہیں۔

خسرو اول نے ایران کے پایہ تخت "طیسفون" کو بہت وسعت دی اور اس کے نواح میں نئے شہر آباد کیے اور محلات تعمیر کرائے۔ اسی سلسلے میں مصنف نے مشہور "طاق کسریٰ یا ایوان کسریٰ" کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ طاق خسرو کے محل میں دربار کا ہال کمرہ تھا۔ محل کا رقبہ ۳۰۰ × ۴۰۰ میٹر ہے۔ تمام عمارات میں صرف طاق کے بہت سے آثار اب تک باقی ہیں۔ اس کے سامنے کا رخ ۹۱ گز وہ بچا ہے۔ اس میں ایک دیوار ہے جس میں کوئی کھڑکی نہیں لیکن وہ برجستہ ستونوں اور محرابوں سے آراستہ ہے اور چھوٹی چھوٹی محرابیں چار منزلوں میں بنی ہوئی ہیں۔ طاق کسریٰ کی ساخت ساسانی تمدن کے ابتدائی مراحل کا نمونہ ہے۔ دیکھنے والوں کو اپنی مجموعی شکل یا جزئیات کی خوبصورتی سے اس قدر حیرت میں نہیں ڈالتی جتنا کہ اپنی جسامت اور طول و عرض سے یہ وہ

محل تھا جس میں شہنشاہ ایران اپنے دربار منعقد کیا کرتا تھا اور سلطنت کے معاملات پر احکام جاری کرتا تھا۔

مصنف نے خسرو اول کے عہد میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق. بادشاہ کے درباریوں کی فہرست اور ان کے فرائض منصبی بیان کیے ہیں۔ ان کے علاوہ نجومیوں، طبیبوں، شاعروں اور خواجہ سراؤں کی جماعتوں کی تفصیل پیش کی ہے۔ ان کے علاوہ دربار کے آداب، امتیازات اور خطابات بھی مفصل طور پر بیان کیے ہیں۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے متعلق خاص اطلاعات حاصل نہیں۔ عوام اکثر جاہل ہوتے تھے البتہ امرا، اور نجبا کے بچوں کو تعلیم کا کچھ حصہ نوجوان شہزادوں کے ساتھ دربار میں ملتا تھا۔ اس تعلیم کا اعلیٰ افسر "معلم اسواران" تھا۔ ان کو عام نوشت و خواند کے علاوہ حساب، چوگان بازی، شطرنج بازی، شہسواری اور شکار کی تعلیم دی جاتی تھی۔

طبی نظریہ اگرچہ زرتشتی تھا تاہم طب یونانی کا اثر ہر جگہ ظاہر تھا بالعموم علاج کے پانچ طریقے تھے (۱) کلام مقدس (۲) آتش (۳) نباتات (۴) نشتر (۵) خوشبودار دواؤں کی دھونی طبیبوں کی فیس کے متعلق بھی قواعد مقرر تھے جب چوتھی صدی میں سلطنت روم سے نسطوریوں کا اخراج ہوا تو وہ میسوپوٹیمیا اور ایران میں پھیل گئے جہاں عیسائیوں نے اپنے خاص مدارس قایم کیے جن میں یونانی طب پڑھائی جاتی تھی۔ سب سے مشہور طبیہ مدرسہ گندیشاپور میں تھا جو ساسانیوں کے بعد بھی قایم رہا اور دور اسلامی کی ابتدائی صدیوں میں علم طب کا بڑا اہم مرکز تھا۔ خسرو اول کے عہد کا مشہور طبیب شاہی طبیبوں کا رئیس اور اپنے عہد کا سب سے بڑا مفکر بُرزُوْیہ ہے جس کی خود نوشت سوانح حیات کو ابن المقفع نے "کلیلہ و دمنہ" کے عربی ترجمہ کا مقدمہ قرار دیا ہے۔ "کلیلہ و دمنہ" سنسکرت کے ایک مجموعہ حکایات موسوم بہ "پنچ تنتر" کا ترجمہ ہے جو طبیب موصوف نے پہلوی زبان میں کیا تھا۔

اس باب کے آخر میں ایران کی عمومی زندگی اور معاشرتی زندگی کے حالات بُرزُوْیہ کی زبان سے اس طرح ادا ہوئے ہیں۔

"ہمارا زمانہ جو کہن سال اور از کار رفتہ ہو چکا ہو اگرچہ ایک روشن پہلو رکھتا ہو تاہم حقیقت میں وہ بے حد تاریک ہو اگرچہ خدا نے بادشاہ کو اقبال مندی اور کامیابی بخشی ہو اور بادشاہ خود بھی مآل اندیش، توانا، عالی ہمت، متجسس، عادل، رحم دل، فیاض، صداقت پسند دانا، فہیم، فرض شناس، جفاکش، عاقل، آمادۂ امداد، حلیم الطبع، معقول پسند، مہربان، ہمدرد واقف کار، علم دوست، نیکی پسند، ظالم کش، بے خوف اور صاحب عزم صمیم ہو لیکن بایں ہمہ ہمارا زمانہ ہر پہلو سے رو بہ تنزل ہو ایسا معلوم ہوتا ہو کہ صداقت ختم ہو چکی ہے مفید چیزیں گم ہیں اور مضر موجود، اچھی پژمردہ ہیں اور بری سرسبز، دروغ کو فروغ ہو اور صداقت بے رونق، علم کا درجہ پست ہو اور جہالت کا بلند........غرض ایسا معلوم ہوتا ہو کہ دنیا مسرت کے نشہ میں یہ کہہ رہی ہو کہ میں نے نیکی کو مقید اور بدی کو آزاد کر دیا ہو۔"

باب نہم میں ساسانی سلطنت کے "آخری شاندار عہد" کا بیان ہو۔ خسرو اول کا جانشین ہرمزد چہارم جو ۵۷۹ء میں تخت نشیں ہوا بعض باتوں میں اپنے باپ کا خلف الصدق تھا بلکہ اس کا عدل اپنے باپ کے عدل سے بڑھ کر تھا۔ اس کے عہد حکومت میں رومیوں کے ساتھ پھر جنگ کا سلسلہ جاری ہو گیا سپہ سالار بہرام چوبیں نے بغاوت کی جس کے نتیجہ میں ہرمزد معزول ہوا اور خسرو دوم تخت نشین ہوا لیکن بہرام چوبیں نے اس کی اطاعت قبول کرنے سے بھی انکار کیا اور شاہی فوج کو شکست دے کر پایۂ تخت میں داخل ہوا اور تاج شاہی سر پر رکھا۔ خسرو دوم رومیوں کی مدد سے دوبارہ حملہ آور ہوا اور بہرام چوبیں کو شکست دے کر تخت حکومت واپس لیا۔ اس کی پُر معرکہ زندگی نے ایرانیوں کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ اسی عہد میں ایک دوسرے سپہ سالار وستہم نے بغاوت کی اور دس سال تک سرکش رہا۔ رومیوں کے ساتھ پھر لڑائی جاری ہو گئی۔

خسرو دوم کا باپ امیروں پر سخت گیری کرتا تھا لیکن غریبوں پر مہربان تھا اس کے خلاف خسرو دوم ایک طرف تو رعایا سے بزور روپیہ وصول کرتا تھا اور دوسری طرف امراء سے سخت بدگمان تھا اور ذرا ذرا سی بات پر قتل کرا دیا کرتا تھا۔ اس کی طبیعت کی سب سے نمایاں خصوصیت حرص و زر پرستی

تھی اور اپنی اڑتیس سال کی حکومت میں اس نے ہر ممکن طریقے سے بے اندازہ دولت جمع کر کے خزانے بھرے اس کے مشہور خزانوں کے نام حسب ذیل ہیں۔(۱) گنز داذآورد (۲) گنز گاؤ (۳) گنج عروس (۴) گنج دیبائے خسروی (۵) گنج افراسیاب (۶) گنج سوختہ (۷) گنج خضرا (۸) گنج شاد آورد۔

مصنف نے اس کے عظیم الشان محلات کی تفصیل کے بعد اس کے بعض عجائبات شمار کیے ہیں (۱) قصر طیسفون (۲) درفش کاویانی (۳) ملکہ شیریں (۴) دربار کے دو گویے سرکش اور باربذ (۵) غلام خوش آرزو (۶) گھوڑا شبدیز (۷) فیل سفید (۸) شطرنج (جس کے مہرے یاقوت اور زمرد کے تھے) (۹) تاج (جس میں ایک سو بیس پونڈ خالص سونا لگا ہوا تھا اور جو محل کی چھت سے لٹکی ہوئی زنجیر سے بندھا رہتا تھا تاکہ بادشاہ کے سر کو تکلیف نہ پہنچے) (۱۰) تخت تاکدیس (جو ہاتھی دانت اور ساگوان کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اور جس کے پترے اور کٹھرے سونے اور چاندی کے تھے۔ طول ۱۸۰ ہاتھ، عرض ۱۳۰ ہاتھ اور بلندی ۱۵ ہاتھ تھی) چار زربفت کے قالین جو یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھے اور جن میں سے ہر ایک سال کے ایک خاص موسم کی کیفیت پیش کرتا تھا اور اسی موسم کے ساتھ مخصوص تھا (۱۲) ایک بیش بہا قالین جس کا نام "بہار خسرو" تھا۔

خسرو دوم جنس لطیف کا بہت دلدادہ تھا اس کی ایک چہیتی بیوی شیریں جسے "گلزار حسن" اور رشک ماہ" بیان کیا گیا ہے آخر تک اس کے مزاج پر حاوی رہی خسرو و شیریں اور فرہاد و شیریں کے عشقیہ افسانے ساسانی سلطنت کے خاتمہ سے پہلے ہی وجود میں آگئے تھے جو بعد میں ایران کی عشقیہ شاعری کا ایک مقبول عام موضوع بنے۔

خسرو دوم اعلیٰ خوشبوؤں اور بہترین کھانوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس کا غلام خوش آرزو ان کی لطافت و خوبی کا دقیقہ شناس تھا۔ اسی طرح قیمتی برتن بھی بادشاہ بہت عزیز رکھتا تھا جن کے بہت سے نمونے آج روس اور یورپ کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔

خسرو دوم کے عہد حکومت میں ایرانی موسیقی بھی درجۂ کمال کو پہنچ گئی تھی۔ اس کے دو مشہور گویے کے نام (سرکش اور باربذ) اوپر دیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے باربذ نے اپنے کمال کی وجہ سے لازوال شہرت

حاصل کی ہے۔

عیسائیوں کے ساتھ خسرو دوم کا سلوک اچھا تھا اور اس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ ظاہر ہو کہ اس کا یہ عمل اس کی عیسائی ملکہ شیریں کے اثر کا نتیجہ تھا۔

اس باب کے آخر میں مصنف نے چند قدرتی حوادث کا ذکر کیا ہو۔ سنہ ۶۲۷ء میں دجلہ اور فرات میں سخت طغیانی آئی اور کئی بند ٹوٹ گئے جن سے مزروعہ زمینوں کو سخت نقصان پہنچا طیسفون کے شاہی محل میں دربار عام کے کمرے کا ایک حصہ گر گیا اور بعد میں ان واقعات کو ساسانیوں کے خاتمے اور اسلام کے غلبے کی فال قرار دیا گیا۔

باب دہم میں ساسانی خاندان کے خاتمہ کا بیان ہو۔ خسرو دوم باوجود اپنے عیوب کے ایک طاقتور بادشاہ تھا۔ اس نے اپنے طویل عہد حکومت میں امرا کی جاہ طلبی کو قابو میں رکھا لیکن اس کی زرپرستی اور رومیوں کے ساتھ لڑائیوں میں ملک نادار ہو گیا اور جنگی مصیبتوں سے سلطنت کو مہلک صدمہ پہنچا۔ خسرو دوم کی وفات کے بعد امرا کی حرص و ہوا کا طوفان اٹھا اور شاہی خاندان کی طاقت یکے بعد دیگرے بہت سے جانشینوں کی عارضی اور چند روزہ حکومت کی وجہ سے برباد ہو گئی۔ چنانچہ سنہ ۶۲۸ء سے سنہ ۶۵۲ء تک کے تھوڑے عرصے میں شاہی خاندان کے بارہ ارکان نے تخت سلطنت کو آراستہ کیا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ یزدگرد سوم تھا جو سنہ ۶۳۲ء میں تخت نشیں ہوا

صحرائے عرب کے بادیہ نشیں جن کے سینوں میں اسلامی تعلیمات کا جوش بھرا ہوا تھا اور جن کو حضرت عمر جیسے بے مثال مدبر نے سلک تنظیم میں منسلک کیا تھا بے پناہ جانبازی کے ساتھ ایران پر حملہ آور ہوئے اور ایک قلیل عرصہ میں ان جوشیلے حملہ آوروں نے ساسانیوں کے صدیوں کے پرانے اور کامل نظام سلطنت کو نیست و نابود کر دیا۔

یزدگرد سوم کے عہد کا سب سے طاقتور امیر رستم تھا وہ تدبیر و سیاست اور فن سپہ سالاری کا بھی ماہر تھا۔ عربوں کے خطرے کو پورے طور پر سمجھ کے تمام فوجوں کی سپہ سالاری اپنے ہاتھ میں لی اور دشمن کو روکنے کی سرگرم کوشش کی۔ حضرت عمر نے سبقت کی اور سنہ ۶۳۶ء میں عرب فاتح

حضرت سعد بن ابی وقاص کی سپہ سالاری میں قادسیہ کے میدان میں ایرانیوں کے مقابلہ پر آئی۔ رستم لڑائی میں مارا گیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ دوسرے ہی سال ایران کا پایہ تخت طیسفون عربوں کے قبضے میں آیا اور یزدگرد سوم وہاں سے بھاگ گیا تمام خزانے اور بے شمار بیش قیمت سامان فاتحین کے ہاتھ آیا ۶۴۲ء میں نہاوند کے مقام پر ایک اور زبردست لڑائی ہوئی جس میں ایرانیوں کو پھر شکست ہوئی۔ اس کے بعد خوزستان، آذربائیجان، ارمنستان، اصفہان اور فارس کے صوبے یکے بعد دیگرے فتح ہوئے۔ یزدگرد نے خراسان میں پناہ لی لیکن اس کے خاتمے کے دن قریب تھے چنانچہ اسی فراری کی حالت میں ۶۵۲ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس پر ساسانی خاندان کا خاتمہ ہوا۔

خاتمہ میں مصنف نے رومی مورخ امیان کی زبان سے ایرانی امرا کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"ایرانی عموماً چھریرے اور سانولے رنگ کے ہوتے تھے۔ ان کی نگاہیں تند بھنویں گول نیم دائرے کی شکل کی ہوتی تھیں۔ حد درجے کے محتاط اور بدگمان ہوتے تھے۔ دشمن کے ملک میں زہر اور جادو کے خوف سے باغوں میں کسی پھل کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے قیمتی جواہرات، سونے کے کڑے اور طوق پہنتے تھے اور ہر وقت تلوار حمائل کیے رہتے تھے۔ شیخی باز، تند خو، وحشت انگیز، حیلہ ساز اور بے رحم ہوتے تھے البتہ میدان جنگ میں دلیری اور بہادری سے لڑتے تھے۔ جنگ کے علاوہ اپنے اوقات اسلحۂ جنگ اور شکار کی مشق اور لطیف عیاشی میں صرف کرتے تھے۔ باوجود دیگر عیوب کے بہت مہمان نواز اور عالی حوصلہ ہوتے تھے۔ کئی مرتبہ جلا وطن یونانیوں اور مغلوب بادشاہوں نے ایرانیوں کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

عرب مصنفین نے بھی ساسانیوں کی شاندار سلطنت کی دل سے تعریف کی ہے۔

اہل ایران نے صدیوں تک ملل اسلامیہ کی ذہنی رہنمائی کی ہے اگرچہ ان کی اخلاقی اور سیاسی

طاقت ساسانی سلطنت کے خاتمے کے بعد کمزور ہو گئی تھی۔ خلافت عباسیہ کی سیاسی روایات ایرانیوں کی وراثت تھی اور زوال خلافت کے بعد ایران میں جو سب سے پہلے نئی سلطنتیں وجود میں آئیں اُن کی تعمیر اُن ہی پرانی روایات کی بنیاد پر ہوئی اور سامانیوں کا شاندار عہد ساسانی عظمت ہی کا انعکاس تھا
ضمیمہ اوّل "انتقال اوستا" پر ہے جس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ ساسانی عہد کے آخری زمانے سے پہلے زرتشتیوں کے پاس کوئی مذہبی کتاب نہیں تھی۔
ضمیمہ دوم حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کی فہرست کے متعلق ہے۔

کتاب کے آخر میں اضافات ہیں جن کے بعد جناب مترجم کی طرف سے "اسما، الفاظ، اصطلاحات اور دیگر مطالب کی چار فہرستیں ہیں اور ان کے بعد ساسانی سلطنت کا نقشہ ہے۔

کتاب میں مختلف چوالیس تصویریں ہیں جن میں سے بعض کی تفصیل مصنف نے اپنے اپنے مقام پر دی ہے۔ تمام کتاب میں مصنف کے حواشی کے علاوہ جناب مترجم کی طرف سے بھی متعدد مفید حواشی دیے گئے ہیں۔

یہاں پر یہ بیان کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اصل کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے سب سے پہلے طہران یونیورسٹی کے نامور پروفیسر آقائی رشید یاسمی نے اس کا فارسی ترجمہ ۱۹۴۸ء میں شایع کیا ہے جو موجودہ اردو ترجمے کے سلسلے میں مفید ثابت ہوا ہوگا۔

آخر میں تاریخی دنیا کے لیے کتاب کی اہمیت کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ترتیب مضامین کے سلسلے میں ہمیں جو اختلافات مصنف سے ہیں ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں ساسانی عہد کی سیاسی تاریخ نہ ہونے کے برابر ہے اور پڑھنے والا اس بات پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے تمدنی حالات کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے وہ اس عہد کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کسی دوسری کتاب سے کرے۔ اس لیے ہمارے خیال میں اس کا پہلا باب "ساسانی عہد کی سیاسی تاریخ" پر ہونا چاہیے تھا کیونکہ کسی عہد کے تمدنی حالات صرف اسی صورت میں بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں کہ جب ان کے مطالعہ سے پیشتر اس عہد کی سیاسی تاریخ سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس کمی کی وجہ سے یہ کتاب ساسانی عہد پر ایک مستقل تصنیف نہیں قرار دی جا سکتی۔

دیباچہ میں مصنف نے بیان کیا ہو "ہم نے اپنی کتاب کو زیادہ دل پسند بنانے کے لیے یہ کیا ہو کہ تمدنی معلومات پر علیحدہ بحث قایم کرنے کے بجائے ان کو جا بجا ابواب کے اندر ایسی مناسب جگہوں پر رکھ دیا ہو جہاں وہ سیاسی واقعات یا حالات عمومی کی شرح کا کام دیں جو اُن ابواب میں بیان کیے گئے ہیں" ہمارے خیال میں مضامین کی جو ترتیب مصنف نے کتاب کو دل پسند بنانے کے لیے اختیار کی ہو اسی ترتیب سے کتاب کی دل پسندی میں کمی ہو گئی ہو اور مندرجہ ذیل نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔

(۱) "متعلقہ مضامین کے ارتباط باہمی کا انقطاع" جو ان کے مختلف ابواب میں بکھر جانے کی وجہ سے عمل میں آیا ہو۔ بطور مثال نظامِ عدالت کے سلسلے میں قانون فوجداری کی تفصیل باب ششم میں ہو تو قانون دیوانی کی تفصیل باب ہفتم میں۔ ساسانیوں کی سیاسی اور معاشرتی جماعت بندی کے کچھ حالات باب دوم میں اور کچھ باب ہفتم میں۔

(۲) "غیر معمولی طوالت" اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔

(۳) "تکرار بیان" بطور مثال مرکزی حکومت کا نظم و نسق، بادشاہ کے درباریوں کی فہرست اور اُن کے فرائض باب دوم میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں اور اس تفصیل کو معمولی اختلاف کے ساتھ باب ہشتم میں دہرایا گیا ہو۔ اسی طرح فوجی تنظیمات کی تفصیل باب دوم میں ہو اور پھر باب پنجم اور باب ہشتم میں

(۴) "ناقابل برداشت ضخامت" جو مذکورہ بالا نقائص کا نتیجہ ہو۔ پوری کتاب کا غور سے مطالعہ کرنا ایک صبر آزما کام ہو۔

پس ہمارے خیال میں اگر مذکورہ بالا نقائص کو دور کیا جائے اور ساسانی عہد کی مختصر سیاسی تاریخ کے اضافہ کے بعد اس عہد کی تمدنی معلومات کو علیحدہ مستقل عنوانات قایم کر کے بیان کیا جائے تو پوری کتاب کے تمام اہم مطالب اس سے نصف ضخامت میں آ سکتے ہیں اور کتاب کی دل پسندی اور اہمیت میں حقیقی معنوں میں اضافہ ہو سکتا ہو۔

غلام سرور ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

دیوانِ غالب اُردو کا ایک نایاب نسخہ

دیوان غالب اردو کا سب سے پرانا مطبوعہ نسخہ اب کونسا ملتا ہے۔ یہ سوال خاصہ دلچسپ ہے۔ تذکرۃ الشعرائے اردو میں مولوی کریم الدین صاحب کے بقول دیوان غالب اردو پہلی بار غالباً سنہ ۱۸۴۲ء میں چھپا تھا۔ مولوی کریم الدین صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مطبع سید الاخبار میں چھپا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے "غالب نامہ" میں لکھا ہے کہ "سید المطابع میں شایع ہوا" مالک رام صاحب کا "ذکرِ غالب" میں بیان ہے کہ "فخر المطابع سے شایع ہوا" اس طرح تاریخ طباعت میں بھی اختلاف ہے۔ جناب ساحل بلگرامی (مضمون "غالب کی ایک رباعی" مطبوعہ نگار دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء) کے سنہ ۱۸۴۱ء سے لے کر تذکرۃ الشعرائے اردو کے سنہ ۱۸۴۳ء تک کے عرصے میں کسی وقت یہ نسخہ چھپا تھا۔ اس نسخہ کی کوئی کاپی اگر اس وقت کہیں ہوتی تو یہ سب شبہات آسانی سے مٹ سکتے تھے۔ ایک کے سوائے غالب پر سارے تحقیق کرنے والوں کو اس کا اقرار ہے کہ انھوں نے اس طبع اول کا کوئی نسخہ کہیں نہیں دیکھا۔ نہ غالباً دنیا کی کسی لائبریری میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ صرف شیخ محمد اکرام صاحب مصنف "غالب نامہ" نے لکھا ہے کہ ان کو یہ نسخہ بھی ابو محمد صاحب کے کتب خانہ سے دستیاب ہو گیا۔ لکھتے ہیں "لیکن مجھے جس چیز کی سب سے زیادہ تلاش تھی وہ دیوان غالب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا جو سنہ ۱۸۴۲ء میں دہلی میں چھپا۔ یہ مجھے انگلستان کی کسی لائبریری میں نہیں ملا اور جب میں ہندوستان آیا تو رامپور اس کی تلاش میں گیا لیکن .... پہلا مطبوعہ منتخب دیوان نہ ملا لیکن یہاں سے مجھے یہ اطلاع مل گئی کہ مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ جس میں عام اڈیشن سے نصف اشعار ہیں ..... خان بہادر سید ابو محمد صاحب کے پاس ہے" سوال یہ ہے کہ کیا یہ طبع اول ہی کا نسخہ ہے؟ اس کے متعلق اکرام صاحب ہی نے غالب نامہ کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھا ہے:۔

"اس پر سے سرورق غائب ہے لیکن کتاب کی ظاہری صورت، اشعار کی تعداد اور دوسری وجوہات کی بنا پر یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ باختلاف خفیف اسی قلمی نسخہ کی نقل

ہے جو سنہ ۱۸۳۳ء میں نواب ضیاء الدین نے مرتب کیا اور جو سنہ ۱۸۴۱ء میں سید المطابع دہلی میں چھپا۔ ان "دوسری وجوہات کی تشریح بھی اکرام صاحب نے اسی صفحہ پر کر دی ہے فرماتے ہیں

"اس مطبوعہ نسخہ میں مروجہ دیوان اردو سے بہت کم شعر ہیں۔ درباری دور کے اشعار نہیں اور اشعار کی تعداد قریباً اتنی ہے جو اس دیوان اردو میں تھی جس کا خاتمہ سنہ ۱۲۴۸ھ یعنی سنہ ۱۸۳۳ء میں نواب ضیاء الدین نے لکھا مروجہ دیوان اردو میں فقط غزلیات کے اشعار ۱۴۰۰ ہیں قطعات و قصائد وغیرہ کے اس پر مستزاد جب نواب ضیاء الدین نے سنہ ۱۸۳۳ء میں دیوان غالب اشاعت کے لیے مرتب کیا اور وہ خاتمہ لکھا جو آثار الصنادید میں چھپ گیا ہے تو اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ تھی معلوم ہوتا ہے یہ مجموعہ مرتب ہونے کے چار برس بعد تک نہ چھپ سکا اور جب شائع ہوا تو اس میں چند اشعار کی کمی بیشی ہوئی اور جس طرح غالب نے سنہ ۱۸۶۱ء میں متداول اردو دیوان سے نواب ضیاء الدین کا خاتمہ حذف کر دیا تھا۔ اولین مطبوعہ نسخہ میں بھی اسے شائع نہ کیا۔ یہ نسخہ سید المطابع دہلی میں سنہ ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ اور غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا"

قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان وجوہ میں سے کوئی ایک بھی ایسی قطعی دلیل نہیں جو خان بہادر ابو محمد صاحب کے نسخہ کو بلاشک وشبہ پہلے اڈیشن کا نسخہ ثابت کرے۔ لے دے کر صرف ایک دلیل ہے کہ اس میں متداول نسخہ سے کم اشعار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس نسخہ میں کل کتنے اشعار ہیں گو یہ اقبال کیا ہے کہ اس میں "اختلاف خفیف" ہے۔ پھر سب سے عجیب بات یہ ہے کہ نواب ضیاء الدین کا لکھا ہوا خاتمہ اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ خاتمہ محض اسی طبع اول کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسی خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ طبع اول میں کتنے اشعار دیوان میں تھے۔ خاتمہ ایسا اچھا کہ آثار الصنادید میں جگہ پائے لیکن جس مقصد اور جس جگہ کے لیے لکھا گیا تھا وہیں نہ چھپے۔ نواب ضیاء الدین حیات تھے۔ دیوان غالب انہی کی خواہش، کوشش اور ترتیب سے آرایش طبع سے مرصع ہوا تھا یہ کسی طرح سمجھ میں

نہیں آتا کہ طبع اول ہی سے یہ خاتمہ حذف کر دیا گیا ہو جبکہ اور جتنے بھی غدر سے پہلے کے اڈیشنوں اور قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے ان سب میں یہ تقریظ زینت کتاب ہے۔ اکرام صاحب نے جو توجیہ اس کے حذف کی فرمائی ہے وہ نہایت دور از کار اور غیر قابل یقین ہے۔ سلاشاء میں دیوان کا حجم ڈیوڑھا ہو چکا تھا پہلی طباعت کو جس کے لیے اصل میں خاتمہ لکھا گیا تھا۔ ۲۰، ۲۲ سال گزر چکے تھے اور اب اتنی مدت بعد اس کا اندراج یقیناً غیر مناسب تھا۔ مثلاً خاتمہ میں فقرہ ہے کہ "ایزد و بزرگ را ہزاران سپاس کہ دریں زماں کہ سنہ ۱۲۵۱ مقدسہ ہجری۔۔۔۔ رسیدہ" بھلا یہ مضمون سنہ ۱۲۷۸ میں طباعت کے لیے کہاں موزوں رہا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ جس وجہ سے ۱۸۶۱ء میں اس کا طبع کرانا غالب نے مناسب نہیں سمجھا اسی وجہ سے طبع اول کے وقت ۱۸۴۲ء میں بھی شامل دیوان نہ کیا ہوگا دلیل ناقص نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل میں اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو کوئی دلیل قوی یا ضعیف ایسی نہیں جس کی بنا پر خان بہادر ابو محمد صاحب کے نسخے کو طبع اول کا نسخہ سمجھا جائے۔ صرف یہ بات کہ اس میں متداولہ دیوان سے اشعار کی تعداد بہت کم ہے کوئی ثبوت نہیں۔ یہ تو اکرام صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ متداولہ دیوان کے چھپنے سے پہلے بھی ایک سے زاید بار یہ دیوان چھپ چکا تھا اور ان سب اڈیشنوں میں اشعار کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ خان بہادر صاحب کا نسخہ کسی بعد کی طباعت (لیکن متداولہ دیوان سے قبل) کا نسخہ ہو۔ ان شکوک کے ساتھ اگر ان حقایق کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ ۱۸۴۲ء کے مطبوعہ نسخے کا سراغ کسی اور کام کرنے والے کو آج تک نہ مل سکا تو ہمارے نزدیک یہ فیصلہ کر لینے میں زیادہ غلطی کا امکان نہیں کہ دیوان غالب اردو طبع ۱۸۴۲ء اب نایاب ہے۔

اب آیئے دیکھیں طبع ثانی کے متعلق اہل علم حضرات کیا فرماتے ہیں۔

پہلے شیخ محمد اکرام صاحب کی تحقیق ہی کو لے لیجیے۔ آپ "غالب نامہ" میں فرماتے ہیں "اولین مطبوعہ نسخہ۔۔۔۔ سید المطابع دہلی میں ۱۸۴۲ء میں طبع ہوا اور غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھاپا گیا۔" اکرام صاحب کے نزدیک دوسرا اڈیشن وہ ہے جو غدر سے پہلے کانپور میں چھپا۔ اکرام صاحب اس کی تاریخ طباعت اور مطبع کا نام تحریر نہیں فرماتے لیکن جیسا کہ آیندہ ملاحظہ میں آئے گا کانپور میں

دیوان غدر سے قبل نہیں بعد میں چھپا تھا۔

ذکر غالب میں مالک رام صاحب ایم۔اے پہلے اڈیشن کے متعلق فرماتے ہیں ”۱۲۵۷ھ (۴۲-۱۸۴۱ء) میں فخر المطابع سے شایع ہوا۔ یہ اڈیشن ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر اس کے آخر میں نواب ضیاءالدین احمد خان بہادر کی جو تقریظ تھی وہ آثار الصنادید (سرسید) میں موجود ہے۔“ ہمیں اس میں صرف یہ کلام ہے کہ ۱۲۵۷ھ کسی طرح ۴۲-۱۸۴۱ء کے مطابق نہیں ہوتا۔ مالک رام صاحب نے وقت کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ۱۲۵۷ھ میں تقریظ لکھی گئی تھی لیکن طباعت و اشاعت چار سال بعد یعنی ۴۳-۱۸۴۲ء میں غالباً ہوئی۔ مالک رام صاحب آگے فرماتے ہیں: ”دوسرا اڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں شایع ہوا۔ اس کے آخر میں بھی تقریظ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس نسخہ میں کل ۱۷۹۲ اشعار ہیں۔ اس نسخے کی ترتیب متداول نسخوں سے مختلف ہے۔ غالباً پہلے اڈیشن میں بھی ایسی ہی ہوگی۔ آغاز میں قطعات ہیں۔ پھر ایک مثنوی اور قصیدے ہیں۔ قصیدوں کے بعد غزلیات ہیں اور سب سے آخر میں رباعیاں۔ آخر میں نیر رخشاں کی فارسی کی تقریظ ہے اور شروع میں مرزا کا اپنا فارسی کا دیباچہ ہے۔“ گویا مالک رام صاحب کے نزدیک دوسرا اڈیشن ۱۸۵۵ء یعنی قبل غدر چھپا۔ اس میں ۱۷۹۲ اشعار تھے اور ترتیب خلاف معمول تھی۔ افسوس یہ ہے کہ مالک رام صاحب مقام اشاعت اور مطبع کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔

غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب ”غالب“ میں ان تفاصیل کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ان کی مجمل معلومات (اردو دیوان ۱۸۵۹ء سے پیشتر ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا۔ صفحہ ۲۹۲) غالب کے ایک خط پر منحصر ہے جو انھوں نے غالباً ۱۸۶۲ء میں سید بدرالدین صاحب کو لکھا۔ فرماتے ہیں: ”وہ اس عرصے میں دلی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور اب تیسری جگہ آگرہ میں چھپ رہا ہے۔“ اس عرصے کا تعین نہیں کیا گیا ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قریب یعنی بعد از غدر کے زمانے سے مراد ہے۔ جو آیندہ سطور سے اور ظاہر ہو جائے گا۔ گویا مہر صاحب غدر سے قبل کے مطبوعہ نسخوں سے مطلع نہیں ہیں۔

حضرت سائل دہلوی نے اپنے مضمون غالب کی ایک رباعی "نگار" دسمبر ۱۹۴۲ء میں ضمناً اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں "اس وقت میرے پیش نظر تقریباً تمام اہم مطبوعہ نسخوں کے علاوہ چند قلمی نسخے .... موجود ہیں ...... اس وقت غالب کے دیوان کا قدیم ترین نسخہ میرے سامنے جو اگرچہ وہ شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید المطابع کے چھپے ہوئے نسخے کی قلمی نقل ہے لیکن اپنی قدامت کی وجہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نسخے کے بعد کا وہ قلمی نسخہ ہے جو ۱۸۵۵ء میں خود مرزا نے اپنی پوری نگرانی میں کتابت کرا کے نواب یوسف علی خاں بہادر مرحوم والی ریاست رامپور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے بعد یہی نسخہ مطبع احمدی میں ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں طبع ہوا جس کے خاتمے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

"داد کا طالب غالب گذارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا ہے ......"

آخر میں غالب کے نام کی مہر کے بعد کی عبارت سے پایا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ۲۰ محرم الحرام ۱۲۷۸ھ میں طبع ہوا۔ اسی سال وہ پھر مطبع نظامی کانپور میں چھاپا گیا جس کا خاتمہ اس عبارت پر ہوا ہے "دیوان بلاغت نشان جناب نواب اسد اللہ خاں غالب کا دہلی میں چھپا لیکن بسبب سہو و نسیان کے بعض مقام میں تغیر و تبدل ہوا اس لیے جناب مجمع لطف بیکراں محمد حسین صاحب دہلوی نے بعد نظر ثانی اور تصحیح جناب مصنف کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی الحجہ ۱۲۷۸ ہجری مطبع کانپور میں صحت تمام اور درستی کمال سے چھاپا" گویا سائل دہلوی صاحب کے نزدیک مطبوعہ نسخوں کی ترتیب یہ ہے کہ پہلی بار ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں سید المطابع دہلی میں چھپا پھر محرم ۱۲۷۸ھ مطابق جولائی ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا اور پھر اسی سال لیکن گیارہ ماہ بعد مطبع نظامی کانپور میں چھپا۔ بالفاظ دیگر قبل غدر صرف ایک بار چھپا اور پھر غدر کے بعد ایک ہی سال میں دو بار دلی اور کانپور سے شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام رسول صاحب مہر جن ایک سے زاید مرتبہ کا ذکر فرماتے ہیں وہ اصل میں بعد از غدر مطبع احمدی دہلی اور مطبع نظامی کانپور کی اشاعتوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطبع نظامی کانپور کے خاتمے کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کانپور میں اس سے قبل دو بار کبھی

نہیں چھپا تھا۔ بالفاظ دیگر محمد اکرام صاحب جو فرماتے ہیں کہ غدر سے پہلے ایک دفعہ اور کانپور میں چھپا وہ غلط ہے۔ گویا اکرام صاحب کے حساب سے اب غدر سے پہلے صرف وہی سید المطابع والا اڈیشن رہ جاتا ہے اور یہی بیان سالک صاحب بگرامی کا معلوم ہوتا ہے لیکن بگرامی صاحب ہی نے جو عبارت مطبع احمدی (۱۸۶۱ء) والے دیوان کے خاتمہ سے نقل کی ہے اور جو خود غالب کی لکھی ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دیوان اس سے قبل ایک سے زاید مرتبہ چھپ چکا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ۱۸۴۱ء (پہلا اڈیشن) کے بعد اور غدر یا ۱۸۶۱ء (غدر کے بعد پہلا اڈیشن) تک اور کتنی بار غالب کا اردو دیوان چھپا اور کب کب۔

جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے شیخ محمد اکرام صاحب، سالک صاحب بگرامی اور غلام رسول صاحب مہر کی تحقیق کے مطابق تو اس درمیان میں اردو دیوان ایک بار بھی نہیں چھپا۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۸۵۵ء کے قریب اردو دیوان منتخب ہوا۔ یہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان کا زمانہ بے شک ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو طبع اول (۱۸۴۱ء) کا علم غالباً نہیں ہے اور وہ ۱۸۵۵ء کو پہلا انتخاب کا سال خیال فرماتے ہیں۔ بہرحال اس کی بھی طباعت کے متعلق وہ بالکل خاموش ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ انتخاب ۱۸۶۱ء سے قبل چھپا بھی یا نہیں۔ اس کے برخلاف مالک رام صاحب نے صریحاً بیان فرمایا ہے کہ دوسرا اڈیشن ۱۸۵۵ء میں چھپا۔ اس کی تفصیل بھی دی ہے لیکن بدقسمتی سے مطبع کا نام نہیں لکھا۔ کانپور کی چونکہ کوئی تصریح نہیں ہے اس لیے خیال ہوتا ہے کہ یہ بھی دہلی ہی میں چھپا ہوگا۔ مالک رام صاحب نے اس طرح اس کا بیان فرمایا ہے کہ گویا یہ نسخہ بذات خود انھوں نے خوب دیکھا ہے۔ میں اس میں شک نہیں کرنا چاہتا لیکن ایک بات بے شک عجیب ہے کہ بقول مالک رام صاحب اس میں ۲۹۷۱ شعر ہیں گویا متداولہ نسخہ سے بھی زیادہ! اور ترتیب بھی اس کی ایسی ہے کہ کسی اور نسخے کی نہیں۔ نہ اس سے قبل کے نسخے کی نہ بعد کے متعدد نسخوں کی۔ بہرحال یہ ہے مالک رام صاحب کا دوسرا اڈیشن مطبوعہ ۱۸۵۵ء۔ محققین کی صف میں صرف مالک رام صاحب ہی یقین اور وثوق کے ساتھ ۱۸۴۱ء کے بعد اور غدر سے پہلے کے کسی مطبوعہ نسخہ کی خبر دیتے ہیں۔

لیکن ان محققین کے علاوہ خود مرزا نے مطبع احمدی دہلی والے نسخے کے خاتمے پر بالتصریح لکھ دیا۔

ہے کہ "غالب گذارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار چھاپا گیا" گویا اس نسخہ (۱۸۶۱ء) سے قبل دو بار چھپ چکا تھا۔ کانپور میں مطبع احمدی دہلی میں چھپنے کے گیارہ ماہ بعد چھپا۔ اس لیے مرزا غالب یقیناً کانپور کے علاوہ بلکہ اس سے قبل کی دو اشاعتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس طرح تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا مطلب ۱۸۴۱ء والے اور (مالک رام صاحب کے) ۱۸۵۵ء والے نسخوں سے ہے۔ گویا ۱۸۴۱ء کا پہلا اور (اگر ایسا ہے تو) ۱۸۵۵ء کا دوسرا اڈیشن ہوا۔ کاش یہ مسئلہ یوں آسانی سے حل ہو جاتا لیکن اس ناقابل انکار حقیقت کا کیا کیا جائے کہ ۱۸۴۷ء میں بھی دیوان غالب اردو دہلی میں یقیناً چھپا تھا۔ اس وقت میرے پاس ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ دیوان کا ایک نسخہ بہ تمام وکمال موجود ہے۔ اس کا سرورق اور خاتمہ بالکل محفوظ ہیں۔ سرورق پر صاف چھپا ہوا ہے کہ "یہ نسخہ خود مرزا غالب کی تصحیح اور مقابلہ کے بعد در مطبع دارالسلام دہلی واقع حوض قاضی مبینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین احمد لکھنوی حلیہ انطباع پوشید" یہ نسخہ ۹½ انچ × ۶ انچ سائز پر ہے۔ کل ۱۰۸ صفحے ہیں۔ شروع میں غالب کا فارسی کا دیباچہ ہے۔ پھر ۲۸۸ غزلیات کا انتخاب ہے جس میں کل ۱۰۵۸ شعر ہیں۔ ان میں ۶۵ غزلیں ایسی ہیں جن میں تین یا تین سے کم اشعار درج دیوان ہیں۔ اس کے بعد تین قصیدے ۶۱ اشعار کے ہیں۔ پھر ۲۱ اشعار کے چار قطعے ہیں اور پھر ۲۰ شعر دس رباعیوں کے ہیں۔ گویا کل ۱۱۶۰ شعر ہوئے۔ خاتمے پر نواب ضیاء الدین صاحب بہادر کی معروف تقریظ ہے۔ تعداد اشعار کے متعلق اس کا یہ فقرہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے "جملگی اشعار شعری شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و یک صد واند" یک صد کے بعد واو عطف سے صاف ظاہر ہے کہ تعداد کا آخری لفظ چھپنے سے رہ گیا۔ چونکہ اس نسخے میں اشعار کی کل تعداد ۱۱۶۰ ہے۔ اس لیے غالباً چھوٹا ہوا لفظ "شصت" ہوگا۔

تعجب اور سخت تعجب تو یہ ہے کہ اس ۱۸۴۷ء والے نسخے کی کسی نے آج تک اطلاع نہیں دی۔

بہر حال اب اس علم کے بعد دیوان غالب اردو کی اولین طباعتوں کے متعلق نئے زاویوں سے بحث کرنی ہوگی۔ میں درخواست کروں گا کہ اہل شوق حضرات حسب ذیل امکانات کو مد نظر رکھتے

ہوئے اس مسئلے پر مزید تحقیق فرمائیں:-

۱- غالب کے اردو دیوان کے طبع اول کا پتہ مولوی کریم الدین صاحب کے تذکرۃ الشعرائے اردو سے چلتا ہے جو ۱۸۴۸ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ میرے پاس جو دیوان کا نسخہ ہے وہ ۱۸۴۷ء کے وسط میں چھپ چکا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی کریم الدین صاحب دہلی میں رہتے ہوئے اس ۱۸۴۷ء کی اشاعت سے کیونکر لاعلم رہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تذکرۃ الشعرائے اردو میں جہاں سن طباعت کا حوالہ دیا ہے وہاں اصل میں ۱۸۴۷ء ہو اور کتابت کی غلطی سے ۱۸۴۳ء معلوم ہوتا ہو۔ یہ واضح رہے کہ ۱۸۴۳ء بہرحال غلط تاریخ ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ ۱۸۴۲-۴۳ء کا مطبوعہ نسخہ کہیں ملتا نہیں۔

ب- اگر یہ ماننا ضروری ہی ہے کہ ۱۸۴۳ء میں دیوان اردو چھپا تھا اور وہی پہلا اڈیشن ہے مگر اب وہ ناپید ہے، تو یہ ۱۸۴۷ء کا اڈیشن یقیناً اور بلا شک و شبہ دوسرا اڈیشن ہے۔ نہ کہ ۱۸۵۵ء کا وہ عجیب اڈیشن جس کا ذکر مالک رام صاحب نے بطور طبع ثانی کیا ہے۔

ج- اگر ۱۸۴۳ء کے مطبوعہ نسخہ کو پہلا اڈیشن اور ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخہ کو دوسرا اڈیشن مانا جائے تو پھر مالک رام صاحب کا ۱۸۵۵ء کا اڈیشن کہاں گیا؟ غالب نے خود تصریح کر دی ہے کہ قبل از غدر اردو دیوان دوبار (نہ کہ تین بار) چھپ چکا تھا گویا مالک رام صاحب والے تیسرے اڈیشن سے انکار ہے۔ یا اگر یہ اڈیشن بھی واقعی موجود ہے پھر ۱۸۴۳ء والے اڈیشن سے انکار۔ اس صورت میں ۱۸۴۷ء کا نسخہ پہلا اڈیشن ہوگا اور ۱۸۵۵ء کا نسخہ دوسرا اڈیشن۔ مرزا غالب کو اپنی تصانیف اور خصوصاً دیوان کی طباعت میں غیر معمولی بلکہ ضرورت سے بھی زیادہ انہماک اور دخل رہتا تھا۔ یہ فرض کر لینا نہایت خلاف قیاس ہے کہ مرزا غالب کو اس معاملہ میں سہو ہوا اور وہ تین کے بجائے دو اشاعتوں کا حوالہ دے گئے۔

بہرحال غالب پر معلومہ لٹریچر کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دیوان غالب اردو کا قدیم ترین مطبوعہ نسخہ اپنی صحیح مکمل اور غیر مشتبہ حالت میں صرف وہ ہے جو مطبع دار السلام دہلی میں ۱۸۴۷ء میں چھپا اور جس کی ملکیت کا فخر مجھ کو حاصل ہے۔ مجھے تو قوی شبہ ہے کہ یہی پہلا اڈیشن بھی ہے۔ غالب کا نسخہ ہی کا [illegible]

"میخانۂ آرزو سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں مرتب ہو چکا تھا۔ غالب کی تمام تصانیف میں سب سے پہلے یہی کتاب مرتب ہوئی اور آپ کو وہ اصل میں باعثِ ناز سمجھتے تھے جس کے چھپنے کے وہ بے انتہا مشتاق تھے لیکن اس کے چھپنے کی نوبت بھی ۱۸۴۵ء میں آسکی جبکہ نواب ضیاء الدین نیرنے اس تصحیح کے بعد مطبع دارالسلام دہلی میں چھپوایا۔ اردو کا دیوان فارسی دیوان سے تین سال بعد ۱۸۳۸ء میں مرتب ہوا تھا پھر اس کی ایسی کیا جلدی تھی کہ فارسی دیوان سے بھی پہلے چھاپ دیا گیا۔ یہ خلاف قیاس ہے۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ فارسی دیوان کے دو سال بعد اسی مطبع دارالسلام دہلی پر ۱۸۴۷ء میں پہلی بار نواب ضیاء الدین نیر ہی نے طبع کرایا جس میں دیباچہ و تقریظ سب شامل ہے۔

مالک رام صاحب ایم اے نے ذکر غالب میں دیوان غالب اردو کی طباعت کے متعلق از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۹۸ مفصل بحث کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پہلی بار دیوان ۱۸۴۱-۴۲ء میں غالباً میں چھپا۔ دوسری بار ۱۸۴۷ء میں چھپا تیسری بار ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی دہلی میں چھپا۔ چوتھی بار ۱۸۶۱ء میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا اور شاید پانچویں بار ۱۸۶۳ء میں مطبع مفید خلائق آگرہ میں چھپا۔ اس کے بعد مالک رام صاحب ایم۔ اے نہایت قطعیت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:۔

"غالب کی زندگی میں اردو دیوان کا اور کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا"

پھر ۱۸۴۷ء کے مطبوعہ نسخے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سید اسد علی انوری فرید آبادی

شہریت کی تعلیم

(یہ مقالہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ہنڈی سرکل میں پڑھا گیا)

دوستو! آج ہم سب یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کے ایک بڑے مقصد کی جانچ پڑتال کریں جسے عام طور سے ان لفظوں میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ تعلیم کا مقصد فرد کو ایک اچھا شہری بنانا، اس موضوع پر بحث کرنے میں آسانی ہوگی اگر ہم اسے چند خاص حصوں میں تقسیم کرلیں اور پھر ہر ایک حصے سے الگ الگ بحث کریں۔ یہ حصے حسب ذیل ہیں۔

شہریت کا تصور انسان کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا؟ اس کی نشو ونما کیونکر ہوئی؟ شہریت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے لیے کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیئے؟ تعلیمی ادارے شہریت کی تعلیم کس طرح دے سکتے ہیں؟

ابتدائی انسان ہر طرح آزاد تھا۔ اس کی نظر و حرکت پر اگر کوئی قوت پابندی عاید کرتی تھی تو وہ تھا اس کا طبعی ماحول۔ وہ اپنی ضرورتوں کو جس طرح چاہتا پورا کرلیتا تھا جب اسے بھوک لگتی وہ کسی جانور کو مار کر یا کسی درخت سے پھل پتیاں توڑ کر اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ جب وہ تھک جاتا تو جہاں چاہتا لیٹ جاتا اور سو جاتا۔ غرض ساری دنیا اس کی تھی لیکن اس کا یہ حق بہت عرصے تک بلا شرکت غیرے قایم نہیں رہ سکا۔ جوں جوں انسانی نسل میں اضافہ ہوتا گیا انسان کو اس بات کا احساس تیز سے تیز تر ہوتا گیا کہ دنیا کی چیزوں کے استعمال میں دوسروں کو شامل کرنا ناگزیر ہے۔ دراصل یہی وہ احساس ہے جو ابتدا میں اجتماعی زندگی کا سبب بنا۔ اجتماعی زندگی کی نشو ونما کے لیے انسان کو اپنے اوپر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ تھا شہریت کا پہلا تصور جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ انسان نے عمر اور تجربے سے سیکھا کہ اس کے ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے گویا کہ شروع میں جن ذمہ داریوں کا بوجھ انسان کے کندھوں پر پڑا۔ وہ کسی بیرونی طاقت یا شخصیت نے اس پر زبردستی۔۔۔ عاید نہیں کی تھیں بلکہ اس نے خود انھیں ضروری سمجھ کر اپنے ذمہ لیا تھا لیکن

جماعت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شہریت کا رنگ روپ بھی بدلتا گیا۔ رفتہ رفتہ پوری جماعت کی باگ ڈور فرد واحد کے ہاتھ میں آئی جو سب سے طاقتور اور ذہین ہوا۔ بس اس نے ساری جماعت کو اپنے حکم کے مطابق چلنے پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسان جو آزاد پیدا ہوا تھا اور شروع میں کچھ عرصے تک آزاد رہا بھی۔ رفتہ رفتہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔ اجتماعی زندگی نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں کبھی پروہتی نظام قایم ہوا تو کبھی جاگیرداری کبھی امپریلزم نے زور پکڑا تو کبھی فاسزم نے۔ یہ سارے کے سارے نظام کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ اس وقت بھی دنیا کے بعض حصوں میں غلامی کی رسم جاری ہے جہاں آقا کے نزدیک غلام کی قدر وقیمت ایک زرخرید مویشی سے زیادہ نہیں ہے۔ اب بھی کہیں کہیں جاگیرداری اپنی روایتی شان وشوکت کے ساتھ پیچھے جمائے ہوئے ہے۔ امپریلزم مختلف بھیسوں میں دنیا کے بیشتر حصے کو دن رات کھلے بندوں لوٹ رہی ہے اور فاسزم امپریلزم کی مدمقابل بن کر انسانیت کو تباہ وبرباد کرنے میں اپنے حریف سے بازی لے جانے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے۔

ساتھیو! ہر نظام اپنے وجود کو قایم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر ضرور کرتا ہے۔ وہ افراد کے لیے خاص راستے بھی تجویز کرتا ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے انھیں ان راستوں پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک "شہریت" نام ہے ان بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی صفت کا۔ کسی نظام کی نظر میں اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اس نظام کو سب سے اچھا سمجھے اور اس کی بقا کے لیے ہر قسم کی جد وجہد کرے گویا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد کو ایک ہی سانچے میں ڈھالکر ایک نمونے کا بنا دیا جائے اور اس طرح بڑی حد تک انفرادیت کو ختم کر دیا جائے۔ غرض شخصی آزادی اور شہریت دو متضاد چیزیں بن گئی ہیں لیکن یہ ہے بہت مضحکہ خیز اور نامعقول بات۔ وہ ریاستیں جو آج ایک خاص قسم کے انسان ڈھالنے کا کام بہت انہماک سے کر رہی ہیں۔ ان کے بڑے بڑے نامور فرزند جن کے نام آج بھی ان کی قومیں عزت واحترام کے ساتھ لیتی ہیں جن کے ادبی پیدائش اور ایام وفات کو قومی تہوار کا درجہ حاصل ہے اس ٹائپ سے بالکل مختلف تھے جس کے پیدا کرنے کی آج جد وجہد

کی جا رہی ہو۔ اگر کسی شہری میں آزادی رائے اور آزادی عمل کی جھلک نظر آتی ہو تو اسے ریاست کچلنے کی کوشش کرتی ہو گو کہ یہ دو خوبیاں ہیں جو کہ اس ریاست کے گزشتہ نامور فرزندوں کی شخصیت کا بہت نمایاں حصہ تھیں۔ امریکہ والے ابراہم لنکن کا نام بہت عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ ان کے ہاں لنکن کی شان میں قصیدوں کے دیوان کے دیوان بھرے پڑے ہیں لیکن وہاں آج ان لوگوں کو بلا تکلف جیل میں ٹھونس دیا جاتا ہو جن میں لنکن جیسے خیالات اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ تمام مغربی ممالک حضرت عیسیٰؑ کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن وہ اگر آج زندہ ہوتے اور اپنے اصول کے مطابق لڑائی میں شریک ہونے کے خلاف آواز بلند کرتے تو ان کی جو گت بنتی اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں یا تو انہیں کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہوتا جہاں ان کی آواز سننے والا بجز ان کی ذات اور ان کے خدا کے اور کوئی تیسرا نہ ہوتا یا پھر سرے سے ان کا حساب ہی بے باق کر دیا گیا ہوتا۔ اس سے ظاہر ہو کہ اس قسم کی شہریت بحیثیت ایک آئیڈیل کے بہت ناقص چیز ہو کیونکہ اس سے تخلیق کے سارے سوتے بند ہو جاتے ہیں اور ذہنی طور پر انسان محض غلام بن کر رہ جاتا ہو۔ ذہنی غلامی کبھی بڑے آدمی پیدا نہیں کر سکتی بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی وجہ سے معمولی انسان بھی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی نہیں کر پاتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ کیا ہر قسم کی شہریت انسان کی ترقی کو روکتی ہو اور شہریت کی تعلیم لازمی طور پر گھٹیا اور پست قسم کے انسان پیدا کرتی ہو؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہو۔ اصل میں شہریت کا تعلق جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہو سماجی نظام سے ہو۔ اگر کسی سماج میں ہمیشہ بڑھنے اور ترقی کرنے کے بیج موجود ہیں، اگر وہ سمجھتا ہو کہ عوام کی ترقی اس کے لیے مضر ہونے کے بجائے مفید ہو تو وہ اپنے افراد کی فردیت کو بجائے دبا کر ختم کرنے کے ابھارنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اچھی طرح پھلنے پھولنے کے موقعے دے گا۔ وہ ان قوتوں کی سرکوبی کرے گا جو عوام کو ترقی کرنے سے روکتی ہیں جو انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتیں۔ وہ ان پابندیوں کی تعداد کم سے کم کرے گا جن کا ماننا اور جن کے مطابق چلنا ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔ یہ پابندیاں ایسی ہوں گی جو اس کی نشوونما میں رکاوٹ

ڈالنے کے بجائے معاونت کریں گی۔ اسے میں دو ایک مثالوں سے واضح کروں گا۔ سڑک کے ایک طرف چلنے کی پابندی نہ صرف دوسروں کے لیے مفید ہے بلکہ اس شخص کے لیے بھی مفید ہے جو اس پابندی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس طرح نہ صرف موٹر، بس اور تانگوں کو پیدل چلنے والوں کی وجہ سے رکاوٹ نہیں ہوتی بلکہ پیدل چلنے والا بھی سڑک کے حادثوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اس طرح ہر شخص کو کام کرنے پر مجبور کرنا نہ صرف ریاست کے لیے مفید ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی جو دوسروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور خود عیش سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کو بھی انفرادی خوبیاں اجاگر کرنے کا موقع ہوگا۔ ایسے ترقی پسند سماج میں اجتماعی زندگی کی خاطر انفرادی امتیازات کو فنا کرنے کے بجائے صحیح سمتوں میں ابھارا جائے گا۔ اگر شہریت کی تعلیم اس قسم کے سماج کو پیش نظر رکھتے ہوئے دی جائے تو انفرادی کلچر کی بہترین چیزوں کو قایم رکھنا ناممکن نہیں ہے لہذا شہریت کی تعلیم کے معاملہ میں بہت سمجھ بوجھ اور ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اگر اس میں دور اندیشی کو جگہ نہ دی جائے تو یہ فرد کو موجودہ نظام حکومت کا محض آلۂ کار بنائے گی اور بس۔ اس لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہم شہریت کے تنگ آئیڈیل کے خطرات سے آگاہ رہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہریت کی تعلیم کے دو مختلف مقصد ہو سکتے ہیں یا موجودہ نظام کو قایم رکھنا اور اسے تقویت پہنچانا یا اسے برباد کرکے دوسرے نظام کی داغ بیل ڈالنا دوسرے لفظوں میں افراد کو ایک آئیڈیل سماج کی تشکیل کے لیے تیار کرنا۔ جہاں تعلیم قدامت پسند ریاست کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہاں تقریباً ہمیشہ اس کا مقصد موجودہ نظام کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے اور اس صورت میں تعلیم ایک پیچھے لے جانے والی طاقت کا کام کرتی ہے۔ قدامت پسند ریاستیں شہریت کے نام سے جمہور میں جو باتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں ان میں سے اکثر اچھی نہیں ہوتیں کسی شہری میں حُبِ وطن کی خوبی کو بہت سراہا جاتا ہے لیکن یہ حُبِ وطن افراد میں جس شدت کے ساتھ پیدا کی جاتی ہے وہ اچھی ہونے کے بجائے بہت بُری چیز ہے۔ شہری اپنے وطن کے مقابلے میں دوسرے دیس کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے اور کسی حد تک انھیں حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کا جذبہ خودک

نتیجہ ہو سکتا ہو اس کا ایک دل ہلا دینے والا سین آج ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں فاشسٹ نظام حکومت میں ایک اچھے شہری کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہو کہ وہ اپنے تمدن اور تہذیب کو سب سے اچھا سمجھے اور یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی سمجھے کہ دنیا کے اور کسی ملک کو اپنے تمدن اور تہذیب کو قایم رکھنے کا کوئی حق نہیں ہو اور اسی لیے تمام دنیا والوں کو اسی کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے۔ اسی بات کا بیڑا جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے اٹھایا ہو کہ وہ گولے اور بارود کے زور سے تمام دنیا کو مہذب بنا کے چھوڑیں گے۔ ہندوستان کی قومی تحریک میں بھی اس رجحان کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہو۔ قومی جھنڈے کے گیت میں تمام دنیا کو جیتنے کی اُمنگ کا اظہار رہتا ہو۔ سکل دسو میں یہ لہرادے، تب ہووے پرن پرن ہمارا یعنی جب ہمارا ترنگا جھنڈا تمام دنیا پر لہرائے گا تب ہی ہمارا عہد پورا ہوگا۔ اس قسم کی شہریت کی تعلیم نہ صرف دوسرے ملکوں کو ظلم واستبداد کا شکار بنانے کی طرف مائل کرتی ہو بلکہ وہ اپنے ملک میں بھی تشدد اور ناانصافی برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہو۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب کبھی کسی بڑے کارخانے یا تعلیمی ادارے میں ہڑتال ہوتی ہو تو ہم میں سے اکثریت کی ہمدردیوں کا رُخ کس طرف ہوتا ہو۔ ہم میں سے ایسے کتنے لوگ ہیں جن کی ہمدردی صحیح معنوں میں مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہو یوں زبانی ہمدردی تو تقریباً سب ہی دکھاتے ہیں لیکن عملی طور پر ان کی مدد کرنے والے بہت ہی کم لوگ ہوتے ہیں۔ آخر اس سنگدلی اور بے حسی کی اصل وجہ کیا ہو؟ دراصل بات یہ ہو کہ ہماری شہریت کی تعلیم ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہو کہ ملک کا قانون اور دستور اس قسم کی سماجی ناانصافیوں کو جائز قرار دیتا ہو۔ دستور چاہتا ہو کہ ضبط اور [illegible] بہر صورت قایم رہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اقتدار رکھنے والی جماعت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ روس کو چھوڑ کر باقی تمام ملکوں میں مدرسہ طلبا کو بزدلی کا سبق دیتا ہے وہ سکھاتا ہو کہ موجودہ سماجی نظام کی بنیاد عدل وانصاف پر قایم ہو۔ بھلا ایسے مدرسوں کے طلبا سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں؟

اب تک ہم نے اس بات سے بحث کی ہو کہ موجودہ نظام کو تقویت پہنچانے والی شہریت کی تعلیم کس قسم ہوتی ہو اور اس میں کیا خامیاں ہیں۔ اب ہم شہریت کی تعلیم کے دوسرے مقصد کو لیں گے

یعنی پرانے نظام کو ختم کر کے ایک ایسا نظام قایم کرنا جس کا انحصار انصاف اور انسانی مساوات کے اصول پر ہو۔ یہ ان لوگوں کا نظریہ ہے جن میں موجودہ نظام کا سخت ردعمل ہوا ہے اور جنھیں انقلاب کے سوا نجات کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہاں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایک انقلابی کے نزدیک شہریت کا تصور اسی قدر تنگ ہو سکتا ہے جس قدر کہ قانون اور دستور کے حامی کا۔ کسی قایم شدہ نظام سے بغاوت اور دشمنی کے دو مختلف سبب ہو سکتے ہیں مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی یا خوش حال لوگوں کے ساتھ نفرت۔ بعض انقلابیوں کی جد وجہد اتنی عوام کو خوش حال بنانے کے لیے نہیں ہوتی جتنی کہ ان لوگوں سے انتقام لینے کی خواہش سے جو موجودہ صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ یہ اپنی جگہ کوئی پسندیدہ جذبہ نہیں۔ تنگ نظر اور متعصب انقلابی، رجعت پسند کی دقیانوسیت کو رفتہ رفتہ اختیار کر لیتا ہے جو عقل اور اپج کے سرچشموں کو ہر صورت میں ابھرنے سے روکتی ہے۔ ہاں یہ بات تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گی کہ نفسیاتی امتیاز سے یہ لازمی بات ہے کہ اگر ہمیں ایک چیز سے محبت ہے تو اس کی متضاد چیز سے نفرت ہوگی لیکن ہم ان میں سے کس کو پہلے رکھیں اور زیادہ زور دیں۔ اس سے ہمارے عمل میں بہت بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے تاہم اس میں شک نہیں کہ انقلاب کا حامی قانون اور دستور کے حامی کے مقابلے میں بہتر تعلیم دے سکتا ہے۔ قدامت پسندی میں اعلیٰ قسم کے ذہنی عمل کی گنجایش کم ہے۔ برعکس اس کے انقلاب کے حامی کو کسی حد تک ہر وقت تخیل سے کام لینا پڑتا ہے تاکہ وہ موجودہ چیزوں سے بہتر کوئی دوسری چیز پیش کر سکے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی اعلیٰ قدروں سے واقف ہو اور انھیں کسوٹی سمجھ کر موجودہ سماج کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ ان لوگوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا جو موجودہ نظام کے مظالم کے شکار بنے ہوئے ہیں۔ یا وہ لوگوں کی تکلیف دور نہ کرنے کے لیے بہانے تلاش نہیں کر سکتا۔ بہر حال قدامت پسند تعلیم کے مقابلے میں انقلاب پسند تعلیم میں عقل، اپج اور ہمدردی کے لیے زیادہ جگہ رہتی ہے۔

باوجود اس کے کہ شہریت کی تعلیم میں خطرے ہیں تاہم اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا

جا سکتا کیونکہ سماج کی کڑیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ مہذب زندگی کی آسانیاں اور سہولتیں باہمی اشتراک عمل پر منحصر ہیں اور صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور بھی بڑھتی جائے گی۔ قومی مرکزیت کا احساس اب تقریباً سب ہی ملکوں میں زور پکڑ رہا ہے لیکن دنیا کی موجودہ جنگ کی ہولناک تباہیوں نے شدت کے ساتھ اب اس کا احساس پیدا کر دیا ہے کہ محض قومی مرکزیت سے بھی کام نہیں چلے گا جب تک بین الاقوامی مرکزیت کو قایم نہ کیا جائے اس کے بغیر ہماری سائنٹفک تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی بلکہ اس کو خودکشی کرنی پڑے گی۔ جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے تمام دنیا کی ایک ریاست یا تمام ملکوں کے ایک قومی وفاق (فیڈریشن) کی ضرورت ہوگی۔

یہ تو ماننا پڑے گا کہ شروع میں کچھ عرصے تک اس قسم کی شہریت کی تعلیم میں بھی کچھ خرابیاں ضرور رہیں گی جو انفرادی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گی۔ لیکن اگر اس کے بغیر ساری دنیا کی تہذیب و تمدن کے برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے تو ان عارضی خرابیوں کو برداشت کرنا چاہیے۔ آج کل کی قومیں پرانی قوموں کے مقابلہ میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتی ہیں اور اگر انھیں زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا ہے تو ان کے افراد میں قومی شہریت کے احساس کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی شہریت کا احساس تیز سے تیز تر ہونا چاہیے۔ دنیا کی ریاست کی وفاداری قومی وفاداری کے بدترین نتیجے یعنی جنگ کے امکانات کو بالکل ختم کر دے گی۔ اس لیے اب تعلیم کا سب سے بڑا کام افراد میں بین الاقوامی شہریت کا احساس پیدا کرنا اور بڑھانا ہے۔ اب ہمارا کام بحیثیت استاد کے یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کو اس ہونے والی دنیا کی ریاست کا شہری بنائیں یعنی ان میں وہ ذہنی اور عملی خوبیاں پیدا کریں جو اس ریاست کے قیام میں مدد دیں گی۔ ہم اپنے طلبا میں یہ احساس پیدا کریں کہ تمام دنیا کے بسنے والے ایک ہی انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بحیثیت انسان کے کوئی فرق نہیں وہ تمام لوگ جو محنت اور ایمانداری سے روزی کماتے ہیں قابل عزت ہیں۔ ہمیں ان کی سیوا کرنی چاہیے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا چاہیے۔ ان میں ان کی موجودہ پستی اور تباہی کا احساس

پیدا کرنا چاہیے اور اسے دور کرنے کی تدابیر بتانی چاہییں۔ اس قسم کی تعلیم تمام دنیا کی ایک جمہوری ریاست قائم کرنے میں مدد دے گی جبکہ ساری دنیا ایک اور صرف ایک ہی اقتصادی اور سیاسی جماعت ہو جائے گی اس وقت انفرادی نشو و نما کے لیے بھی صحیح معنوں میں مواقع ہوں گے۔ اس وقت تعلیمی میدان میں ریاست اور بچے کے مفاد ایک ہی ہوں گے۔ اس وقت جارحانہ قسم کی قومیت کی تعلیم دینا غیر ضروری ہوگا۔ پھر یونیورسٹی ٹریننگ کور یا غلط تاریخ پڑھانے کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ پھر ہمارے تعلیمی اداروں میں بچوں کو یہ بتانے اور یقین دلانے کی کوئی وجہ نہ ہوگی کہ انگریزوں کی حکومت یا مسلمانوں کی سلطنت انصاف اور اخلاق کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی تھی۔ یا یہ کہ ہندو راج "رام راج" تھا جہاں گائے اور شیر ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ ہندوؤں کا قدیم کلچر بہت ہی ترقی یافتہ تھا۔ یہاں تک کہ اُس زمانہ میں ہندوستانیوں نے وہ تمام چیزیں ایجاد کرلی تھیں جنھیں آج جدید سائنس کے کرشموں میں شمار کیا جاتا ہے وغیرہ۔ غرض اس وقت انسانی ذہن ہر قسم کے تعصبات و توہمات سے پاک ہو جائے گا۔

شہریت کی تعلیم کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ اچھے شہری کس طرح تیار کئے جائیں۔ شہریت کی تعلیم گھر سے شروع ہوتی ہے جب بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے اس وقت ہی سے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ اس میں کچھ ایسی عادتیں پیدا کر دیتے ہیں جو شہریت کے لحاظ سے مفید یا مضر ہوتی ہیں۔ اگر گھر میں بچے کو بہت زیادہ لاڈ پیار کیا جاتا ہے اور اس کی ہر ضد کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ بچے میں اپنی ضرورت اور خواہش کو مقدم سمجھنے کا رجحان ترقی کرتا ہے یقینی طور پر شہریت کی تعلیم کی یہ بہت بُری ابتدا ہے ایسا بچہ بڑا ہونے پر بھی خود غرضی کی طرف مائل ہوگا اور اُسے دوسروں کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اُٹھانے میں ذرا تامل نہ ہوگا۔ برعکس اس کے اگر گھر میں اس پر بہت بے جا دباؤ ڈالا گیا تو یہ بھی شہریت کی تعلیم کے حق میں بُرا ہے کیونکہ اس صورت میں اُس میں خود اعتمادی کے بجائے احساس کمتری پیدا ہو جانا ناگزیر ہے جس کا نتیجہ آگے چل کر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کوئی کام ہی نہ کر سکے اور ہر معاملے میں دوسروں کا دست نگر رہے لہٰذا شہریت کے لیے وہی گھر اچھا ہے جہاں بچے کو شروع سے یہ سکھائی جاتی ہے کہ ہر حق کے ساتھ ایک فرض بھی وابستہ ہے جہاں اسے

دوسرے بچوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کا موقع دیا جاتا ہو اور جہاں اسے ہر بات میں دوسروں کا بھی خیال رکھنے کی ضرورت سے آگاہ کیا جاتا ہو۔

لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے بہت کم گھر ایسے ہیں جو صحیح تربیت کا فرض انجام دیتے ہیں اس لیے شہریت کی تعلیم کا فرض کلیتہً مدرسہ کے ذمہ آتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ گھر اس بڑے کام میں مدرسہ کا ہاتھ نہیں بٹاتا بلکہ اکثر گھر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ اس صورت میں مدرسہ کا کام بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مدرسے کو بڑی ہمت اور مستقل مزاجی سے اس بڑے فرض کو انجام دینا چاہیے۔ اسے چاہیے کہ وہ مدرسے کی زندگی میں ایسے زیادہ سے زیادہ موقعے فراہم کرے جن میں بچے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنا سیکھیں۔ اپنی نجی ضرورتوں کو باری باری سے پورا کریں۔ مدرسے کے سامان کو ذمہ داری سے استعمال کریں۔ اس قسم کی سماجی خوبیاں بچوں کو چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں دینے سے پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مدرسہ اور جماعت کا انتظام کرنے کے لیے بچوں کی خود اختیاری حکومت قایم کی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو انھیں سماج سیوا کے بڑے کام سونپے جا سکتے ہیں۔ مثلاً دیہات سدھار، تعلیم بالغان، فرسٹ ایڈ، میلوں اور حادثوں میں عوام کی امداد کرنا وغیرہ۔ ان میں سے بعض کام گرمیوں کی بڑی تعطیلات میں منظم طور پر کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے طلبا میں ان کاموں کے ذریعہ یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ دنیا کے کام مل جل کر کرنے سے بخوبی چلائے جا سکتے ہیں۔ وہ اس بات کی اہمیت سمجھ جائیں گے کہ جو چیزیں عوام کے استعمال کے لیے ہیں انھیں بہت سلیقے اور ذمہ داری سے برتنا چاہیے۔ اور کسی چیز پر اپنے حق کی خاطر دوسروں کے حقوق نظر انداز نہیں کرنے چاہییں۔

اگر ہم اپنے موجودہ تعلیمی ادارہ کو اس کسوٹی سے جانچیں تو ہمیں بڑی مایوسی اور ندامت ہوتی ہے۔ اچھے شہری ہماری موجودہ تعلیمی فضا میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ اسے آپ تعلیمی فضا کہیں گے یا تخریبی فضا جس کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں۔ اٹھتی ہوئی امنگوں اور بڑھتے ہوئے حوصلوں کو کچلنے والی، ذہنیت پست کرنے والی اور اخلاق بگاڑنے والی تعلیمی رعائتیں۔ بلا سمجھے بوجھے رٹنے کے لیے کتابوں کا ایک ڈھیر اور سب سے بڑا امتحان کا ہوا جو مہینوں رات کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ اچھے شہری پیدا

کرنے کے لیے تعلیمی فضا کو ان برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ ہمارے نئے مدرسے میں جرمانے، بیت یا مدرسے سے اخراج کا خوف دلا کر ضبط پیدا نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی بنیاد طلبا اور اساتذہ کے باہمی خوشگوار تعلقات پر قایم کی جائے گی۔ وہاں افراد ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے کے ہمدرد ہوں گے۔ وہاں دفعہ ۱۰۹ کے ملزموں کی طرح طلبا کی نگرانی نہیں کی جائے گی بلکہ وہ خود اپنے نگراں ہوں گے۔ وہاں جاسوسی سب سے بڑا گناہ اور اخلاقی گناہ سمجھا جائے گا۔ طلبا خود اپنی بنائی ہوئی انجمنوں اور اپنے چنے ہوئے نمایندوں کے ذریعہ ضبط قایم رکھیں گے۔ مدرسے کا ہر رکن انجمن کے سامنے اپنے کردار کے لیے جواب دہ ہوگا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر فرد ضبط نفس کا عملی سبق سیکھے گا۔ پھر وہ نہ صرف اپنے مدرسے کی چار دیواری کے اندر بھلے مانس کی طرح رہے گا بلکہ باہر بھی۔ پھر وہ تکلیف دہ اور شرمناک نظارہ جس سے ہمیں سنیما اور ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر یا ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس ڈبے میں آئے دن دو چار ہونا پڑتا ہے جہاں انسانوں کا مجمع برتاؤ کے اعتبار سے مویشیوں کے گلے سے مشابہ نظر آتا ہے کبھی دکھائی نہ دے گا۔

اگر بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی ادارے یہ کام نہ کرنا چاہیں۔ شاید ان کے منتظمین آج کے فرسودہ سماج کو قایم رکھنے کے لیے تعلیمی اصول اور طریقے نہ بدلیں تو پھر ہمارا فرض کیا ہے؟ اگر ہم ان شہری خوبیوں کی قدر کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ہمارا پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ ہم انھیں اپنی شخصیت میں سمو لیں اس کے بعد ہمیں چاہیے کہ ہم ان خوبیوں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں فرصت کے اوقات میں آرام چھوڑ کر عوام تک پہنچنا ہوگا ان کے ساتھ مل کر ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر ان کے دلوں میں گھر کرنا ہوگا۔ ان کے لیے کلب رات کے مدرسے، کتب خانے، پڑھائی گھر وغیرہ قایم کرنے ہوں گے۔ اس کے لیے سرمایہ سے زیادہ جوش اور نیک نیتی سے کام کرنے والے رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بعض ملک کے طلبا نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں کیا ہندوستان کے طلبا جو آج ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اس میدان میں [illegible] گے اور اس میدان میں اپنے قدم بڑھائیں گے؟ میرے نزدیک آپ شہری اور سماجی احساس کو پرکھنے کے لیے سب سے بڑی اور صحیح کسوٹی یہی ہے۔ کیا آپ اس امتحان کے لیے تیار ہیں؟

سلامت اللہ

مارکسیت

سیاسی بحثوں میں اکثر ہمارے کان لفظ مارکسیت سے آشنا ہوتے رہتے ہیں خصوصاً نوجوان طبقہ اس نظریہ زندگی کو ہر سیاسی، سماجی، ذہنی اور ارتقائی کش مکش کا واحد حل سمجھتا ہے لیکن اس لفظ کے جتنے نام لیوا ہیں شاید اتنے ہی اس کے معنی بھی تراش لیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مارکسیت ایک اقتصادی نظام ہے تو دوسرا اس کو ہر زاویہ نگاہ میں انقلاب سے تعبیر کرتا ہے۔ عامیانہ تشریح یہ ہے کہ اس نظریہ کا بانی یعنی کارل مارکس اشتراکیت کا باوائے آدم تھا اور اس کی پیشین گوئیوں پر عمل پیرا ہو کر لینن نے روس میں انقلاب برپا کیا لیکن شاید ان تمام حضرات کے تعجب کی انتہا نہ رہے جب ان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تمام تشریحات محض فروعی ہیں اور خود نظریہ مارکسیت مارکس ایجاد کردہ نہیں ہے۔ مارکسیت کو زمان و مکان میں نہیں گھیرا جا سکتا۔ اس کا قیام مارکس سے بہت پہلے موجود تھا

مارکسیت ایک فلسفہ ہے لیکن وہ دیگر فلسفوں سے مختلف ہے۔ دیگر فلسفے ایک حد پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں لیکن مارکسیت آگے قدم بڑھاتا ہے۔ دوسرے فلسفے مزعومات اور اعتقاد کے گورکھ دھندے ہیں جبکہ مارکسیت تاریخ کی مادی تشریح کا نام ہے بعض حضرات اس کو تاریخ کی اقتصادی تشریح سمجھتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے مارکسیت محض روٹی اور کپڑے کے مسائل میں محدود ہو جائے گا۔ مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اقتصادی نظریات، سیاسی اصول اور عمل کا پروگرام تو محض اس کی شاخیں ہیں، چونکہ مارکسیت زندگی کا فلسفہ ہے اس لیے وہ زندگی کے تمام مسائل کا رازدار ہے۔

مارکسیت ایک مادی فلسفہ ہے لیکن مارکسی مادیت عمومی مادیت سے بہت مختلف ہے یہ تو مارکسیت کارل مارکس کی ایجاد کردہ ہے اور نہ کسی ایک فرد نے اس کو بنایا۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پندرہویں صدی سے انیسویں صدی عیسوی تک کے تمام سائنسی خیالات انسانی تجربات افکار اور خیالات کو اکٹھا کیا۔

یورپ میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں زبردست ذہنی ہیجان تھا اور خیالات میں سخت انتشار پرانا نظام چولا بدل رہا تھا بلکہ قدیم سماج کے بطن سے ایک نیا بچہ پیدا ہو رہا تھا۔ انسانی طبیعتوں میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ پرانی تہذیب اپنی افادیت کھو چکی تھی تصوف اور مابعد الطبیعات انسانی ذہن کو اسپار رکھنے کی ناکام کوششیں کرتے کرتے تھک چکے تھے چنانچہ ایسے نظام کی ضرورت تھی جو سماجی جمود اور ذہنی سکرات کو ختم کر دے۔ جب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی انقلابات پڑھتے ہیں ہمیں کبھی بھی پندرہویں اور سولہویں صدی کا پس منظر نہ بھولنا چاہیے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ مارکسیت ایک فلسفہ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا فلسفہ بذات خود کیا شے ہے؟ اس کے جواب میں اس قدر اختلاف رائے ہے کہ شاید ہی دو فلسفی متفق ہوں لیکن اگر ہم فلسفہ کی تاریخ پر غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی مادی تشریح کا نام فلسفہ ہے اگر ہم قدیم ترین فلسفہ کا مطالعہ کریں تو کیا مشرق اور کیا مغرب ہم یہی پائیں گے کہ اس کی بنیاد عقلیت پر تھی۔ وہ انسان کے ماحول اور اس کے تعلقات کا تجزیہ کرنا چاہتی تھی لیکن علوم کی کمی اور عقول کی تنگی کے باعث قدیم انسان کی یہ کوشش رائیگاں گئی آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں فطرتاً موجود ہے اور اعتقاد ایک لابدی امر ہے لیکن انسان کی قدیم تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انسان کی فطرت میں اعتقاد نہ تھا۔ اس کو اسباب و علل معلوم کرنے کا شوق تھا اور وہ فطرتاً غیر معتقد تھا۔ اعتقاد کا قیام انسانی ذہن میں اس وقت ہوا جب وہ تنگ نظری اور کم علمی کی وجہ سے کائنات کا تجزیہ نہ کر سکا لیکن ناکامی کا اعتراف اس کی غیرت کے خلاف تھا چنانچہ اس نے اپنی اس نام نہاد ناکامی کو مفروضات کے سلسلے سے وابستہ کر دیا۔

سائنسی طریقہ فکر کے سبب مارکسیت فلسفہ میں آیا۔ تخیل کے یہ معنی نہیں کہ کسی شے کو فرض کر لیا جائے بلکہ کسی شے کی جستجو کے لیے مفروضات کی ضرورت ہوتی ہے جو تجزیہ یا معاملے تو مختلف ہو سکتی ہیں ورنہ مسئلہ [illegible] ہوں گے سائنسدان مفروضات اسی وقت مانتے ہیں جب وہ ان کو تجرباتی جستجو

کی کسوٹی پر پرکھ لے۔ زمانہ جدید کے سائنسی خیالات نے کلاسیکی فلسفہ کو ختم کر دیا جو ہزار بارہ سو سال سے یورپ پہ چھایا ہوا تھا۔ اس کے باوجود بھی سائنسی خیالات اور عقلیت پر اسی وقت پورا پورا بھروسہ کیا جائے گا جب ان کو تجربہ کی بنا پر آزما لیا جائے۔ بعض سائنسی مفکر بھی مفروضات اور مابعد الطبیعیات کے چکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیونکہ کائنات کے تجزیہ میں علوم اور سائنسی آلات کی کمی کی وجہ سے انھیں اب تک ناکامی ہو رہی ہے۔ مارکس سے قبل جدید فلسفہ اسی الجھاوے میں پڑا تھا مفکرین پرانے مفروضات ترک کر کے نئے نئے مفروضات کے چکروں میں پھنس جاتے تھے۔ مثال کے طور پر کانٹ کو لے لیجیئے۔ اس کے فلسفہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حد درجہ کا "سترد کن" تھا لیکن لطف یہ کہ پرانے مابعد الطبیعیاتی عقاید مسترد کر کے اس نے نئے ایجاد کر دیے۔

مارکس نے قدیم فلسفہ کو ختم کر دیا۔ اس نے کہا کہ "خیالات حقیقت ہیں۔ قدیم فلسفی خیالات کی حقیقت سے انکار کرتے تھے۔ مارکس پہلا مادی تھا جس نے خیالات میں داخلی حقیقت کو دریافت کیا۔ اس نے کہا جب ایک بار بھی خیالات پیدا ہو جائیں اور انسانی ذہن میں ان کا تسلسل قایم ہو جائے تو وہ اتنے ہی اصل ہوں گے جیسے کوئی بھی طبعی شے۔ چنانچہ اس کے مطابق "خیالات" طبعی اور مادی ہوتے ہیں ایک اور سوال تھا جس کا جواب مارکس نے دیا "مادہ یا خیال" پہلے کس کا وجود تھا؟ اس کا تعلق انسانی خیالات اور ارتقا سے ہے ہیگل کے مطابق نوع انسان کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے چنانچہ اس کے بموجب خیال ہمیشہ سے قایم تھا اور مادہ ان ہی خیالات کا ایک سلسلہ تھا یا بالفاظ دیگر ایک وسیلہ لیکن مارکس نے اس سے اختلاف کیا۔ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ "خیالات وجود ہی میں کیونکر آئے؟ اس نے کہا کہ اگر بقول ہیگل نوع انسانی کی تاریخ فلسفہ کی تاریخ ہے تو اس کا راز خیال میں مضمر ہوگا جو فلسفہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں ہی "خیال" پیدا ہو جائے گا انسانی کردار اور ارتقا بھی اسی خیال کے زیر اثر رہیں گے جس کے معنی یہ ہوے کہ انسان ایک خیالی جال میں پھنسا رہے گا اور اس کی تمام حرکات اور عادات، کردار اور ارتقا سب قایم شدہ خیال کے ماتحت ہوں گے۔ پھر انسان کبھی بھی خیال کی جبریت سے باہر نہیں آ سکتا لیکن تاریخ میں ایسا نہیں

ہوا۔ ان خیالات کی جبریت سے انسان ہمیشہ جد وجہد کرتا رہا ہے۔ دنیا کا ارتقا ہی اس جبریت سے گریز کے باعث ہوا ہیگل نے تشفی بخش جواب نہیں دیا اور نہ اس نے یہ بتلایا کہ خیال پیدا کیونکر ہوا۔

سائنسی علوم مثلاً بشریات اور علم آثار قدیمہ کے ذریعہ مارکس نے سماج کی ابتدا کی جستجو شروع کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ انسان کے خیالات اس کے زمانہ کے طریق پیداوار کے مطابق قایم ہوتے ہیں۔ معاش کی جستجو میں انسان جو طریقہ اختیار کرتا ہو وہ اس کے خیالات کی بھی عکس کشی کرتے ہیں یعنی یہ کہ مادہ پہلے اور خیال بعد میں۔ اس نتیجے نے مسایل زندگی کی بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا دیا۔ یہ صحیح ہو کہ بہت سے موجودہ فلسفی اور سائنسداں مارکس کی اس تشریح کے قائل نہیں ہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ انسان کے خیالات اس کے ماحول کا آئینہ ہیں۔ اس کے ثبوت میں نہ صرف تاریخ پیش کی جا سکتی ہو بلکہ ہر زمانہ کا سماجی ماحول بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی میں بھی بعض قومیں قدیم تہذیب کو سینے سے لگائے ہیں جبکہ ان کی ہمسایہ قومیں تہذیب نو کا گہوارہ ہیں اگر ایک قوم میں جاگیری نظام موجود ہو تو دوسری میں سرمایہ داری اور تیسری میں اشتراکی۔ مارکس کی اس تحقیق کے بعد فلسفہ کے بہت سے مسائل حل ہو گئے اور انسان پہلی بار ایک خیالی غلام کے بجائے تاریخ کے اصلی رنگ روپ میں نظر آیا وہ اپنی ماہیت سے واقف ہوا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد مارکس نے فلسفہ کی بالکل نئی تعریف کی۔ اس کا قول ہو کہ فلسفہ دنیا کی تشریح ہی نہیں کرتا ہو بلکہ اس کو بدل بھی سکتا ہو۔ مارکس سے قبل ہر فلسفی نے دنیا کو جوں کا توں مان لیا اور یہ سوال نہیں اٹھایا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں اور اپنی موجودہ شکل میں کیونکر آئیں۔ جس شکل میں کائنات ان کے سامنے موجود تھی اور جو حرکتیں اشیا میں ہوتی رہتی تھیں انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور ان حرکتوں اور عمل کی تبدیلیوں ہی پر تجربے کرتے رہے کسی نے بھی اس عمل کی وجہ دریافت نہ کی۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ اشیا کے عقب میں کوئی پوشیدہ قوت موجود ہو جو اپنے اشاروں سے دنیا میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے یہ مشاہدہ کی جگہ کسی خیالی بنیاد پر قایم تھی۔ مارکس نے ان تصورات کو مسترد کر دیا۔ بقول اس کے

انسان کائنات کی تشریح کر سکتا ہے کیونکہ کائنات کے بنانے میں اس کا ہاتھ ہے۔

فلسفہ کا کام دنیا کی تشریح کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو تبدیل بھی کر دینا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسان دنیا بنا سکتا ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے پیشرو اور قدما نے اس دنیا کو بنایا تھا جس میں ہم رہتے ہیں۔ یہ نظریہ مذہبی خیالات و افکار کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اعتقاد کو کالعدم کر دیتا ہے۔ مارکس سے قبل تصوراتی فلسفہ نے مذہبی خیالات رد کر کے تقدیریت قائم کر رکھی تھی جس کے بموجب انسان اپنے ماحول کا شکار تھا نہ اس کو اپنے ماحول پر قدرت تھی اور نہ وہ اس کو بدل ہی سکتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک بہت بڑے خیالی جیل خانے میں بند ہے جس میں ہر کام کسی غیر فطری قوت کے اشاروں پر ہوتا ہے اور بے چارہ انسان کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہتا ہے۔ مارکس نے اس کہنہ خیالی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ سائنسی علوم سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقا سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ انسان اس ماحول پر ردعمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود۔ چنانچہ وہ اپنے ماحول ہی کا بنانے والا نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا بھی ہے۔

تاریخ کی مادی تشریح کے ذریعہ مارکس نے انسانی ارتقا کی تاریخ ازسرنو لکھی اس سے پہلے تاریخ چند غیر معتبر واقعات کا مجموعہ تھی۔ لوگوں کو تاریخی واقعات پر اتنا ہی ایمان تھا جیسے خدا یا مذہب پر کبھی ان واقعات کی چھان بین نہیں کی گئی۔ اکثر سینہ بہ سینہ صحیح یا غلط واقعات چلے آتے تھے لیکن کوئی ان پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ چونکہ کوئی مورخ ایک واقعہ کو لکھ گیا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ان کا فرض ہو جاتا تھا تمام مذہبی رزمیہ نظمیں اس کے ثبوت میں موجود ہیں۔ مارکس نے تاریخ کو سائنس کا رتبہ دیا جس طرح سے کہ طبعی دنیا کا کوئی امر بغیر سبب کے رونما نہیں ہو سکتا اسی طرح تاریخی واقعات بھی گزشتہ واقعات کے مرہون منت ہیں۔ تاریخ کے اس بنیادی اصول پر تہذیب و تمدن کا نشوونما ہوا اور انسانی ارتقائی منازل پر پہنچا لیکن عمل اور ردعمل کے بغیر انسان ہرگز ارتقائی منازل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے جب ایک نظام قایم کیا تو اس میں یہ بھی اہلیت تھی کہ وہ اس نظام کو تبدیل بھی

کرسکے۔ مثلاً اس نے جب جاگیری نظام کی بنیاد ڈالی تو اسی کو اکھاڑ پھینکا۔ یہ ہے جدلیات کا اصول جس کو مارکس نے دنیا کے سامنے پیش کیا وہ کہتا ہے کہ ہر شے میں اس کے عمل اور ردعمل کی قوتیں موجود رہتی ہیں۔

مارکس نے اپنے عہد کے سرمایہ داری نظام کو جدلیاتی کسوٹی پر پرکھا۔ اس نے ثابت کیا کہ اس کے عہد کا نظام تمدن، آرٹ اور انسانی کردار سب ہی سرمایہ داری طریقہ پیداوار کا آئینہ ہیں اس عہد سے قبل انسانی ذہنیت، خیالات، علوم وفنون اور انسانی قدریں سب ہی جاگیری سماج کے محور پر گھومتی تھیں لیکن جس وقت جاگیری سماج کے نقائص عیاں ہو گئے۔ پوشیدہ جراثیم اُبھر آئے اور کمزور نظام اپنی افادیت کھو چکا تو سرمایہ داری نے اس کو ایک ہی دھکے میں گرا دیا اور روز افزوں انسانی ضروریات کے مطابق ایک نیا نظام قایم کیا۔ لیکن سرمایہ داری نظام میں بھی اس کے ردعمل کی قوت پوشیدہ تھی۔ جب تک یہ نظام بنی نوع انسان کی ترقی کی شاہراہ بنا رہا زیادہ سے زیادہ لوگ اس پر گامزن رہے لیکن جب اس شاہراہ کی ملکیت سمٹ کر صرف پانچ فیصدی لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو یہ نظام بھی تاریخ کی چکی میں پیس ڈالا گیا اور اشتراکیت کا قیام ہوا۔ مارکسیت کے بموجب اشتراکیت بھی انسانی ترقی کی آخری منزل نہیں ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے بہت سے اشتراکی اور مارکس کی کتابوں کو طوطے کی طرح رٹنے والے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مارکسیت کے معنی ہیں ایک اشتراکی نظام جس میں اشیا کی ذاتی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت قایم کر دی جائے لیکن ایسے حضرات کنوئیں کے مینڈک کی طرح مارکسیت کو روٹی اور کپڑے ہی کے سوال پر ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ مارکسیت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ توہم پرستی اور ہیرو پرستی، اعتقاد، تنگ نظر قومیت، استبدادیت اور سیاست کا قاطع ہے۔ وہ محض ایک اقتصادی یا سیاسی اصول ہی نہیں بلکہ اس کی ہمہ گیری میں زندگی کا ہر پہلو اور معاشرت کا ہر شعبہ کائنات کی تمام اشیا۔ تنقید، سائنس اور علوم وفنون سب ہی داخل ہیں لیکن مارکسیت چند سخت اصولوں کا مجموعہ نہیں جو ہمیشہ [illegible] کے بعد سائنسی تجربات ہونے پر تجزیاتی آلات کی ترقی سے اور علوم وفنون کی نئی دریافت کے بعد

مارکسیت میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ مارکس نے نہ تو پیغمبری کا دعوےٰ کیا اور نہ اس نے اپنی پیشین گوئیاں کو اٹل ہی سمجھا۔ تاریخ کے مطالعہ، سماج کے حالات اور سائنسی خیالات کی روشنی میں مظاہر قدرت کی تحقیق و تدقیق کرنے کے بعد مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تاریخ میں ہم آہنگی ہے اور دنیا میں تبدیلیاں ایک خاص اصول پر ہوتی ہیں چنانچہ اس نے جو پیشین گوئی کی وہ یہ تھی کہ آئندہ زمانے میں سرمایہ داری کے شکست کھانے اور اشتراکیت کے قایم ہونے کا بہت امکان ہے۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ تبدیلی حتماً اسی طرح واقع ہوگی جیسی وہ سمجھتا ہے۔ خاص فاشیزم کے متعلق مارکس کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ انیسویں صدی میں سرمایہ داری میں اس کا امکان نہ تھا۔ بیسویں صدی میں سرمایہ دار نے تاریخ اور سائنس سے بہت کچھ سیکھا اور اپنی ساکھ کچھ دن اور قایم رکھنے کی غرض سے فاشیزم کو عروج دیا۔ ایک دوسری مثال لیجیے۔ مارکس کے زمانہ میں علم طبیعیات ہنوز ابتدائی منازل میں تھا۔ اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کائنات میں مادہ بہت سے طبعی یا مادی ذروں کی شکل میں موجود ہے۔ مارکس کا بھی یہی خیال تھا لیکن زمانہ حال کی تحقیقات نے اس نظریہ کو مسترد کر دیا ہے۔ جدید سائنس کے مطابق کائنات میں مادہ برقیوں اور پروٹوں کی شکل میں موجود ہے چنانچہ اگر ہم مارکس کے کہنے پر سختی سے پابند رہیں تو ہم غیر سائنسی ہو جائیں گے جو مارکسیت کے متضاد ہے۔

فرض کیا جائے ایک مارکسی خیالات کا انسان ایسے سماج میں منتقل کر دیا جاتا جس میں ہنوز قدیم نظام قایم ہے یہاں مارکسیت کا اطلاق ہو سکتا ہے اور وہ شخص اپنے مارکسی خیالات اور تشریحات رکھ سکتا ہے۔ ایسا شخص غیر فرقہ وارانہ سماج کا نظریہ رکھتے ہوئے اپنا ماحول بنائے گا اور کوشش کریگا کہ سماج جلد سے جلد درمیانی منازل طے کر کے اشتمالیت قبول کرلے۔ خود مارکس نے کیمونسٹ مینفسٹو میں کہا ہے کہ سماج کی نشو و نما تبلاتی ہے کہ سرمایہ داری جلد ختم ہو جائے گی اور دنیا اشتمالیت کی طرف مائل ہو گی لیکن اپنے زمانے کی سیاسی تحریکوں میں مارکس نے ہمیشہ جاگیریت کے خلاف سرمایہ داری کا ساتھ دیا اور کوشش کی کہ جلد سے جلد جاگیریت ختم ہو کر ایک بہتر نظام قایم ہو۔ وہ مانتا تھا کہ سرمایہ داری نظام بھی بنی نوع انسان کے مسائل حل نہیں کر سکتا لیکن جاگیریت کے مقابلے میں

وہ ضرور انقلابی اور مفید تھا۔

مارکس نے یورپ کی سرمایہ داری حکومتوں کا مطالعہ کرکے اشتراکیت کی پیشین گوئی کی تھی لیکن مارکس کے زمانہ میں یورپی قومیں ہندوستان اور چین کے متعلق بہت کم جانتی تھیں۔ چنانچہ یہ کہنا کہ جو کچھ مارکس نے جرمنی، فرانس اور انگلستان کے لیے کہا اور جن جن تبدیلیوں کی پیشین گوئی کی وہ بجنسہ ہندوستان اور چین پر بھی صادق آتی ہیں اور ان ملکوں میں بھی سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں بالکل مغربی ممالک کے اصولوں پر ہوں گی سخت نادانی ہے۔ مارکس نے کبھی اپنے قول کو آخری فیصلہ نہیں کہا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ انسانی ترقی اشتمالیت اور غیر فرقہ وارانہ ریاست قایم ہو جانے پر بند ہو جائے گی۔

مارکسیت اعتقاد نہیں ہے۔ مارکس کے بعد دنیا میں سائنس کو کافی ترقی ہو چکی ہے اور ہمیں چاہیئے کہ مارکس کے ہر قول کو جدید سائنسی تجربات کی روشنی میں دیکھ کر اختیار کریں۔

علی امام ایم اے

برما

پانچ سال پہلے تک ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ اور اب بذات خود ایک ملک یعنی برما یا برہما آسام اور بنگال کے مشرق میں، چین کے جنوب اور سیام کے مغرب میں واقع ہے اس کا رقبہ ٢،٣٣،٤٩٢ مربع میل ہے بمبئی جو اب رقبہ کے اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے پہلے دوسرے نمبر پر تھا کیونکہ اس کا رقبہ ١٠٨٧،١١٥ مربع میل ہے۔ اس کے شمال سے جنوب کی طرف پہاڑیوں کے سلسلے ہیں اور اسی رخ پر دریا بہتے ہیں۔ اس کا ساحل ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ دندانے دار ہے اس لیے یہاں بندرگاہیں اچھی بن سکتی ہیں۔ پہاڑیوں کے درمیان میدانی علاقے ہیں جن میں ہو کر یہاں کے دریا بہہ رہے ہیں۔ برما میں مغرب کی طرف پٹکوئی اور ارکان یوما کے سلسلے ہیں۔ بیچ میں پیگو یوما اور مشرق میں شان اور تناسرم کی پہاڑیاں ہیں۔ شمالی حصہ بالکل پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ جنوب میں کافی چوڑا ڈیلٹا دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے بن گیا ہے۔ یہاں کے بڑے دریا اراودی، ستانگ، سالوین اور چندون ہیں۔ ان میں اراودی سب سے بڑا ہے اور اس میں تقریباً نو سو میل تک چھوٹے چھوٹے جہاز اور اسٹیمر چل سکتے ہیں۔ اراودی کا معاون چندون بھی کشتی رانی کے لیے موزوں ہے۔ عام طور پر یہاں کی زمین پتھریلی ہے۔ البتہ دریاؤں کی وادیاں بہت ہی زرخیز ہیں ملک میں بارش کا اوسط چالیس انچ کے قریب ہے مگر اکیاب کے علاقے میں ٢٠٠ انچ، ڈیلٹائی حصے میں ١٠٠ انچ اور وسطی حصے میں ٢٠ سے ٤٠ انچ تک بارش ہوتی ہے۔ شمالی اور وسطی میدانوں کے علاقے میں بنگال کی طرح سخت گرمی ہوتی ہے۔ جنوبی میدانوں میں گرمی اور بڑھ جاتی ہے۔ البتہ پہاڑوں پر درجہ حرارت کچھ کم رہتا ہے۔ زرخیز زمین، گرم آب و ہوا، اور کثرت بارش کی وجہ سے یہاں جنگلوں کی بہتات ہے اور سوائے ان میدانی علاقوں کے جہاں جنگل کاٹ کر صاف کر لیے گئے ہیں ہر جگہ جنگل ہی جنگل نظر آتے ہیں جن میں ساگون بہت ہوتا ہے ریلوں، جہازوں اور اسی قسم کے دوسرے آلات کا صرف میں

یہی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ یہ لکڑی بڑی پائدار اور مضبوط ہوتی ہے۔ نہ اس میں دیمک لگتی ہے اور نہ اس پر پانی کا اثر ہوتا ہے۔ جنگلوں سے بڑے بڑے لٹھے کاٹ کر ہاتھیوں کی مدد سے دریاؤں میں لاکر ڈال دیے جاتے ہیں جو بہتے بہتے رنگون تک آجاتے ہیں جہاں ان کو چیر کر تختے بنائے جاتے ہیں اور بڑی مقدار میں باہر بھیجے جاتے ہیں۔ جنگل کی دوسری پیداواریں ربر، بانس اور ساکھو کی لکڑی ہے۔ شمالی کوہستان میں شہتوت کے درخت کافی ہیں جن پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔ سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں یہاں سے تقریباً ۴½ لاکھ ٹن ساگون حاصل کیا گیا۔ اس کے علاوہ دوسری لکڑیوں کی مقدار ۴ لاکھ ٹن رہی۔ اور لکڑی کے کوئلے کی مقدار ۱۱ لاکھ ٹن تھی۔

یہاں کی خاص فصل دھان ہے۔ برما کا تقریباً ۱۶ لاکھ ایکڑ رقبہ پانی سے سیراب ہو سکتا ہے اور یہاں میں ۱۴½ لاکھ ایکڑ کے قریب دھان کی کاشت میں ہے۔ کل رقبہ کاشت کے ۶۹ فی صدی حصہ پر دھان کی کاشت ہوتی ہے۔ دھان صاف کر کے چاول کی شکل میں بڑی مقدار میں باہر بھیجا جاتا ہے۔ دھان کے علاوہ دوسری خاص فصلوں میں پھل، گنا، تمباکو، مٹر، چائے، جوار اور باجرہ شامل ہیں۔ معدنیات میں مٹی کا تیل بہت اہم ہے۔ دریائے اراودی کے کناروں پر مٹی کے تیل کے چشمے ہیں جہاں سے تیل پائپ اور کشتیوں کے ذریعہ رنگون لاکر صاف کیا جاتا ہے اور یہیں صاف مٹی کا تیل، پیٹرول، موم بتیاں اور دوسری چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ سنہ ۳۹ء میں یہاں سے ۲۵،۷½ ملین گیلن پیٹرول حاصل کیا گیا تھا۔ ٹین اور ولفرم مرگوئی اور ٹوائے کے اضلاع میں پایا جاتا ہے، ولفرم بڑی قیمتی اور کار آمد شے ہے۔ موٹروں، ہوائی جہازوں اور دوسری مشینوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سنہ ۳۹ء میں ۲۴۲۴ ٹن ولفرم یہاں سے نکالی گئی تھی۔ ان کے علاوہ سونا، چاندی، سیسہ، جست اور سرخ پتھر بھی یہاں پایا جاتا ہے۔

رنگون برما کا پایۂ تخت ہے اور دریائے اراودی کی ایک شاخ پر واقع ہے۔ یہ بڑا اچھا بندرگاہ ہے۔ یہاں تیل صاف کرنے، لکڑی چیرنے اور سگریٹ بنانے کے متعدد کارخانے ہیں۔ یہاں ایک [illegible] پیاڈی کہتے ہیں جو یہاں کا سونے کا پگوڈا بہت مشہور ہے۔ سنہ ۳۱ء میں یہاں کی آبادی [illegible]

آبادی چار لاکھ سے کچھ زیادہ تھی۔ اس میں بندرگاہ کا علاقہ شامل نہیں تھا اب اس پر دشمن کا قبضہ ہوگیا ہے اور فوجوں نے اس کو خالی کرتے وقت تباہ کن پالیسی کے تحت سارے شہر کی کارآمد چیزوں کو تباہ کردیا ہے۔ برما کے دوسرے ساحلی بندرگاہ مولمین (۹۰۰۵،۵۶) بسین (۲۶۶۲، ۵۰۴۴) اکیاب (۳۰۰۹۴) ٹوائے (۱۸۰۱۰، ۲۹) اور مرگوئی (۵۰۴۰۵، ۲۰) ہیں۔ اندرونی بندرگاہوں میں پرومم (۲۹۵، ۲۸) تھزادہ (۲۵۲، ۲۸) اور مانڈلے (۵۰۹، ۴۳۱) قابل ذکر ہیں۔ رنگون کے بعد مانڈلے ہی برما کا بڑا شہر ہے۔ یہ پہلے برما کا صدر مقام بھی تھا۔ یہاں لکڑی پر خوبصورت نقاشی بڑی اچھی کیجاتی ہے۔ یہاں سونے کا ایک پگوڈا بھی ہے۔ بھامو (۲۴۰۸، ۷) ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مگر اس کی اہمیت اس سے زیادہ ہے کہ چین سے ایک راستہ اس شہر سے ہوکر گزرتا ہے اور برما اور چین کی اندرونی تجارت اسی راستہ سے ہوتی تھی مگر چین کے ساحلی علاقے نکل جانے کے بعد اس کا سارا سلسلہ بیرونی دنیا سے منقطع ہوگیا اور برما روڈ کی اہمیت بڑھ گئی۔ اب پھر رنگون پر جاپان کا قبضہ ہو جانے سے برما روڈ بیکار ہوگئی ہے۔ یہ دوسری سڑک مانڈلے اور لاشیو سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے اور چنکنگ کو ملاتی ہے اور اسی لیے چین کو آسام کی جانب سے ملانے کی کوشش کی جارہی ہے، مے میو (۱۷۰، ۲۱) موسم گرما میں حکومت کا صدر مقام رہتا ہے۔ تیل کے چشموں کے علاقوں میں چاک (۲۰۸۳۰، ۱۲) اور نیان یانگ (۹۰۰، ۱۱) اور چاندی اور سیسہ کی کانوں کے قریب نمٹو یانگمی (۰۱، ۷۸۰، ۱۲) مشہور مقامات ہیں۔ رنگون مانڈلے، مے میو اور منگلاڈن میں فوجی چھاؤنیاں ہیں۔ یہاں ۲۱ بڑے شہر اور قصبے ہیں۔ برما میں ۲۰۰۵۷ میل لانبی ریل کی لائن ہے۔ پہلے یہ ریل ایک کمپنی کی ملکیت تھی مگر ۱۹۲۹ء میں اس کو حکومت ہند نے خرید لیا اور اب یہ حکومت برما کی ملکیت ہے۔ برما میں ۱۰۷۷ کارخانے ہیں جن میں سے آدھے دھان صاف کرنے والے ہیں۔ ½ کے قریب لکڑی چیرنے والے اور بقیہ مختلف قسم کے ہیں ۱۹۴۰-۴۱ء میں مجوزہ بجٹ کے مطابق یہاں کی آمدنی مجموعی ۲۰ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ تھی۔ آمدنی کی بڑی مدیں کروڑگیری چنگی، مالگذاری، جنگلات اور محاصل آمدنی ہیں۔ بینکاری کے معاملے میں برما اب تک ہندوستان سے متعلق ہے۔ اور ریزرو بنک آف انڈیا کا ایک مقامی دفتر رنگون میں ہے۔ اس کے علاوہ

اکثر شہروں میں امپیریل بنک کی شاخیں بھی موجود ہیں

برما ایک پرانا ملک ہے اور یہاں وقتاً فوقتاً مختلف قومیں اور خاندان حکومت کرتے رہے ہیں۔ گیارہویں اور تیرہویں صدی کے درمیان برما کی حکومت اپنے پورے عروج پر تھی اور اس کی نشانیاں آج بھی پاگن کے علاقے میں موجود ہیں۔ یہ شہر اور یہ سلطنت قبلائی خان کے عہد میں ایک چینی حملے سے ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی طاقتور سلطنت نہ قایم ہو سکی اور وسطی برما کا بڑا حصہ شان خاندان کے زیر اقتدار آ گیا۔ سولہویں صدی میں پھر ایک برمی شہزادے نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔ اس کا دارالخلافہ پیگو تھا مگر کچھ عرصے کے بعد ایک نئے خاندان نے آوا میں قوت حاصل کر کے پیگو کو بھی اپنا ماتحت کر لیا اٹھارہویں صدی میں یہاں کی مختلف ریاستوں میں اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں۔ جن میں انگریز اور فرانسیسی بھی ان کے ساتھ تھے۔ انگریزوں نے ہمیشہ برمیوں کا ساتھ دیا اور فرانسیسی پیگو والوں کے ساتھ رہے۔

سنہ ۱۶۱۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے برما کے بعض مقامات مثلاً سیریم، پروم اور آوا میں اپنے تجارتی کارخانے قایم کیے اور کمپنی کے گماشتے اور ایجنٹ یہاں رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۷۹۵ء میں برمی فوج کے پانچ ہزار سپاہیوں نے چٹاگانگ کے انگریزی علاقے پر حملہ کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ وہ ان ڈاکوؤں کی تلاش میں آئے ہیں جنھوں نے برما سے بھاگ کر یہاں پناہ لی ہے۔ اس وقت تو خیر بات رفع دفع ہو گئی مگر سنہ ۱۸۲۳ء میں برمی باشندوں نے آسام کی ایک ریاست پر حملہ کر دیا۔ یہ رئیس انگریزوں کا دوست تھا اس بنا پر سنہ ۱۸۲۴ء میں رنگون پر حملہ کیا گیا اور یہ بہت آسانی سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد کچھ اور علاقہ فتح کر لیا گیا مگر دو سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا آخر سنہ ۱۸۲۶ء میں صلح ہو گئی اور تناسرم ارکان ہرگوئی اور ٹوائے وغیرہ کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا اور ایک کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا جس کا ایک چوتھائی حصہ اسی وقت داخل کیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک حالات اچھے رہے مگر بعد میں تعلقات خراب ہونے لگے۔ انگریزی سفیر کو پہلے برمی پائے تخت سے رنگون آنا پڑا اور پھر رنگون بھی چھوڑنا پڑا۔ برمیوں نے انگریزی جہازوں اور ملاحوں پر حملے شروع کیے اور سنہ ۱۸۵۲ء میں برما کی دوسری لڑائی ہوئی اور جنوبی برما کا سارا علاقہ انگریزوں کو مل گیا۔ البتہ شمال میں ایک

آزاد برمی ریاست قایم رہی جس کا حاکم تھی باعقا مگر اس کے مظالم سے تنگ آکر ۱۸۸۵ء میں اس کے خلاف جنگ کی گئی اور اس کے دارالسلطنت مانڈلے پر قبضہ کر لیا گیا۔ اب گویا پورا برما انگریزوں کی عمل داری میں آگیا۔ دوسرے سال ریاستہائے شان کو بھی برما میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ریاستیں کئی چھوٹی بڑی ریاستوں کا مجموعہ ہیں اور ان کے مقامی رئیس ہیں جو اندرونی معاملات میں آزاد ہیں ۱۹۲۲ء میں ان سب کا ایک فیڈریشن قایم کر دیا گیا ہے اور ایک کونسل عام انتظامات کی ذمہ دار ہے جس کے ممبر بڑے رئیس بذات خود اور چھوٹے رئیسوں کے نمایندے ہیں۔ چیف کمشنر ان کا نگراں ہے۔ ان کے جنوب میں کرینی کی ریاستیں ہیں جو پہلے پانچ تھیں مگر اب تین رہ گئی ہیں۔ ان سے بھی ایک متحدہ وفاق بنانے کے لیے کہا گیا مگر یہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ یہاں پر برطانوی برما کا کوئی قانون نافذ نہیں ہے۔ ان کے اپنے قوانین بالکل الگ ہیں۔ البتہ ایک پولٹیکل ایجنٹ یہاں رہتا ہے۔ ۱۸۶۲ء میں برما کو چیف کمشنری کا درجہ دیا گیا اور ۱۸۹۷ء میں یہاں لفٹننٹ گورنر مقرر ہونے لگا اور ۱۹۲۳ء میں اس کو پورے صوبے داری اختیارات مل گئے۔

۱۹۱۹ء میں جب ہندوستان کو اصلاحات دی گئیں تو اس میں جان بوجھ کر برما کو شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ برما اپنی مقامی خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان سے کچھ زیادہ مشابہت نہیں رکھتا۔ اس لیے یہاں کے مسائل پر خاص طور سے علیحدہ غور کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس کام کے لیے برما ریفارم کمیٹی قایم ہوئی جس نے ۱۹۲۲ء میں سفارش کی کہ برما کو وہ تمام اختیارات دیے جائیں جو ہندوستانی صوبوں کو ۱۹۱۹ء میں حاصل ہو چکے ہیں چنانچہ ۲۳ء سے یہ پورے اختیارات والا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کے لیے کانفرنسیں اور کمیٹیاں ہوئیں تو برما کی مقامی خصوصیات کی بنا پر اس کو ہندوستان سے علیحدہ کر دینے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ اور برطانیہ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا اور ۱۹۳۵ء کے قانون میں برما کو ہندوستان میں شامل نہیں کیا گیا بلکہ اس کو ہندوستان کے مماثل اصلاحات الگ دی گئیں چنانچہ جب یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو اس نئے قانون کا نفاذ ہوا تو برما ہندوستان سے الگ ہو گیا اب

یہاں حکومت برطانیہ کا نمایندہ گورنر ہو جس کا تعلق براہ راست سکریٹری آف اسٹیٹ سے ہو یہاں دو قانون ساز مجلسیں ہیں ایک سینٹ کہلاتی ہو جس کے ۳۶ ارکان ہیں جن میں سے آدھے منتخبہ اور آدھے نامزد شدہ ہیں۔ دوسری دارالعوام ہو جس کے ۱۳۲ ممبر ہیں جو سب منتخب ہوتے ہیں۔ ہندوستانی مفادات کی دیکھ بھال کے لیے یہاں ایک ہندوستانی ایجنٹ رہتا ہو۔

یوں تو برما دو بڑے حصوں میں منقسم ہو ایک شمالی اور دوسرا جنوبی لیکن خاص برما اس حصے کو کہا جاتا ہو جو پہلے وسط برما کہلاتا تھا۔ یہ تقریباً آٹھ انتظامی اضلاع پر مشتمل ہو۔ مانڈلے، پرومے، پاگن اور آوا جیسے شہر اسی خطے میں ہیں۔ برما کی اصل تہذیب و تمدن کا گہوارہ یہی خطہ رہا ہو۔ دراصل برمی قوم مختلف قوموں اور قبیلوں کے اتحاد سے بنی ہو۔ مثلاً نسلی اعتبار سے ان کا بڑا حصہ تبتی نسل سے تعلق رکھتا ہو ان کی زبان تبت چینی حلقہ سے متعلق ہو اور خط و خال میں یہ منگولی نسل سے زیادہ قریب ہیں گویا مختلف قومیں اور قبیلے پہاڑوں پہاڑیوں اور تنگ دروں سے ہوتے ہوئے خاص برما میں آکر آباد ہوئے اور متحد ہو کر ایک قوم بن گئے اور یہ قوم عرصہ تک ہندوستان اور چین کے درمیان ایک درمیانی طاقتور قوم کی طرح زندگی گزارتی رہی اور اس لیے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہو کہ جب ان میں نسلی اور قومی عصبیت کے جذبات پیدا ہونا شروع ہوئے تو ان کا آغاز بھی یہیں سے ہوا جنھوں نے بڑھتے بڑھتے خطرناک صورت اختیار کر لی جس کا اظہار علانیہ طور پر ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ قومی خصوصیات کی وجہ سے دوسری قوموں سے عداوت تو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی مگر ابتدا میں یہ تعمیری کاموں تک محدود رہی مثلاً دیسی مال خریدنے کا شوق اور دیسی مصنوعات کی سرپرستی کی گئی مگر بعد میں ہندوستانیوں اور چینیوں کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پیدا ہونے لگا اور اس خاص زمانے میں ان جذبات کے پیدا ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت برما میں بڑی کساد بازاری پھیلی ہوئی تھی اور معاشی ابتری نے حالات بہت نازک کر دیے تھے چاول جو یہاں کی عام پیداوار ہو اس کی قیمت بہا بگر رہی تھی مثلاً ۱۹۲۶ء میں دھان کی ایک کشتی کی قیمت ۱۹۳ روپیہ تھی تو ۱۹۳۰ء میں ۱۲۸ روپیہ ہو گئی اور ۱۹۳۱ء میں صرف ۷۷ روپیہ رہ گئی۔ اس کی وجہ سے بہت سے کاشتکار تباہ ہو گئے

اور زراعت چھوڑ کر مختلف قسم کی محنت مزدوری کرنے لگے مگر یہاں ان کو غیر مہارت رکھنے والے ہندوستانی مزدوروں سے مقابلہ کرنا پڑا اور یہ ان کے دشمن ہو گئے، چنانچہ ۱۹۳۰ء میں رنگون میں برمیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور نہ صرف آپس میں مزدوروں میں تصادم ہوا بلکہ بہت سے ہندوستانی کاشتکاروں اور مالکان زمین پر بھی حملے کیے گئے اور اس کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی ہندوستان واپس آ گئے۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں برمیوں اور چینیوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے کچھ چینی چین واپس چلے گئے۔

اسی قومی عصبیت اور غیر ملکیوں کے خلاف جذبہ نفرت نے یکایک ۲۲ دسمبر ۱۹۳۰ء کو ایک اور خطرناک شکل اختیار کر لی یعنی برمی حکومت کے خلاف ایک سازش کی گئی۔ اس کا مقصد موجودہ حکومت کا تختہ الٹ کر اس کے بجائے ایک جنگلی سردار کو تخت پہ بٹھانا تھا۔ اس کا خاص مرکز تھرا وڈی تھا کیونکہ یہی یہاں کے سیا سٹین کا مسکن تھا مگر بہت جلد اس کے اثرات چار پانچ ضلعوں تک پھیل گئے۔ اور حکومت کو اس فتنے کے دبانے کے لیے فوج استعمال کرنا پڑی گویا یہ ہنگامہ جلد ختم ہو گیا مگر مئی ۱۹۳۱ء تک اس کی دبی ہوئی چنگاریاں اِدھر اُدھر بھڑکتی رہیں۔ گزشتہ سال پھر رنگون میں برمیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تصادم ہو گیا جس میں ہندوستانیوں کا کافی نقصان ہوا۔

۱۹۳۱ء میں برما کی کل آبادی ۱۴٬۶۴۷٬۴۹۷ تھی جو مندرجہ ذیل بڑے بڑے مذاہب میں منقسم تھی۔

بدھ	۱۲٬۳۴۸٬۰۳۷	۸۴٫۳ فی صدی
جنگلی	۷۶۳٬۲۴۳	۵٫۲ "
مسلمان	۵۸۴٬۸۳۹	۴٫۰ "
ہندو	۵۷۰٬۹۵۳	۳٫۹ "
عیسائی	۳۳۱٬۱۰۶	۲٫۳ "
دیگر	۴۹٬۳۱۹	

ملکی لحاظ سے وہاں کی آبادی کی تقسیم یہ ہے۔

برمی	۹۰،۹۲،۲۱۴	ہندوستانی	۱۰،۱۷،۸۲۵
چینی	۱،۹۳،۵۹۴	ہندی برمی	۱،۸۲،۱۶۶
یورپین اور ہندوستانی عیسائی	۳۰،۸۵۱		

برما میں چونکہ مختلف نسلیں اور قومیں آباد ہیں اور چونکہ یہ کئی ملکوں کے درمیان آباد ہے۔ اس لیے یہاں زبانیں بھی طرح طرح کی بولی جاتی ہیں۔ پہاڑی قبیلوں کی بولیاں الگ الگ ہیں لیکن مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کل آبادی کا ۲/۳ حصہ برمی یا اس کی ذیلی زبانیں بولتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے آبادی اس طرح منقسم ہے

برمی اور اس کی ذیلی زبانیں	۹۷،۴۷،۱۳۳	۶۶٫۵ فی صدی
دوسری دیسی زبانیں بشمول چینی	۳۷،۸۹،۸۲۸	۲۵٫۹ 〃
ہندوستانی زبانیں	۱۰،۷۹،۸۲۰	۷٫۴ 〃
انگریزی	۲۶،۸۹۹	۰٫۲ 〃
دیگر زبانیں	۳،۸۵۰	۰

ہندوستانی زبانوں میں ۲ لاکھ کے قریب باشندے ہندوستانی' اردو اور ہندی بولنے والے ہیں۔

پیشوں کے اعتبار سے آبادی کی تقسیم مندرجہ ذیل ہے۔

زراعت	۶۶٫۵ فی صدی	پرورش مویشی	۲٫۳ فی صدی
جنگل و معدنیات	۱٫۴ 〃	صنعت	۱۰٫۷ 〃
نقل و حمل	۳٫۶ 〃	تجارت	۹٫۰ 〃
فوج اور نظم حکومت	۱٫۲ 〃	آزاد اور متفرق پیشے	۵٫۳ 〃

یہاں ایک یونیورسٹی ہے اور اس سے متعلق انجینیرنگ کالج اور طبی کالج ہے۔ مانڈلے میں ایک انٹر کالج ہے اس کے علاوہ ایک اسکول آف آرٹس، ایک جنگلاتی اسکول اور دس تجارتی اسکول ہیں

۳۱-۱۹۳۰ء میں جملہ تعلیمی اداروں اور ان کے طلبا کی تعداد حسب ذیل تھی۔

ادارے	تعداد	طالب علم	طالبات
اعلیٰ ادارے	۳	۱۰,۴۱۴	۱۷۸
دوسرے درجے کے ادارے	۱,۴۶۴	۱,۴۶,۶۴۷	۷۴,۸۴۹
پرائمری مدرسے	۴,۱۹۵	۱,۶۵,۶۴۹	۱,۳۶,۵۵۰
کل سرکاری مدرسے	۷,۵۶۷	۳,۲۱,۴۶۳	۲,۱۳,۴۳۸
غیر سرکاری مدرسے	۱۷,۹۵۷	۱,۹۶,۵۷۷	۶,۲۸۹
کل مدرسے	۲۵,۵۲۴	۵,۱۸,۵۴۰	۲,۱۹,۷۲۷

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے کل خواندہ اشخاص کی تعداد ½۲۴ لاکھ تھی جس میں ۱۰ لاکھ عورتیں شامل تھیں۔ خواندگی کے لحاظ سے اس وقت برما ہندوستان کی تمام ریاستوں اور صوبوں سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ ذیل کے اعداد سے یہ فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ یہ کسی زبان میں خواندہ اشخاص کی تعداد کا اوسط فی ہزار ہے۔

مقام	خواندہ اشخاص	مرد	عورت
برما	۳۶۸	۵۶۰	۱۶۵
برما (علاوہ ریاستہائے برما)	۳۹۷	۶۰۰	۱۸۲
کوچین	۳۳۷	۴۶۰	۲۲۰
ٹراونکور	۲۸۹	۴۰۸	۱۶۸
بڑودہ	۲۰۹	۳۳۰	۷۹
بنگال	۱۱۰	۱۸۰	۳۲
مدراس	۱۰۸	۱۸۸	۳۰
میسور	۱۰۶	۱۷۴	۳۳

مقام	خواندہ اشخاص	مرد	عورت
بمبئی	۱۰۲	۱۷۶	۲۹
آسام	۹۱	۱۵۲	۲۳
پنجاب	۵۹	۹۵	۱۵
یوپی	۵۵	۹۴	۱۱

بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہو کہ برما جیسا وسیع صوبہ (کیونکہ اس وقت وہ صوبہ ہی تھا) جہاں بہت سے وحشی قبیلے آباد ہوں جس کے اکثر حصے پہاڑی ہوں، جہاں ریل اور سڑکیں بہت کم ہوں، جہاں کے اکثر حصوں میں تہذیب و تمدن کی شعاعیں تک نہ پہنچی ہوں وہ خواندگی میں اتنی ممتاز حیثیت رکھتا ہو۔ دراصل اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ یہاں غیر سرکاری مدرسوں کی تعداد بہت کافی ہو اور یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہو کہ یہاں خواندگی کا اوسط اتنا بڑھا ہوا ہو۔ یہ مدرسے اصل میں بدھ مت کی چھوٹی چھوٹی خانقاہیں ہیں جن کو "ہپون گی گیانگ" کہا جاتا ہو۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایسا مدرسہ موجود ہو۔ جہاں سر منڈا کر اور پیلا لباس پہن کر ہر بدھی لڑکے کو جانا پڑتا ہو۔ ان مدرسوں میں معمولی طریقہ پر لکھنا پڑھنا اور تھوڑی بہت ریاضی سکھائی جاتی ہو۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا ہو کہ بدھ مذہب میں ایسے لڑکے بہت کم ملتے ہیں جو معمولی نوشت و خواند سے واقف نہ ہوں۔

برمیوں کا لباس سادہ ہوتا ہو۔ سر پر ایک ریشمی پگڑی، ایک ڈھیلی سی صدری اور کمر سے ایک تنگ بندھی رہتی ہو جو ٹخنوں تک آتی ہو۔ ان کی عورتوں کا لباس بھی مردوں کی طرح ہوتا ہو البتہ سر پر پگڑی نہیں ہوتی اور لنگی کا سرا مرد سامنے کی طرف کرتے ہیں اور یہ ایک جانب لٹکا لیتی ہیں۔ برمی عورتیں ہنس مکھ اور خوش مزاج ہوتی ہیں اور ایک خوش وضع اور خوش قطع برمی خاتون دنیا کی تمام دوسری عورتوں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ برمی عورتیں بڑی حد تک آزادانہ اور کھلی ہوا میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ اپنے گھر کے معاملات میں تو بالکل خود مختار ہوتی ہیں مگر اپنے شوہروں کے بیرونی کاموں میں بھی بڑی حد تک دخیل ہوتی ہیں۔ برما میں بیدی اور ریشم کا کاتنا اور بننا اور جوتے سازی

گھریلو صنعتوں میں داخل ہیں اور ان میں زیادہ تر عورتیں نمایاں ہیں۔ چھوٹی موٹی تجارت اور بالخصوص اشیائے خوردنی کا لین دین ان کے ہی ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ یہاں تجارت میں ایک ہزار مردوں کے مقابلے میں کمانے والی عورتوں کا اوسط ۱۰۹۴ ہے۔ کچھ عورتیں کشتیاں بھی چلاتی ہیں۔

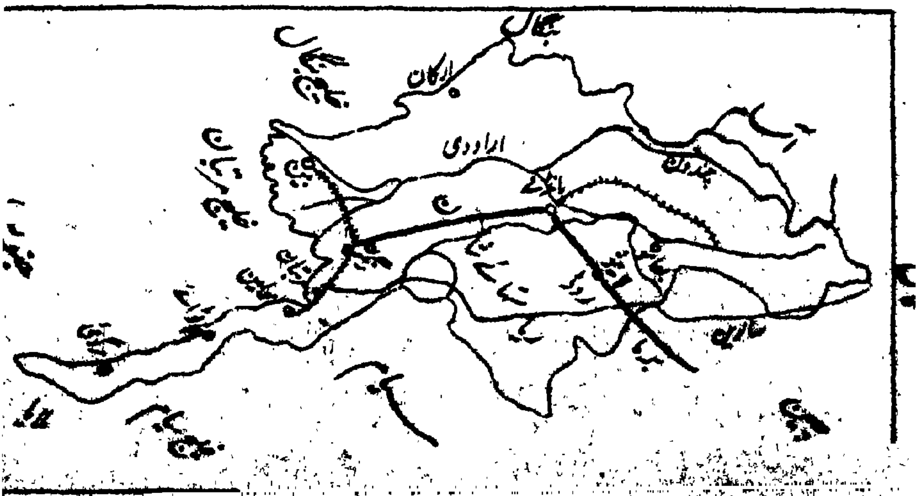
برمی، شان اور مون لوگوں میں شادی کی تقریبات عام طور پر ملتی جلتی ہیں۔ ان کے یہاں شادی کی کوئی خاص رسم نہیں ہوتی اور صرف لڑکے اور لڑکی کی رضامندی سے شادی ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات بڑے بوڑھوں کی رضامندی تک حاصل نہیں کی جاتی اور نہ ان کو شادی میں شریک کیا جاتا ہے۔ امرا کے طبقہ میں البتہ شادی کے موقعوں پر لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ پنا ہمنی پور کے بزمی، قاضی یا پنڈت کے فرائض انجام دیتا ہے اور متبرک پانی چھڑک کر نئے جوڑے کو آشیرباد دیتا ہے جیسے شادی میں آسانی ہے ویسے ہی طلاق کے معاملے میں بھی بڑی آسانی ہے۔ اس میں صرف دیہات کے پنچ کی منظوری ضروری ہوتی ہے اور اس کے بعد فریقین علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ طلاق سے عورت کے رتبے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شادی پر اس کا نام نہیں بدلا جاتا اس لیے طلاق کے بعد ایسا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ نہ شادی کی انگوٹھی یا کوئی اور خاص نشانی ایسی استعمال کرتی ہے جو طلاق کے بعد اس کو ترک کرنا پڑے۔ برما میں زیادہ تر ایک ہی شادی کا رواج ہے اور اس کی بڑی وجہ غالباً یہاں کی عورتوں کی معاشی آزادی ہے۔ امرا میں البتہ ایک عورت بطور چھوٹی بیوی کے رکھ لی جاتی ہے مگر ایسی عورتوں کی تعداد کبھی دو سے متجاوز نہیں ہوتی۔ برمی حکومت کے عہد کی یادگار ہے جب بادشاہوں کے یہاں حرموں اور لونڈیوں کا عام رواج تھا اور بڑے بڑے امرا بھی ان کی نقل کیا کرتے تھے۔ کاچن لوگوں میں دو سے زیادہ شادیاں ایک ساتھ نہیں کی جاتیں۔ چونکہ متوفی بھائیوں کی بیواؤں سے شادی کرنے کو اچھا سمجھا جاتا ہے اس لیے یہ لوگ ان کی عورتوں سے شادیاں کر لیتے ہیں بعض قوموں میں بے اولادی کی صورت میں دوسری شادی کی اجازت ہے۔

برما کے پہاڑی علاقوں میں طرح طرح کے قبیلے آباد ہیں جن کے رسوم و رواج، عادات و اطوار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان قبیلوں کی اکثریت کے یہاں "تاؤ ذیپ" یا کھوا...

کے مکان ہوتے ہیں جو اکثر والدین کے گھر کے سامنے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں لڑکیاں رات کو کنواروں سے ملتی ہیں اور اس کو کوئی معیوب بات خیال نہیں کرتے۔ اکثر قبیلوں میں شادی سے پہلے جنسی تعلقات قایم کرنے کی اجازت ہے اور اولاد پیدا ہونے کے بعد یا تو فریقین آپس میں شادی کر لیتے ہیں یا عورت کو اس کا تاوان جو عموماً ایک بھینس یا گائے ہوتی ہے ادا کر دیا جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اکثر یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ شام کو بازار یا ہاٹ سے لوٹتے وقت لڑکیاں اپنی رضامندی سے لڑکے کے گانو چلی جاتی ہیں اور لڑکے کے گانو والے اس امر کی اطلاع لڑکی والوں تک پہنچاتے ہیں۔ اگر ان کو یہ بات پسند آگئی تو وہ خاموش رہتے ہیں ورنہ اسی وقت لڑکے کے گانو پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اگر اس اثنا میں لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر انڈا پکا کر دونوں نے مل کر ساتھ کھا لیا ہے تو پھر یہ تعلقات ٹوٹ نہیں سکتے بہر حال برما میں ایسے قبیلے آباد ہیں جن کی عادتیں، طور و طریق، معاشرت، وضع قطع، لباس اور عقاید ہمارے یہاں کی جنگلی اقوام سے ملتے جلتے ہیں اور جن کو ابھی تک موجودہ تہذیب و تمدن کی ہوا نہیں لگی ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم۔ اے

نقشہ برما



غافل لکھنوی

(نام منور خاں تخلص غافل، تلمیذ مصحفی، لکھنؤ میں نقیر محمد خاں گویا کے احاطہ میں رہتے تھے۔ ان کی تمام زندگی گمنامی میں بسر ہوئی۔ اتفاق کی بات ہو کہ ان کے فرزند میاں جھنو خاں نے جو نول کشور پریس میں ملازم تھے ایک بار مالک مطبع سے اپنے والد مرحوم (غافل) کی شاعری کا ذکر کیا۔ مالک مطبع کو افسوس ہوا کہ ایسے باکمال شاعر کا کلام ضائع ہو رہا ہو چنانچہ ان کے شوق اور تلاش سے جھنو نے غافل کے کلام کا بہت سا حصہ ڈھونڈ نکالا جو جولائی ۱۸۷۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ غافل کے کلام پر قدامت کا رنگ غالب ہو۔ متروک الفاظ کی کثرت ہو۔ تمام دیوان کی ورق گردانی کے بعد یہ چند اشعار اس قابل نظر آئے کہ انھیں اہل ذوق کے سامنے پیش کیا جائے)

نکلا نہ داغ دل سے ہمارا تو کوئی کام
نہ وہ چراغ دیر نہ شمع حرم ہوا

بندے کو اپنے سب کچھ دیتا ہے بے طلب وہ
درگاہ کبریا میں مانگے کوئی دعا کیا

کیا کیا یہاں نہ شکلیں بنیں اور بگڑ گئیں
ہستی بھی اک نمونہ ہو موج حباب کا

ہر ایک گل کو تمنا ہوئی کہ جام بنے
چمن میں لے کے جو وہ شیشۂ شراب آیا

دل کی دل ہی میں رہی اپنی تمنا کیا کیا
دفعۂ عمر دم چند تھا کرتا کیا کیا

ہر طرح بندگئ عشق میں مجبوری ہو
نہ کیا میں نے گنہ تو بھی گنہگار رہا

بزم میں وا جو نقاب رخ جاناں ہوگا
کوئی بیخود کوئی ششدر کوئی حیراں ہوگا

کیا احتیاج خانہ بدوشوں کو قصر کی
جا بیٹھے جس جگہ وہی اپنا مکاں ہوا

لے چل اے وحشت فلک سے بھی پرے
اس قفس میں اب تو گھبراتے ہیں ہم

جلوۂ برق کم نما ہیں ہم
ہو جو ہستی یہی تو کیا ہیں ہم

مثال آئینہ بے جا نہیں یہ حیرانی
کوئی تو سامنے میرے ہو جو دو چار ہوں میں

مبتلا رنج مکافات میں فرزانے ہیں
پرسشِ حشر سے فارغ ہیں جو دیوانے ہیں

دور ہی سے بھی رکھا بزم میں ہم کو محروم
کیا تھی بادۂ انصاف سے پیمانے ہیں!

مہر و مہ جن کی ہیں خیرات کے ساغر عشق
ان دونوں اپنے تصرف میں وہ پیمانے ہیں

ہے شرر کو وقفۂ یک دم ہمیں یہ بھی نہیں
کس قدر ہم بے بقا ہیں کتنے بے بنیاد ہیں

غریقِ بحرِ بلا کی ہو کیا خبر ان کو
جو لوگ بیٹھے ہیں آرام سے سفینوں میں

افشاں نہیں ہے سنبلِ مشکینِ یار میں
تارے چھٹک رہے ہیں یہ صبحِ بہار میں

کبک چمن میں کب ہیں یہ رنگیں خرامیاں
تو جس چمن میں پانو دھرے لالہ زار ہو

خاک بدن میں اپنی تو کر اس کی جستجو
شاید اسی غبار سے پیدا سوار ہو

کچھ قید نہیں کعبہ ہو یا دیرِ مغاں ہو
عاشق ترے پوجیں گے اسی کو تو جہاں ہو

ہرگز نہیں سودائے محبت میں خسارا
ہے اس میں بھی اک نفع اگر جی کا زیاں ہو

دیر میں ہر چند سو نقصان تھے
فائدہ اک یہ ہوا دیکھا تجھے۔

نگاہ یار ہم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے
کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

کم گلستاں سے نہیں اس کا سراپا گل
یار کیا آتا ہے گویا کہ بہار آتی ہے

گو کہ ہر جا تجھے اے جانِ جہاں دیکھا ہے
کیا بتاؤں جو کہے کوئی! کہاں دیکھا ہے

ہر خاک کے ذرہ میں ہے خورشید کا جلوہ
محروم نہیں یار کے دیدار سے کوئی

بحرِ دنیا میں نہیں کوئی مصیبت کا شریک
ڈوبتے کو آشنا بھی دیکھتے ہیں دور سے

غم نہیں اس کا کوئی تو گر پڑے اور ٹوٹ جائے
پر غضب ہو اشک یوں گر ہر بنے اور لوٹ جائے

اس گلستاں میں نہیں مجھ سا کوئی سوختہ بخت
ہاتھ جس گل کو لگاؤں میں وہ اختر ہو جائے

چلتے ہیں راستے میں جو بچ کر غبار سے
واقف نہیں ہیں اپنے وہ انجام کار سے

یہ عشق ہے وہ آتشِ سوزاں کہ جس نے آہ
دونوں جہاں کو پھونک دیا اک شرار سے

مرسلہ حبیب کیفوی

جامِ صہبائی

کچھ لہو و لعب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو (۱) کچھ عیش و طرب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو
ملتا ہے مگر کبھی کبھی وہ اُن سے جو پردۂ شب میں ڈھونڈتے ہیں اس کو

روپوش جب آفتاب ہو جاتا ہے (۲) جب طاری جہاں پہ خواب ہو جاتا ہے
آتا ہے وہ میرے پاس چپکے چپکے ہنس دیتا ہے بے نقاب ہو جاتا ہے

جب عشق کی آگ نور ہو جاتی ہے (۳) سب کلفت زیست دور ہو جاتی ہے
ہو جاتا ہے اضطراب پُر کیف اثرؔ جاں غرق مئے طہور ہو جاتی ہے

مردانِ خدا ہیں پیکرانِ تسلیم (۴) منزل کو رواں دواں ہیں بیگانۂ بیم
بجھ جائے گی آگ اور پھٹ جائیگا نیل اے پیروِ سنتِ براہیم و کلیم!

رہ تیغ بدست زندگانی ہے یہی (۵) باطل کو پچھاڑ کامرانی ہے یہی
حق، تجھ کو اگر گلے لگا لے ہنس کر کونین سے بڑھ کے شادمانی ہے یہی

پہنچا ہے کس اوج پہ ستارا میرا (۶) ہے حکم قضا و قدر اشارا میرا
میں خوش ہوں کہ تو بھی مجھ کو پا کر خوش ہے میں تیرا ہوں اور تو سہارا میرا

دنیا میں بلند حق کی آواز کریں! (۷) پیدا ہر دل میں ذوقِ پرواز کریں!
انساں نالاں ہے اہرمن کے ہاتھوں آ! پرچمِ حق کو پھر سرافراز کریں!

ہوں گے کوئی اور آہ بھرنے والے (۸) ڈر کر سگِ اہرمن سے مرنے والے
ہم ڈر کے یہاں نہیں رہیں گے یارب! ڈرتے ہیں کسی سے تجھ سے ڈرنے والے!

اثرؔ صہبائی

دل کا مرثیہ

وہ دل، وہ بحرِ غم کا شناور کدھر گیا
وہ کاروانِ شوق کا رہبر کدھر گیا

وا کر کے مجھ پہ رازِ حیاتِ گریز پا
میرا رسول، میرا پیمبر کدھر گیا

تاریکیاں ہیں وسعتِ عالم پہ خیمہ زن
وہ ماہ و آفتاب کا ہمسر کدھر گیا

افسردہ ہے خیال تو جذبات مردہ ہیں
احساس کی جبیں کا وہ زیور کدھر گیا

بخشا تھا جس نے سوزِ براہیم روح کو
بت خانۂ جنوں کا وہ آذر کدھر گیا

میں جن کی وسعتوں میں بھٹکتا پھرا کبھی
وہ دشت کیا ہوا، وہ سمندر کدھر گیا

جس کی نوا سے کون و مکاں تک بہک گئے
وہ انگبیں فروش سخنور کدھر گیا

اوہام کی سپاہ نے سجدے کیے جسے
وہ صف شکن یقین کا خنجر کدھر گیا

کس آس پہ اٹھائے پھروں جامِ زندگی
اس جام سے وہ بادۂ احمر کدھر گیا

سونا پڑا ہوا ہے جہانِ طلب ندیم
وہ خضر کیا ہوا وہ سکندر کدھر گیا

احمد ندیم قاسمی

"بانگِ سحر"

۱ شعر میں قیمتی اوقات کو کھو لیتا ہوں — بادۂ عشق میں جذبات بھگو لیتا ہوں
راہ چلتے ہوئے ظلمات میں کھا کر ٹھوکر — دو گھڑی کے لیے تقدیر کو رو لیتا ہوں

۲ غنچہ ہوں تند ہواؤں سے چٹک جاتا ہوں — چلتے چلتے رہِ توحید میں رُک جاتا ہوں
زندگی تنگ ہے ماحول سے جب چیخ اٹھتی ہے — دل و جاں سے تری درگاہ میں جھک جاتا ہوں

۳ چاک در چاک گریبان کو سینے نہ دیا — ساغرِ عیش کا ایک گھونٹ بھی پینے نہ دیا
شاید انجام کو کھل جاتے طلسمات حیات — لیکن اس وقت تلک احساس نے جینے نہ دیا

۴ شورشِ عشق نے موجوں سے ابھارا مجھ کو — دور ساحل سے محبت نے پکارا مجھ کو
مجھ سے جذبات کی پیکار کا انجام نہ پوچھ — سو گیا لے کے سمندر کا کنارا مجھ کو

۵ کیا کہوں! تلخیٔ احساس نے جینے نہ دیا — چاکِ دل شدتِ آلام نے سینے نہ دیا
بادۂ حسن کا بخشا تھا جو تو نے ساغر — زندگی بھر غمِ افلاس نے پینے نہ دیا

۶ فکرِ فردا میں دل و جان کو کھو لوں اے دوست — کشتِ نغمہ غمِ ہستی میں ڈبو لوں اے دوست
چھوڑ کر نالۂ تازہ کو، ٹھہر کر اک بار — کیوں نہ پھوٹی ہوئی تقدیر کو رو لوں اے دوست

۷ تری درگاہ میں آتا ہوں میں گانے کے لیے — قصۂ درد و الم تجھ کو سنانے کے لیے
قلزمِ زیست کے ساحل پہ ٹھہر جاتا ہوں — اپنی روٹھی ہوئی تقدیر منانے کے لیے

۸ زندگی ہو مری سوتوں کو جگانے کے لیے — اک نئے عہد کی تعمیر اٹھانے کے لیے
ہمنوا ہو مرے گیتوں سے اگر ساز ترا — جاوداں ہوں مرے نغمات زمانے کے لیے

فضل حسین کیف اسرائیلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

اقبال کا مطالعہ:۔ از سید نذیر نیازی صاحب حجم ۱۶۳ صفحات تقطیع ۲۲×۱۸/۸ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ نفیس، قیمت عہ، شائع کردہ کتاب خانہ پنجاب ۲۶ بیرون لوہاری گیٹ لاہور۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کی زندگی اور شاعری پر پچھلے چند سال میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ادبی رسالوں کے خاص نمبر بھی نکل چکے ہیں۔ لیکن ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس موضوع پر جو کچھ لکھا جا سکتا ہے لکھا جا چکا۔ اس لیے کہ اقبال کی جامع شخصیت کے بہت سے گوشے اور ان کی ہمہ گیر شاعری کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن کو اب تک کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور جن پہلوؤں پر اب تک تبصرہ کیا گیا ہے ان میں بھی بہت کچھ گنجایش باقی ہے۔ سید نذیر نیازی صاحب کی یہ کتاب اقبالیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ مصنف اقبال کے ہم وطن ہیں۔ ان کے تعلقات مرحوم سے عزیزانہ تھے اور انھیں برسوں مرحوم کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ نیازی صاحب تاریخ اسلام اور علوم فلسفہ میں اچھی نظر رکھتے ہیں۔ غرض ان میں وہ سب صفات موجود ہیں جو اقبال کی شاعری کے گہرے مطالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے درکار ہیں۔

یہ کتاب چار مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلے کا عنوان وہی ہے جو پوری کتاب کا ہے یعنی "اقبال کا مطالعہ" اس میں شاعری کے مفہوم سے بڑی خوبی سے بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری محض اظہار جذبات کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی تفسیر ہے۔ اس میں اور فلسفہ میں جو فرق ہے وہ موضوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ طرز ادا کے لحاظ سے ہے۔ پھر یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے اور زندگی کی ایک مکمل تفسیر اسلام کے نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان ہے "اقبال اور حکمائے فرنگ" اور اس میں اس عام غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے خیالات

نیٹشے، برگساں اور دوسرے مغربی فلاسفہ سے ماخوذ ہیں۔ تیسرا مضمون "اقبال کی عظمتِ فکر" سب سے زیادہ دقیق اور جامع ہے اور اس میں اقبال کے مابعد الطبیعی اور عمرانی نظریات کی تحلیل کرکے ان کے پورے نظامِ فکر کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے جو مصنف کے نزدیک سراسر اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔ چوتھے مضمون "اقبال کی آخری علالت" میں پڑھنے والے کو جو مجرد تصورات اور مسائل پر غور کرتے کرتے تھک گیا ہے، پیرِ مشرق کی آخر عمر کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی جاتی ہے۔ مصنف کے قلم نے اس تصویر میں اصلیت کا رنگ بھرنے میں کمال کر دیا ہے۔ جو محبت اور عقیدت انھیں اقبال سے ہے وہ سادگی اور اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کے ذریعے پڑھنے والے کے دل میں منتقل ہو جاتی ہے اور اسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ خود اس آخری علالت میں اقبال کی تیمارداری اور خدمت کر رہا ہے۔ جب ان کی طبیعت سنبھلتی ہے تو امید موہوم سے خوش ہو جاتا ہے۔ جب ذرا گرتی ہے تو وقت موعود کے ڈر سے گھبرا جاتا ہے اور آخر ایک روز قضائے الٰہی کے آگے سر جھکا کر دل پر پتھر رکھ کر ملتِ اسلامی کی اس بے بہا دولت کو سپردِ خاک کر دیتا ہے۔

خدا کرے زمانہ نیازی صاحب کو اس کا موقع دے کہ اقبال کی ایک مکمل سیرت، ان کے کلام اور ان کی تعلیمات پر ایک مفصل تبصرہ لکھ سکیں۔ اس وقت اقبال کے قدر دانوں کے لیے یہ مختصر کتاب "اقبال کا مطالعہ" بہت غنیمت ہے۔ (ع۔ح)

قابیل :۔ مترجمہ مجنوں گورکھپوری۔ ملنے کا پتہ ایوان اشاعت گورکھپور، قیمت مجلد ۱۲؍ صفحات ۱۹۸، سائز ۲۲×۱۸/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط۔

تخلیق آدم کے ساتھ ساتھ خدا ایک ایسی ہستی کو بھی وجود میں لایا اور اس کو نسل آدم پر مسلط کرکے دونوں کو جنگ کرنے کے لیے دنیا میں بھیج دیا جس پر اگر انسان غالب آ جائے تو اس کا درجہ قدوسیوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے اور اگر بدقسمتی سے انسان مغلوب ہو جائے تو وہ دائرۂ بندگی سے خارج ہو کر انسانیت کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے اور ساتھ ہی انسان کے اندر ایک ایسا جذبہ بھی رکھا اس جذبہ کو اس کے حریف ہستی کا آلۂ کار کہا جائے خواہ کچھ، جاسے کسی ایک حالت میں

سکون نہیں لینے دیتا اور غالباً یہی اس کے ارتقائی مدارج کا باعث بھی ہے۔

زیر نظر کتاب انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی ایک تمثیل کا ترجمہ ہے جسے مجنوں گورکھپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے جس میں مصنف نے اسی حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض اُن حقایق پر بھی روشنی ڈالی ہے جو انسان کے لیے کش مکش کا باعث بنے ہوئے ہیں تمثیل کا تعلق آدم کی اولین اولاد سے ہے۔ قابیل اپنی زندگی کو ایک بار سمجھتا ہے اور اس کے ذہن میں موت کا ڈراؤنا تخیل جاگزیں ہے اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کا شوق۔ اسی وجہ سے اس کی روح آسودگی و سکون کی متلاشی۔ عزازیل قابیل کو ذوق الارض کائنات کے حقایق کے علم کا شوق دلاکر فضائے بسیط کی سیر کراتا ہے جہاں وہ لاتعداد اجرام سماوی دیکھتا ہے جو کرۂ ارض سے کہیں زیادہ بڑے اور حیرت انگیز ہیں۔ قابیل عزازیل سے ان کے متعلق سوالات کرتا ہے وہ مبہم اشارات میں جوابات دیتا ہے ان جوابات سے قابیل کو جو علم حاصل ہوتا اس سے اپنی فنا اور بے مائگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ علم اس کی بے چینی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے جس کا نتیجہ آخر میں ہابیل کے قتل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

مصنف نے علم ہیئت کے جدید نظریات، تحقیقات اور انکشافات بھی بیان کیے ہیں۔ ترجمہ اچھا ہے اور اس پر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

تعلیم جدید۔ مقالہ جناب محمد صدیق میمن صاحب صدیقی۔ ملنے کا پتہ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ قیمت ۳ر، صفحات ۴۰، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، کاغذ کتابت و طباعت معمولی۔

زیر نظر رسالہ ایک مقالہ ہے جو بمبئی کی ایک مجلس میں محمد صدیق میمن صاحب صدیقی نے پڑھا تھا جس میں فاضل مقرر نے یورپین مورخین و محققین کی شہادتوں کی روشنی میں دینی علوم و فنون کے تاریخی اور اولی تعلیمی مراکز کے اعداد پیش کرنے کے بعد علم کی تعریف، اہمیت اور عظمت کی آیات قرآنی کی روشنی میں وضاحت کی ہے اور تعلیم جدید کے نقصانات پر نقادانہ نظر ڈال کر بیان کیا ہے کہ اس سے دینی حالت اور رفتار کو جو صدمہ پہنچا ہے لیکن اس سے فنا ہے خوشحالی بھی میسر نہ آسکی [illegible] کیا ہے کہ تمام علوم و فنون کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے کیونکہ [illegible]

حل قرآن نے پیش نہ کیا ہو استدلال میں آیات قرآنی پیش کی ہیں اسلوب بیان مولویانہ ہے۔

نوروس :- از مسعود اختر جمال، ناشر مکتبہ ادبستان پانڈے حویلی بنارس، قیمت قسم اول ؎ر قسم دوم مجلد ؎، غیر مجلد ؎ر، صفحات ۱۷۴، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

موجودہ سماجی جابرانہ نظام کی فرسودگی کے خلاف بغاوت اور امیری و غریبی کی کش مکش نے ادب کا رُخ بدل کر رکھدیا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ادب ماحول سے اور ماحول ادب سے لازمی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ اس انقلابی کش مکش نے شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا ہے جو انقلاب کو اپنا نصب العین بنا کر اپنے قلم کی طاقت سے موجودہ سماجی نظام کو بدل کر اس کی تعمیر نئے نظام پر کرنا چاہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب مسعود اختر صاحب جمال کی نظموں کا مجموعہ ہے جو انقلابی نصب العین کے علمبردار ہیں اور ان کی نظمیں اس نصب العین کی آئینہ دار۔ ساتھ ہی مجموعہ میں رومانی نظمیں، مناظر فطرت کی نقاشی اور غزلیں بھی شامل ہیں جو الگ الگ عنوانات کے تحت دی گئیں ہیں۔ جذب ناتمام، آسمان، نئی دنیا، ایک خواب اور صبح بنارس اچھی نظمیں ہیں۔ غزلیں بھی دلی تاثرات کی حامل ہیں۔ اشعار میں معنی آفرینی کے باوجود روانی کافی ہے۔ امید ہے کہ یہ نوجوان شاعر آیندہ اور ترقی کرے گا

مرقع شہادت :- از مولانا ضیاء القادری صاحب بدایونی، ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں قیمت ؎، صفحات ۲۶۴، سائز ۲۷×۱۷/۸، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

عالم اسلام کے لیے خصوصاً اور انسانیت کیلیے عموماً واقعۂ کربلا ایک دردناک حادثہ اور درس عبرت ہے اور حضرت حسینؓ کی صداقت، استقلال اور پامردی انسانیت کے لیے فخر کا باعث ہے اس کے برعکس آپ کے دشمنوں کی شقاوت قلبی اور سفاکی باعث ننگ، جسے دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔

مرقع شہادت اسی دردناک واقعہ کی ایک تصویر ہے جس کو مولانا ضیاء القادری نے شاہنامۂ اسلام کے طرز میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں پس منظر کے طور پر حضرت علیؓ اور حضرت خاتون جنت کی شادی، حضرت حسنؓ کی پیدائش، ان کے محاسن اخلاق اور شہادت کا مجملاً خاکہ کھینچا ہے جو موقع کے اعتبار سے ناموزوں نہیں ہے، اس کے بعد اصل موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور واقعات شہادت کی مکمل نقاشی کی ہے۔

ہر مصنف اپنے طبعزاد موضوع میں آزاد ہوتا ہے لیکن جب موضوع تاریخی اہمیت رکھتا ہو اور اس میں عقیدت مندانہ عنصر بھی شامل ہو تو مصنف مقید ہو جاتا ہے اور گوناگوں مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ضیا صاحب اس حیثیت سے قابل ستایش ہیں کہ تاریخی واقعات کی صحت میں شاعرانہ مبالغہ آمیزی سے فرق نہیں آنے دیا اور افراط و تفریط سے حتی الامکان دامن بچا گئے اور غالباً اسی وجہ سے اکثر اشعار میں آمد کے بجائے آورد پائی جاتی ہے کہیں کہیں شاعرانہ رنگ آمیزی بھی ہے باوجود اس کے اشعار اثر سے خالی نہیں۔ ضرورت بھی اسی کی تھی کہ واقعاتِ شہادت تاریخی صحت کے ساتھ سادہ اشعار میں بیان کر دیے جاتے کیونکہ مرثیہ گو حضرات نے مراثی میں شاعرانہ حیثیت سے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور اس میں مزید اضافہ سے حاصل بھی کیا ہوتا۔

کربلا:- از منشی پریم چند صاحب آنجہانی، ناشر لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، قیمت عہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۲۱۴، کاغذ، کتابت و طباعت خاصی۔

منشی پریم چند صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں اور نہ ہی اردو ادب میں ان کا پایہ محتاجِ بیان ہے۔ زیر نظر کتاب منشی صاحب کا ایک ڈرامہ ہے جو اسلامی تاریخ کے سب سے اہم اور دردناک حادثہ "واقعہ کربلا" سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جس میں منشی صاحب نے واقعہ کربلا کے تاریخی واقعات پیش کیے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی تعلیمات و معاشرت کی جھلک دکھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس ڈرامہ میں ہندو مسلم اتحاد اور حق و انصاف کی حمایت کا بلاتفریقِ مذہب و ملت سبق دیا ہے۔ یہ کوشش اپنی جگہ پر کتنی ہی مستحسن ہو لیکن ایک ایسے تاریخی واقعہ میں اس قسم کا پیوند جس کی صحت میں تردد ہو کہاں تک زیب دیتا ہے اور اس کو کس حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے میں کئی تاریخی و تمدنی غلطیاں ہیں بعض جگہ ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو تعلیمات اسلامی کے قطعاً خلاف ہیں اور جن کی توقع حضرت حسینؑ اور ان کے رفقا سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ کردار نگاری میں [illegible] قائم نہیں رہا ہے اسی قسم کی متعدد خامیاں ڈرامہ میں پائی جاتی ہیں جن سے پتہ چلتا

ہوکہ یہ ڈرامہ ان کی ابتدائی تصنیف ہو اور غالباً منشی صاحب کو بھی ان خامیوں کا احساس تھا اس لیے انھوں نے اس کو شایع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا بہتر تھا کہ اب بھی شائع نہ کیا جاتا کیونکہ یہ تصنیف منشی صاحب کی شخصیت کے شایانِ شان نہیں۔

ٹالسٹائی کی کہانیاں :۔ مترجمہ یزداں جالندھری۔ پبلشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور، قیمت عہ، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یزداں جالندھری صاحب اس سے پہلے بھی ٹالسٹائی کے افسانوں کا ایک انتخاب "گناہ ہر بہت" کے نام سے شایع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ مترجم نے ٹالسٹائی کا خیال لے لیا ہو اور ماحول ہندوستانی ہی رکھا ہو اور چونکہ پرانے روسی اور ہندوستان کے سماجی نظام میں کم فرق ہو اس لیے اس میں انھیں خاطر خواہ آسانی اور کامیابی بھی ہوئی ہے۔ افسانے تمامتر کسی نہ کسی مذہبی اصول یا اخلاقی نکتے کے حامل ہیں، زبان کی پاکیزگی اور سلاست نے ترجمہ کو بالکل اپنا دیا ہو بہتر ہو اگر مترجم ٹالسٹائی کی دیگر تصانیف بھی اسی طرح اردو میں پیش کر دیں۔

حکومت الٰہی :۔ مولفہ ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم، ملنے کا پتہ مکتبہ سیفیہ مونگیر (بہار)، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۳۶، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، قیمت درج نہیں۔

مولانا سجاد مرحوم ایک بڑی اعلیٰ سیاسی دماغ رکھنے والی شخصیت تھی زمانہ کے سیاسی اختلال نے جیساکہ ہر صاحب تدبر ہستی کو ایک ایسے سیاسی نظام پر تفکر کرنے کی دعوت دی ہو جس سے انتشار تمدن دور ہو کر امن و امان، فلاح و بہبودی کی صورت اختیار کر سکے۔ اسی طرح حضرت علامہ ابوالمحاسن نے بھی اس میدان سیاست میں ایک سیاسی نظام مرتب کرنا چاہا تھا مولانا کے نزدیک تمام دنیاوی دستور قابل پذیرائی نہیں کیونکہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس لیے ناقص، کمزور اور ناقابل عمل ہیں ایسی حالت میں صرف نظام الٰہی ہی تمام انسانوں کے لیے قابل قبول اور قابل عمل ہو سکتا ہو [illegible] الٰہی کیا ہو؟ یہ مولانا [illegible] اسکے [illegible] کو انھوں نے [illegible] زیر نظر کتاب [illegible] [illegible] مولانا نے [illegible] [illegible]

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روزافزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے۔ وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اسکے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر [illegible] لکھنؤ

چند قابل دید کتابیں

مبادی سیاسیات: مصنفہ پروفیسر محمد ہارون خاں شیروانی صاحب ایم۔ اے (آکسن) ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس بیرسٹرایٹ لا۔ صدر شعبۂ تاریخ سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ فی زمانہ سیاست کو جو عروج حاصل ہو گیا ہے اس سے ہر شخص کو سیاست کے ابتدائی اصولوں سے ضرور واقف ہونا چاہیے۔ اس میں مصنف نے سیاست کے ان تمام اصولوں کا ذکر کیا ہے جو موجودہ دنیا میں کار فرما ہیں۔ کتاب کو سیاست کی تعریف، مملکت اور اسکے ہم جنس ادارات، تخیل مملکت کا آغاز اور اس کا ارتقا، مملکت کی آبادی اور اس کا رقبہ، اقتدار اعلیٰ، قانون، حقوق و آزادی، حکومت کا دائرہ عمل اور فرائض وغیرہ ابواب میں تقسیم کر کے عام فہم انداز میں سیاسی گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ اسکے مطالعہ سے مبتدی بھی سیاسی دنیا سے واقف ہو سکتا ہے۔ ۶۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد پانچ روپے (صہ)

شرح اقبال: مولفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب۔ مصنف نے اقبال کے خیالات کو تین حصوں آرٹ، تمدن اور مذہب میں تقسیم کر کے ان پر مقالے لکھے ہیں۔ ان کے ضمن میں کلام اقبال کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعری اور فنون لطیفہ کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر اور اقبال کے شاعرانہ مسلک پر سیر حاصل طویل بحث کی ہے۔ اقبال کے کلام کی امتیازی خصوصیات، انفرادی اور اجتماعی خودی کے متعلق اقبال کے اصول، مملکت، تمدن، معاشی اور معاشرتی نظام کے متعلق اقبال کے تصور۔ خدا کے وجود اور توحید کے متعلق وہ بنیادی خیالات واضح کئے ہیں جن پر اقبال کی ساری تعلیم کا دارومدار ہے۔ قیمت غیر مجلد تین روپے چار آنہ (سہ)

تاریخ سلطنت خداداد: مصنفہ محمود خاں صاحب محمود۔ ہندوستان کے طویل اسلامی دور نے صرف دو مجاہدین پیدا کئے۔ نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہید۔ اس کتاب میں انہی شہدا کی سوانح حیات، جنگی کارروائیاں اور شہادت کے حالات درج ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان پر انقلاب اور ملک کی موجودہ حالت کے اصلی اسباب بھی بتائے گئے ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی شہرت ہندوستان ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ تک پہنچ چکی ہے۔ ۷۵۰ صفحات ۳۰ فوٹو بلاک۔ قیمت فی جلد للعہ

تاریخ جنوبی ہند: مصنفہ محمود خاں صاحب محمود۔ ملک کی موجودہ سیاست اور ... ہندو مسلم تعلقات کو ... آپ ... جنوبی ہند کی ...

[illegible]


OKASA

جامعہ

زیرادارت: نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۶۳ نمبر ۶ | بابتہ ماہ جون ۱۹۴۲ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ ۸ آنہ

فہرست مضامین

اعتذار

جنگ کی وجہ سے، طباعت میں جو دقتیں پیدا ہوگئی ہیں، ان سے ناظرین جامعہ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جامعہ برابر وقت پر شائع ہوتا رہا۔ مگر ادھر کچھ عرصے سے، بازار میں سرے سے کاغذ ملتا ہی نہیں، جس کی وجہ سے مئی کا رسالہ تاخیر سے شائع ہوا، ہمارا خیال تھا کہ جون کا پرچہ وقت پر شائع ہو جائے گا، مگر ہمیں دلی افسوس ہے کہ انتہائی کوشش کے باوجود ہم اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہم حالات پر جلد سے جلد قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"مینجر رسالہ"

مسلمانوں کا تاریک مستقبل

ہم مسلمانوں میں خوش فہمی، رجائیت اور خوش عقیدگی اس قدر وافر رہی ہو کہ ہم نے بہت عرصہ سے صحیح صحیح واقعات کا انطباق اپنے اوپر کرنا اور ان سے نتیجہ نکالنا چھوڑ دیا ہو کبھی کوئی ناخوشگوار نتیجہ نکالنے کے لیے ہماری روحیں، دل و دماغ و تیار نہیں رہے ہیں۔ ہمارے شاعر، ہمارے مفکر، ہمارے لیڈر اور رہنا کچھ اس خوش عقیدگی سے اس قدر مانوس رہے ہیں کہ کبھی ہم نے حالات کا صحیح صحیح اندازہ کر کے صحیح نتیجہ نکالنے کی کوشش اور ہمت نہیں کی۔ حالی نے مسدس لکھا اور اس میں مسلمانوں کی ابتری اور زبوں حالی کا جو صحیح صحیح نقشہ کھینچا اس سے مسلمان اور مسلمانوں کے رہنا چیخ اٹھے کہ اس سے مسلمان ناامید اور مایوس ہو جائیں گے اس لیے کوئی امید افزا چیز بھی ہونی چاہیے چنانچہ بے چارے حالی کو ایک ضمیمہ لکھ کر اور شامل کرنا پڑا جس میں آئندہ کو روشن دکھایا گیا اسی طرح شبلی، اقبال وغیرہ جتنے مسلمان ادیب و شعراء ہوئے انھوں نے بھی اس خوش فہمی کو برقرار رکھا۔ خوش فہمی بھی حقیقت سے گریز کا ایک طریقہ ہوا کرتی ہو جب انسان اپنی موجودہ حالت کو سدھار نہیں سکتا تو آئندہ کے خود ساختہ خوشگوار خواب ہی دیکھ کر جی کو کسی نہ کسی طرح بہلا لیا کرتا ہو موجودہ باتوں میں ذرا سی بھی کوئی اچھی اور مفید مطلب چیزیں ہوتی ہیں ان کو بے انتہا وسعت دیتا ہے یہی حال قوم کا بھی ہو جس قوم میں جمود، تعطل، بے حسی اور بے عملی ہو وہ اپنی بے بسی کو آئندہ ہی کے خواب دیکھ کر بہلاتی رہتی ہو اپنے معمولی افراد کو بطل اعظم قرار دیتی ہو۔ اپنی معمولی تحریکوں کو آئندہ کی تعمیر کی بنیادیں قرار دیتی ہو اور تلاش میں رہتی ہو کہ کون سی ایسی معمولی اور حقیر چیز نظر آ جائے جسے بڑھا کر اپنے تعطل کو چھپانے کی خاطر اسے معراج پر چڑھا دیا جائے یہ حالت قوم کے افراد اور تحریکوں کی قدر کرنا نہیں بلکہ اپنی بے عملی پر پردہ ڈھانکنا ہو۔ یہ خوشگوار و شیریں خواب جس طرح ایک فرد کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں اسی طرح آخر کار ایک قوم کو بھی زوال کی انتہائی حدوں تک پہنچا دیتے ہیں تاریخ سے اس قسم کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں۔ یونان، روما، مصر، بابل سب معراج پر پہنچ کر اسی خوش فہمی

ہوکر آخر کار انقلاب و زوال کا شکار ہوتے گئے۔

مسلمانوں میں یہ خوش فہمی کہاں سے آئی اور اس کے کیا اسباب و نتائج ہوئے اس کا تلاش کرنا کچھ زیادہ وقت طلب امر نہیں ہو یہ خوش فہمی یا غلط فہمی دراصل ان عالموں کی پیدا کردہ ہو جنھوں نے قرآن و حدیث سے آیتیں اور حدیثیں تلاش کرکے مسلمانوں کو قرب قیامت اور ان کی سب سے برتری و بہتری کا خوف و لالچ دلاتے رہے اور اس طرح اپنی بے عملی اور عدم صلاحیت کا جواز پیش کرتے رہے۔ قرآن و حدیث کی ان آیتوں پر کبھی زور نہیں دیا جن سے یہ مطلب نکلتا ہو کہ خدا کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جس میں خود اپنی حالت بدلنے کی صلاحیت نہ ہو۔ بلکہ اس کے بجائے قوم کو خدا کے وعدے یاد دلاتے رہے اور اس طرح ان کو بے عمل، بے حس اور بے حرکت رہنے پر قانع رکھا۔ مسلمانوں کو گویا ابتدا ہی سے یہ باور کرایا گیا کہ ان کی تقدیر ہی میں افضل ترین قوم ہونا مقسوم ہو اس لیے اگر ان کی موجودہ حالت خراب سہی تب بھی خدا ان کو اس حالت میں کبھی نہ رکھے گا بلکہ چونکہ یہ قوم خدا کی پسندیدہ ترین قوم ہو اس لیے ان کے دن ضرور پھیر دے گا۔ انھیں کسی قسم کا خوف، ہراس اور افسوس نہ کرنا چاہیے۔ خدا سے نا امید ہونا کفر ہو۔ اس قسم کی تلقین اور اس قسم کی ہدایت نے عام مسلمانوں کو بظاہر مطمئن یعنی بے خبر اور قانع کر دیا انھیں اپنا زوال زوال نہ نظر آیا انھیں اپنی پستی محض چند روزہ نظر آئی۔ انھیں یہ قوی امید بندھ گئی کہ خدا خود بخود غیب سے ایسے سامان ظہور میں لائے گا جس سے مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی اور دنیا کی اقوام میں وہ پھر سربلند ہو سکیں گے۔ جہاں ملانے انھیں یہ تعلیم ان کی زبوں حالی کو چھپانے کے لیے دی تھی وہاں انھیں یہ بھی چاہیے تھا کہ وہ نا امیدی کو مٹانے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف عمل کی بھی تعلیم دیتے۔ علما خطیب اور شاعروں کو چاہیئے تھا کہ اس امید اور وعدۂ فردا جس کا وہ ہر موقع پر نام لیا کرتے تھے اس کو عملی شکل میں لانے کی بھی تدبیریں بتاتے لیکن یہ کام چونکہ مشکل تھا اس لیے اُن سے نہ ہو سکا اور یوں بھی تھا کہ انھیں معلوم بھی نہ تھا کہ یہ دوسرا حصہ کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہو بے عملی کا سب سے آسان جواز یہ ہو کہ بغیر کسی قسم کی سعی کیے کسی کام کو خدا کے حوالے کر دیا جائے۔ ہمارے دینی اور دنیوی رہنما عرصے سے یہی کرتے رہے ہیں اور خدا کی آڑ لے کر خدا کی اس برگزیدہ اور پسندیدہ قوم

کو دھوکے دیتے رہے ہیں چنانچہ اس قسم کی تلقین کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اس جگہ ہیں کہ ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہمارا نصب العین کیا ہے دنیا میں ہماری کیا پوزیشن ہونا چاہیے اور خدا نے ہمیں کس لیے بنایا تھا۔ ہماری حالت ایسی گو مگو کی ہے کہ ہر رہنما کی طرف آنکھ اٹھاتے ہیں لیکن اسے بھی راستہ سے دور پاتے ہیں اور پھر چار طرف خالی نظر ڈال کر متوحش ہو جاتے ہیں۔

اس زوال و نکبت کی وجہ محض یہ غلط راہبری ہی نہیں بلکہ چند نقائص اور بھی ہیں۔ علما نے کبھی جبر و اختیار کے مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ یہ مسئلہ ہمیشہ مبہم اور غیر واضح ہی رہا کہ انسان اپنے افعال میں مختار ہے یا نہیں تعلقات دنیوی میں خدا اور بندے کے حدود کیا ہیں کیا خدا ہمارے تمام افعال کا مالک ہے یا ہمیں بھی کچھ اپنے ماحول کو درست کرنے کا اختیار ہے۔ اس مسئلہ کے حل نہ ہونے کی وجہ سے ہماری قوتیں کبھی یکسو اور یک طرفہ نہیں ہونے پائیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لے کر اب تک یہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ قرآن شریف میں کہیں اختیار کی تلقین معلوم ہوتی ہے اور کہیں محض صبر و شکر کی اور بظاہر اس متضاد ادلہ عمل نے متضاد آرا کے گروہ پیدا کر دیے۔ زوال و بدبختی کے زمانے میں "تعز من تشاء و تذل من تشاء" کا ورد حالانکہ محض صبر کی تلقین کے لیے تھا لیکن اسے جمود و تعطل پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا اور کرایا گیا۔ ہمارے دینی رہنماؤں نے کمتر "لیس للانسان الا ما سعیٰ" کی طرف زور دیا اور زیادہ تر وعدۂ خداوندی اور نزول مہدی کی طرف اشارہ اور ہدایت کر کے خاموش رہتے رہے۔ دوسرا بنیادی نقص تاریخی ہے۔ خلفائے عباسیہ کا دور اسلامی تاریخ کا اعلیٰ ترین دور ہے جس زمانہ میں اسلام گویا اپنے معراج پر تھا۔ تمام اسلامی شعائر اپنے انتہائے کمال پر تھے یہ وہ زرین عہد تھا کہ اسلامی تاریخ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی کہی جا سکتی ہے۔ اس عروج پر پہنچ کر اسلامی مفکرین و مدبرین یہ تعین نہ کر سکے کہ اب ہم کس رُخ اپنی ترقی کو بڑھا سکتے ہیں ان کی افواج زمانے کی بہترین فوجیں تھیں اس لیے مزید عسکری ترقیوں کا خیال ان کے نزدیک بے سود ہو گیا۔ ان کی تہذیب اعلیٰ ترین تھی اس لیے مزید تمدنی و تہذیبی اصلاح ان کے لیے محض ایک اصطلاحِ بے مفہوم تھی۔ ان کا اخلاق زمانہ میں سب سے برتر تھا اس لیے مزید اخلاقی جلا ان کے فہم سے دور تھی۔ ان کا علم دینی و دنیوی

اپنے دور کی معراج پر پہنچ چکا تھا اس لیے مزید وسعت کی گنجایش اس میں ان کو نظر نہ آئی۔ علمی فضا میں یہ حد بندی بہت کچھ مذہب کی وجہ سے بھی ہوئی۔ علمائے مذہب نے مزید علم کی موشگافیاں شیطانی کارفرمائیاں گردان کر اس سمت میں علم کو ایک حد سے زیادہ بڑھنے نہ دیا گویا وہی مذہب جو اسلام کی ترقی کا سبب بنا تھا۔ علوم میں ترقیاں ہوئی تھیں اسی ایک حد پر پہنچ کر اس کے لیے زنجیر پا بن گیا۔ غرضکہ خالص اسلام اپنی اس انتہا کو پہنچ کر سیاسی و اقتصادی طور پر ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کے لیے مزید ترقی ناممکن تھی چنانچہ زوال و نکبت کے آثار شروع ہوگئے آخر کار تاتاریوں نے اس شمع کو گل کر دیا اس عہد زریں کے بعد جتنے مسلمانوں نے سیاسی حکومتیں قایم کیں انھیں ہم تمامتر اسلامی نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ زیادہ تر ذاتی کارنامے تھے جو شہنشاہیت قایم کرنے کیلیے سامراجی اصول کی بنا پر کیے گئے اور یہ سامراجی ذاتی کارنامے بھی محض چند مخصوص ہستیوں کی ذات سے قایم رہ کر انھیں وجوہ سے معدوم ہوگئے جن کی وجہ سے دیگر اسلامی حکومتیں برباد ہوگئیں تھیں۔ عسکری اور علمی فضائیں محدود ہوکر رہ گئی تھیں۔ آپس کے مذہبی مناقشات، بحری کارناموں کی طرف کم توجہی اور اقتصادی قوت کا محض چند افراد میں محصور ہوکر رہ جانا یہ ایسی بنیادی کمزوریاں تھیں جن کے باعث آخر کار یہ شاندار عمارت روز بروز کمزور اور کھوکھلی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ جب ہم بیسویں صدی کی ابتدا میں آکر آنکھیں کھولتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ہندوستان جو ایک دو صدی پیشتر مغلیہ خاندان کی عظمتوں کا مرکز بنا ہوا تھا ۱۸۵۷ء میں اپنی آخری چمک دکھانے کے بعد اب پدرم سلطان بود کے تفکرات میں نعرہ زن ہے دنیاوی ترقیوں سے بدگمان ہے اور صرف قرآن کو اپنی دنیوی اور دینی ترقیوں کا حامل سمجھتے ہوئے بھی اسے جزدان میں بند رکھتا ہے یا بغیر سمجھے پڑھتا ہے۔ دنیائے اسلام کی آخری خلافت یعنی خلافت عثمانیہ ترکی ایک مرد بیمار سمجھی جا رہی ہے اور اس میں ایسا گھن لگ گیا ہے جس کی وجہ سے تمام کرگسان یورپ اسے نوچ لینے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان ترکی کو ایک ایسی قوت سمجھے ہوئے ہے جو اٹل اور بے پناہ ہے۔ ایران روس و فرنگ کی نظروں میں ایک لقمۂ تر نظر آ رہی۔ افغانستان فرنگ کی سیاست کا شکار ہو چکا اور مصر میں فرنگی ریشہ دوانیاں یہودیوں کی

رح سے خون پینے پر تل گئی ہیں بلکہ انھوں نے اپنے چنگل میں خدیو مصر کو جکڑ لیا ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر اب تک کے حالات کا جائزہ لیجئے تمام واقعات کے اثرات سلامی ممالک پر جو کچھ مترتب ہوئے ہیں تو حالت اور بھی افسوسناک نظر آئے گی ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم تی ہو کر گستان یورپ اپنے اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے سے ٹکر لیتے ہیں ترکی کی سلطنت جو اس نت تک غنیمت کہی جا سکتی تھی ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی۔ مصر، عرب، فلسطین، ایران اور افریقہ کے اسلامی طوں میں غرضکہ ہر جگہ سیاسی چالیں چلی گئیں۔ وہ نام نہاد اتحاد جو کافی حد تک مسلمانوں کے دلوں کو جوڑے ئے تھا۔ وطنیت کے نظریوں خود غرضی کی چالوں اور فریب کی ترکیبوں سے ختم کر دیا گیا۔ مصر ترکی کا دشمن لیا۔ عرب ترکی کے خلاف ہو گئے۔ ایران ترکی سے پہلے ہی بدظن تھا۔ عراق کو بھی اس اتحاد سے الگ کر دیا ا۔ مغربی مدبرین کی سیاسی چالیں کامیاب ہوئیں اور اسلامی اتحاد فنا کی منزلوں میں پہنچ گیا۔ جمال الدین غانی نے اگر کچھ بیداری پیدا کرنی چاہی تو وہ سختی سے دبا دی گئی کیونکہ سیاست محض ایک شخص کا کام ں ہوا کرتا جب تک تمام قوم کے افراد میں اس کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ اسلامی ممالک کے سلاطین ا اپنی خود غرضی کے طلسمی پھندوں میں گرفتار عقل کے دشمن ہو رہے تھے چنانچہ جنگ کے اختتام پر جب ہم سلامی ممالک پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر ملک خستہ، بے روح اور اپنی حیات کے لیے غیروں کا محتاج نظر آتا ترکی محض ایشیائے کوچک میں محدود کر دیا گیا اس کی مغربی، مشرقی اور جنوبی وسعتیں تمام تر ختم کر دی ں۔ ایران تو ہمیشہ سے ایک ناکارہ سیاسی ملک رہا ہے۔ اس کی حالت جیسے پہلے ناگفتہ بہ تھی تقریباً ویسی باقی رہی نام نہاد ترقیاں محض دل خوش کن باتیں تھیں جس طرح وہ پہلے روس و برطانیہ کے رحم و م پر تھا ویسے ہی وہ بعد کو بھی رہا۔ عرب و عراق بظاہر آزاد ہو گئے لیکن مندوب کا طوق گلے میں پڑا رہا سطین سے جو معاہدے کیے گئے تھے ان کا پورا کرنا تو درکنار یہودیوں کو داخل کر کے ان کی آزادی اور گی بھی ختم کر دینے کی کوشش کی گئی۔ مصر اسمٰعیل کے زمانہ سے جیسا پابند غیر چلا آ رہا تھا ویسا اب بھی اسی طرح افریقہ کے دیگر اسلامی ممالک بھی غیروں کے چنگلوں میں گرفتار رہے

زمانہ ایک کروٹ اور لیتا ہے جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی دو آمر پیدا ہوتے ہیں پہلی جنگ عظیم

میں جرمنی بے حد کچل دیا گیا تھا چنانچہ وہاں غم و غصہ کے شعلے بھڑکتے رہے اور آخر کار تاریخی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک ہٹلر وہاں پیدا ہو گیا۔ اٹلی کو جنگ عظیم میں بطور حلیف کے لوٹ کھسوٹ میں مال کم ملا تھا اس لیے وہاں بھی بے چینی تھی جس سے مسولینی نے فائدہ اٹھایا اور اطالویوں کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ وہ حبشہ کو لے کر دوسرے ملکوں پر ڈورے ڈال سکیں۔ جرمنی اگر اپنی پست حالی کو دور کر کے اپنی حالت سدھار کر مطمئن ہو جاتا تو کوئی ایسا شکایت کا موقع نہ تھا لیکن اس نے حوصلہ مندی کا حریصانہ ثبوت دیا یعنی اپنی طاقت کے زعم میں دوسرے ممالک کی آزادی و زندگی چھین کر ان پر مظالم شروع کر دیے یہ ظاہر ہو کہ اسے کوئی برداشت نہ کر سکے گا۔ جاپان الگ دہنِ آز پھیلائے چین اور جزائر ہند و ہندوستان کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں ہے۔ غرضکہ ظلم، خود غرضی اور فساد کے ہر طرف مظاہرے ہیں جس کے پاس ذرا سی بھی طاقت ہے وہ کمزور کو ختم کر دینا چاہتا ہے اور کر رہا ہے۔ ہر طرف بربریت اور بہیمیت آشکارا ہے۔ ابھی تک تو بھیڑیے لڑ رہے ہیں اس لیے بعض بھیڑیں بچ گئی ہیں جب بھیڑیوں کی جنگ ختم ہو گی تو پھر ایک بھی بھیڑ سلامت نہ رہے گی۔

شیطانیت کے اس فتنہ و فساد کے پُر آشوب دور میں ذرا اسلامی ممالک کی حالتوں پر نظر ڈالیے۔ مسلمان ترکوں کی طرف سے بڑے خوش عقیدہ رہے ہیں اور ترکی ان کے نزدیک ایک ایسا ملک ہے جو آہنی اور ناقابل تسخیر قوت رکھتا ہو۔ یہ بھی ایک ایمانی غلط فہمی ہے ترکی دول یورپ کے مقابلہ میں محض ایک تیسرے درجہ کی طاقت ہے یا معمولی دوسرے درجہ کی یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ وہ زمانے اب نہیں رہے جبکہ ذاتی شجاعت اور فطری بہادری جنگ کے نتائج طے کیا کرتی تھی فتح و شکست اب بموں، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے طے ہوتی ہے۔ بم، ہوائی جہاز اور ٹینک بنانے کے لیے ظاہر ہے کہ لوہا، کوئلہ اور تیل کی ضرورت ہے جن ممالک میں یہ معدنیات زیادہ ہوں گی وہی ملک اب طاقتور کہا جائے گا۔ ترکی میں معدنیات بے حد کم ہیں ساتھ ہی اس کا مالیہ بھی کمزور ہے ایسی صورت میں وہ اپنے آپ کو اتنا مسلح نہیں کر سکتا جتنا کہ وہ ممالک جن کے پاس کہ یہ ذخائر موجود ہیں۔ عرصے سے ترکی نے بیرونی قرضہ بھی لینا ترک کر دیا ہے۔ غرضکہ ترک اپنی ذاتی شجاعت پر جس قدر چاہے بھروسہ کرے

اور ایک ایک فرد اپنے وطن پر قربان ہو جائے لیکن اس کے پاس نہ سرمایہ زیادہ ہے نہ معدنیات کے ذخائر اس لیے اگر اس کی کسی مضبوط طاقت سے جنگ چھڑ گئی تو نتیجہ زیادہ عرصہ تک ملتوی نہ رہے گا۔ آج کل ترکی اپنی غیر جانبداری جو کچھ قایم رکھ سکا ہے وہ اس کی اپنی جائے وقوع کی بدولت ہے بحر اسود کا دربان ہونے کی حیثیت سے روس، برطانیہ اور جرمنی سب اس کی دوستی کے عرصہ سے متمنی رہے ہیں ترکی کی سیاست اس معنی میں دانشمندانہ ہے کہ تینوں کا توازن قایم رکھے ہوئے ہے اور اسی میں اس کی سلامتی مضمر ہے۔ غرضکہ ترکی کی حالت کو بحیثیت مجموعی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ خلفشار میں اس کی ہستی اس کے اپنے اختیار میں ہے اور یہ امید تو کسی حالت میں نہیں کر سکتے کہ اسلامی دنیا کی تعمیر کا دارومدار صرف اسی کی ذات پر ہے۔

ایران کی حالت جیسا کہ میں پیشتر تحریر کر چکا ہوں زیادہ ناگفتہ بہ رہی ہے۔ شاہانِ قاچار کی فضول خرچیاں اور بد انتظامیاں تو سب کو معلوم ہیں۔ خیال تھا کہ رضا شاہ پہلوی ایران کی حالت بالکل درست کر دیں گے لیکن تھوڑی بہت جو کچھ اصلاحات انھوں نے کیں وہ زمانے کے حالات دیکھتے ہوئے بہت ناکافی تھیں۔ عمال کی تقرری کا وہی طریقہ رہا کہ رشوت لے کر آسامی دی جاتی تعلیم کی طرف بہت دیر میں توجہ کی گئی۔ فوجی قوت کو مستحکم اور جدید بنانے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ خارجی پالیسی اندرونی خرابی کی وجہ سے دوسروں کے رحم وکرم پر رہی چنانچہ آخر کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی اور روسی سیاست کا شکار ہو گیا اور جب کسی زبردست طاقت کو فرصت ملے گی اس کی ہستی تمام ختم کر دی جائے گی۔

مصر کی حالت بھی نہر سوئز کی وجہ سے بہت سقیم رہی ہے۔ خدیو اسمٰعیل نے جو فضول خرچیاں کی ہیں اور قرضہ لیا تھا اس کی وجہ سے مصر جس مصیبت میں پھنسا اس سے ابھی تک نہیں نکل سکا زغلول پاشا کی عمر فرنگی طاقتوں کو دور رکھنے میں ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۶ء میں مولینی کی فسطائیت کے ڈر سے نام نہاد آزادی جو دی گئی اس کی شرائط کسی سے پوشیدہ نہیں۔ نہر سوئز کی وجہ سے برطانوی فوجیں اب تک وہاں براج رہی ہیں اور مصر کی آزادی برائے نام کہی جا سکتی ہے۔

عراق، شام، فلسطین، عرب اور شمالی افریقہ کے ساحلی ممالک یعنی طرابلس، الجزائر اور مراکش

وغیرہ غلام زیادہ اور آزاد کم ہیں۔ عراق نیم آزاد ہے اور اپنی خارجی پالیسی میں دوسروں کا پابند۔ شام کو بھی خوش کرنے اور رکھنے کے لیے اسے نیم آزادی کا درجہ دیدیا گیا ہے فلسطین میں بھی گو مگو کا عالم ہے ابن سعود عرب میں بباطن تو انگریزوں کے مخالف ہیں لیکن کمزوری کے باعث بظاہر اُن کے حلیف بنے ہوئے ہیں اور آج کل سیاست ظاہر ہی میں بہت کچھ کام کرتی ہے۔ شمالی افریقہ کے ممالک بھی دوسروں کے پابند ہیں اور باوجود اسلامی اور قومی جوش ہونے کے بھی بے زری اور بے اسلحہ ہونے کی وجہ سے تقریباً غلام بنے ہوئے ہیں۔ افغانستان بھی ایک چھوٹا آزاد ملک ہے لیکن اس کی خارجی پالیسی اس کی اپنی نہیں ہے۔ سامان اور ذخائر کی کمی اسے بھی دوسروں کا ممنون و پابند بنائے ہوئے ہے۔ چین، جزائر ہند چینی ترکستان اور جنوبی افریقہ کے مسلمان کوئی اپنی سیاسی اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی تاجرانہ یا محکومانہ ہے۔

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ تمام ممالک اسلامیہ کی حالت کا جس سے ہم اخذ کر سکتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی حیثیت دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کیا رہ گئی ہے گزشتہ زمانہ میں ان کی حالت چاہے جیسی رہی ہو لیکن موجودہ حیثیت بالکل ان بھیڑوں کی طرح ہے جو کسی درندے کے دہن میں جانے کے لیے وقف ہو چکی ہوں اور فی الحال خود درندوں کی آپس کی جنگ اور عدیم الفرصتی کے باعث اپنی زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح پورے کر رہی ہوں۔

ذرا اس تباہ حالی اس بدبختی پر پھر سے غور کر لیجیے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بدولت دنیا کی اقوام کے مقابلہ میں عالم اسلام کی یوں مٹی پلید ہو رہی ہے؟ اسباب زیادہ غور طلب نہیں ہیں۔ اوّل تو یہی ہے کہ مسلمان دنیا کے بجائے باوجود لاتغلو فی الدین کے حکم کے، دینیات میں زیادہ غلو کرتے رہے۔ دین کے حاملین نے دنیاوی امور خصوصاً دنیاوی علوم کے حصول میں پابندیاں لگا دیں یہ کہکر کہ سب کچھ قرآن میں موجود ہے اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بجائے وہ داخلی علوم کو اہمیت دیتے رہے۔ تصوف، فلسفہ، عشق اور علم الکلام وغیرہ۔ علوم دنیوی ہیئت و کیمیا وغیرہ کی طرف جو کچھ توجہ ہوئی وہ بہت کم تھی اور اس میں زیادہ انہماک مذہبی پابندیوں کی وجہ سے نہیں دیا گیا نیز ان کی

زیادہ ہمت افزائی بھی نہیں کی گئی۔ خدائی رموز جاننے کا طریقہ کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف دوسری قومیں باوجود کم مہذب ہونے کے دنیاوی علوم میں ترقی کرتی گئیں۔ کانوں سے کوئلہ نکالا گیا انجن ایجاد کیا گیا، بجلی دریافت کی گئی، مٹی کا تیل نکالا گیا وغیرہ وغیرہ چنانچہ دنیاوی امور میں دیگر قومیں ترقی کر گئیں اور مسلمان تصوف و عشق اور جنت و دوزخ کی بحثوں میں الجھے رہ گئے۔ دوسری وجہ مسلمانوں میں اختلال اور زوال آنے کی آپس کی خانہ جنگی ہے جس کی اصل بنا مذہبی ہے یعنی شیعہ و سنی کی جنگ۔ خلافت کے جھگڑے اور اُس وقت سے دنیاوی حکومت کے لیے آپس میں ان دونوں کے جھگڑے (جس کے اُکسانے میں منافقین اور دیگر عقیدے کے لوگوں کا کم حصہ نہیں تھا) صدیوں جاری رہے آپس کے اس تفرقہ نے مسلمانوں کو کھوکھلا اگر نہیں تو کم از کم بے حد کمزور ضرور کر دیا پھر شیعہ سنی کے علاوہ دوسرے فرقے بھی اسلام میں پیدا ہوتے گئے جنھوں نے اس کی بنیادوں کو اور بھی ضعیف کر دیا باطنیوں کا فرقہ اس کی بدترین مثال ہے۔ اس آپس کے تفرقہ کی وجہ سے انھیں اس امر کا خیال ہی نہیں رہا کہ ابھی اسلام کے دیگر مخالفین سے بھی نبرد آزما ہونا ہے چنانچہ وہ وحدتِ خیال و عمل جو مسلمانوں کو آپس میں متحد کیے ہوئے تھی کمزور ہوتی گئی تنظیم و انتظام میں رخنہ آیا اور آخر کار رفتہ رفتہ ان کے اپنے فتح کیے ہوئے ممالک بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ اسپین و سسلی وغیرہ کو کون یاد نہیں کرتا؟ آپس کا اختلاف جہاں انتظامی امور میں اختلال پیدا کر دیتا ہے وہاں وہ تمام خرابیاں بھی پیدا کر دیتا ہے جو کسی ایک ذات سے وابستہ ہوتی ہیں۔ خلفائے راشدین کے بعد سے جمہوریت باوجود اسلامی تعلیم ہونے کے ہمیں کسی دور میں دکھائی نہیں دیتی۔ اُمیہ، عباسیہ، فاطمی، عثمانی جتنے خلفا ہوئے سب میں خلافت پدر سے پسر کو تفویض ہوتی رہی کبھی عام مسلمانوں کو دعوت نہیں دی گئی کہ وہ اپنے خلیفہ کا انتخاب کریں۔ گویا خلافت کیا رہ گئی شہنشاہیت تھی جو تمام آمرانہ شوکتوں کے ساتھ جلوہ آرا ہو گئی تھی شہنشاہیت میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر جانشین صاحب فہم و ادراک بھی ہو چنانچہ جب تک ایسے خلفا سمجھدار اور پرہیزگار رہے سلطنت جوں کی توں قایم رہی لیکن جو خلیفہ ناسمجھ ہوا اور بدقسمتی سے اسے وزیر بھی صاحب تدبیر میسر نہیں آیا وہ عیش و عشرت میں پڑ کر تباہ ہوا اور اپنی قوم کو برباد کیا۔ تاتاریوں نے

جب بغداد تباہ کیا تو وہ خلفائے بنو عباسیہ کی عیش پرستیوں کی صحیح سزا تھی جو انھیں ملی۔ تیسری بہت بڑی وجہ مسلمانوں کی کمزوری کی تصوف کا تباہ کن فلسفہ تھا۔ کسی قوم کی تعلیم سے اس کا حال و مستقبل بنتا ہے ہمیں اس کی وجہ ابھی صحیح نہیں معلوم ہو سکی کہ تصوف کہاں سے اور کیونکر مسلمانوں میں در آیا لیکن جب سے اسلام ایران میں پہنچا ہمیں تصوف ہر دور میں بہت نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اخلاقی تعلیم کی بنیاد تصوف کے مقولوں پر رکھی گئی۔ تصوف ایک طرف تو علم کی خاطر فنا فی اللہ ہونا سکھاتا ہے دوسری طرف عشق یعنی محبت۔ اول تو مسلمان کے لیے فنا فی اللہ ہونے کی ضرورت ہی نہیں حقیقت کو داخلی طور پر جاننے کی ضرورت پیغمبر کے بعد باقی نہیں رہتی جو کچھ حقیقت تھی اسے پیغمبر نے معلوم کر کے ہمارے لیے اخلاقی اصول بنا دیے خود قرآن اسی لیے اترا کہ اخلاقی تربیت و داخلی علمی کاوشیں جو کچھ روح انسان میں پیدا ہوئی ہیں سکون پذیر ہو جائیں پھر بھی صوفیا حضرات نے فنا فی اللہ کا درس قناعت و توکل کی صورت میں دینا شروع کیا۔ حقیقت مصنوعی باتوں میں ڈھونڈی جانے لگی۔ اس سے ایک طرف تو مسلمان متوکل ہو کر دوسروں کا محکوم ہو گیا دوسری طرف عشق کی بدعت مسلمانوں میں ایسی پھیلی کہ جس نے اخلاق اور ایمان دونوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ عشرت اور فحاشی دونوں کے لیے عشق مجازی کے پردہ میں ایک جواز قایم ہو گیا جس نے صدیوں مسلمانوں کو صراط مستقیم سے دور گم کردہ راہ رکھا اور بعض جگہ اب بھی اس مصنوعی حقیقت سے مسلمانوں کو چھٹکارا نصیب نہیں ہوا ہے جب قوم ان نیم حقیقی باتوں یا منفیانہ حقیقتوں میں پڑی ہو تو نہ فرد مضبوط رہتا ہے نہ قوم۔ ایک جھوٹا زعم پیدا ہو جاتا ہے جو شعلہ حیات کو مشتعل رکھتا ہے چنانچہ مسلمان اپنے زعم میں دنیا کی دیگر اقوام کو ناحق سے کمتر، ذلیل، کمزور اور بزدل سمجھتے رہے۔ انھوں نے فن حرب کو ایک محدود ترقی سے زیادہ کچھ وسعت نہیں دی۔ تیر و تلوار، توڑے دار بندوق سے لڑنے اور میمنہ و میسرہ اور قلب قایم کرنے کے علاوہ فن حرب میں انھوں نے کوئی جدت نہیں کی۔ انسان جب اپنے کو گرد و پیش سے مضبوط پاتا ہے تو وہ مطمئن ہو کر آرام یعنی عشرت کرنے لگتا ہے اور وہیں سے اس کی کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ اورنگ زیب کا یہ اصول کس قدر صحیح تھا کہ فوجوں کو مستعد رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انھیں

مشغول رکھا جائے! حکومت فوج سے قایم رہتی ہو اور فوج کو مضبوط رکھنے کے لیے صرف یہ ضروری نہیں ہو کہ انھیں تنخواہیں وقت پر ملتی رہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہو کہ وہ اپنی مشق اصلی یا مصنوعی جنگوں میں کرتی رہیں ساتھ ہی فن حرب کے متعلق ماہرین حرب نئے نئے آلات کے ساتھ ساتھ نئی نئی چالیں بھی سوچتے رہیں۔ مسلمانوں نے عشرت و اطمینان میں یہی چیز باقاعدہ نہیں کی۔ چنانچہ دوسری قوموں نے فن حرب کو ایک منظم علم وفن کی طرح ترقی دے کر دنیا نو سی طریقہ سے لڑنے والوں پر فتح حاصل کی۔ ہندوستان میں فرنگی فتوحات بہت کچھ اسی فن کی برتری کا نتیجہ تھیں۔

یہ ہو ایک مختصر سی فہرست ان اسباب کی جن کی بدولت دولت اسلام میں گھن لگتا گیا۔ بنیادیں کمزور ہوتی گئیں اور آخر کار ساری عمارت منہدم ہوگئی اور اب یہ حالت ہوگئی ہو کہ اسلامی ممالک تو باقی ہیں لیکن ان کی سیاست، ان کی آزادی اور ان کی زندگی ان کے اپنے بس کی نہیں ہے مسلمان زندہ اور باقی ہیں اور غالباً ان کی آبادی پچھلے قرنوں سے کہیں زیادہ ہو لیکن وہ شعلۂ گرم جو ان کے سینوں کو پیشتر روشن اور گرم کیے ہوئے تھا اب فسردہ ہوگیا ہو۔ خیال و عمل کی وہ وحدت جو گزشتہ جنگ عظیم تک نام نہاد خلافت کے سلسلے سے باقی تھی وہ ختم ہوگئی یا کردی گئی۔ مسلمان اب بھی زندہ ہیں لیکن سب سے بڑی کمزوری ان میں اب یہ ہو کہ وہ افسردہ شعلہ جو ان کے سینوں میں بجھتا سا معلوم ہوتا ہے اسے صحیح طور اکسانے اور اس سے کام لینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارا وجود اب بھی سرگرم عمل ہوسکتا ہے لیکن صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔ ہمارا سیاسی، معاشی، علمی یا تعلیمی کسی قسم کا صحیح نصب العین ہی نہیں ہو جسے سامنے رکھ کر ہم کسی طرف گامزن ہوسکیں صحیح نصب العین کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ محض خیالی نہ ہو۔ لایق عمل ہو، مفید ہو اور اتنا مفید کہ افراد اسے ضروری سمجھ کر اس کی طرف خود بخود بغیر کسی پروپگینڈے کے مائل ہو جائیں۔ مشرق سے لے کر مغرب تک سارے اسلامی ممالک پر نظر دوڑا جائیے بیشتر ممالک میں تو کوئی سیاسی بیداری یا سیاسی نصب العین ہی نہیں ہو بعض جگہ نصب العین ہو تو صحیح نہیں اور اس لیے وہ مقبول نہیں۔ جب تک جمیع مسلمانوں کا ایک متحدہ اور صحیح نصب العین نہ ہوگا اسلامی سیاست اور مسلمان کہیں بھی لایق اہمیت نہ ہوسکیں گے صحیح نصب العین اور صحیح ہدایت خود

بجز قلوب کو کھینچتی ہے۔ افسوس کہ ہمارے یہاں نہ وہ ہے نہ یہ۔

دوسری کمزوری جو موجودہ اسلامی ممالک اور اسلامی سیاست میں رخنہ انداز ہو رہی ہے وہ مالی کمزوری ہے یہ صحیح ہے کہ اسلام نے دنیاوی مال و اسباب کو زیادہ وقعت نہیں دی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے سراسر نظر انداز کر دیا جائے۔ دنیا دنیاوی اشیا سے زیر ہو سکتی ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ دنیا ہی مقصود حیات نہ ہو جائے۔ ایمان کی برتری اور اولیت قایم رہے لیکن مسلمانوں نے درویشی توکل، استغنا اور فقر کی تعلیمات کی بدولت معاشی بہتری کی طرف بہت کم توجہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت بے مایہ اور غریب ہو گئی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا دنیا کا کام دنیاوی چیزوں سے چلتا ہے کوئی سیاسی یا معاشی نصب العین کیسا ہی مفید، کتنا اہم اور کتنا ہی شدید ضروری کیوں نہ ہو نہیں چلایا جا سکتا جب تک کہ اس کی مالی حالت مضبوط نہ ہو اس میں حسب منشا کامیابی اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ سیاسی نصب العین کی تنظیم اور نشر و اشاعت منظم طور پر ہو سکے اور یہ آج کل اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ معاشی حالت اس ادارہ یا انجمن کی مستحکم ہو۔ یہ صحیح ہے کہ "مشک خود بوید" لیکن مشک کی خوشبو دور تک نہیں پہنچ سکتی۔ پرانے زمانے میں یہی کام ایلچیوں، پیغامبروں اور واعظین کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن آج کل جبکہ زمان و مکان پر کافی حد تک عبور حاصل ہو چکا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی سیاسی نصب العین کو جلد تر، تمام تر اور خوب تر عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ ساتھ ہی اس ادارہ کا مالیہ مستحکم بنیادوں پر قایم ہو اور ادارہ کا مالیہ اسی وقت مستحکم ہو سکتا ہے جب قوم کے پاس کافی سے زیادہ زر ہو غربت سے نہ صرف یہ کہ سیاسی عمل خوب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا اثر فرد کے اخلاق پر بھی پڑتا ہے۔ نفسیاتی بے بسی اور کمتری کا احساس، ایمان کا متزلزل ہونا، جرایم کا اختیار کر لینا اور صحت کا تباہ کر لینا یہ سب غربت کے معائب ہیں جو ہر غریب قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں مسلمان ہمیشہ سے غریب رہے ہیں اور اتنے غریب رہے ہیں کہ غربت کو انھوں نے اپنی زندگی کا ایک جز سمجھ لیا ہے اور اس سے یہ قوم اتنی مانوس ہو گئی ہے کہ انھیں اپنی غربت کا احساس بھی نہیں رہا ہے یہ وہی صوفیانہ قناعت کی تعلیم ہے جس نے ایمان اخلاق کو کسوٹی پر رکھنے کے لیے اس قسم کی تلقین کو جائز رکھا اور اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے

اپنے نفس کا تزکیہ بہت کچھ اس سے کیا لیکن تزکیۂ نفس ہر عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایک عامی کا اخلاق غربت میں ضرور بگڑ جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ اس امر کا مقتضی ہے کہ اب ضمیر کا مزید تزکیہ نہ کیا جائے بلکہ بقدر ضرورت ضرور معاش حاصل کی جائے اور اس کے بعد قوم کی خاطر وافر سرمایہ حاصل کیا جائے مسلمان اپنے اندر اتنی استطاعت ضرور پیدا کرلے کہ کسی غیر قوم کا پابند و دست نگر نہ رہے لیکن یہ امر ضرور ملحوظ رہے کہ دنیا مقصد حیات نہ بنالی جائے بلکہ اگر صدیق ؓ کی طرح کُل نہیں تو عمر ؓ کی طرح ضرور ہر وقت ہر فرد اپنی قوم کے لیے اپنے تمام اثاثے کا نصف دیدینے کے لیے تیار رہے۔

تیسری اور آخری اہم کمزوری موجودہ دور کے مسلمانوں میں ان کی اخلاقی کمزوری ہے آپس کا نفاق اور منافقت حد سے زیادہ ہے۔ یہ نفاق و منافقت کچھ تو اقتصادی وجوہ سے ہوتی ہے اور کچھ ذاتی بغض و عناد، حسد و رشک کی وجہ سے۔ وجوہ کچھ ہوں نتیجہ بے عملی اور بدعملی ہے۔ کوئی تحریک کوئی پروگرام اور کوئی نصب العین عمل پذیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ آپس میں یکجہتی، یکدلی اور اتحاد نہ ہو۔ یگانگت کا احساس ہی رسی کو مضبوط کر دیتا ہے۔ برادرانہ اخوت اور بھائی چارہ اگر پیدا ہو جائے تو کوئی عمل ایسا نہیں جو انجام پذیر نہ ہوسکے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب حسد و خود غرضی کا بیج دل سے نکال دیا جائے۔ قوم کی خاطر جب کوئی کام کیا جائے اس میں جہاں خودی اور خود غرضی شامل ہوگئی وہیں سے وہ کام ناکامیاب ہونا شروع ہو جائے گا۔ آج مغربی تعلیم کے زیر اثر مذہب کو ایک ذاتی اور نجی چیز سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ اسلام کے خلاف ایک زبردست اور سخت پروپیگنڈہ ہے ممکن ہے دوسرے مذہب ذاتی اور نجی ہوں لیکن اسلام تمام تر ملی اور جماعتی مذہب ہے۔ یہ وضع ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ جماعتوں میں یکدلی یکجہتی اور اخوت پیدا ہو اور وہ کسی کام کو متفقہ طور پر انجام دے سکیں لیکن مغربی تعلیم ہمیں تفرقہ کا پیغام دے رہی ہے یہ سمجھا کر کہ مذہب تو محض ایک انفرادی اور شخصی عقیدہ ہے اس انفرادیت نے جہاں مذہب کی رسیاں ڈھیلی کر دی ہیں۔ وہاں افراد میں ایک انانیت پیدا کرکے جماعتی اور ملی بھائی چارہ کو سرے سے نیست و نابود کر رکھا ہے۔ کوئی مخالف اسلام زہر اس سے زیادہ کڑوا نہیں ہوسکتا۔ اسلام تو جماعت، قوم اور پوری سوسائٹی کو متحد و منظم کرنے والا مذہب ہے۔

لیکن اب اسے بالکل اس کی اسپرٹ کے خلاف ذاتی، انفرادی اور نجی عقیدہ کے طور پر نامزد کیا جا رہا ہے مسلمانوں کو تمام اقوام سے زیادہ اس غلط تعلیم سے نقصان پہنچے گا کیونکہ مسلمانوں میں ہمیشہ مذہب اسلام ہی ایک جوڑنے اور متحد کرنے کی چیز رہا ہے یہی مذہب ہے جس نے انھیں مشترکہ محاذ پر لاکر کھڑا کیا ہے۔ اس عقیدہ کے علاوہ دوسری قوموں کی طرح وطن، نسل، رنگ یا تہذیب وغیرہ انھیں کسی امر میں متحد کرنے والی شے نہیں رہی ہے۔ اسی کی بدولت چین و مراکش کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے رہے ہیں لیکن اب مغربی تعلیم کے زیر اثر انفرادیت کی روح پھونکی جا رہی ہے جو یقیناً اسلام کی جڑ کاٹنے کے لیے نہایت کاری حربہ ثابت ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ اس سے مسلمان غیر متحد ہو کر علیحدہ علیحدہ دوسروں کا شکار ہو جائیں گے بلکہ ان میں ایک من حیثیتِ قوم احساس کمتری پیدا ہو جائے گا جو انھیں اپنے آپ کو ایک برگزیدہ قوم سمجھنے کے بجائے دوسروں کی طرح ایک معمولی قوم سمجھنے پر مجبور کر دے گا۔ اس کے اثرات ابھی سے شروع ہو چلے ہیں اور احتمال ہے کہ دس بیس سال کے اندر ہی مسلمانوں میں وہ احساس کمتری پیدا ہو جائے گا جس کی کوئی مثال نہ دنیا ہی اچھا ہے۔

آخر میں لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی ایسی صورت یا صورتیں ہیں جن سے مسلمان قوم کا دوبارہ احیاء ہو سکے وہ پھر اپنی خرابیاں دور کر کے اپنی حالت سدھار سکیں اور پھر اقوام عالم کے مقابلہ میں وہ سربلند و ممتاز ہو سکیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر قوم میں اپنی حالت سدھارنے کا احساس ہو تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا لیکن اگر اس میں احساس نہیں تو سوالات و جوابات دونوں عبث ہیں۔

سید مزمل حسین

موجودہ جنگ کا ایک رخ

(اس مضمون اور اگلے مضمون میں بحث طلب مسئلے ہیں اور ہر ایک نے اپنا اپنا خیال پیش کیا ہے۔ اگر کوئی صاحب ان کا جواب لکھنا چاہیں تو رسالے کے صفحات ان کے لیے حاضر ہیں۔ مدیر)

موجودہ جنگ کی بابت بہت سی طبیعتیں الجھن میں پڑی ہیں۔ سادہ لوح انسان یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جنگ کیوں شروع ہوئی؟ جرمنی کو اس درجہ مسلح ہونے کا موقع کیوں دیا گیا کہ اس کو تمام دنیا کے خلاف برسرپیکار ہونے کی ہمت ہوگئی؟ انگلستان اور فرانس کیوں مسلح نہ ہوئے؟ چیکوسلاویہ جرمنی کے نذر کیوں کر دیا گیا۔ پولینڈ پر حملہ ہوا تو دول متحدہ نے صرف ریڈیو کے ذریعہ سے لفظی جنگ کرنے پر کیوں اکتفا کیا؟ انگلستان نے فرانس کو خطرہ کی اہمیت کے مطابق مدد کیوں نہ دی؟ روس جرمنی میں اتحاد ہوکر کیوں ٹوٹ گیا؟ ہندوستان میں دو سال قبل وہ سب کچھ کیوں نہ ہوا جس کیلئے سر اسٹیفورڈ کرپس تشریف لائے؟

اگر یہ عرض کیا جائے کہ یہ تمام امور جو واقع ہوئے ان کی صرف ایک وجہ ہے تو ناظرین باور نہ کریں گے لیکن متفکر طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ عظیم الشان واقعات جو ضخیم جلدوں میں نہیں سماتے اخلاقی اعتبار سے ان کی وجہ چند لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اخلاقی نقطۂ نظر سے دور حاضر کی کشمکش کی یہ وجہ ہے کہ دنیا نے دوامی اور حقیقی قدروں کو پس پشت ڈال کر انفرادی اور فوری مفاد کو اپنے ہر عمل کا محرک بنا لیا ہے۔ اس زمانہ میں خواہ فرد ہو یا جماعت یا قوم سب ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر عمل کرتے ہیں۔ کسی کو اس سے بحث نہیں کہ کسی خاص عمل کا اجتماعی طور پر کیا اثر ہوگا۔ جب محض انفرادی مفاد ہی دنیا کا مطمح نظر ہوگا تو ضرور مختلف مفاد آپس میں ٹکرائیں گے۔ یہی انفرادی مفاد کا تصادم بہت سے گھروں میں طلاق و بچوں کی بربادی کی صورت میں منودار ہوتا ہے جماعتوں میں پہنچ کر اکثر ہڑتال اور لاٹھی چارج کا باعث بن جاتا ہے اور اس کے جراثیم جب

قوموں میں سرایت کرکے اس کے مفاد کو ٹکراتے ہیں تو جنگ کی صورت اختیار کرلیتا ہے

یہاں ہمارا مقصد موجودہ کشمکش پر انفرادی مفاد کی روشنی میں نظر ڈالنا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا میں سینکڑوں ملک ہیں جن میں مختلف قومیں آباد ہیں لیکن یہ حقیقت اکثر نظر انداز کردی جاتی ہے کہ ہر ملک کی پالیسی اور پوزیشن میں ذرا سی تبدیلی بھی دوسرے ممالک پر اثر انداز ہو کر رہتی ہے مثلاً اگر جرمنی اور اٹلی فوجی معاہدہ کرتے ہیں تو روس اور فرانس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ آپس میں فوراً اتحاد عمل کریں۔ ہمیں چونکہ مختلف ممالک کے سیاسی عمل سے کما حقہٗ واقفیت نہیں ہوتی اس لیے حکومتوں کی ہنگامی دوستیاں اور دشمنیاں اچنبھے میں ڈال دیتی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلے روس اور جرمنی کی سیاست پر نظر ڈالی جاتی ہے لینن کی موت کے بعد روسی اشتراکیت نے مذہب کی سی شکل اختیار کرلی یعنی لینن کو پیغمبر بلکہ خدا کا رتبہ دیا گیا کامریڈ اسٹالین ان کے دنیاوی خلیفہ مقرر ہوئے اور کمیونسٹ انٹرنیشنل نے کلیسا کی جگہ لی۔ کلیسا کی معرفت خلیفہ کی روحانی حکومت دنیا کے ہر اس شخص پر ہوگئی جو اشتراکیت میں ایمان رکھتا تھا ایسا تعلق کوئی عجیب امر نہیں تھا ہر نئے مذہبی دور میں یہی ہوتا ہے کہ پیروان مذہب دنیا کے کسی گوشہ میں کیوں نہ ہوں خلیفہ کو مدد دیتے ہیں اور ان کی بہبودی پر نظر رکھتے ہیں لیکن بعض خلیفہ اپنی کوتاہ نظری کے سبب سے اپنے مذہبی اصولوں کو پس پشت ڈال کر کسی خاص ملک، قوم، فرقہ یا اپنے ذاتی اور ہنگامی مفاد کو اپنا مطمح نظر بنا لیتے ہیں جس کی وجہ سے خلیفہ اور پیروان کے زاویہ نظر میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے جو کسی نئی اخوت کے لیے بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔ اشتراکی خلیفہ کامریڈ اسٹالین نے بھی یہی کیا کہ اشتراکیت کے ہمہ گیر اصولوں کو ترک کر دیا اور وقتی ضرورت کے ماتحت ہنگامی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے غلط اصول وضع کر لیے جن کے ذریعہ مخالف عناصر سے اشتراک عمل شروع کر دیا مثلاً سوویٹ روس کی سیاسی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کامریڈ اسٹالین نے چینی اشتراکیوں کو شن کیا ئی شک کے سپرد کر دیا جنھوں نے اپنے مفاد کی خاطر لاکھوں بہادر چینی اشتراکیوں کو قتل کرا دیا ہی نہیں بلکہ روسی مفاد کی خاطر کامریڈ اسٹالین نے جرمنی کی جمہوری

پارٹی کے خلاف ہرہٹلر کو مدد دی ۔ ۱۹۲۹-۳۲ء میں جرمن کمیونسٹ پارٹی کو ماسکو کا یہ حکم تھا کہ جرمن اسمبلی میں ہرہٹلر کی پارٹی سے تعاون کرے اور جب ٹراٹسکی نے اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی تو کامریڈ اسٹالین نے کہا: "ہٹلر تو سوڈے کے ابال کی طرح جلد ہی بیٹھ جائے گا پھر میدان ہمارا ہی ہے" کامریڈ ریمل نے ۱۴ را کتوبر ۱۹۳۱ء کو جرمن اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "ایک مرتبہ نازی طاقت میں آجائیں پھر ہم کمیونسٹ ان سب نازیوں کی صفائی اچھی طرح کر دیں گے ہم فسطائیوں سے ہراساں نہیں ہیں یہ کسی دوسری پارٹی کی بہ نسبت جلد ہی ختم ہو جائیں گے" ماسکو ظاہر تو یہ کر رہا تھا کہ وہ ہرہٹلر کو برسر اقتدار لاکر جرمنی میں پرولتاری انقلاب کی رفتار تیز کرنا چاہتا ہے لیکن دراصل واقعہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں جرمن جمہوری پارٹی فرانس کے در غلانے میں پوری طرح آچکی تھی اور جرمنی کے روس پر حملہ کرنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے ماسکو یہ چاہتا تھا کہ ہرہٹلر برسر اقتدار آجائے پھر اس اسٹریلین سے صلح کرلیں گے کیونکہ یہ بھی مجلس اقوام کے خلاف ہے۔ یہ بھی معاہدۂ وارسیلز کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی جرمن کی جمہوری پارٹی کو فنا کرنا چاہتا ہے چنانچہ جرمن جمہوری پارٹی کو کچلنے میں ماسکو نے ہرہٹلر کی خوب مدد کی۔ اس احسان کا جواب اس نے یہ دیا کہ ۲۱ر مارچ ۱۹۳۳ء کو دوران تقریر میں کہا: "ہم روس سے دوستانہ تعلقات بڑھانے کے لیے تیار ہیں" اور اس خیال کے بموجب مئی ۱۹۳۳ء میں روس سے ایک دوستانہ معاہدہ کرلیا جس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ ایک دوسرے سے آپس میں تعاون کریں گے اور اگر کسی تیسری طاقت نے حملہ کیا تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ نہ صرف یہی بلکہ کچھ عرصہ بعد جرمنی نے روس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کرلیا جس کی رو سے روس کو قرضہ دیا گیا۔ مثل مشہور ہے کہ منھ کھائے اور آنکھ لجائے ماسکو نے اس احسان کا یہ جواب دیا کہ جب نازی پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد نسلی تفریق کی بنا پر یہودیوں کو قتل اور جلا وطن کرنا شروع کیا اور دنیا نے فسطائیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو سویٹ پریس نہ صرف خاموش رہا بلکہ کامریڈ اسٹالین نے ماسکو میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہم جرمنی میں فسطائی پارٹی کے برسر اقتدار آجانے سے مسرور تو نہیں ہیں

لیکن یہاں فسطائیت زیر بحث نہیں ہو کیونکہ دیکھئے اٹلی فسطائی سلطنت ہو لیکن اس سے ہمارے خوشگوار تعلقات ہیں" یہ سیاست ۱۹۳۴ء تک برابر جاری رہی۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کمیٹی نے اعلان کیا "نازی ڈکٹیٹر شپ سے یہ فایدہ ہوگا کہ عوام کا جمہوریت پر سے اعتبار جاتا رہے گا اور ان پر سوشل ڈیموکریٹ کا اثر بھی کم ہو جائے گا ایسا ہونے سے جرمنی میں پرولتاری انقلاب پیدا کرنے والے حالات بڑی تیزی سے پیدا ہو جائیں گے۔

جب انگلستان اور فرانس نے لفظی پردوں کی آڑ میں جرمنی اور روس کو ہم آغوش ہوتے دیکھا تو خوف زدہ ہو گئے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر روسی خام اجناس اور مزدور اور جرمنی کی تنظیمی قابلیت اور آلات سب ایک لڑی میں منسلک ہو گئے تو مصیبت کا سامنا ہو جائیگا۔ یہ سوچ کر انگلستان اور فرانس نے ایک نئی پالیسی کی طرح ڈالی اب دول متحدہ نے جرمنی کو سونا دینا شروع کیا اور اس کو اسلحہ بنانے اور مسلح ہونے کی اجازت دیدی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رائن لینڈ آسٹریا اور میمل ہضم کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔ اس رشوت کا یہ اثر ہوا کہ ہٹلر دول متحدہ کے ساتھ ہو گیا اور کل کا دوست (سوویٹ روس) مورد عتاب بن گیا۔

اب پھر روس کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس خطرے کو دور کرنے کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ بین الاقوامی لیگ میں داخل ہو کر نئی دوستیاں پیدا کی جائیں اور نئی دشمنیاں کرائی جائیں اس خیال کے ماتحت بہت سے سیاسی داؤ پیچ کھیل کر روس بین الاقوامی لیگ میں شامل ہو گیا جس کو کل تک روسی سیاستداں ہستیاں ڈاکوؤں کی انجمن کہتی تھیں اور کامریڈ اسٹالین فرماتے تھے کہ لیگ تو بیروں کی طرف سے سڑنی شروع ہو گئی ہو۔ روس کی خوش قسمتی کہ اس دوران میں جرمنی کی طاقت کافی بڑھ گئی اور ظاہر ہو کہ جب کسی کی طاقت زیادہ ہو جاتی ہو تو اس کی خواہشات اور مطالبات وسیع ہو جاتے ہیں چنانچہ طاقت بڑھ جانے پر جرمنی کے مطالبات اتنے بڑھے کہ انگلستان اور فرانس خوف زدہ ہو گئے اور کامریڈ لٹوینوف فرانس کو جرمنی سے توڑ لینے میں کامیاب ہو گئے نہ صرف یہی بلکہ روسی مدبرین کی کوششیں یہاں

تک کامیاب ہوئیں کہ روس، فرانس اور چیکو میں ایک دوستانہ معاہدہ ہو گیا تاکہ اگر جرمنی ذرا بھی سر اٹھائے تو تین طرف سے زد و کوب کیا جا سکے ملکی مفاد کا جادو دیکھیے کہ اس زمانہ میں سرمایہ دار فرانس اور اشتراکی روس اپنے اقدار کے فرق کو بھول گئے بلکہ ماسکو نے اپنے قومی اور ملکی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سیاسی نظریہ پیش کیا "کیمونسٹ پارٹیوں کا فرض ہے کہ سرمایہ دار ملکوں کی جمہوری پارٹیوں سے اشتراک عمل کریں اور فسطائی طاقتوں کے خلاف جمہوری حکومتوں کی طاقت بڑھائیں" اسی سلسلے میں بیک وقت پیرس اور ماسکو سے یہ اعلان ہوا "موسیو اسٹالین فرانس کے ملکی تحفظ کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور انھیں اس کا بھی خیال ہے کہ فرانس کو سامان حرب میں بھی اضافہ کرنا چاہیئے تاکہ اپنی حفاظت کر سکے" ماسکو کے اس اعلان کے یہ معنی تھے کہ فرانس میں جماعتی جد و جہد بند کی جائے اور وہاں کیمونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیوں کو چاہیے کہ موسیو لاوال کی بر جوازی حکومت سے تعاون کریں۔ سرمایہ دار حکومت کا فوجی بجٹ پاس کرائیں سامان حرب بنانے کے کارخانوں میں ہڑتال نہ ہونے دیں اور مزدور جماعت اجرت بڑھانے کا مطالبہ نہ کرے اسی زمانہ میں فرانس کے نوجوانوں کیمونسٹ سبھا کے روسی نمائندے نے ماسکو کے اشارہ پر یہ اعلان جاری کیا "اگر اس زمانہ میں کیمونسٹ نوجوانوں نے فرانس میں انقلاب کرنے کی کوشش کی تو غدار ٹھہرائے جائیں گے" یعنی روس نے سچی اور شفاف اشتراکی سیاست کے برعکس ایک نئی سیاست کی طرح ڈالی۔ اس اشتراکیت سوز سیاست کو باوقار بنانے کے لیے سات سال کے التوا کے بعد ۱۹۳۵ء میں کیمونسٹ انٹرنیشنل کا اجلاس بلایا گیا لیکن اس امر کا پہلے انتظام کر لیا گیا کہ نمائندے جی حضور قسم کے ہوں جو کامریڈ اسٹالین کی ہر تجویز پر ہاتھ اٹھا دیں چنانچہ جب اس اجلاس میں کامریڈ اسٹالین کی نئی سیاست کی تائید میں تجویز پیش کی گئی تو بدل و جان منظور کر لی گئی۔ اگر کسی ملک کے زیادہ باشندے حق پرست، باہوش اور مجاہد نہ ہوں تو وہاں جمہوریت بالکل ایک دھوکا ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ جو سیاست چند لیڈروں کی کوتاہ نظری کا نتیجہ تھی اس کو کیمونسٹ انٹرنیشنل کی طرف سے اشتراکی جمہوریت

کا فیصلہ بنا کر پیش کیا گیا اور تمام دنیا کے کمیونسٹوں کو اس نئی پالیسی پر کاربند ہونے کی ہدایت کی گئی
یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ماسکو کے اشارے پر ایک مشہور اخباری نمایندے مسٹر ہوورڈ کامریڈ اسٹالین
سے ملاقات کرنے پہنچے اور انھوں نے دوران ملاقات میں کامریڈ اسٹالین سے یہ سوال کیا "کیا
واقعی روس انقلاب عالم کے تخیل اور انقلابی جد وجہد سے دست بردار ہو رہا ہے؟" جس کے جواب
میں کامریڈ اسٹالین نے فرمایا "ہمارا نہ کبھی انقلاب پیدا کرنے کا منشا تھا اور نہ ہم کسی ملک میں انقلابی
سازش کرتے ہیں یہ دنیا کو عجیب مضحکہ خیز مغالطہ ہو گیا ہے کہ ہم اشتراکی انقلاب کرنے کے لیے ملک در
ملک جد وجہد کرتے پھرتے ہیں" مسٹر ہوورڈ کی اس ملاقات کا حال دنیا کے تمام اخبارات میں شایع
ہوا تھا تاکہ برجوازی جمہوریتوں کے ساتھ تعاون کی پالیسی کا اعلان زیادہ واضح ہو جائے. چنانچہ جب
اسپین میں جنرل فرانکو نے بغاوت کی تو کامریڈ اسٹالین نے اسپین کی اشتراکی حکومت کی ذرا بھی
مدد نہ کی روس کی اس مجرمانہ غیر جانبداری کی تہہ میں یہ راز تھا کہ سویٹ روس سرمایہ دار حکومتوں کو یقین
دلا دے کہ وہ کہیں بھی اشتراکی انقلاب پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ دل و جان سے برجوازی جمہوری روایات
کے ساتھ ہے لیکن جب یہ خطرہ بہت نمایاں ہو گیا کہ فرانکو کی فتح فسطائیت کو زیادہ طاقتور بنا دے گی
تو اس آخری وقت پر روس مدد کرنے نکلا لیکن اُس وقت بھی ماسکو کی نیازمندی کا یہ عالم تھا کہ
جارحانہ کارروائی کرنے سے پہلے کامریڈ اسٹالین نے سرمایہ دار جمہوریتوں کو یقین دلایا کہ اگر روس
کو اسپین میں فتح ہوئی تو وہاں جمہوری قسم کی حکومت قایم کی جائے گی جو انفرادی ملکیت کو تسلیم
کرے گی جب اسپین کے پرولتاری طبقہ کو یہ معلوم ہوا کہ انفرادی ملکیت کو برقرار رکھا جائے گا تو وہ
بددل ہو کر کنارہ کش ہو گیا. اشتراکی جد وجہد موم کی طرح پگھل گئی اور ہٹلر اور مسولینی کے ایک اور ساتھی
جنرل فرانکو برسراقتدار آ گئے. اس سیاسی تبدیلی نے فسطائیت کا زور اور زیادہ کر دیا جس کا نتیجہ ہوا
کہ فرانس اور روس قریب تر آ گئے لیکن سادہ لوح انسان کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ باوجود فسطائیت
سے برگشتہ ہونے کے روس اطالوی بحری اور ہوائی بیڑے کو حبشہ کے خلاف تیل دے رہا تھا
اور اسپین میں اطالوی بمباروں کے لیے باکو سے تیل آ رہا تھا نہ صرف یہی بلکہ جب روم میں سینیر ٹامو ٹرگز

کا قتل ہوا اور تمام دنیا نے مسولینی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تو روسی سفیر نے علانیہ طور پر مسولینی کے ساتھ کھانا کھایا جس سے یہ اظہار مقصود تھا کہ ساری دنیا تمہاری ذرا سی خانگی کارروائی پر چراغ پا ہو رہی ہے لیکن ہماری محبت دیکھو کہ اس پر بھی تمہارا دامن الفت نہیں چھوڑتے اس زمانہ میں نہ صرف اٹلی سے تعلقات بڑھے ہوئے تھے بلکہ روس کی کئی سربرآوردہ ہستیاں جرمن حکومت سے ربط پیدا کرنے میں مصروف تھیں۔ فرانس میں بھی فسطائیت طاقتور ہو رہی تھی اور فرانسیسی جمہوری حکومت تموری پر بل تک نہ لاتی تھی۔ یہ منافقت موجودہ زمانہ کی سیاست کا جزو لاینفک ہے اس منافقت سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وقت ضرورت سیاسی قلابازی کھائی جاتی ہے جیسا کہ فرانس میں آج کل ہو رہا ہے

اگرچہ بظاہر روس اور فرانس میں دوستی ہو گئی تھی لیکن اپنا اپنا انفرادی مفاد مد نظر رکھتے ہوئے انگلستان اور فرانس یہ چاہتے تھے کہ سیاسی گتھی کچھ اس طرح الجھے کہ جرمنی اور روس میں چھڑ جائے اور یہ دونوں لڑ کر کمزور ہو جائیں تاکہ فرانس اور انگلستان نسبتاً زیادہ طاقتور ہو جائیں اور روس کی دلی تمنا یہ تھی کہ کسی سیاسی الجھن کی وجہ سے جرمنی اور فرانس برسرپیکار ہو جائیں تاکہ جنگ کے بعد روس یورپ میں نسبتاً سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ چنانچہ جب چیکو کا معاملہ پیش آیا تو انگلستان، فرانس اور روس نے اپنا اپنا پہلو بچایا اور چیکو سے معاہدہ ہونے کے باوجود اس کی مدد کو نہ پہنچے واقعہ تھا کہ اگر روس اس معاملہ میں جرمنی سے لڑائی مول لیتا تو وہ تنہا چھوڑ دیا جاتا۔ اگر انگلستان اور فرانس چیکو سے اپنا وعدہ ایفا کرنے پر آتے تو روس کوئی توجیہ نکال کر خاموش رہتا یہ تینوں دلی نے اور ایک دوسرے کے پوشیدہ ارادوں کو خوب پہچانتے تھے۔

آپس کی یہ غیر اعتمادی اور رقابت جرمنی کے لیے بہت مفید ثابت ہو رہی تھی یہ آپس کی رقیبانہ اور انفرادی مفاد کا جذبہ تھا کہ جرمنی کو ایک چھوٹا سا جرمنی مفت ہاتھ لگ گیا۔ اب ہر ہٹلر ت دلیر ہو گئے تھے انھوں نے نہ صرف اپنے مقبوضات واپس مانگے بلکہ یورپ میں ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیے اب جرمنی کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چمبرلین ان سے ملنے برلن گئے جس سے ہر ہٹلر کو یہ یقین ہو گیا کہ اتحادی کمزور ہیں۔ جب کسی ایک فریق کو دوسرے

کی کمزوری کا یقین ہو جاتا ہے تو اس کے مطالبات اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ دوسرے فریق کو سوائے لڑائی کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ یہی شکل یورپ میں پیدا ہو گئی تھی۔ ہٹلر کو دول متحدہ کی کمزوری کا یقین ہو گیا اس لیے جرمنی کے مطالبات اس قدر بڑھ گئے کہ اگر دول متحدہ ان کو مان لیتے تو وہ شکست ماننے کے برابر ہوتا۔ ان حالات میں صاف دکھائی دینے لگا کہ یورپ میدان جنگ بن کر ہی رہے گا۔

جنگ کے امکانات نے ہر سلطنت کو نئی دوستیاں پیدا کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔ چنانچہ انگلستان اور جرمنی دونوں نے روس کی طرف توجہ کی اور اس کی دوستی کے خواہشمند ہوئے انگلستان نے محکمہ خارجہ کے ایک غیر معروف شخص کو ماسکو گفت و شنید کے لیے روانہ کیا لیکن بیکار۔ روس کا خواب کہ سرمایہ دار حکومتیں لڑ لڑ کر فنا ہوں وہاں اشتراکی انقلاب ہوں اور روس خود نسبتاً طاقتور ہو جائے تیس سال میں پہلی مرتبہ پورا ہوتا معلوم ہو رہا تھا ظاہر ہے کہ اس خواہش کے ماتحت روس کوئی ایسا سیاسی اقدام کیوں کرتا جس سے سرمایہ دار ملکوں کی جنگ رک جاتی دوسری بات یہ تھی کہ آخر وہ اپنے طاقتور ہمسایہ جرمنی سے کیوں بگاڑتا اور کیوں جنگ کی آگ میں کودتا۔ تیسرے یہ کہ جغرافی حالات بھی کچھ ایسے ہیں کہ انگلستان روس کو فوراً ہی کوئی فوجی مدد نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چوتھے یہ کہ ابھی تک انگلستان کو شاید یہ خیال کہ جرمنی بجائے مغرب کا رخ کرنے کے مشرق کی سمت بڑھے گا۔ چنانچہ انگریزی وفد ابھی انگلستان کے عوام کا منھ بند کرنے کے لیے ماسکو میں خانہ پری کر ہی رہا تھا کہ جرمنی کے وزیر خارجہ ہوائی جہاز میں ماسکو پہنچے اور پولینڈ و رومانیہ کا نصف نصف اور بالٹک کی ریاستوں اور فنلینڈ کی قربانی چڑھا کر برلن واپس چلے آئے۔ روس اور جرمنی کے اس نئے معاہدے میں یہ صاف طور پر درج تھا کہ دونوں ملک مشترکہ مسائل پر باہم مشورہ سے کام کریں گے۔ ظاہر ہے کہ پولینڈ سے بڑھ کر روس اور جرمنی کے درمیان کونسا مشترکہ مسئلہ ہو سکتا تھا۔ پولینڈ پر حملہ ہونے سے ۴۸ گھنٹے پہلے جرمنی حکومت کی پریس ایجنسی نے اعلان کیا "روس اور جرمنی میں جو معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ خاص طور پر معاہدہ کے اس حصہ پر جو پولینڈ

سے متعلق ہو جرمنی اور روس معاہدہ کے نتائج کی پوری ذمہ داری لینے کے لیے تیار رہیں۔ ۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پولینڈ کا مسئلہ دونوں ملکوں میں پہلے ہی طے ہو گیا تھا۔ روسی پریس میں ہر ہٹلر کی یہ تقریر شایع ہوئی لیکن حکومت کی طرف سے اس کی کوئی تردید نہیں ہوئی۔ ان سب واقعات سے معلوم ہوتا ہو کہ پولینڈ اور دیگر معاملات میں روس معصوم نہ تھا۔

جب پولینڈ کی مدد کو کوئی نہ آیا اور انگلستان اور فرانس نے مغرب میں کوئی محاذ قایم نہیں کیا تو ہر ہٹلر اور کامریڈ اسٹالین کے دل اور بھی بڑھ گئے۔ ادھر کامریڈ اسٹالین نے اسٹونیہ، لٹویہ، لتھونیا پر پُرامن طریقہ سے قبضہ جمایا۔ اُدھر جرمنی نے بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کو ختم کر دیا۔ فرانس کیوں یک لخت گر پڑا اس کی سیاسی، اخلاقی اور فوجی وجوہات سب کو معلوم ہیں یہاں اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں۔

فرانس کی شکست کے بعد سے جو موجودہ جنگ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہو۔ فرانس کی شکست اور وہاں فسطائی رجحانات کے مدبروں کے برسر اقتدار آ جانے سے یورپ کا فوجی توازن بالکل مختلف ہو گیا اس شکست سے نہ صرف جرمنی کا مغربی محاذ محفوظ ہو گیا اس کا دشمن فرانس ختم ہو گیا بلکہ میجنو لائن کا تمام سامان جنگ اور غلہ کا ذخیرہ بھی جرمنی کے ہاتھ آیا یہی نہیں بلکہ فرانس کی تمام صنعت و حرفت فسطائی طاقتوں کی مدد کرنے لگی۔ انگلستان کو بھی بلجیم میں ایسا زخم لگا کہ جرمنی کو اس جزیرہ سے کچھ عرصے کے لیے کوئی خوف نہ رہا۔ مختصر یہ کہ فرانس کی شکست سے وہ حالات بدل گئے جن کی وجہ سے جرمنی نے روس سے معاہدہ کیا تھا۔ جب جرمنی کو اپنے مغربی محاذ سے کوئی خطرہ نہیں رہا تو ہر ہٹلر نے روس کی دوستی سے بھی بے نیازی حاصل کر لی۔ روس کی شومئی اعمال کہ ایک طرف فرانس جرمنی کے زیر اثر آ گیا دوسری طرف فنلینڈ نے دیگر بالٹک ریاستوں کی طرح اطاعت قبول نہیں کی بلکہ انگلستان اور امریکہ کی شہ پا کر روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فنلینڈ کی جنگ نے روس کے فوجی وقار کو خاک میں ملا دیا اور جب روس کو فتح ہوئی بھی تو جرمن ماہرین آلات اور فوجی ماہرین کی مدد سے روس کی اس درجہ محتاجی نے ہر ہٹلر کو اس پر بالکل

آمادہ کر دیا کہ روس سے نئے مطالبات کیے جائیں۔ چنانچہ ۱۳ر نومبر ۱۹۴۰ء کو روسی وزیر خارجہ کامریڈ مولوٹوف کو برلن بلایا گیا اور ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ روس کو چاہیے کہ نئے فسطائی نظام میں داخل ہو جائے اور ترکی، ایران و ہندوستان پر حملہ کر دے۔ ظاہر ہے کہ آزاد و خود مختار طاقت ہونے کی حیثیت سے روس اس مطالبہ کو نہیں مان سکتا تھا چنانچہ وزیر خارجہ نے انکار کر دیا اور باقی گفتگو اقتصادی معاملات تک محدود رہی لیکن چونکہ ہر ہٹلر اب کافی طاقتور ہو چکا تھا اس لیے جرمن کے اقتصادی مطالبات بھی اس قسم کے تھے کہ ان کا تسلیم کرنا اقتصادی آزادی کو خیرباد کہنا تھا شاید کامریڈ مولوٹوف ان اقتصادی مطالبات کا بھی امید افزا جواب نہ دے سکے۔ اس ملاقات سے روسی وزیر خارجہ کو یہ محسوس ہو گیا کہ فاتح فرانس کا نیا وار روس پر ہوگا چنانچہ کامریڈ مولوٹوف کے ماسکو واپس پہنچتے ہی ادھر روس میں باقاعدہ جنگ کی تیاری شروع ہوئی ادھر ہٹلر نے روسی حملہ کی تمہید کے طور پر بلقان کی ریاستوں سے غیر فسطائی اور اشتراکیت پسند اثرات کو ختم کر لینے کی ٹھانی تاکہ روس کو یورپ میں کسی سمت سے مدد نہ پہنچ سکے۔

فسطائی طاقتوں کے بلقان میں اقدام سے روس کو یقین ہو گیا کہ حملہ ہونے والا ہے چنانچہ اپنا محاذ مستحکم کرنے کے لیے روس نے رومانیہ کے علاقہ بسرابیا پر قبضہ کر لیا۔ شاہ کرول نے چونکہ کوئی مدافعت نہیں کی اس لیے رومانیہ کی رعایا نے بغاوت کر دی اور اپنے غصہ کا اظہار اس طرح کیا کہ شاہ کرول کو تخت سے اتار کر ان کے کمسن لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا جنھوں نے روس کے خلاف جرمن مدد حاصل کرنے کی خاطر اپنا تمام ملک ہر ہٹلر کے سپرد کر دیا۔ ہر ہٹلر کی اس فتح نے جرمنی کو بلغاریہ اور یوگوسلاویہ سے قریب تر کر دیا۔ ان دونوں ریاستوں میں حکومتی طبقہ تو فسطائی تھا لیکن رعایا کی بڑی تعداد کمیونسٹ تھی۔ ہر ہٹلر نے حسب دستور سیر و سیاحت کے بہانے بلغاریہ میں جرمن داخل کرنے شروع کر دیے اور وہ اس قدر زیادہ تعداد میں پہنچے کہ شاہ بورس کو فسطائی نظام میں داخل ہوتے ہی بن پڑی۔ بلغاریہ کی اس نئی دوستی پر روس بہت چراغ پا ہوا اور ماسکو نے شاہ بورس کو غم و غصہ کا ایک نوٹ روانہ کیا۔ بلغاریا کے بعد یوگو کا نمبر آیا۔ جرمنی نے

اس حکومت سے بھی مطالبہ کیا کہ یوگو اقتصادی نظام میں جرمنی کے زیر اثر ہونا چاہیے۔ اور ریاست کو فوراً نئے فسطائی نظام میں داخل ہوجانا چاہیے۔ ہرہٹلر کے دباؤ سے یوگو کے حکومتی طبقہ نے یہ مطالبات مان لیے لیکن رعایا نہ مانی اس لیے بادشاہ پال کو برطرف کرنے کے بعد اس کے لڑکے شہزادہ پیٹر کو تخت پر بٹھا دیا۔ روس نے فوراً اس نئی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کرنے کا ارادہ کیا اور برطانیہ نے بھی فی الفور مدد دینے کا وعدہ کیا لیکن جب تک معاہدہ ہوا اور مدد پہنچے یوگو ختم ہوچکا تھا۔ ہرہٹلر روس پر یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ ماسکو کی سازشوں سے یوگو میں بغاوت ہوئی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ درست ہو۔ یوگو کے بعد ہرہٹلر نے یونان کی طرف توجہ کی جہاں ان کے دوست مسولینی کو شکست پر شکست ہورہی تھی۔ یونانی اگرچہ جان توڑ کر لڑے لیکن جرمن دباؤ کو نہ روک سکے اور حکومت کو جزیرہ کریٹ بھاگ جانا پڑا۔ بلقان کی فتح کے یہ معنی تھے کہ مئی ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں روس کو چھوڑ کر تمام یورپ فسطائی چنگل میں آچکا تھا۔

بلقان کی فتح کے بعد سے موجودہ جنگ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہاں واقعات کا تسلسل قابل غور ہے۔ ۲ رمئی ۱۹۴۱ء کو بلقان کی ریاستیں ہرہٹلر کے زیر نگیں آتی ہیں۔ ۶ رمئی ۱۹۴۱ء کو کامریڈ اسٹالین سویٹ روس کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالتے ہیں۔ ۱۲ مئی ۱۹۴۱ء کو ہرہس صلح کی شرطیں لے کر انگلستان پہنچتے ہیں۔ ۲ رجون ۱۹۴۱ء کو ہٹلر اور مسولینی میں ملاقات ہوتی ہے اور ۲۲ رجون کو جرمن فوجیں روسی سرحد میں گھس جاتی ہیں۔

ہرہٹلر کا یہ کہنا کہ روس اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا غلط ہے بلکہ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جرمنی نے روس کے سامنے فسطائی نظام میں شرکت کا مطالبہ رکھکر اسے مجبور کر دیا کہ وہ مدافعانہ جنگ کی تیاری شروع کردے۔ ماسکو کا یہ کہنا کہ ان پر اچانک حملہ ہوا ، بعید از قیاس ہے۔ نومبر ۱۹۴۰ء میں جب کامریڈ مولوٹوف برلن سے واپس ہوئے اسی وقت سے ماسکو کو اس کا علم تھا کہ جرمنی حملہ کرے گا۔ ۶ رمئی کو کامریڈ اسٹالین کے قلمدان وزارت سنبھالنے کے صاف یہ معنی تھے کہ ان کو ہونے والے حملہ کا پورا پورا علم اور یقین تھا (جرمن فوجیں جس تیزی سے روس میں گھسیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے اچانک حملہ کر دیا تھا بلکہ

اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ۲۰ برس کی مدت میں سویٹ روس میں بجائے فوج کو طاقتور بنانے کے روسی خفیہ کو طاقتور بنایا جا رہا تھا اور بجائے مضبوط اور مفید ہتھیار ایجاد کرنے کے روسی حکومتی طبقہ تجربہ کار سیاسی اور فوجی کارکنوں کو قتل اور جلا وطن کرنے کے نئے طریقے سوچتا رہتا تھا ۱۲ مئی ۱۹۴۱ء کو ہرہس جو شرائط صلح لے کر انگلستان پہنچے اس کی بابت سیاسی نظر رکھنے والے رائے رکھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہرہس کا مشن اتنا ناکامیاب نہیں رہا جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ۳ جون ۱۹۴۱ء کو ہر ہٹلر اور ان کے دوست مسولینی میں ملاقات ہوئی جس میں شاید فاتح فرانس نے شکست خوردہ حبش کو روس پر حملہ کے فیصلہ سے آگاہ کیا اس ملاقات کے کچھ ہی دن کے بعد یعنی ۲۲ جون ۱۹۴۱ء کو جرمن فوجیں نئی روسی سرحد میں اس طرح گھستی چلی گئیں کہ جیسے مکھن میں چھری۔ روس کے حملہ کے بعد انگلستان اسی پوزیشن میں آگیا جس میں کہ پہلے روس تھا یعنی کہ انگلستان کے دو دشمن جرمنی اور روس آپس میں لڑ کر ختم ہونے لگے اور انگلستان امریکہ کی مدد سے اسی نسبت سے زیادہ تیزی سے طاقتور ہونے لگا۔ روس اور جرمنی کی جنگ کی وجہ سے سویٹ روس میں جو تباہی ہوئی اس سے سب واقف ہیں اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہیں کہ کامریڈ لٹوینوف امریکہ میں اور کامریڈ جنسکی انگلستان میں گڑگڑا گڑگڑا کر جمہوریتوں سے التجا کر رہے ہیں کہ نیا محاذ قایم کرو ورنہ ہم ختم ہوئے لیکن اس وقت تک جمہوریتوں کو ایسا کرنا قرین مصلحت معلوم نہیں ہو رہا ہے شاید ابھی تک روس میں دم باقی ہے اور سرمایہ دار جمہوریتوں کو یہ خیال ہے کہ ہنوز کمیونسٹ روس اتنا کمزور نہیں ہوا کہ وہ جنگ کے بعد بلا چون و چرا امریکہ اور انگلستان کا تجویز کردہ نیا بیوپاری نظام قبول کرے گا۔ گمان ہے کہ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے یہ جنگ ختم ہو گئی فسطائی فتح (جس کے امکانات روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں) کی شکل میں تو کمیونزم ایک طویل مدت کے لیے ختم ہو ہی جائے گا لیکن جیسا کہ خیال ہے کہ جمہوریتوں کو فتح ہو گی اس شکل میں بھی کمیونزم ایک عرصہ دراز کیلئے خاموش ہو جائے گا جنگ کے بعد امریکہ اور انگلستان تباہ حال سویٹ روس کو اقتصادی دباؤ ڈال کر اس پر مجبور کریں گے کہ وہ موجودہ اشتراکی نظام کو ختم کر دے اور جمہوریتوں کے نئے اقتصادی نظام میں شامل ہو جائے اور جس قسم کے مدبر روس میں آج کل برسر اقتدار ہیں ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی اصول کی خاطر قربانی پیش کریں گے لاحاصل ہے شاید آیندہ واقعات اس امر کی تائید کریں کہ جہاں تک کمیونزم کا تعلق ہے جنگ ختم ہو گئی۔

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

سوویٹ روس کی خارجی پالیسی

جرمنی و سوویٹ جنگ سے پہلے | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سوویٹ روس کی خارجی پالیسی دیگر سرمایہ داری اور سامراجی ریاستوں سے مختلف نہیں ہے۔ لہذا دنیا کے آزاد منشوں کو اس سے ہمدردی ظاہر نہ کرنا چاہیے۔ خاص کر فن لینڈ پر حملہ کے وقت دنیا کے تمام سرمایہ دار اخبارات اور سیاستداں حضرات روس کو بیرحم، ظالم اور خونخوار بھیڑیا کہہ کر پکارتے تھے۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ سوویٹ روس کا ایک بھی عمل سوویٹ جمہوریت کے منافی تھا تو یہ اعتراضات تسلیم کیے جا سکتے ہیں کسی چیز کے تجزیہ کیلیے بہک بہک کر مبہم اصولوں میں غوطہ زنی کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا سوویٹ روس سامراجی ریاست ہو سکتی ہے؟

کسی ریاست کی پالیسی خواہ وہ سیاسی، اقتصادی یا فوجی ہو اس ریاست کے چند بڑے افراد کے خلوص یا بدنیتی پر مبنی نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی بنیاد سماجی کیفیت اور داخلی ضروریات پر قایم ہوتی ہے۔ خارجی ضروریات ہی ایک ریاست کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں پر اقتدار حاصل کرے اس کو ملوکیت کہتے ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ملوکیت پرستی اور ملوکی ارادوں کے لیے ملک گیری بھی لازمی نہ رہی ہماری آنکھوں کے سامنے دنیا کی ایک بہت بڑی ملوکیت پرست ریاست موجود ہے۔ یعنی امریکہ لیکن اس نے کسی دوسرے ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ جدید ملوکیت کی بنیاد اب بجائے سیاست کے اقتصادیات پر قایم ہے۔ توپ بندوق یا زمانہ متوسط کی آہنی تلوار کی جگہ سونے کی زنجیروں نے لے لی ہے جن میں دوسرے ممالک کو جکڑا جاتا ہے۔ اس نظام میں ایک ڈکٹیٹر اپنی من مانی بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اس سرمایہ دار طبقہ کا نمایندہ ہے جو سونے کی زنجیروں کا مالک ہے۔ اس کو اسی طبقہ کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ اندرونِ طبقہ چاہے اختلاف رائے ہو۔ مثلاً ہٹلر وغیرہ کے ڈر سے تھائیسن جرمنی چھوڑ کر بھاگ جائے لیکن بیرونی پالیسی سرمایہ دارانہ رہتی ہے۔ اگر ایک فورڈ

کمپنی کا مالک ہو تو دوسرا بینک آف لندن کا حصہ دار، تیسرا اسکوڈا فیکٹری کا مالک ہے تو چوتھا باٹریا ٹاٹا کے کارخانوں کا ساجھے دار۔ جب ملک کا اقتصادی ارتقا نقطۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے اور اپنے ملک کے حدود میں اس کے فروغ کی تمام گنجائشیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ ملک دوسروں کی آزادی میں رخنہ اندازیاں شروع کرتا ہے۔ یہ فعل بھی اس ملک کی اقتصادی اور سماجی نوعیت پر مبنی ہے جس ملک میں سامان استعمال کے لیے نہیں بلکہ فائدہ کے لیے بنایا جائے گا وہ ضرور ایک نہ ایک روز دوسرے ملکوں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرے گا خواہ فوج سے خواہ روپیہ سے۔

جدید ملوکیت کی بنیاد روپے کی برآمد یا نکاسی پر ہے جب ملک کا سرمایہ دار طبقہ اپنے ملک میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا تو دوسرے ممالک میں روپیہ لگاتا ہے۔ روپیہ لگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بہت سارا روپیہ یا سونا جہازمیں بھر کر دوسرے ملک میں بھیجا جاتا بلکہ اس کے مختلف طریقے ہیں مثلاً قدر زائد کی برآمد بینکی اسکیمیں اور قرضہ وغیرہ چونکہ جدید ملوکیت سرمایہ داری ہی کا نتیجہ ہے اس لیے بے حد ترقی پذیر سرمایہ داری ریاستیں ہی ملوکی پالیسی اختیار کر سکتی ہیں۔

سویٹ اقتصادیات سرمایہ دارانہ نہیں ہیں۔ اس کی اقتصادیات کا ضروری اور اہم اصول پیداوار کے ذرائع (مثلاً فیکٹری، کانیں، زمین اور سرمایہ) کی ذاتی اور انفرادی ملکیت کا فقدان ہے یہ اشتراکیت کا سنگ بنیاد ہے۔ پیداوار کی انفرادی ملکیت ختم ہو جانے پر پیداوار اور اس کی تقسیم کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ نفع گیری کے بجائے استعمال اس کا فرض اولین خیال کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اشتراکی نظام میں بھی سرمایہ جمع ہوتا ہے اور جس کے جمع ہوئے بغیر صنعت وحرفت کی ترقی ہی ممکن نہیں ہے لیکن یہ جمع شدہ سرمایہ اجتماعی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے نفع گیری اور لوٹ کھسوٹ کا نہیں۔

کیا سویٹ روس کے لیے وسعت ملکی کی ضرورت ہے؟ یہ صحیح ہے کہ وہاں کی آبادی بہت ہے لیکن اس کے پاس زمین بھی کافی ہے۔ روس دنیا کا چھٹاں حصہ ہے اگر وہاں کی آبادی دس گنا بڑھ جائے تب بھی روس گنجان نہیں کہا جا سکتا اس کے علاوہ اور کوئی بھی سبب نہیں جو سویٹ کو ملک گیری کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ اس کے پاس اتنا فالتو سرمایہ بھی نہیں جو دوسرے ملکوں میں لگائے کیسی

پہلو سے بھی وہ قدیم یا جدید ملوکیت پرست نہیں کہا جا سکتا۔

اب آیئے دورِ حاضرہ کے چند واقعات پر نظر ڈالیں۔ اگر سوویٹ روس ملوکیت پسند نہیں ہے تو کیا وجہ ہے جو اس نے پولینڈ، فن لینڈ اور بیسا رابیہ پر حملہ کیا۔ اگر بین الاقوامی حالت سے ہٹ کر اس کی وجہ معلوم کی جائے تو ہم ناکامیاب رہیں گے۔ اس لیے ہمیں تاریخ دہرانا پڑے گی گزشتہ پندرہ سال سے سوویٹ روس امن قایم رکھنے کے لیے چلا رہا تھا مجلس اقوام میں کئی سال تک مسٹر لٹوینافٖ امن و امان کے لیے ہر امکانی کوشش کرتے رہے بار بار فاشی طاقتوں کی عیارانہ چالوں اور جارحانہ منصوبوں سے جمہوری ریاستوں کو متنبہ کرتے رہے متحدہ محاذ کے لیے سعی بلیغ کرتے رہے۔ فرانس سے جرمنی کے خلاف معاہدہ کیا۔ عالمگیر ہتھیار بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن جمہور پرستوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی۔ تمام نام نہاد جمہوری اور فاشی طاقتوں نے عالمگیر اسلحہ بندی میں تخفیف کے بجائے اضافہ کیا۔ مجلس اقوام کی کمیٹیاں بنیں اور ٹوٹ گئیں کیونکہ اسکوڈا فیکٹری کے جنگی اسلحہ خانہ میں انگریزی، امریکی اور فرانسیسی سرمایہ داروں کا ساجھا تھا۔ زیکو سلاواکیہ جرمنوں کے ہاتھ میں آجانے کے بعد بھی انگریزی بمباروں نے اسکوڈا پر بمباری نہیں کی کیونکہ ہٹلر نے انگریز سرمایہ داروں کو یقین دلایا تھا کہ ان کے حصوں کا نرخ بڑھا دیا جائے گا۔

اپنی قومی شان کو خطرہ میں ڈال کر بھی سوویٹ روس نے جنگ ٹالنے اور امن و امان قایم رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے جرمنی سے دب کر برسٹلٹوسک کی صلح منظور کر لی تھی۔ جاپانی عسکری حوصلوں کے آگے جھک کر جنگ رفع دفع کی تھی۔ یہ سب آخر کیوں؟ محض دنیا میں امن قایم رکھنے کے لیے اور ہر طرف گھرے ہوئے، فاشی اور نیم فاشی ریاستوں سے اپنے ملک کو بچانے کی خاطر انقلاب دشمن ملکوں کی توپوں کے دھانوں کے سامنے اس نے عالمگیر انقلاب کا خواب دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اپنے اس ملک کو بچانے کی ٹھان لی جہاں خون کی ندیاں بہہ کر ابھی ابھی دنیا کا ایک بہترین نظام قایم ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۳۹ء شروع ہوتے ہی اسے جنگ کا زبردست خطرہ محسوس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ

جنگ چھڑ گئی تو دنیا کی تمام سرمایہ دار اور فاشی طاقتیں مل کر سوویٹ یونین کو تباہ کرنے کی فکریں کریں گی اسے معلوم تھا کہ ۲ ستمبر ۱۹۳۹ء سے ایک ہفتہ قبل انگلستان کے وزیر داخلہ مسٹر ہڈسن نے جرمنی کو ایک کروڑ پونڈ قرض دینے کا وعدہ کیا تھا تاکہ وہ اپنی صنعتیں بڑھا سکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کثیر رقم سوویٹ روس پر حملہ کی تیاری کے لیے دی جا رہی تھی۔ سوویٹ کے لیڈر نہ تو پاگل تھے اور نہ جذباتی جبکہ دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بین الاقوامی اخلاق کو پاش پاش کر رہی تھیں۔ سوویٹ یونین کا محض جذباتی یا اصولی طور پر اس کا قایم رکھنا ایک بے معنی شئ تھی۔

اعتراض کیا جاتا ہے کہ روس و جرمن معاہدہ موجودہ جنگ کا پیش خیمہ تھا۔ اس نے جرمنی کی رسی دراز کر دی۔ جرمنی کو روس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اسے دو محاذوں پر جنگ نہیں کرنا پڑے گی چنانچہ اس نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور مجبوراً فرانس و انگلستان کو اعلان جنگ کرنا پڑا۔ روس و جرمن معاہدہ کے تدبر کا اگر ذکر کیا جائے تو ایک الگ مضمون کی ضرورت ہوگی۔ اس سے روس کو جو کچھ فائدہ ہوا وہ مختصراً یہ تھا۔ اوّل۔ روس کو اطمینان ہو گیا کہ سرمایہ داری طاقتیں اب متحد نہیں ہو سکتیں۔ دوم۔ ہٹلر کی کتاب "میری جدوجہد" کا وہ خواب کہ وہ یوکرین پر حملہ کرے گا اور دنیا کا کل سرمایہ دار طبقہ اس کی پشت پناہی پر موجود ہوگا شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ سوم متوسط یورپ کی ریاستیں ایک زمانہ کے لیے ہٹلر کی زد سے بچ گئیں۔ چہارم۔ انگلستان اور فرانس سے لڑ کر جرمنی کافی کمزور ہو جائے گا اور روس کو آسانی سے شکست نہ دے سکے گا۔ پنجم۔ روس کو موقعہ مل جائے گا کہ وہ جنگی تیاری کر کے جرمنی کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ ششم۔ روس اور اشتراکیت کے خلاف جرمنی کا آٹھ سال کا پروپیگنڈا ختم ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے اسٹالن کی اس بصیرت افروز پالیسی پر دھیان نہ بھی دیں اور روس و جرمن معاہدہ ہی کو موجودہ جنگ کی جڑ سمجھیں پھر بھی سوویٹ روس حق بجانب نظر آئے گا۔ یہ پولینڈ کے تصفیہ سے ثابت ہوگا۔

جب ہٹلر اور فاشی طاقتوں کی دھمکیاں محض دھمکیاں نہ رہیں بلکہ ان پر عمل بھی شروع ہو گیا اور زیکوسلاواکیہ کی بربادی کا نقشہ سپرد تحریر کیا تو ۱۹۳۹ء

۱۰ / ۳ ۔ ۱ منہ جلد ۱۰ آرٹ ۱۰۰ /۱۰۰

شروع ہوتے ہی روسیوں کے سامنے جرمنوں کے جارحانہ منصوبے سوالیہ جملہ بن کر کھڑے ہو گئے ہٹلر جمہوری طاقتوں کا اس قدر دشمن نہ تھا جس قدر سوویٹ روس کا۔ وہ آپ کو اشتراکیت کا دشمن کہکر فخر کرتا تھا۔ بقول اس کے کمیونسٹ تہذیب و تمدن کی ذلیل تلچھٹ ہیں۔ جرمنی میں اس نے اشتراکیوں کی طاقت توڑ دی۔ انہیں ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتارا۔ مزدوروں کی انجمنیں اپنے سیاہ وردی والے غنڈوں سے برباد کرائیں۔ فرانکو کی حمایت میں اسپین میں جمہوریت پسند عوام پر گولے برسائے۔ رائسٹاغ کی آتشزدگی پر ہزاروں کمیونسٹوں کو گولی سے اڑا دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رائسٹاغ میں خود ہٹلر نے آگ لگوائی تھی تاکہ وہ اس بہانے سے کمیونسٹوں کا صفایا بول دے۔ دنیا جانتی ہے کہ اشتراکیت کا سب سے بڑا دشمن فاشی نظام ہے۔ روس خاموش نہ تھا۔ دنیا کی الٹ پلٹ دیکھ کر اسے خوشی نہ ہوتی تھی وہ جانتا تھا کہ ہٹلر کے کیا منصوبے ہیں اور محوری ریاستیں کس طرح اس کے چاروں طرف جال پھیلا رہی ہیں۔ اسپین میں انگلستان، فرانس اور امریکہ کی عدم مداخلت اور میونک معاہدہ اس کا بین ثبوت تھا کہ سرمایہ داری طاقتوں میں ملی بھگت تھی۔ ادھر ہٹلر نے پولینڈ سے مطالبات شروع کر دیے۔ انگلستان اور فرانس کی جمہوری ریاستیں اس کے لیے بھی تیار تھیں فرانس کی حکومت نے ایک "یلو" کتاب شائع کی ہے جس میں جنگ سے قبل فرانس و جرمنی کی سرکاری خط و کتابت اور دیگر اہم مسودات شائع کر دیے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فرانسیسی حکومت پولینڈ کے معاملہ میں دب کر سمجھوتہ کرنے پر تیار تھی۔

انگلستان کی حکومت کا رویہ ظاہر تھا۔ پولینڈ کو اس کے تحفظ کی ضمانت دے چکنے کے بعد بھی پس پردہ جرمنی سے سمجھوتہ کی سانٹھ گانٹھ ہو رہی تھی۔ یہ روس اور انگلستان کی گفت و شنید سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ جب انگلستان کے جمہوری اور فاشی دشمن عوام نے دیکھ لیا کہ ان کی حکومت فاشی طاقتوں سے میل جول رکھنا چاہتی ہے تو انہوں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کھلے بندوں حکومت کو برا کہنا شروع کیا۔ مزدوروں کے جلسے اور لیبر پارٹی کی کانفرنسیں ہوئیں اور گورنمنٹ متنبہ کیا گیا کہ اگر اس نے پولینڈ کے معاملہ میں غفلت سے کام لیا اور جرمنی کے ارادوں کے آگے

سر جھکا دیا تو مین الاقوامی جمہوریت خاک میں مل جائے گی۔ پارلیمان کا چنا رجی ہونے والا تھا۔ حکومتی
حلقوں میں سنسنی پھیل گئی اور انھوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ پولینڈ کے تحفظ کا ضامن انگلستان بنتا ہے۔ روس
نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا لیکن انگلستان کے آیندہ عمل پر عمیق نگاہیں جمائے رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عوام
کی رائے سے مجبور ہو کر حکومت نے پولینڈ کو ضمانت دے دی ہے لیکن اس ضمانت میں اخلاص نظر نہیں
آتا۔ انگریزی حکومت نے روس کو جانچنے کی غرض سے گفت و شنید شروع کی اور یہ تجویز پیش کی کہ پولینڈ
کے تحفظ کے لیے روس کی امداد طلب کی جائے۔ نہ صرف روس بلکہ ہر شخص جانتا ہے کہ پولینڈ میں اگر کوئی جنگی
کمک پہنچا سکتا تھا تو وہ روس تھا کیونکہ اس کی سرحد پولینڈ سے ملی ہوئی ہے۔ انگریزی فوجیں تبھی اتر سکتی
تھیں۔ اس سلسلے میں پارلیمان میں ایک دلچسپ قصہ پیش آیا جس وقت وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین نے رائے عامہ
سے مجبور ہو کر یہ اعلان کیا کہ انگریزی حکومت پولینڈ کو اس کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے تو مسٹر لائڈ جارج
نے کھڑے ہو کر پوچھا "ضمانت دینے وقت کیا جنگی کمانڈروں سے پوچھ لیا گیا تھا آیا انگلستان پولینڈ
میں کمک پہنچا سکتا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے اور کمانڈروں نے بھی حامی بھری ہے
تو ایسے کمانڈروں کو فوراً نکال دینا چاہیے۔ پولینڈ انگلستان سے قریب قریب ایک ہزار میل دور ہے
بیچ میں سمندر اور کئی ریاستیں ہیں۔ خاص کر جرمنی اس کا دروازہ روکے کھڑا ہے۔ بالٹک سمندر سے
کمک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ جرمنی آبدوز کشتیوں کے ذریعہ تمام جہاز ڈبو سکتا ہے۔ سوویٹ روس پولینڈ کا
ہمسایہ ہے اس کے جہاز بھی بالٹک سمندر میں موجود تھے۔ اس کی فوج بھی چند گھنٹوں کی اطلاع پر پولینڈ
میں داخل ہو سکتی ہے اس کے ہوائی جہاز وارسا کے اڈوں سے اڑ کر برلن پر بمباری کر سکتے تھے
چنانچہ روس کی امداد کے بغیر پولینڈ کو ضمانت دے دینا حماقت تھی۔ پھر بھی روس نے دوستی کا ہاتھ
آگے بڑھایا۔ اس نے انگلستان اور فرانس سے کہا کہ وہ پولینڈ کے تحفظ کی [illegible] کاغذی ضمانت نہیں
دیکھنا چاہتا اس پر عمل ہونا چاہیے۔ انگریزی مشن ماسکو بھیجنے اور گفت و شنید کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا
لیکن یہ مشن کئی ماہ کے بعد سمندر کے راستے سست رفتاری کی سرگردگی میں پہنچا۔ انگریزی حکومت اب
بھی پس و پیش کر رہی تھی اور کمیونسٹ حکومت کے ساتھ معاہدہ کرتے ہوئے گھبرا رہی تھی چنانچہ

فوج کے ایک معمولی افسر مسٹر اسٹرنگ بھیجے گئے جو نہ تو عوام کے نمایندہ تھے اور نہ ان کو اتنے اختیارات تھے کہ وہ معاہدہ کر سکتے۔ قریب تین ماہ تک ماسکو میں گفت و شنید ہوتی رہی لیکن کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ تمام دنیا کی آنکھیں اس کانفرنس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ ان کے استعجاب اور افسوس کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھیں معلوم ہوا کہ انگلستان معاہدہ کی راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ ماسکو کی کانفرنس برخاست ہو گئی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ سویٹ روس کا کہنا یہ تھا کہ پولینڈ پر حملہ ہونے کی صورت میں صرف وہی کمک پہنچا سکتا ہے چنانچہ روسی فوجوں کو پولینڈ میں داخل ہونے کی اجازت ملنی چاہیے انگلستان اور اس کے بل بوتے پر پولینڈ کہتا تھا کہ روسی فوجیں پولینڈ میں نہ داخل ہوں۔ معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر کسی ملک پر حملہ ہو تو ہمسایہ جب تک اپنی فوجیں اس ملک میں نہ لائے وہ کیونکر مدد کر سکتا ہے۔ لڑائی ریڈیو یا برقی پیغامات سے تو نہیں لڑی جاتی۔ دوسرے یہ کہ سویٹ روس کا مطالبہ تھا کہ پولینڈ کے ساتھ ہی ساتھ تمام بالٹک ریاستوں کی ضمانت دے دی جائے کیونکہ اسے خطرہ تھا ممکن ہے کہ جرمنی لٹویا استونیا یا لتھوانیا سے ہو کر روس پر حملہ کرے۔ ایسی حالت میں اپنی سرحد مضبوط کر لینا سیاسی عقلمندی ہے۔ روس یہ تمام مطالبات جرمنی کے خلاف طلب کر رہا تھا پھر بھی انگریزی حکومت نے انھیں ٹھکرا دیا۔ لندن ٹائمز کے فوجی نامہ نگار نے اسی زمانہ میں لکھا کہ اگر پولینڈ کو بچانا ہے تو روس کی تمام شرطیں منظور کر لینی چاہئیں لیکن انگریزی سیاستداں پھر بھی نہیں مانتے تھے۔ ماسکو کی کانفرنس ختم کر دی گئی۔ روس کو اب زبردست خطرہ محسوس ہونے لگا۔ پولینڈ کے ذریعہ کسی وقت بھی اس پر حملہ ہو سکتا تھا۔ ہٹلر کے منصوبے اظہر من الشمس ہیں کیا سویٹ اس وقت بھی خاموش رہتا یہاں تک کہ جرمنی اس پر حملہ کر دیتا۔ اور تمام جمہوری ریاستیں بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کا ساتھ دیتیں؛ چنانچہ سویٹ روس نے اس وقت جو کچھ کیا اپنے بچاؤ کے لیے کیا۔ اس روشنی میں دیکھنے کے بعد روس و جرمن معاہدہ ایک سیاسی تدبر نظر آئے گا۔ کچھ دن کے لیے جرمنی کا حملہ رک گیا۔ اس دوران میں روس نے جنگی تیاری شروع کر دی۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ دو ہفتہ کے اندر پولی حکومت کے پیر اکھڑ گئے حکومت

معہ سیاست دانوں کے کہیں بھاگ گئی۔ ہر طرف ابتری اور بے سروسامانی پھیل گئی۔ اس کے شہر اس بری طرح برباد کیے گئے کہ ان کا نشان تک باقی نہ رہا۔ صرف نام رہ گیا۔ دنیا پوچھ رہی تھی کہ انگلستان کی ضمانت کہاں گئی؟ لوگوں کو اب معلوم ہوا کہ سویٹ روس کی امداد کس قدر ضروری تھی۔ پولینڈ کی حکومت کے بھاگتے ہی تمام ملک درہم برہم ہو گیا۔ سویٹ روس کب برداشت کر سکتا تھا کہ کل کا کل ملک جرمنوں کے ہاتھ آئے۔ وہاں کے کارخانے جرمنی کے لیے اسلحہ بنائیں اور اس کا غلہ جرمن فوجوں میں بانٹا جائے۔ چنانچہ بدلتے ہوئے زمانے اور فاشی طاقتوں کے خطرناک عروج سے ڈر کر سویٹ نے اپنی فوجیں پولینڈ میں بھیج دیں۔ جرمنی سویٹ سے قبل از وقت نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دونوں نے مل کر آدھا آدھا پولینڈ تقسیم کر لیا۔ پولینڈ کی تقسیم پر دنیا کے نام نہاد بلند اخلاقوں کے حلقہ میں کھلبلی پڑ گئی۔ ہر طرف سے روس کو گالیاں دی جانے لگیں۔ اس کو بھی جرمنی کا ساجھے دار اور ایشیائی بھیڑیا کہہ کر پکارا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ پولینڈ کی خبریں تمام دنیا میں پہنچیں۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ جس حصہ پر نازیوں نے قبضہ کر لیا ہے وہاں سوا ہی کے ڈھیر اور تباہی کے کچھ باقی نہیں لیکن روسی فوج کا پولینڈ کے مزدوروں اور کسانوں نے استقبال کیا۔ روسی نظام اس حصہ میں بھی قایم کر دیا گیا۔ ہر کسان کو ایک گائے اور چند ایکڑ زمین مل گئی۔

پولینڈ کے واقعات پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ بدقسمتی سے وہ جرمن خطرہ کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ اور روس سے دوستانہ تعلقات رکھنے کا روادار نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمگیر سرمایہ داری روس کے خلاف تھی۔ ۱۹۳۴ء سے ایک سرمایہ دار حکومت جرمنوں کو مشتعل کر رہی تھی کہ وہ روس پر حملہ کریں۔ لوکارنو کا معاہدہ روس کے خلاف کیا گیا تھا۔ وارسائی کی صلح کے تمام دفعات ایک ایک کر کے جرمنی نے نہیں بلکہ انگلستان، فرانس اور امریکہ نے پاش پاش کیے تھے۔ اس صلح کی ایک دفعہ کے بموجب جرمنی جنگی جہاز نہیں بنا سکتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں مسٹر بالڈون نے جرمنی سے ایک بحری معاہدہ کیا اور اسے اجازت دے دی کہ وہ انگریزی بحری طاقت کا ۳۵ فیصدی بنا سکتا ہے۔ فاشی جرمنی میں صنعت و حرفت بڑھانے کے لیے امریکہ اور دوسری طاقتوں نے اسے قرض دیا۔ جنگی قرض جرمنی

پرسے معاف کر دیا گیا۔ ہٹلر سے پہلے نہیں بلکہ اس کے اقتدار میں آنے کے بعد کوششیں ہو رہی تھیں کہ جرمنی کو انقلاب سے بچایا جائے اور فاشزم کو فروغ دے کر سویٹ روس کے مدمقابل کھڑا کر دیا جائے۔ میونک کے معاہدہ میں زیکوسلاواکیہ کو ذبح کر دیا گیا۔ روس سب کچھ دیکھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ پولینڈ کے تحفظ کی ضمانت بیکار رہے۔ پولینڈ پر حملہ اور اس کی شکست کے بعد ایک نئے میونک کی تیاری ہو رہی تھی۔ پولینڈ پہنچ کر فاشی فوراً سویٹ روس پر حملہ کر دیتی۔ ہٹلر وعدہ توڑنے میں ماہر ہے۔ روس جرمن معاہدہ بھی پھاڑ کر پھینک دیا جاتا۔ اگر مغربی جمہوری حکومتیں آسٹریا، زیکوسلاواکیہ اور پولینڈ کی تباہی کے بعد خاموش رہ سکتی تھیں تو سویٹ پر حملہ کے وقت ان کا رویہ ظاہر تھا۔

لیکن کیا پولینڈ پر روسی حملہ فی الواقع کوئی حملہ تھا؟ کہا جاتا ہے کہ پولینڈ ایک جمہوری ریاست تھی لیکن یہ غلط ہے۔ پولینڈ میں نہ جمہوریت تھی اور نہ قومی حکومت۔ ۔ ۵ فی صدی باشندے غیر پولینڈ کے تھے یعنی یوکرینی اور سفید روسی۔ بیس سال سے پولینڈ کی اقلیتوں کے ساتھ حکومت کا جو سلوک تھا وہ ہندوستان میں اچھوتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پولینڈ کا ملک وارسائی کی صلح کے بعد بنا ہے۔ اس کو ایک علیحدہ ملک بنانے کا راز قدیم آسٹرین ملوکیت کو توڑنا مقصود تھا اور بالشویزم اور مغربی حکومتوں کے درمیان ایک حد فاصل قایم کرنا مطلوب تھی۔ علیحدہ ملک بنتے ہی غیر پولی باشندوں میں ایک زبردست قومی تحریک شروع ہو گئی جس کا منشا پولینڈ سے علیحدگی اختیار کرنا اور سویٹ روس میں ضم ہو جانا تھا۔ ان کی یہ تمنا تھی بھی فطری کیونکہ نسلی اور تاریخی لحاظ سے یوکرین اور سفید روس سویٹ کی اولاد تھے۔ سویٹ روس میں رہنے والے ہم قوم یوکرینی وغیرہ کی خوش حالی نے اور بھی تازیانہ کا کام کیا اور وہ سویٹ میں ضم ہو جانے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اس کے باوجود سویٹ حکومت نے پولینڈ حکومت سے کوئی مطالبہ نہیں کیا اور نہ یوکرینیوں اور سفید روسیوں کے علاقے واپس کرنے کو کہا۔

جس وقت نازی فوج پولینڈ میں داخل ہونے لگی اور سویٹ کو خطرہ محسوس ہوا کہ پولینڈ فتح کر لینے کے بعد جرمنی اس پر بھی حملہ کر بیٹھے گا تو اس نے جنگی اور سرحدی تحفظات کی غرض سے سویٹ فوج پولینڈ میں بھیج دی جس نے نہ صرف سفید روسیوں اور یوکرینیوں کو آزاد کرایا بلکہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے

دھارے کو روک دیا چنانچہ پوئنٹ پر روس کا حملہ صرف اپنے بچاؤ اور سفید روسیوں اور یوکرینیوں کے آزاد کرانے کے لیے کیا گیا تھا۔

آیئے اب ذرا فن لینڈ کے قضیہ پر نگاہ ڈالیں۔ لٹویا، اسٹونیا اور لتھوانیا نے تو روس سے معاہدہ کر لیا اور اس نے انھیں تحفظ کی ضمانت بھی دیدی تھی لیکن فنلینڈ کسی سمجھوتہ کے لیے تیار نہ تھا یورپ کی جنگ شروع ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے لیکن کہیں بھی فوجی لڑائی اور نبرد آزمائی شروع نہ ہوئی تھی۔ سویٹ کو نہ صرف جرمنی سے خطرہ تھا بلکہ مغربی جمہوری ریاستیں بھی اس کے خلاف تھیں۔ سرمایہ داروں میں مصالحت کی گفت و شنید ہو رہی تھی۔ مغربی محاذ پر جنگ بند کرکے ایک دوسرا محاذ قایم کرنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں فنلینڈ کے ذریعہ روس پر حملہ ہو سکتا تھا۔ مغربی ممالک بآسانی سوئیڈن کے راستہ فنلینڈ اپنی فوجیں بھیج سکتے تھے۔ انگریزی جہازی اڈا بھی پٹسامو میں بن چکا تھا۔ بین الاقوامی سیاست کا عجیب حال تھا۔ جنگ تو انگلستان، فرانس اور جرمنی کے درمیان تھی لیکن سویٹ کے چاروں طرف جال پھیلایا جا رہا تھا۔ انگلستان کا دشمن تو جرمنی تھا پھر کیا وجہ تھی کہ مغربی محاذ پر دشمن سے نبرد آزمائی کے بجائے پٹسامو میں انگریزی جہازی اڈا بنایا گیا؟

فنلینڈ ایک غیر زرخیز اور غریب ملک ہے۔ وہاں کی پیداوار وہاں کے باشندوں کے لیے بھی کافی نہیں لیکن ایک سال سے فنلینڈ کی حکومت اسلحہ بندی کر رہی تھی۔ قلعے بنائے جا رہے تھے۔ فوجیں تیار ہو رہی تھیں اور جدید ہتھیاروں کی مشق ہو رہی تھی۔ آخر یہ تیاری کس کے خلاف تھی؟ سویٹ روس ہی فنلینڈ پر حملہ کر سکتا تھا لیکن وہ اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکا تھا فوجی تیاریوں کی نوعیت بھی بچاؤ کی سی نہیں بلکہ حملہ کی سی تھی چنانچہ جب سویٹ روس نے فنلینڈ سے معاہدہ کے لیے گفت و شنید شروع کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر فنلینڈ سویٹ کی تجاویز منظور کر لیتا تو اسے اپنی آزادی سے دست بردار ہونا پڑتا لیکن یہ غلط ہے سویٹ روس کا مطالبہ تھا کہ فنلینڈ پٹسامو کے اردگرد کا بنجر علاقہ اسے دیدے جس کے معاوضہ میں وہ اس قطعہ زمین کا تین گنا حصہ دینے کو تیار تھا۔ کیا اسی کو آزادی پر ڈاکہ ڈالنا کہتے ہیں؟ پٹسامو کا محل وقوع نہایت مناسب تھا۔ وہاں سے روس پر بآسانی حملہ ہو سکتا ہے اور

دوسرے ممالک کی فوجیں بغیر خطرے کے وہاں آسکتی ہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ روس اور فنلینڈ کی جنگ میں مغربی جمہوری ریاستوں نے نہیں اپنی فوجیں اتاری تھیں ۱۹۲۰ء میں بھی روس کے خلاف اتحادیوں کی مداخلت یہیں سے شروع ہوئی تھی جرمنی کا جنرل وونڈرراف کہتا تھا۔ "فنلینڈ روس کا قفل ہے۔ اگر مجھے اس کی کنجی مل جائے تو میں روس کا دروازہ کھول سکتا ہوں" سویٹ حکومت کا فرض تھا کہ وہ اس کنجی کو دشمن کے پاس نہ جانے دے لیکن فنلینڈ یہ کنجی فاشی طاقتوں کے ہاتھ بیچنے کو تیار تھا جب تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں تو سویٹ نے فنلینڈ پر حملہ کیا

سویٹ کے مطالبات کیا تھے؟ پٹسامو کے بندرگاہ کے علاوہ وہ لینن گراڈ کے قریب کا علاقہ جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار مربع میل تھا طلب کر رہا تھا اور اس کے معاوضہ میں وہ اس کا بیس گنا زرخیز علاقہ جھیل لڈوکا کے پاس دینے کو تیار تھا۔ اس کے علاوہ روس چاہتا تھا کہ فنلینڈ تیس سال کے لیے جزیرہ ہینگو اس کے ہاتھ میں دیدے اور جزیرۂ آلینڈ سے اپنی فوجیں ہٹالے۔ نقشہ کے دیکھنے سے معلوم ہوجائے گا کہ یہ علاقے فنلینڈ کے لیے بالکل بیکار ہیں لیکن اگر یہاں دشمن کا قبضہ ہوگیا اور جس کی امید بھی تھی، اور کرونسٹاٹ کے بندرگاہ پر آبدوز جہازی اڈا بن گیا تو روس کے جنگی اور تجارتی جہاز بالٹک میں نہیں آسکتے۔ ان کو بہت آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ جزیرہ آلینڈ آبنائے فنلینڈ کا دروازہ ہے اور لینن گراڈ سے بہت نزدیک۔ آج کل کی بڑی توپیں کرونسٹاٹ سے لینن گراڈ پر بمباری کرسکتی ہیں۔ ۱۹۱۷ء میں جب یہ جزیرہ فنلینڈ کے ہاتھ آیا تو مجلس اقوام نے یہاں فوج رکھنا اور جنگی قلعے بنانا ممنوع قرار دیدیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں فنلینڈ نے یہاں قلعہ بندی شروع کردی۔ سویٹ نے اس کی مخالفت کی لیکن بے سود فنلینڈ مجلس اقوام کے فیصلہ کو کالعدم کرنے پر تلا ہوا تھا اور مجلس اقوام خاموش تھی۔ مغربی جمہوری ریاستیں بھی چشم پوشی کر رہی تھیں۔ سویٹ اس کو حملہ کا پیش خیمہ سمجھتا تھا وہ کب تک خاموش رہتا۔ اس پر حملہ کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں چنانچہ اسے مجبوراً اپنے تحفظ کے لیے اس حملہ کا تدارک کرنا پڑا۔

روس و فنلینڈ گفت وشنید کی داستان بھی لطف سے خالی نہیں۔ فنلینڈ ایک آزاد ریاست تھی اور اسے پورا پورا اختیار تھا کہ وہ جس سے چاہے معاہدہ کرے لیکن گفت وشنید کی لمبی داستان اس کا

بین ثبوت ہو کہ فنلینڈ کے ارادوں اور خواہشات پر دوسروں کا قبضہ تھا۔ بہت کچھ لیت و لعل کے بعد فنلینڈ کا سیاسی وفد ماسکو پہنچا۔ سویٹ حکومت نے بعض تجاویز پیش کیں لیکن بجائے ماسکو میں غور کرنے کے وفد فنلینڈ کے دارالخلافہ ہلسنکی واپس گیا تاکہ وہاں معتمدین ریاست سے مشورہ کرے۔ ماسکو اور ہلسنکی کے درمیان زیادہ فاصلہ بھی نہیں۔ پھر لاسلکی اور تار کی رسل و رسائل بھی موجود تھی۔ ہوائی جہاز ۲۴ گھنٹے میں ہلسنکی جاکر واپس بھی آسکتا تھا لیکن فنلینڈ کا وفد ریل سے سفر کرتا اور اپنے دارالخلافہ سے کئی کئی روز بعد واپس آتا کم از کم چھ بار اس وفد نے ہلسنکی کا چکر لگایا اور کئی مہینے روس کو گفت و شنید میں الجھائے رکھا۔ وفد کے اس قدر دیر میں آنے کا ایک یہی سبب معلوم ہوتا ہو کہ فنلینڈ کی حکومت روسی تجاویز سننے کے بعد کسی اور حکومت کو مطلع کرتی ہوگی اور جب تک وہاں سے مشورہ نہ مل جائے اپنے وفد کو روکے رکھتی ہوگی۔ یہ تیسری طاقت کون تھی؟ جب یہ وفد آخری جوابات کا وعدہ کرکے آخری بار ہلسنکی پہنچا تو حکومت بدل چکی تھی اور گفت و شنید کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس نئی حکومت کا وزیر اعظم مسٹر ریٹی تھا جو اخبار لنڈن ٹائمز کے قول کے بموجب لندن کے بینک کا ایک ڈائرکٹر تھا اور جس کی خدمات کے صلہ میں انگریزی حکومت نے اسے "کے سی وی او" کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ایک طویل قصہ کی کڑی ہیں۔ ان کو ملایا جائے تو کل راز عیاں ہو جاتا ہو۔ اخبارات کی سرخیوں کو پڑھنے والے پروپیگنڈے کے دھوکے میں آجاتے ہیں اور ان کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ مسٹر ریٹی کا حکومت میں آنا اس بات کا ثبوت تھا کہ روس و فنلینڈ کی گفت و شنید منقطع کرانے میں ایک تیسری طاقت کا ہاتھ تھا۔ اس تیسری طاقت نے غریب فنی عوام کو ایک ایسے مضبوط ہمسایہ سے لڑا دیا جسکا دل غریب کی آہ و زاری پر بھر آتا تھا اور جو غریب کسانوں اور مزدوروں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ ہو روس فنلینڈ کا سیاسی پس منظر چونکہ فنلینڈ کے لوگ دوسرے کے بھڑکانے میں آگئے اور حماقت کر بیٹھے اس لیے دنیا کے تمام سویٹ دشمنوں نے فنی سپاہیوں کی شجاعت کے گیت گانا شروع کر دیے۔ روسی فوجوں کو ناکارہ اور غیر تربیت یافتہ بتلایا جاتا تھا لیکن اصل واقعات اس کے بالکل خلاف ہیں۔ جو لوگ فنی فوج کے کارناموں پر سر دھنتے تھے۔ یہ نہیں غور کرتے کہ فنلینڈ نے روس کا مقابلہ کس طرح کیا؟ موجودہ جنگ میں

روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے۔ اخبارات کے ذریعہ یہی خبریں مشہور کی جاتی تھیں کہ فنی فوج جدید ترین اسلحات سے مسلح ہے اور اس کی سرحد پر زبردست قلعے بنائے گئے ہیں۔ میز ہیم لائن کا مقابلہ میژنو لائن سے کیا جاتا تھا دنیا جانتی ہے کہ جب فرانس نے میژنو لائن بنائی تھی تو فرانس کا دیوالہ نکل گیا تھا فنلینڈ جیسے غریب اور مفلوک حال ملک کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ اس نے میز ہیم لائن بنائی، فوجوں کو جدید ترین اسلحہ سے مسلح کیا اور ہوائی طاقت بھی قایم کر لی۔ اس نے کسی ملک سے قرض بھی نہیں لیا معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ کسی تیسری طاقت نے خفیہ طور پر مدد پہنچائی فنلینڈ غریب تھا لیکن بین الاقوامی سرمایہ داری تو اس کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ روس فنلینڈ کے اتنے دن تک نبرد آزما ہی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ روس غریب فنی عوام کو کھیرے کی طرح کاٹنا بھی نہ چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ چند چوٹیں کھانے کے بعد فنلینڈ صلح کرے گا لیکن اس کا خیال غلط نکلا فنلینڈ دوسروں کے لیے لڑ رہا تھا۔ اس کی سرزمین پر انقلاب اور ردِ انقلاب کی طاقتوں کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ روس نے محض چند دستے فنی محاذ پر بھیجے جو جدید ترین اسلحات سے مسلح بھی نہ تھے۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ فنلینڈ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھا اور نئے قلعے بنا رہا تھا کئی ماہ تک لڑائی ہوتی رہی لیکن جب روس کو معلوم ہو گیا کہ بین الاقوامی سرمایہ فنلینڈ کو جنگی محاذ بنانا چاہتا ہے جب اسے معلوم ہوا کہ انگریزی جہازی بیڑہ پٹسامو پہنچ گیا۔ فرانس کی پچاس ہزار فوج فنلینڈ کی امداد کے لیے روانہ ہو گئی اور امریکہ سے رسد پہنچنے لگی تو اس نے اپنی اصلی مسلح فوج بھیجی جس نے ایک ہفتہ کے اندر آدھے سے زیادہ فنلینڈ پر قبضہ کر لیا۔ فنلینڈ اب خواب سے چونکا اور سویٹ سے صلح کر لی۔ سویٹ نے یہاں بھی اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا۔ اول اسے اختیار تھا کہ صلح منظور ہی نہ کرتا اور تمام ملک فتح کر لیتا اور دوم یہ کہ صلح کی شرائط سخت ترین رکھتا لیکن سویٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے جس قدر ملک جنگ کے دوران میں حاصل کر لیا تھا سب کا سب واپس کر دیا اور صرف پٹسامو، جزیرہ ہینگو اور آلینڈ اور کرونسٹاٹ کے قریب تھوڑے سے علاقہ ہی پر اکتفا کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ روس کے ارادے قطعاً ملوکی نہ تھے وہ صرف اپنا تحفظ چاہتا تھا۔

(باقی آئندہ)

علی امام ایم اے

اشتراکیت اور خود مختاریتؔ

اس میں شک نہیں کہ اسؔ جنگ نے بنی نوعِ انسان میں ایک بحران اور خطرناک صورت پیدا کردی ہے اور جمہور کی تکالیف اور مصائب میں خاص اضافہ کیا ہے۔ اس لڑائی کا رجعت پسندانہ امتیازی اثر دنیا کے تمام بورژوا طبقہ (سرمایہ داروں) پر یہ ہوا ہے کہ ان کے غارت گری اور سفاکی کے باطل عقیدے کا جو نام نہاد قومیت اور وطنیت کے ڈھونگ میں چھپا ہوا تھا بُرا حشر ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ تمام انقلاب زری و ملکی اور جمہور کے خیالات میں عام بیداری اور عام بےچینی پیدا ہونے سے ظہور میں آیا اور اس انقلاب کی اساس خیالات کی وہی عام بیداری ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان خیالات میں وسعت اور گہرائی پیدا کریں اور ان خیالات کو ایک شکل دیں۔ اس فرض کا صحیح اظہار اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم نعروں اور شدید مظاہروں سے عام دلوں میں جوشِ عمل اور جوشِ انقلاب پیدا کریں اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس خسروانہ یا بورژوانہ جنگ کو عام جمہوری لڑائی میں تبدیل کریں اور اپنے اصولی جد وجہد کو جو دورانِ جنگ میں انجام دیں اور ہمارے تمام جمہوری مظاہرے ہماری رہبری اسی خاص سمت میں کریں جہاں سے ہم ایک انقلاب پیدا کر سکیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس عالمگیر جنگ میں جو دنیا کی بڑی اور عظیم قوموں کے درمیان جاری ہے وہ کون سی انقلابی تحریک ہے جو دبی ہوئی آگ کی مانند بھڑک اٹھے گی۔ اس انقلاب کا حشر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے بغیر کسی گھبراہٹ اور جھجک کے اولوالعزمی اور علوِ ہمتی کے ساتھ جد وجہد میں مصروف

ؔ انقلاب روس کی سب سے بڑی شخصیت اور روس کے معمارِ اعظم لینن کی ایک مشہور تصنیف Socialism and War ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ مضمون اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ اس کا انگریزی نام Socialism & Self Determination ہے اور یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔ (مترجم)

عہ یعنی گزشتہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء-۱۸ء۔

ہوجائیں جو ایک خاص نظام کے ماتحت انجام دی جائے۔

باتل کے نظریے کا اعلان ہمارے ذہن کو فوراً انقلاب پیرس کی طرف منتقل کرتا ہو یعنی حکومتی جنگ کو عام جمہوری جنگ میں تبدیل کرنا۔ نصف صدی پہلے پرولتاری طبقے (مزدور طبقہ) کی حالت عام طور پر نہایت پست اور زبون تھی۔ اور اس وقت تک اشتراکی انقلاب کو کامیاب اور بروئے کار لانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ باہمی اتحاد اور باہمی یگانگت بھی پیدا نہیں ہوئی تھی جو انقلابی قوت کو فروغ بخشتی اور یہ ایک طے شدہ امر ہو کہ پیرس میں کام کرنے والے مزدوروں کے ذہن و دماغ میں قومیت کے جذبے کو نفوذ کر کے ان کے خیالات و جذبات کو گرما دیا گیا تھا اور اس طرح سے قومیت کے فکری تصورات (روایات ۱۷۹۲ء) کے حسین جال میں اس جماعت کو محصور کر لیا گیا تھا اور یہی وہ قابل نفرین اور حقارت آمیز جذبہ ہو جس سے کم ظرف اور چال باز بورژوا طبقہ نے مزدوروں کی جماعت کو مسخر کر لیا تھا اس کمزوری یا حقیقت کا انکشاف مارکس کے زمانے میں ہوا۔ پیرس کے انقلابیوں نے ان لوگوں کو جنھوں نے خود ان کی سرگرمیوں اور کوششوں کو ختم کرنا چاہا تھا۔ انقلاب کے رفع ہونے پر معاف کر دیا تھا لیکن موجودہ دور کے ایک اشتراکی کے لیے یہ ناممکنات میں سے ہو کہ وہ ان شخصیتوں کو زندہ چھوڑ دے جو انقلابی سرگرمیوں کی خفیہ یا علانیہ کاٹ کرنا چاہیں ہم انھیں ہرگز معاف نہیں کر سکتے ہیں۔

خندقوں میں بھائی چارے کی مثال | ہر محارب ملک کے بورژوا طبقے (سرمایہ دار طبقہ) کے اخبارات نے مختلف مثالیں بطور اقتباس و استناد دوسرے محاربی ملکوں کے سپاہیوں کے بھائی چارہ کے متعلق پیش کی ہیں کہ وہ خندقوں میں کام کرتے وقت بھی بھائی چارے کی عمدہ مثالیں قایم کرتے ہیں۔ انگلستان اور جرمنی کے محاربی اور عسکری عہدیداروں نے اس بھائی چارے کے خلاف سخت اور شدید احکامات صادر کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ حکومت اور بورژوا طبقہ اس اتحاد باہمی کو کس قدر اہمیت دیتا ہو۔ اس وقت جبکہ مصلحت پرستی اور موقع شناسی مغربی یورپ میں عمرانی اور جمہور پسند پارٹی کے لیڈروں میں سرایت کر چکی ہو اور جبکہ معاشرتی وطن پرستی کی تائید و حمایت تمام معاشرتی اور جمہوری پریس کر رہے ہیں اور پرولتاریوں (مزدوروں) کے دوسری بین الاقوامی

مجلس کی ظاہری ہیئت اس سے متاثر معلوم ہو رہی ہو اس قسم کے بجائے جائے اور اتحاد باہمی کا امکان ہو اگر اس سلسلے میں منظم طور پر کام کیا گیا اور خصوصاً ان تمام انتہا پسند اشتراکیوں کی طرف سے جو دوسرے محاربی ملکوں میں بستے ہیں تو ہم کس قدر جلد اس ریاکارانہ، رجعت پسندانہ اور غلامانہ لڑائی کو ختم کر کے ایک بین الاقوامی انقلابی تحریک کو جنم دے سکیں گے۔

غیر آئینی جماعتوں کی اہمیت | دوسرے مصلحت پرستوں کی طرح تقریباً دنیا کے تمام ممتاز اور نمایاں نراجیوں نے عمرانی وطن پرستی کے جذبہ کے ماتحت پلکھنو اور کاٹسکی کی طرح اس لڑائی میں شرکت کی۔ اس لڑائی کا ایک مفید نتیجہ یہ ہوگا کہ مصلحت پرستی اور حکومت شکنی ختم ہو جائے گی۔ معاشرتی جمہوری جماعتوں کو اگر ذرا سا بھی قانونی امکان ملا تو وہ جمہوریا عوام کی تنظیم کرنے میں اور اشتراکیت کی تبلیغ و اشاعت میں ہرگز نہ چوکیں گی اور انھیں چاہیئے کہ ضابطہ پرستی سے میکانکی طریقہ کار برتیں اور مسرز بورژوا یعنی سرمایہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنی گولیوں کا نشانہ بنائیں۔ انجلز نے عام جمہوری جنگ کے متعلق بطور حوالہ لکھا ہو اور اس ضرورت پر زور دیا ہو کہ جب بورژوا طبقہ اپنا معاہدہ توڑ دے تو ہمیں بھی چاہیئے کہ ہم قانونی طور پر اپنے معاہدے کو ختم کر دیں۔ اس تنازع نے اس چیز کو آشکارا کر دیا ہو کہ سرمایہ دار ہر ملک میں خواہ وہ جمہوری اور آزاد ملک ہی کیوں نہ ہو اپنے قانونی معاہدے توڑ رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہو کہ ہم جمہور کی رہبری ایک انقلاب کی جانب کر سکیں جب تک کہ ہم ایک غیر آئینی جماعت نہ بنا لیں جو تبلیغ و اشاعت، بحث و مباحثہ اور تحلیل و تجزیہ کا اہم کام انجام دے اور اس طرح مختلف انقلابی ذرائع سے جد وجہد پیدا کر دے۔ مثال کے طور پر جرمنی کو لے لیجیئے جہاں اشتراکیوں کی ہر ایماندارانہ سرگرمی کا استیصال میکانکی مصلحت پرستی اور ریاکارانہ "کاٹسکی ازم" کے مقابلے میں قانونی اعتبار سے کیا گیا۔ انگلستان میں ان لوگوں کو باشقت قید کی سزا دی گئی جنھوں نے جنگ سے دور رہنے کی اپیل شائع کی تھی۔

ایک معاشرتی جمہوری جماعت کے رکن ہونے کا خیال نہایت موزوں اور مناسب ہو اور اس کے ساتھ غیر آئینی طریقوں کی نشر و اشاعت کی تردید کرنا اور قانونی پریس میں اس کا مضحکہ

لڑانا اشتراکیت سے دشمنی ہے اور اسے گمراہ کرنا ہے۔

بورژوانہ یا خسروانہ جنگ میں اپنی خود کی حکومت کی شکست | حامیان فتح اس لڑائی کا انجام شخصی حکومت کا قیام چاہتے ہیں اور نعرے لگانے والے اور چیخ پکار مچانے والے نہ کسی کی جیت چاہتے ہیں اور نہ کسی کی ہار۔ دراصل یہ لوگ ایک ہی نظریے کے ماتحت اور اسی نظریے کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں اور وہ عمرانی وطن پرستی کا نظریہ ہے۔ رجعت پسندانہ جنگ میں ایک انقلابی جماعت اپنی حکومت کی شکست کے لیے کوئی مدد نہیں کر سکتی ہے لیکن وہ اس تعلق کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتی جو حکومت کی فوجی طاقت اور اس سنہرے موقع کے درمیان ہوتا ہے جو طاقت کو آسانی سے منقلب کر سکتی ہے لیکن صرف ایک سرمایہ دار جو سمجھتا ہے کہ یہ جنگ حکومتوں کی پیدا کردہ ہے اور اس کا اختتام وانجام بھی حکومتوں اور اقوام کے درمیان طے پائے گا اور جس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ انجام ایسا ہی ہو تو وہ تمام محاربی ملکوں کے اشتراکیوں کے ان خیالات کو جو وہ اپنی حکومت کی شکست کے سلسلے میں ظاہر کرتے ہیں مضحکہ انگیز اور نامعقول سمجھتا ہے۔ برخلاف اس کے ایسے خیالات کا اظہار ان مزدوروں کی دلی تمناؤں کے مطابق ہوتا ہے جو واقف کار جماعت کے رکن ہوتے ہیں اور وہ دل لگا کر ہمارے مقصد کے حصول کی خاطر ہماری سرگرمیوں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور ان کی یہ مخلصانہ مدد بورژوانہ یا خسروانہ جنگ کو عام جمہوری جنگ میں تبدیل کرنے کا باعث ہوگی۔

انگلستان، جرمنی اور روس کے اشتراکیوں کی جماعت کی طرف سے اگر لڑائی کے خلاف آواز بلند کی جائے اور لڑائی کی سخت مخالفت کی جائے تو بلاشبہ علی الترتیب ان حکومتوں کی فوجی طاقت پر اثر پڑے گا اور اس کی طاقت کمزور ہو جائے گی لیکن اس مخالفت کا سہرا اشتراکیوں کے ہی سر ہونا چاہیے۔ اشتراکیوں کو چاہیے کہ وہ عام جمہور کے سامنے اس مسئلہ کی نشر و اشاعت کریں اور جمہور کو واضح طور پر سمجھائیں کہ انھیں اس جابرانہ حکومت سے انقلاب ہی کے توسل سے نجات مل سکتی ہے۔ ان حکومتوں کی مشکلات و مصائب کا اندازہ خاص طور سے اس جنگ سے کرنا چاہیے اور اپنا اصل مقصد حاصل کرنا چاہیے۔

امن پسندی اور امن کے نعرے | جمہور کا عام امن پسندی کا رجحان دراصل ایک ہنگامے کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور یہی عام جمہوری رجعت پسندانہ جنگ کے خلاف عام احساسِ بیداری تمام عمرانی جمہور پسندوں کا اہم فرض ہے کہ وہ ایسے موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ لوگ ہمیشہ اس قسم کی ہر تحریک کے اس سرگرم اور جوش انگیز حصے میں شرکت کریں گے اور ہر اُن عام مظاہروں میں شامل ہوں گے جن کی اساس خیالات کی انھیں عام بیداری پر قایم ہوگی۔ وہ ایسا کرکے دوسروں کو دھوکہ ہرگز نہ دیں گے یعنی یہ کہ ایک انقلابی تحریک کے عدم وجود پر بلا کسی الحاق و اضافے کے یا بغیر کسی قوم اور ملک پر حملہ کیے اور بلا کسی قتل و غارت اور لوٹ مار کے یا موجودہ حکومتوں یا حکمراں جماعتوں کے درمیان بغیر نفاق و افتراق کے بیج بوئے ہوئے وہ امن و سکون قایم رکھ سکیں گے۔ اس قسم کی ریاکارانہ چال کی حیثیت محاربی ملکوں اور ان کی خفیہ حکمتِ عملی کے ہاتھوں میں اور انقلاب کی مخالف کوششوں کے درمیان ایک کھلونے کی سی ہوگی کہ وہ رازدارانہ طور پر ان کی خفیہ چالوں اور کوششوں میں معاون ثابت ہوں گی۔ وہ شخص جو ایک مستقل مستحکم اور دیرپا عام جمہوری امن کا خواہاں ہے اسے چاہیے کہ حکومت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کھڑا ہو اور انقلاب میں مدد اور شرکت کرے۔

اقوام کا حق خود مختاریت | موجودہ جنگ میں بورژوا طبقہ کا سب سے بڑا فریب یہ ہے کہ اس نے اپنے قہرمانہ اور سفاکانہ مقصد کو ایک حسین نظریے کی آڑ میں چھپا رکھا ہے اور وہ قومی آزادی یا نیشنل لبریشن کا نظریہ ہے۔ انگریزوں کا آزادی کا وعدہ بلجیم سے اور جرمنی کا وعدۂ آزادی پولینڈ سے ہمارے سامنے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل یہ لڑائی اکثریت پسند اقوام کے زورآوروں کے درمیان ہے اور اس کا مقصد ظلم و ستم کی گھاٹی کو زیادہ گہرا اور وسیع بنانا ہے۔

حامیان اشتراکیت اپنے اہم اور بلند ترین مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ ہر قومی مصیبت و ہلاکت کا مدافعانہ مقابلہ نہ کریں گے خواہ اس مشکل یا مصیبت کی شکل یا نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ جائز طور پر وہ اس چیز کا مطالبہ کریں کہ تمام کمزور اور انحطاط پذیر ملکوں کے تمام عمرانی جمہور پسندوں (جو انفرادی حیثیت سے "اقوام عظیم"

ہ کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں) کی طاقت اور حیثیت کا اعتراف کریں اور تمام کمزور و مغلوب قوموں کے حق مختاریت کا صحیح سیاسی معنوں میں تحفظ کریں یعنی انھیں سیاسی تقسیم کا حق تفویض کیا جائے۔ کسی بڑی اور ممتاز قوم کا اشتراکی یا ایک بڑی قوم جو کئی نوآبادیات کی مالک ہو کر اگر اس حق یا اصول کی حمایت اور حفاظت نہیں کرتی تو در اصل وہ جنگجو وطن پرست ہے۔

اس حق یا اصول کو سراہنے سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کی حمایت کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے یہ اصول زیادہ نڈر بے دھڑک یعنی زیادہ وسیع اور عالمگیر اور عظیم حکومتوں اور حکومتی انجمنوں کے قیام و تشکیل میں ہماری مدد اور رہبری کرتا ہے یہ ایک منظم یا لازمی تشکیل ہے جو جمہور اور معیشت کے ارتقا یا نشو و نما میں زیادہ مفید اور معین ثابت ہوگی۔

دوسری مغلوب اقوام کے اشتراکیوں کا فرض ہے کہ وہ مغلوب اور غالب دونوں اقوام کے مزدوروں کے (جس سے اتحاد تنظیمی مراد ہے) اتحاد کامل کے لیے جائز اور یقینی طور پر جد و جہد کریں اور سعی بہیم کو دخل دیں۔ دو اقوام کے درمیان قانونی تقسیم کا تصور (باؤر اور رینر کا "قومی ثقافتی سوراج" کا نام نہاد نظریہ) ایک رجعت پسندانہ خیال ہے۔

شہنشاہیت یا امپریل ازم کے خلاف ایک بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کی تحریک کو بروئے کار لانا اور اس کو کامیاب بنانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ ہم دوسری اقوام کے حق خود مختاریت کا باضابطہ اعتراف نہ کریں۔ بقول مارکس و انجل "وہ فرد جو کسی دوسرے فرد پر ظلم و جبر روا رکھے گا آزاد (زندہ) نہ چھوڑا جائے گا" اس طرح کوئی پرولتاری جو دوسری قوم کے حقوق کے پائمال کرنے کی سازش میں اپنی قوم کا ساتھ دے گا وہ سوشلسٹ یا اشتراکی کہلانے کا ہرگز مستحق نہ ہوگا۔ (ترجمہ)

احسان رشید صدیقی

سیاسی نصب العین اور ان کا اثر عملی سیاسیات پر

سیاسیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی اصول سیاسیات اور عملی سیاسیات۔ یہ ایک دوسرے سے کافی تعلق رکھتی ہیں۔ اصولی غور و فکر میں صرف ہوا میں محل نہیں بنائے جاتے۔ انسان ہمیشہ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر نظریے قایم کرتا ہے اور سیاسی نظریے اس ماحول کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں کہ سیاسی مفکر نے اپنی زندگی بسر کی ہو۔ زمانہ قدیم سے آج تک ہم دیکھتے آئے ہیں کہ مفکرین نے بڑی بڑی شخصیتوں کے جذبات کو حرکت دی اور ان سے عظیم الشان کام انجام دلوائے۔

بعض وقت خیال کیا جاتا ہے کہ اصول سیاسیات بلحاظ سیاسی نتائج بے مقصد ہوتے ہیں۔ برک کہتا ہے کہ "مملکت کی فرسودگی کی حقیقی علامت یہ ہے کہ اس کے ارکان اصولی بحث میں پڑ جائیں" مگر حقیقت میں حالات ایسے ابتر نہیں۔ اکثر انقلابات جن کو سیاسی مفکرین کے قایم کردہ نصب العین کی بدولت فروغ ہوا آخر کار انسانیت کے لیے مفید ثابت ہوئے سیاسی مفکرین ہی کے سوچ بچار کا نتیجہ تھا کہ جمہوریت نے اس قدر ترقی کی شخصی آزادی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور بین الاقوامی انصاف کا زرین نقطہ نظر وجود میں آیا۔

سیاسی نظریے اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ گزشتہ واقعات کے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور آیندہ کے لیے رہنمائی کرتے ہیں کیونکہ مستقبل اب ویسا ہی ہے جیسا کہ حال گزشتہ میں تھا یعنی ایک مطمح یا امید مگر کوئی نظریہ بھی پوری طرح عملی جامہ نہ پہن سکا جس طرح کہ کسی مفکر کے دماغ میں قایم کیا گیا تھا۔

تاریخ عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے مختلف دور کسی نہ کسی سیاسی نظریے سے متاثر ہوتے رہے۔ آزادی ایتھنز اور اس کا نظم و ضبط روما کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ زمانہ وسطیٰ میں وحدت انسانیت کو نصب العین قرار دیا گیا تھا مگر جب نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو علیحدہ خود مختار

مملکت ہر ایک ملک و قوم کی سیاسی خواہش ہو گئی۔ ایتھنز میں آزادی کا مفہوم کچھ اور ہی تھا اور شہریوں کے ایک خاص حصہ تک محدود کر دیا گیا تھا۔ یہ امر تسلیم کر لیا گیا تھا کہ انسان کی ذہنی اور جسمانی ترقی بغیر حکومت کی مداخلت کے ہونی چاہیے۔ یہی نظریہ آج کل کے انفرادیت پسندوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

عہد وسطیٰ میں وحدت انسانیت کے نظریے کو مذہب کے ذریعہ عملی صورت نصیب ہوئی۔ مقدس سلطنت روما اسی کا نتیجہ تھی۔ نشاۃ ثانیہ اور اصلاح دین کی ہوا نے اس وحدت کو باقی نہ رکھا۔ لاتعداد خود مختار مملکتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور جدید تخیل قومیت نے جنم لیا۔ مکیاولی اور بودن جیسے مفکرین نے اپنے سیاسی نظریوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ مکیاولی کی خواہش تھی کہ وہ اطالیہ کو ایک طاقتور مرفہ حال متفق اور خود مختار سلطنت دیکھے۔ اس کے خیالات نے ہم عصر زمانہ سے زیادہ آنے والے سیاستدانوں کی رہنمائی کی۔ وہ ایک بہت بڑا حقیقت بیں تھا۔ اسی لیے اس کے بتائے ہوئے طریقے بہت مقبول ہوئے جب سے اس کی کتاب "پرنس" چھپی ہو تب ہی سے اس کی پرستش کی جا رہی ہے۔ مکیاولی نے سیاست اور اخلاق میں تفریق کی اور حصول مطلب کے لیے ہر قسم کی کارروائی اختیار کرنے کو جائز قرار دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کا فلسفہ مدبروں میں بہت عام ہوا اور انھوں نے اس پر حرف بہ حرف عمل بھی کیا۔ سولھویں صدی میں باوجود مذہب کی مخالفت کے "پرنس" بادشاہوں کی درسی کتاب بنی رہی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مکیاولی ہی کے عقاید یورپی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ نپولین، لوئی فلپ، بسمارک اور کور جیسی ہستیوں نے اس کی پیروی کی۔ آج کل بھی اسی کے مقرر کردہ قواعد کا دور دورہ ہے۔ ہٹلر اور مسولینی اس کے دل سے پیرو ہیں۔

جب خود مختار مملکتیں بڑھتی گئیں اور ان میں ربط پیدا ہوا تو بین الاقوامی قانون کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس خیال کو ولندیزی مفکر گروشس نے پیش کیا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ جنگ ایک فطری چیز ہے جس کو روکنا ناممکن ہے۔ لڑائی ہو مگر اصول انسانیت کے مطابق گروشس کے بعد سے آج تک یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ زور و زیادتی کے دور کو امن اور ضوابط کی پابندی سے بدل دیا جائے۔ معاہدہ ورسائی کے بعد بین الاقوامی عدالت کو تشکیل دے کر اس مقصد کی طرف

ایک قدم اٹھایا گیا تھا مگر حالیہ جنگ نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

افلاطون نے اپنی کتاب جمہوریہ میں ایک عینی مملکت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مملکت تین جماعتوں پر مشتمل ہونی چاہیے فلسفی بادشاہ نظم ونسق کے ماہر اور عوام جن میں حکومت کے پیچیدہ معاملات سمجھنے کی اہلیت نہیں۔ حاکم جماعت کو بچپن ہی سے خاص تعلیم دی جانی چاہیے۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ فلسفہ حاکموں اور پروپیگنڈا عوام کے لیے ضروری ہے اسی کی بدولت خونریزی سے گریز کیا جا سکتا ہے اور بہترین اشخاص کی آمریت قایم رہ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ افلاطون کے خیالات غیر عملی ہیں۔ وہ وطنیت پر بہت زور دیتا ہے اور اجتماعی خوش حالی کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتا ہے علاوہ بریں وہ اس مسئلہ کی اہمیت سے منھ نہیں موڑتا کہ حکومت کی باگ ماہرین کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو عمومیت اکثر نظرانداز کر جاتی ہے۔ افلاطون کا اثر کسی قدر جدید ہمہ گیر مملکتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ چیدہ اشخاص کی حکومت، معاشی خودکفالتی اور شہریوں کی زندگی حکومت کے زیر اثر دونوں کے ملتے جلتے نظریے ہیں۔

قومیت کا نظریہ جب سے پیدا ہوا تب ہی سے عملی سیاسیات پر اثر کرتا رہا ہے مفکرین کے دماغ سے زیادہ اس نے عمل میں نشو و نما پائی۔ زمانہ وسطیٰ میں اس کا وجود نہ تھا میکیاولی ہی پہلا قوم پرست سمجھا جاتا ہے۔ اس نے قومیت کے جذبہ کو ابھارنے کی اولین کوشش کی۔ انگلستان نے سب سے پہلے اس کو قبول کیا اور جب انگریز فرانس پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں جون آف آرک کی قیادت میں قوم پرستی کا محاذ قایم ہوا اس کے بعد پولستان کی تقسیم نے اور تقویت بخشی۔ انقلاب فرانس اور نپولین کی فتوحات نے یورپ کی ہر قوم کو قوم پرست بنا دیا سیاسی قاید، شعرا، اور مقررین نے اس شعلہ کو اور بھڑکایا۔ اب قومیت نے سیاسی اصول کی صورت اختیار کی اور اس اصول کی بنیاد پڑی جس کے بموجب ہر ایک نیشنلٹی کے افراد ایک علیحدہ خود مختار مملکت کی خواہش کرتے ہیں۔ اس تحریک کو دبایا نہ جا سکا اور جرمنی اور اطالیہ کا اتحاد اسی کا نتیجہ تھا۔ بعض وقت قومیت کی پرستش مضرت رساں ہو جاتی ہے جب ایک قوم اپنی بڑائی کرنے لگے اور اپنے مفاد کی خاطر

جارحانہ کارروائی اختیار کرے تو اس کا لازمی نتیجہ جنگ ہوگا اور یہی بے جا قوم پرستی موجودہ جنگ کا باعث ہوئی۔

مملکت کا تصوری نظریہ بھی عملی سیاسیات پر اثر کرتا رہا ہے اس کے بموجب مملکت کی پرستش کی جانا چاہیئے۔ مملکت آلہ کار نہیں بلکہ نصب العین ہے۔ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ اس کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل ہونی چاہیئے۔ کانٹ نے اس نصب العین کو قایم کیا اور اس کے پیرو ہیگل نے بسمارک کے تحت جرمنی میں آہنی اور خونی دور کیلئے زمین تیار کی۔ جدید فاسی جرمنی اور فاشسٹ اٹلی بھی مملکت کے اقتدار کو اسی حد تک سراہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مملکت کی بہتری کے لیے شخصی آزادی، زندگی اور ملک کو قربان کر دینا چاہیے۔ ان کا خیال ہے کہ افراد مملکت کے لیے ہیں نہ کہ مملکت افراد کے لیے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے شروع سے مختلف اقوام نے جمہوریت کو اپنا سیاسی نصب العین قرار دیا مگر ابھی تک اس کو پوری طرح حاصل نہیں کیا گیا ہے۔ کبھی بھی معاشرہ اس طرح تشکیل نہیں دیا گیا کہ اس کے ہر فرد کو ترقی کا برابر موقع ملے۔ زمانہ جنگ کے عارضی حالات کو چھوڑتے ہوئے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں عوام کا اقتدار پایا جاتا ہے جمہوریت نہ صرف ایک طریقۂ حکومت ہے بلکہ اس کا تعلق ایک ایسے معاشرہ سے ہے جس کی بنیادیں مساوات، اخوت اور حریت پر رکھی گئی ہوں۔ کیا انگلستان میں اس قسم کے حالات پائے جاتے ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ انگریزی طریقۂ حکومت کو سیاسی جمہوریت کہا جا سکتا ہے اور وہ بھی ایسی جمہوریت جس کی باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ ہر فرد کو برابر ترقی کا موقع ملے۔

یہی جمہوریت کسی حد تک سوئٹسزرلینڈ میں پائی جاتی ہے۔ وہاں جمہوریت کو واقعی میدان عمل میں پاتے ہیں جس کی مختلف وجوہات ہیں مثلاً بے حد جذبۂ وطنیت، اعلیٰ تعلیم، سیاسی اتحاد اور سوئس قوم کی رواداری اور مصالحت پسندی۔ شہریوں کا حق ابداع اور استصواب رائے جمہور، رائے عامہ کو حکومت میں نمایاں حصہ دیتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ وہاں غریبوں اور امیروں میں زیادہ گہری تفریق نہیں پائی جاتی جس کی وجہ سے معاشرہ کی بنیادیں متزلزل نہیں ہیں پس وہاں سیاسی

اور معاشی جمہوریت دونوں کا دور دورہ ہو جو ہر قوم کا نصب العین ہونا چاہئے۔

دنیا کے بڑے بڑے انقلاب بھی کسی نہ کسی سیاسی یا اقتصادی نصب العین کو حاصل کرنے کی کوشش کا نتیجہ تھے۔ انگریزی انقلاب کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کو عینی صورت بعد میں دی گئی۔ پہلے عمل اور قیاس آرائی " کے اصول پر عمل کیا گیا۔ اسٹوارٹس بادشاہوں کی مطلق العنان اور ظالم حکومت تقشفی انقلاب کی باعث ہوئی۔ ایک ایسی حکومت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو علاوہ مستحکم ہونے کے مذاہب اور ساری جماعتوں سے بالاتر ہو۔ کرامول نے موقع پاکر اپنی آمریت قایم کی۔ ہابس نے اپنی کتاب "لیوی تھیان" لکھ کر اس کے دور کو جائز قرار دینے کی کوشش کی اسی طرح ۱۶۸۸ء کے انقلاب کو لاک نے بعد میں عینی صورت دی اور دستوری بادشاہت کے لیے اپیل کی۔

امریکی اور فرانسیسی انقلابات بھی سیاسی نصب العین کے زیر اثر ہوئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی مفکرین تاریخ انسانیت کو کہاں تک بدل سکتے ہیں۔ فطری حقوق کے نظریہ اور مانٹسکیو نے امریکی سیاسی زندگی کو بہت کچھ متاثر کیا۔ انقلابیوں نے فطری حقوق کے نظریے کی بنا پر برطانوی پارلیمان کے محصول عائد کرنے کے حق کی مخالفت کی اور بادشاہ پر معاہدہ توڑنے کا الزام لگایا۔ نیا دستور تیار کرتے وقت امریکی مدبر اور سیاست دانوں نے مانٹسکیو کے تفریق اختیارات کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

فرانسیسی مفکرین والٹیر اور ڈائدیرو فنیلان اور ان کے سرتاج روسو نے اپنی تحریروں کے ذریعہ دنیا کا سب سے بڑا انقلاب پیدا کیا۔ روسو چیخ اٹھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا مگر اب ہر جگہ جکڑا ہوا ہے۔" حریت، مساوات اور اخوت انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ روسو کو آج کل بھی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا مشیت عمومی کا نظریہ پھر تازہ ہو گیا ہے جب سے انتخاب کرنے والوں سے اپیل کرنے کا طریقہ شروع ہوا ہے۔

نپولین کا عظیم الشان دور بھی انقلاب ہی کا نتیجہ تھا وہی انقلاب جو سیاسی مفکرین کی

تحریروں کی بدولت پروان چڑھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نپولین ایک بار روسو کی قبر پر گیا اور کہنے لگا، میرا خیال ہے کہ اگر یہ شخص پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو اچھا تھا۔ "یہ کیوں؟" اس کے کسی ساتھی نے دریافت کیا "اس لیے کہ روسو ہی فرانسیسی انقلاب کا باعث ہوا" نپولین نے جواب دیا۔ یہ الفاظ سیاسی نصب العین اور عملی سیاسیات کے تعلق کو صاف ظاہر کرتے ہیں۔

دور جدید میں بھی سیاسی نصب العین جو اہمیت رکھتے ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا عال میں سب سے بڑا نظریہ مجلس بین الاقوام کا تھا۔ عالمگیر مملکت کے زمانہ وسطیٰ کے خیال کو ولسن نے گزشتہ جنگ عظیم کے بعد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ یہ اسکیم معاشی اور معاشرتی معاملات میں مفید ثابت ہوئی اور اس کو اپنے اصل مقصد یعنی اقوام کو آپس میں جنگ کرنے سے باز رکھنے میں ناکامی ہوئی۔ بین الاقوامیت کا تخیل پنپ نہ سکا اور قومیت کے جذبہ نے سیاسی مدبروں کا آلہ کار بن کر دنیا کو موجودہ ہولناک جنگ میں جھونک دیا اور مجلس بین الاقوام کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

عہد حاضر میں ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اشتمالیت، فاشیت اور نازیت نے دنیا میں کھلبلی مچا رکھی ہے۔ یہ بھی مفکرین کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ روسو کے بعد مارکس نے انقلاب کے جذبہ کو بہت سراہا۔ اس کے خیالات پر روس میں عمل کیا گیا۔ ملکیت کوئی چیز نہ رہی۔ سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا۔ زمین اور قدرتی ذرائع تمام قوم کی ملک قرار دیے گئے اور یہ قبول کر لیا گیا کہ ہر شخص دولت عامہ کا مساوی حصہ دار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مذہب کو بھی خیرباد کہہ دیا گیا۔ اب روس میں چاروں طرف مارکس کا بول بالا ہے۔ ایک بار کسی سیاح نے ایک کارخانے کے مزدور سے دریافت کیا کہ اگر مشین خراب ہو جائے تو وہ کیا کرتا ہے۔ جواب ملا۔ "انتظامی مجلس کو اس کی اطلاع دے دی جاتی ہے اور جب تک مشین چالو نہ ہو جائے ہم (اس نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں مارکس کی کتاب کیپٹل لٹکی ہوئی تھی) وہ کتاب پڑھتے رہتے ہیں۔" اشتمالیت کا ایک اور نصب العین یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی حیثیت حاصل کرے لیکن اس کی کوشش کرتا رہا مگر جب سے اسٹالین نے اقتدار حاصل کیا ہے اس پہلو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے لینن جس کام میں گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ناکام رہا، اسٹالین اس جنگ کے بعد کامیاب ہو جائے۔

فاشیت اور نازیت نے کانٹ اور ہیگل کے مثالی نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے جرمن اور اطالوی اپنے نصب العین کے نشہ میں چور رہیں۔ نازیت جرمن قوم کا مذہب ہے۔ ہٹلر اس کا پیغمبر اور گوئرنگ اور گوئبلس اس کے بڑے پادری بچپن ہی سے لڑکوں کو قومیت اور نسل کی فوقیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کا مادہ مفقود کر دیا گیا ہے اور تلقین کی جاتی ہے کہ قاید کے کہنے پر اعتقاداً عمل کرو اور اس کے احکام کی خاموشی سے تعمیل کرو۔ اس طرح قوم پر پورا قابو حاصل کر کے اس کی توجہ دوسری طرف منعطف کرادی جاتی ہے اور اکثر بین الاقوامی قضیے کھڑے کر دیے جاتے ہیں موجودہ جنگ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

عہد حاضر میں نصب العین کی جنگ بھی اقوام کے مابین بہت شد و مد سے ہو رہی ہے ہر ایک اپنے خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ سولھویں اور سترہویں صدی میں یہی مخالفت مذہب کے بھیس میں نمایاں ہوئی تھی۔ یہ جنگ عیسائی فرقوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان ہوئی تھی موجودہ جنگ سے قطع نظر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نصب العین کی جنگ اشتمالیت اور اس کے مخالفین کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہ جنگ معاشی اور معاشرتی بنیادوں پر لڑی جا رہی ہے اور اس میں فوجی اور غیر فوجی سب شامل ہیں۔ بارکر کے الفاظ میں "ایک اجتماعی فلسفہ دوسرے اجتماعی فلسفہ سے دست وگریباں ہے"

دوسری طرف عمومیت اور فاشیت کے نصب العین آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ طریقہ حکومت کے متعلق ان کا تصور جدا ہے۔ عمومیت حکومت کے نصب العین سے زیادہ اس کے طریقہ حکومت کو اہمیت دیتی ہے اور جہاں تک یہ سوال درپیش ہے وہ فاشیت اور اشتمالیت دونوں کی مخالف ہے کیونکہ یہ بحث و مباحثہ کو ممنوع قرار دیتے ہیں اور صرف ایک پارٹی کو جائز سمجھتے ہیں مگر حکومت کے مقصد کے متعلق فاشیت اور اشتمالیت تضاد خیالات رکھتے ہیں۔

عمومیت اور ہمہ گیر مملکت کے نصب العین کی ٹکر کی وجہ سے دنیا ایک اور خونی دور سے گزر رہی ہے۔ یہ جنگ گزشتہ جنگ سے زیادہ ہولناک اور پریشان کن ہے کیونکہ بمباری کے ذریعہ شہریوں کو بے حد و حش نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ بارکر کہتا ہے "نصب العین کی جنگ بہت بڑی جنگ ہے اس لیے نہیں کہ اس کا نتیجہ جسمانی جنگ ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ داخلی توازن بگاڑ دیتی ہے۔ پھر لڑائی معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان ہونے لگتی ہے۔

اور پھر عقل کو اپنے سارے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ آج کل جو تباہی اور بربادی ہو رہی ہے اس سے بارکر کی پیشین گوئی کی تصدیق ہوتی ہے۔

ایک اور اصولوں کی جنگ زردار اور بے زر اقوام کے درمیان ہو رہی ہے۔ مفلس اقوام مزید زمین کے خواہاں ہیں جہاں ان کی آبادی نقل وطن کر سکے، جہاں ان کو خام اشیا حاصل ہو سکیں اور تیار شدہ مال کے لیے منڈیاں ہوں۔ ان نصب العین کو جارحانہ حکمت عملی کی بدولت ہی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور یہ تصور کی حد سے گزر چکے ہیں اور حالیہ جنگ کو اسی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

تف ہے ایسے نصب العین پر جو آخرکار جنگ کے باعث بنتے ہیں۔ پھر ہمیں آیندہ کے لیے کیا نصب العین قرار دینا چاہیے یہ بہت کٹھن سوال ہے مگر ہم آپ اور سب ایسی دنیا چاہتے ہیں کہ جہاں شانتی ہو۔ مرفہ حالی ہو، انسانیت کے لیے ہر قسم کی مفید ترقی ہو۔ قوم پرستی کو چاہیے کہ وہ اپنی جگہ بین الاقوامیت کو دے۔ مجلس اقوام کا یہی مقصد حیات تھا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی اس لیے کہ اقوام نے اس کو اس جذبہ کے تحت نہ چلایا جو ولسن کے پیش نظر تھا۔ سامراج اور مجلس اقوام دو متضاد تصورات ہیں جن کا ایک ساتھ قایم رہنا ناممکن ہے۔ آیندہ کے لیے ایک بین الاقوامی قوت کی ضرورت ہے۔ چاہے یہ مجلس اقوام ہو یا کوئی اور ادارہ مگر ایسی مجلس نہیں جو صرف قراردادیں منظور کرتی رہے اور کوئی عملی قدم نہ اٹھائے یا وزنی ریاستوں کے اشاروں پر کام کرتی رہے اس کے چند قواعد کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ پہلے عوام میں بین الاقوامی شعور پیدا کرنا چاہیے۔ اس کے بہترین ذرایع مدرسے، اخبارات، سنیما اور پروپیگنڈا ہیں۔ دوسرے مستعمرات کو بین الاقوامی قوت کے تحت دیدیا جائے اور آبادی کے نقل وطن پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو۔ تیسرے بین الاقوامی اہمیت رکھنے والے اڈے مثلاً نہر سوئز، جبل الطارق اور سنگاپور بین الاقوامی مجلس کے زیر نگرانی ہوں۔ اور چوتھے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ تمام ممالک معاشی طور پر ایک دوسرے کے محتاج رہیں تاکہ جنگ کی طرف زیادہ راغب نہ ہو سکیں۔ ہم اپنے اس مضمون کو اس امید پر ختم کرتے ہیں کہ ایسا زمانہ جلد آئے گا اور دنیا کو آئے دن کی اُدھیڑ بُن سے نجات دلائے گا۔

سید التفات حسین بی اے (آنرز)

اے ہند!

بدلیں گے اور ضرور ہمارے بھی رات دن ۔۔۔ اے ہند تیرے ہوش میں آنے کی دیر ہے
پھر گونجنے لگیں گے محبت سے بام و در ۔۔۔ ذہن و زباں کو کام میں لانے کی دیر ہے
خود سرفروش آئیں گے نذرِ وفا لیے ۔۔۔ محفل میں مرن شمع جلانے کی دیر ہے
پھر تیری خاکِ پاک سے پھوٹے گی زندگی ۔۔۔ تجھ کو ترا فسانہ سنانے کی دیر ہے
بے چارگی کو ملنے لگے گا ہر اختیار ۔۔۔ مایوسیوں کو زہر پلانے کی دیر ہے
کانٹوں میں زندگی کا تبسم ہے بے قرار ۔۔۔ پھولوں کا گرم خون بہانے کی دیر ہے
بدلے گا پھر کسان کی قسمت کا فیصلہ ۔۔۔ موجودہ خرمنوں کو جلانے کی دیر ہے
پھر مفلسی کے ہاتھ میں تڑپیں گی بجلیاں ۔۔۔ دولت کے سر پہ چوٹ لگانے کی دیر ہے
ہر دل میں مضطرب ہے نئی زندگی کی آگ ۔۔۔ اب میکدے کو عام بنانے کی دیر ہے

وہ مٹیا برج اور وہ جلیانوالا باغ!
وہ سینۂ سراج وہ ٹیپو کے دل کے داغ!
بزمِ اودھ کے آخری بجھتے ہوئے چراغ!
دلی کے میکدے کے وہ کچلے ہوئے ایاغ!

[illegible] گا ہمیں بھی کبھی اذنِ انتقام ۔۔۔ دنیا کو دل کے زخم دکھانے کی دیر ہے

ورسائی کا وہ جبر دکھاتا ہوا فرانس!
کمزور گردنوں کو جھکاتا ہوا فرانس!

پھرتا ہے آج ٹھوکریں کھاتا ہوا فرانس!
ہٹلر کے آگے اشک بہاتا ہوا فرانس!
کوئی تو سننے آئے گا اپنی بھی داستاں   محفل میں صرف شور مچانے کی دیر ہے

وہ روس کا دیار وہ ذلت کی رہگذر!
وہ زار بعدِ زار تباہی کا شور و شر!
شاہی کا کر و فر وہ لیڈروں کے زر و سیم
لیکن جنوں نے رکھ دیا سب بے نیاں کر!
اے ہند! تیری محفلِ خاموش کی قسم   تیرے بھی اب زبان ہلانے کی دیر ہے

فضل الدین آثر ایم اے

دعا

وہ ضو کہ امانت ہو مری خاک میں یارب!
اُس ضو کو عطا کر تو ہم آغوشیٔ جبریل
ہر غلسِ تخیل کو آسودہ بنا دے
مدت سے گراں ہو مرے افکار کی زنبیل
نا محرم انجام ہیں امروز کے راہی
تدبیر سے کر ان کے خیالات کو تبدیل
ہر سینۂ مردہ کو سکھا ذوقِ تب و تاب
ہر دل میں جلا دے مرے احساس کی قندیل
اک دورِ نیا ہو مرے ہر خواب سے پیدا
فردا کی سحر ہو مرے اجمال کی تفصیل
زندہ ہو مری لذتِ تجدید سے دنیا!
ہر شعر سے پیدا ہوں نوا ہائے سرافیل
ہر نقشِ تخیل ہے حقیقت میں ادھورا
میں چاہتا ہوں تجھ سے فقط فرصتِ تکمیل

فضل حسین کیف اسرائیلی

سیاح سے

یہ عمارات، یہ ایوان، یہ پتھر کے نقوش — عہدِ ماضی کے ہیں شہکار، نہ دیکھ اے سیاح!
یہ حسیں صبح، یہ ہر چیز میں نیچر کے نقوش — منظرِ وادی و گلزار نہ دیکھ اے سیاح!

آ، اسی سر بفلک نقرئی ایواں کے قریب — ڈائری کو تری اک دوسرا عنواں دیدوں
ہاں اسی دلکشیٔ صحنِ گلستاں کے قریب — تجھ کو تفریح کے کچھ اور بھی ساماں دیدوں

یہ جو کھیتوں سے چلی آتی ہے شیریں آواز — بھوک اور پیاس کا تھرایا ہوا نغمہ ہے!
وہ ابھی جس نے فضاؤں میں کیا ہے پرواز — مضطرب روح کا گھبرایا ہوا سایہ ہے!

ہاتھ دریا سے ابھی جس نے یہاں جوڑے ہیں — تجھ کو حیرت ہے کہ وہ آدمی مردہ کیوں ہے؟
جس نے کچھ پھول گلستاں سے ابھی توڑے ہیں — تو نے پوچھا ہے وہ دوشیزہ فسردہ کیوں ہے؟

دیوتا اور شہنشاہ کے سایوں ہی میں — یہ عمارات، یہ نظارے پلے ہیں اے دوست!
ان ہی ایوان و طربگاہ کے سایوں ہی میں — کتنے انسان یہاں پیچ رہے ہیں اے دوست!

سلام مچھلی شہری

قطعات

ہر طرف سے اُٹھ رہی ہے موجِ نغمہ آفریں
ہر طرف سے آ رہی ہے بھینی بھینی سی مہک
آہ یہ ساعات رنگیں، اُف یہ لمحات حسیں
میرے دل میں ہو رہی ہے میٹھی میٹھی سی چسک

چھیڑتا ہے جب کوئی سازِ خموشی ناگہاں
آخری راتوں کے تاروں کی سہانی چھاؤں میں
یاد آتی ہے مجھے بھولی ہوئی اک داستاں
دل پہنچ جاتا ہے چمپا کی مہکتی چھاؤں میں

مٹتا جاتا ہے سکونِ زندگانی کا سوال
ہوتا جاتا ہوں خوشی سے دور، کلفت سے قریب
بڑھتا جاتا ہے محبت تنہا جوانی کا خیال
موسمِ گل کو بھی ہیں بے چاند کی راتیں نصیب

ہو گیا ہنگامۂ عالم سکوتِ دل نشیں
عشرتِ حالات میں گم تلخیٔ آلام ہے
نیند سی برسا رہی ہے کائنات سُرمگیں
منتظر آنکھیں ہیں، سنولایا ہوا اک بام ہے

وسعتوں پر دل کی چھایا ہے اُداسی کا فسوں
منظروں سے درد و غم لے کر پلٹتی ہے نظر
ایک ناکامِ محبت کی جوانی کیا کہوں
جس طرح ہوتی ہے سونی گرمیوں کی دوپہر

سحر رام پوری

غزل

دنیا کسے پا کے چھوڑتی ہے
نامرد بنا کے چھوڑتی ہے

کیا کیا ہیں کنوئیں جنھیں محبت
انساں کو جھنکا کے چھوڑتی ہے

خود موت نہ نگلے جن کو۔ دنیا
ایسوں کو بھی کھا کے چھوڑتی ہے

حیرت زدگانِ عشق چونکے
وہ آنکھ جگا کے چھوڑتی ہے

پرچھائیں بھی چھوڑے ساتھ دنیا
اس موڑ پہ لا کے چھوڑتی ہے

انسان کو، کیا بتائیں وہ آنکھ
کس گوں پہ لگا کے چھوڑتی ہے

سنتے ہیں کہ رفتہ رفتہ وہ زلف
دیوانہ بنا کے چھوڑتی ہے

بیگانہ بھی ہے وہ نرگسِ شوخ
اپنا بھی بنا کے چھوڑتی ہے

بھولے تھے جسے۔ نگاہ تیری
وہ قصہ سنا کے چھوڑتی ہے

جو کچھ بھی کہیں، تری محبت
انسان بنا کے چھوڑتی ہے

اپنے سے ہر ایک کو محبت
بیگانہ بنا کے چھوڑتی ہے

غم سے نہیں بچنے دیتی دنیا
یہ زہر پلا کے چھوڑتی ہے

سو طرح بناتی ہے محبت
سو طرح مٹا کے چھوڑتی ہے

اے دوست امید آج تیرا
دامن شرما کے چھوڑتی ہے

آمادۂ جور جب ہو وہ آنکھ
یہ نقش بٹھا کے چھوڑتی ہے

بجلی ہے فراقؔ یاد اس کی
یعنی تڑپا کے چھوڑتی ہے

فراقؔ گورکھپوری

وہبی

(منشی شیو پرشاد وہبی تلمیذ خواجہ ارشد علی خاں قلق اردو اخبار کے مہتمم تھے ۱۸۸۱ء میں ان کا مجموعۂ کلام مرقع ارژنگ کے نام سے طبع ہوا۔ رنگ کلام کسی خصوصیت کا حامل نہیں۔ اس مرقع سے جو اچھے اشعار مل سکے وہ یہ ہیں)

لبریز میری عمر کا کیا جام ہو گیا　　کیا ختم دور بادۂ گلفام ہو گیا
پرتو جو اُن کے عارض پُر نور پر پڑا　　ہر ذرہ پر گمان ہوا آفتاب کا
سیراب اس جہاں میں ہوا کونسا غریب　　ہر راہ رو کو ہوتا ہے دھوکا سراب کا
ہے خون دل میں سنگ حوادث کا اس لیے　　سینے سے میں لگائے ہوں شیشہ شراب کا
عشق بتاں سے باز نہ آؤں گا ناصحا!　　مجبور ہوں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
ساقی جو تیرے ہاتھ سے ہو دور آفتاب　　بڑھ جائے اور لطف شب ماہتاب کا
تو نہاں تھا تو یہاں پیش نظر تھا سب کچھ　　سب ہوا آنکھ سے پنہاں تو ہوا تو پیدا
دیکھنے والوں سے بیکار ہے پردہ اُن کا　　چار سو ہم کو نظر آتا ہے جلوہ ان کا
ہر روز ترقی پہ ہے سودا مرے دل کا　　مشکل نظر آتا ہے سنبھلنا مرے دل کا
کس رنگ سے آتا ہے تصور ترا اے شوخ　　کچھ اور نظر آتا ہے نقشا مرے دل کا
جز یاد خدا اب نہ رہے یاد بتوں کی　　کعبہ کہیں ہو جائے کلیسا مرے دل کا
میری نظروں سے نہاں رہتے ہیں آپ　　میرے دل میں مثل جاں رہتے ہیں آپ
رحم کیجئے خاکساری پر مری　　مجھ سے کیوں دامن کشاں رہتے ہیں آپ
ہے خوفناک منزل عشق بتاں بہت　　اس راستہ میں لٹ گئے کارواں بہت
لاتی ہے دیکھنا مری قسمت کہاں مجھے　　جنس وفا و مہر گراں ہے جہاں بہت

ٹوٹی ہے صورتِ دلِ بےکس جو بار بار — توبہ شکستہ دل ہو مرے ہر گناہ سے

قید اس کی کچھ نہیں کعبہ ہو یا بتخانہ ہو — ہر جگہ ہم کو خیال جلوہ جانانہ ہو

اس بھروسہ پہ گناہ کرتے ہیں تو بھی ہم زہد — رحم کرتی ہو عطا اس کی خطا سے پہلے

وہ ہم اسیرِ قفس ہیں کہ مر کے چھوٹیں گے — ہمیں ہو ایک خزاں آئے یا بہار آئے

محو رہتا ہوں تصور میں رُخ و ابرو کے — کام کعبہ سے نہ کچھ دیر کی تصویروں سے

جو مر چکے ترے کوچہ میں فرد ہو کے اُٹھے — غبارِ دل نہ بنے گرچہ گرد ہو کے اُٹھے

رہا نہ عشق میں راحت طلب مزاج اپنا — جو ہم جہاں سے اُٹھے اہلِ درد ہو کے اُٹھے

ہوا ہم کو سجدے کیے اس قدر — ہماری جبیں سنگ در ہو گئی

جب گئے دن ہنر کے ہوتے ہیں — کام آتا نہیں ہنر کچھ بھی

کون مرتا ہو کون جیتا ہے — بے خبر! تجھ کو ہو خبر کچھ بھی

ایک صورت پہ نہیں سارا زمانہ رہتا — شاد رہتا ہو اگر کوئی تو ناشاد کوئی

ایذا وہ ہجر کی ہے کہ زندہ رہے بشر — حیران ہوں کہ بھول گئی کیا قضا مجھے

کرتا ہے توبہ کوئی بھی فصلِ بہار میں — بیٹھے بٹھائے نشہ میں سوجھی یہ کیا مجھے

رسوا کیا شراب کے دھبوں نے بارہا — سب لوگ جانتے تھے بڑا پارسا مجھے

ہو گئی بے پوچھے ہم تر دامنوں کی مغفرت — آبروئے جوششِ اشکِ ندامت رہ گئی

دشت عدم سے کھینچ کے لایا یہاں مجھے — لے جائے گا یہ جوشِ جنوں اب کہاں مجھے

احباب چل بسے نہ لیا مجھ کو اپنے ساتھ — سمجھا سبھوں نے گردِ پسِ کارواں مجھے

دیکھا نہ ایک رنگ پہ باغِ جہاں کبھی — آئی بہارِ گل کبھی خزاں کبھی

میں کیا ہوں جو تم سے دل لگاتا — اک بات ہو یہ بھی دل لگی کی

ہو جائے وہی اپنی شفاعت کا وسیلہ — ہم کو تو کوئی ایسی خطا بھی نہیں آتی

مرسلہ حبیب کیفوی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سیاسی کتابیں :-

ٹروٹسکی :- از نریندر ناتھ سیٹھ، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۱۰۰، سائز ۳۰×۲۰/۱۶، قیمت ۹/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

کچھ عرصہ سے مکتبہ اردو لاہور سیاسی عام فہم، مفید، آسان اور ارزاں کتابیں چھپوا رہا ہے۔ یہ اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے۔ ٹروٹسکی نے انقلاب روس کے لیے جس پرسوز بیدار مغزی تدبر اور سیاست سے کام لیا ہے وہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس کی زندگی ایک بہادر سورما کی نصیحت بخش، ہمت افزا رومان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو میں ٹروٹسکی اور اس کے مسلک پر دو ایک اچھی کتابیں اور بھی نکل چکی ہیں۔ یہ کتاب بھی اس موضوع پر اچھی لکھی گئی ہے۔ ٹروٹسکی کی زندگی کے حالات اور اس کے پیغام کو شرح اور مدلل لیکن آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ دلچسپی آخر تک قایم رہتی ہے۔

جواہر لال نہرو :- از گوپال متل صاحب، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۴۲، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ قیمت ۱/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

جواہر لال نہرو پر یہ مختصر کتاب بھی دلچسپ ہے۔ حالانکہ بیشتر مواد ان کی اپنی کتابوں سے ماخوذ ہے پھر بھی متل صاحب نے محض ان ہی حالات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ پنڈت جی کی سیاست پر ہلکا لیکن پُرمغز تبصرہ بھی ساتھ ساتھ کرتے گئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت یقیناً بڑھ جاتی ہے۔

گاندھی :- از گوپال متل صاحب ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۶۶، سائز ۳۰×۲۰/۱۶، قیمت ۱/ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

گاندھی جی کی اپنی سوانح عمری "تلاش حق" میں بہت کچھ ہے لیکن وہ صرف سنہ ۱۹۲۰ء کے حالات

تک ہے۔ زیر نظر کتابچہ میں زمانہ حال تک کے واقعات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ یہ کتاب بہت مختصر ہے پھر بھی گاندھی جی کی زندگی کے خط و خال واضح ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کی سیاست پر ہلکا سا تبصرہ گاندھی جی کے متعلق بہت سی باتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

فاسزم:۔ از ہیرلڈ لاسکی مترجمہ باری، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۶۲، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۱۲، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

پروفیسر لاسکی نے اس مختصر کتابچہ میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صرف ایک یورپی انقلاب ہی ہٹلر کو تباہ کر سکتا ہے۔ یورپ کے عوام کو چاہیے کہ وہ بغاوت کریں، انگلستان انھیں اس کام کے لیے امید دلائے اور ان کی رہبری کرے۔ اپنا انگریزی نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے لاسکی نے یورپ کے واقعات کا حسب منشا اچھا احاطہ کیا ہے۔ ترجمہ بھی برا نہیں ہے موجودہ جنگ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ضرور اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ادبی کتابیں:۔

نغمۂ زندگی:۔ از سید فضل احمد کریم فضلی، ملنے کے پتے دفتر انجمن ترقی اردو دہلی و فضلی برادران لمیٹڈ کمنٹ ہاؤس سٹن روڈ ایکسٹنشن کلکتہ، صفحات ۱۸۴، سائز ۲۰×۲۶/۱۶، قیمت جلد چرمی عہ جلد پارچہ ولایتی پیر، کاغذ و طباعت نہایت نفیس۔

خیال تھا کہ اب غزل کے دن پورے ہوگئے اور دلی کے رنگ میں کہنے والا غزل گو اب کوئی پیدا نہ ہوگا لیکن فضلی صاحب کی غزلوں کا یہ مجموعہ دیکھ کر طبیعت کو خوش ہونا پڑا۔ وہی دلی کی صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان ہے، روانی فطری معلوم ہوتی ہے اور دل و درد آشنا۔ غالب کا سہل ممتنع اور آتش کی سی روانی اور کلام میں ہلکی سی شستہ جوانی، اس چیز نے فضلی صاحب کا کلام قابل مطالعہ بنا دیا ہے

یہ فضلی کا لطف سخن دوستو! خدا داد ہے اکتسابی نہیں ہے

بان پختہ اور استادانہ رنگ لیے ہوئے ہے روزمرہ پر عبور معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی محض محاورہ بندی یا نالی نہیں ہے۔ خیالات لطیف، سیدھے سادے الفاظ اور سیدھی سادی طرز میں برجستہ سمو دیے

گئے ہیں: عرض حال میں خود اپنے کلام کے متعلق یہی لکھتے ہیں۔

زباں دیکھو تو بالکل سیدھی سادی   نہ مضموں میں کوئی جدت بڑی ہو
وہی ہیں روز ہونے والی باتیں   وہی جن کا بیاں لا حاصلی ہو
یہ سب کچھ ہو مگر پھر بھی جو دیکھو   تو ان میں اک نرالی تازگی ہو

ان کے منتخب کلام سے ان کی خصوصیات زیادہ آشکارا ہوں گی۔

جینے میں یہ لطف کہاں تھا   شاد رہے تڑپانے والا
ہم تو کوشش کرتے ہیں فضلی بہت   دل بہلتا ہی نہیں بہلائیں کیا

کیا دن تھے وہ یا رب کیا وہ شب جب جمع تھے سارے ہم مشرب
اک کیف میں ڈوبے سب کے سب اک لطف مسلسل جینا تھا

وہ غصے میں ہیں تو لگتے ہیں اور بھی پیارے   بری بھی چیز بھلی لگتی ہو حسینوں پر
کچھ عجب حال اب ہے فضلی کا   تم نے کیا کر دیا نہیں معلوم
پھر چھوٹے آنسوؤں میں مزا پا رہا ہوں میں   سو دو کے جان بوجھ کے پھر کھا رہا ہوں میں
پھر دل سے ہو گئیں وہی باتیں مری شروع   سمجھا رہا ہے وہ بھی سمجھا رہا ہوں میں
پھر بیٹھے بیٹھے دیکھتا ہوں جاگتے میں خواب   وہ مسکرا رہے ہیں اور کھلا جا رہا ہوں میں
شانے پہ میرے بکھری ہوئی ہے پھر ان کی زلف   اور انگلیوں سے پھر اسے سلجھا رہا ہوں میں
تنہائیوں میں غیر کے کھٹکے کا لطف تھا   گھبرا رہے ہیں وہ بھی گھبرا رہا ہوں میں
اس نے کیا کیا! ہم کو ہوا کیا!   وہ کیا بتائے! ہم کیا بتائیں!
خرمن پہ غم کے بجلی گرا دیں   تم مسکرا دو اور ہم مسکرا دیں!

غرضکہ غزلیات میں اسی قسم کی سادگی و پرکاری کے اشعار بکثرت ہیں لیکن یہی سادگی قومی نظموں میں بالکل ناکامیاب ثابت ہوئی ہے۔ قومی نظمیں قصیدوں کی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں ان میں جب تک لفظی بلند آہنگی نہ ہو ان میں جان نہیں آتی۔ اس لیے وہ پانچ چھ نظمیں جو فضلی صاحب نے وردو قومی کے

زیر اثر کہی ہیں وہ محض درد کے اظہار کے اثر انگیز نہیں ہوسکی ہیں البتہ آخر میں آکسفورڈ کی دلچسپیوں پر جو بیانیہ نظم ہے اس میں ان کی سادگی و روانی خوب کام آئی ہے بعض اوقات میر حسن کے اثر کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ غرضکہ فضلی صاحب غزل اور بیانیہ نظم یا مثنوی میں بہت کامیاب رہے ہیں اور وہ اگر ان ہی میں اپنا میدان سخن محدود رکھیں تو ان کے اور ان کی شاعری دونوں کے لیے مفید ہوگا۔

مضامین عظمت (حصہ اول) ؛ ازعظمت اللہ خاں مرحوم ملنے کا پتہ علی اسداللہ خاں برکت بنگلہ ٹیگی چیل قدیم حیدر آباد دکن صفحات ۲۵۸، سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$، قیمت عمر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی

عظمت اللہ خاں مرحوم کی نظموں کا مجموعہ "سریلے بول" کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔ یہ ان کے مضامین کا پہلا حصہ ہے جس کا وعدہ سریلے بول کے دیباچہ میں کیا گیا تھا۔ عظمت اللہ خاں مرحوم جہاں اردو شاعری میں نئی نئی باتوں کے کہنے اور نئی طرز سے کہنے کے شایق تھے وہاں انھوں نے اردو نثر میں بھی اپنا خاص اسلوب پیدا کیا تھا وہ یہ تھا کہ مرحوم سنجیدہ مضامین کو غیر سنجیدہ اور دلچسپ انداز میں لکھتے تھے تاکہ عام پڑھنے والے ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور پڑھکر فائدہ اٹھائیں انھیں وہ اگر سنجیدہ طور پر سمجھانے کی کوشش کرتے تو ناظرین یا سامعین کا جی نہ لگتا۔ مثلاً ان کے مضامین کے عنوان ہی جاذب توجہ ہیں: "زندہ بدست مردہ"، "لڑائی کھٹواتی"، "اٹکر لیس"، "گڑیا خانہ"، "سود ا چپنا بیٹیا چال"، وغیرہ۔ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ خوش مذاقی کے ساتھ ساتھ ہی مفید اور ضروری باتیں بھی سمجھا دی جائیں۔ پھر بھی مرحوم کے مضامین میں مزاح کم اور سنجیدہ باتیں زیادہ ہیں لیکن مضامین کی افادیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ خود عظمت مرحوم نے خوش مذاقی کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو اور منطقی ہتیترے اور داؤ پیچ ذہن کے لیے پر لطف ورزش بھی ہو جائیں۔ مرحوم کی کوشش اس خوش مذاقی کے حصول میں کافی کامیاب ہے لیکن وہ اسے کمال پر نہ پہنچا پائے تھے کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ رشید الدین صدیقی کی بعض بعض تحریریں اس خوش مذاقی کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ زیر نظر مضامین میں مولیر کے ایک ڈرامہ "علم دوست خواتین" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ ترجمہ کی مشکلات کو مرحوم نے بڑی قادر الکلامی سے طے کرلیا ہے زبان و اسلوب

اور مضامین کی افادیت ہر صورت سے یہ مضامین لایق مطالعہ ہیں

بھید (ترجمہ کینڈڈا از برنارڈ شا) :- مترجمہ نورالحسن ہاشمی ایم اے ملنے کا پتہ ارشاد بکڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، صفحات ۸۴، سائز ۲۰×۲۶/۸، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، قیمت درج نہیں غالباً دس بارہ آنے میں مل سکے۔

یہ ڈراما دراصل برنارڈ شا کے اشتراکی عقاید کے زمانے کی چیز ہے جس میں بتلایا گیا ہے کہ گھریلو روزمرہ کی زندگی میں عورت کا مرتبہ مرد سے کتنا بلند ہے نیز مرد محض اقتصادی وجوہات کی بنا پر اسے غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ یہ صرف عورت ہی ہے جو اس بات کو جانتے ہوئے بھی اپنی اصلی محبت کی خاطر ان باتوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ یہ ترجمہ رسالہ جامعہ میں باقساط شایع ہوتا رہا ہے اور اب کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے۔ فروخت کرنا اس کا مقصد نہیں ہے محض کتابی صورت میں لانے کے لیے رسالہ مذکور سے کچھ پرچے نکلوا لیے گئے ہیں۔ ترجمہ رواں، بامحاورہ اور قابل مطالعہ ہے۔

بگولے :- از احمد ندیم قاسمی، ناشر مکتبہ اردو لاہور، صفحات ۲۴۴، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، قیمت ۱۲/ کاغذ کتابت وطباعت اچھی۔

قاسمی صاحب کی زندگی دیہاتوں میں زیادہ گزری ہے وہ خود ایک کسان ہیں اس لیے کسانوں کی زندگی سے تمام تر واقف۔ زیر نظر افسانوں کے مجموعہ میں زیادہ تر دیہاتی زندگی ہی کی عکاسی کی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ منشی پریم چند کے بعد دیہاتی زندگی کو پیش کرنے میں سب سے زیادہ سرگرمی قاسمی صاحب ہی نے دکھلائی ہے لیکن قاسمی صاحب ایک جوان آدمی ہیں اور شاعر، اس لیے ان کے کرداروں اور افسانوں میں شاعری کا زیادہ عنصر ہے۔ انھیں کسانوں سے ہمدردی ہے اس سبب سے وہ ان تمام مظالم کو بھی آشکارا کرنا چاہتے ہیں جو پٹواری، نمبردار اور پولیس ان پر کرتی رہتی ہے۔ اس طرح پر گویا ان کا قلم رومان و واقعیت کو ملا دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ یہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ دیہات کی زندگی میں زندگی کا عنصر زیادہ نمایاں، اور شباب شاعری کا عنصر دبا ہوا ہوتا ہے قاسمی صاحب

کے کردار شاعر کی طرح حساس ہیں اور بعض تو شاعری کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً کریاکرم کی ہیروئن قاسمی کا مقصد، ان کا نفسیاتی تجزیہ صحیح لیکن ان کا اسلوب کچھ اس طرح کا ہے کہ ان کے پیش کردہ مظالم کے مرقعے باوجود صحیح ہونے کے دوسرے اشتراکی فنکاروں کی طرح ایک پروپگنڈہ یا نمائش معلوم ہوتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دانستہ وہی پلاٹ منتخب کیے گئے ہیں جو ظلم و زیادتی کا مرقع پیش کرتے ہیں دیہات میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کی حساس شاعری ان کی قوت مشاہدہ، ان کا تفکر اور ہلکی سی طنز وہاں بہتر ثابت ہوتی ہے جہاں وہ شہر والوں کی زندگی یا کوئی نفسیاتی تجزیہ پیش کرتے ہیں مثلاً بچے، السلام علیکم (جو ایک انگریزی افسانہ ہے جسے قاسمی صاحب نے خوب اپنایا ہے) دیہاتیوں کی زندگی پیش کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب پہلے سے ایک نتیجہ سوچ لیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق واقعات گھڑ دیتے ہیں۔ مثلاً "ماں" میں جو نتیجہ دکھلایا گیا ہے وہ ایک کلیہ نہیں ہے بلکہ بحث طلب مسئلہ ہے۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے یہ صحیح ہے کہ دیہات میں بھی شاعر اور مفکر ہوتے ہیں لیکن اُن کا اسلوب بھی دیہاتی ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کا اسلوب اور طریقہ شاعرانہ زیادہ ہے۔ دیہاتی زندگی کے پیش کرنے میں اسلوب بھی اگر منشی پریم چند کی طرح شستہ، سلیس اور ٹھیٹھ ہندوستانی ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ ورنہ وہ میرے خیال میں نفسیاتی تجزیے والے اور شاعرانہ افسانوں میں زیادہ کامیاب ہوں گے بشرطیکہ ان کے کردار اپنی طبیعت و ماحول کے لحاظ سے ان کے اسلوب کے ہم آہنگ ہوں۔ مثلاً "سپنوں کا محل"۔ "ماؤ کی میاؤں" وغیرہ

پارۂ کچکول :- از سائل دہلوی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ رحیمیہ، اردو بازار متصل جامع مسجد دہلی، سائز ۲۲×۲۰/۱۶، قیمت ۲ر صفحات ۷۱، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ حضرت سائل دہلوی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے جو ان کے احباب و شاگردوں کے تقاضوں کی بنا پر شائع کیا گیا ہے۔ اکثر یہ غزلیں ریڈیو سے بھی نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے مختصر مجموعہ پر مفصل تبصرہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی حضرت سائل دہلوی کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ دلّی کی نکھری ستھری زبان، برجستہ نشست الفاظ آسان اور رواں۔ روزمرہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔

وہی قادر الکلامی ہے جو شاہ نصیر، ذوق اور داغ کی وساطت سے یہاں تک پہنچی ہے حالانکہ وہ معنویت جامعیت اور روحانی ستھرا پن نہیں جو میر، سودا، سوز اور درد کی دہلوی روش کا نشتر لگائے۔

پہلی کتاب پینی ریڈنگ (انگریزی) مرتبہ حافظ فیاض احمد انصاری۔ ملنے کا پتہ شرکت اردو مکتبہ جامعہ دہلی سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۴۸، قیمت ۶/ر، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

اس کتاب میں چند انگریزی اخلاقی نظموں کو معہ ان کے منظوم اردو ترجمہ کے جمع کر دیا گیا ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ ہے اس کے ذریعہ بچوں میں سمجھنے اور یاد کرنے کا مادہ پیدا کیا جائے۔ انگریزی زبان کو بھی اس طرح سیکھنے میں مدد ملے گی اور اخلاقی اسباق کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی زبان میں انگریزی سے ترجمہ کرنے کی صلاحیت بھی بڑھے گی طلبا اور ماہرین تعلیم کے لیے یہ کتاب ضرور مفید ہے۔ (م۔ح)

مذہبی کتابیں :۔

تسہیل الترتیل :۔ مولفہ الیاس برنی، مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۵۰، قیمت ۱۲/ر، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

الیاس برنی صاحب جہاں علم و ادب میں کافی کام کر چکے ہیں وہاں مذہبی کام بھی خوب کر رہے ہیں اور مختلف مذہبی کتابیں ان کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں فن تجوید کو انھوں نے بہت سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے ترتیب کا کام برنی صاحب خصوصیت سے خوب کر لیتے ہیں چنانچہ اس مختصر سی کتاب میں بھی قرأت کی ضرورت اور اس کے اصول و طریق بڑے اچھے طریقے سے سمجھائے ہیں جن سے اس فن کے تمام نکات و اشارات واضح ہو جاتے ہیں اور قرآن پڑھنے میں ایک نئی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں تو یہ فن ہمیشہ سے مسلمانوں کے مکمل اور پختہ ترین فنون میں سے ہے اور عربی، فارسی اور اردو میں متعدد کتابیں فن قرأت پر ملیں گی لیکن اپنی ترتیب و تفہیم کے لحاظ سے یہ کتاب بھی ضرور لائق مطالعہ ہے۔

شان خدا :۔ مولفہ عبید الرحمٰن عاقل رحمانی، پبلشر کتابستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۶۴ بمبئی نمبر ۸ سائز ۲۰×۳۰/۱۶۔ صفحات ۷۵، قیمت ۸/ر کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

اس کتاب میں خدا کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ الحاد اور دہریت جو آج کل بطور فیشن رائج ہو رہی ہے منہدم ہو جائے تقریباً تمام پرانے فرنگی فلاسفہ کے اقوال دیے گئے ہیں اور مادیین کے اعتراضات بھی دیے گئے ہیں اور ان کا جواب بھی دیا گیا ہے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ اعتقاد خالق ایک فطری جذبہ ہے لہذا اگر یہ اعتقاد حواس خمسہ ظاہری اور عقل سے حاصل نہ ہو سکے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کا وجود ہی نہیں کیونکہ یہ اعتقاد عقل سے حاصل کرنے کی چیز ہی نہیں۔ دہریت کو مٹانے کا جہاں تک مقصد ہے یقیناً یہ سعی بڑی حد تک مبارک ہے مگر اس میں موجودہ منکرین و متشککین فلاسفہ کے دلائل پیش کرنے کی کمی رہ گئی ہے بہرحال پھر بھی قابل مطالعہ رسالہ ہے۔

محمد رسول اللہ ۔ مترجمہ مولانا عبید الرحمن عاقل رحمانی۔ ملنے کا پتہ، کتابستان پوسٹ بکس نمبر ۴۱۶ ۳ بمبئی نمبر ۳، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۹۳، قیمت ۸ر، کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

یہ کتابچہ ترجمہ ہے مشہور انگریزی صاحب اسلوب ادیب کارلائل کی ایک کتاب کے ایک باب کا۔ کارلائل کا مقولہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد مادر گیتی سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوا کرتا ہے جو حق و حقیقت کی آواز بلند کرتا ہے اور کفر و باطل کی باتوں کی پول کھول دیتا ہے۔ ایسے فرزندان حقیقت کو کارلائل بطل عظیم گردانتا ہے۔ ایسے بطل کا وجود کسی صورت میں ہو خواہ وہ شاعر ہو یا مصلح، پیغمبر ہو یا بادشاہ لیکن ہوتا وہ فرزند توحید و حقیقت ہے۔ محمد رسول اللہ کو بھی کارلائل ایک بطل عظیم گردانتا ہے جن کا پیغمبر کی صورت میں ظہور ہوا یہ باب کارلائل کا بہت مشہور رہا اور اس میں ان تمام عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے مسکت جواب دیے گئے ہیں جو اس زمانہ میں پیغمبر کی ذات گرامی پر کیے جاتے تھے۔ اردو میں اس کا ترجمہ کئی بار چھپ چکا ہے۔ موجودہ ترجمہ بھی اچھا، رواں اور باترتیب ہے جس نے کارلائل کا یہ مقالہ ابھی تک نہ دیکھا ہو اس ترجمہ سے ضرور مستفید ہو۔

بلاکشانِ اسلام مصنفہ مولانا ادریس احمد صاحب۔ ملنے کا پتہ موتمر المصنفین کوچہ ناہر خاں بیت السعید دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات ۸۴، قیمت ۱۲ر، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

مولانا احمد سعید صاحب نے ایک موتمر المصنفین قایم کی ہے تاکہ اہل قلم اس میں شامل ہو کر خاموشی سے تصنیف و تالیف کا کام کر سکیں یہ اس سعی کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں ان اٹھائیس صحابہ اور صحابیات کا مختصر تذکرہ ہے جنھوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں اسلام قبول کر لینے پر سخت مالی اور جانی اذیتیں برداشت کیں۔ کتاب مختصر بہت ہے اس لیے اس سے سیری نہیں ہوتی۔ اس موضوع پر ایک سیر حاصل تذکرہ ہونا چاہیے تھا۔ (ج۔ع)

رسائل:۔

ماہنامہ کتاب:۔ زیر ادارت جناب پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مقام اشاعت کتاب خانہ پنجاب، لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۸، صفحات ۳۲، قیمت سالانہ عہ/ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جنوری ۱۹۴۲ء سے نکل رہا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان کی ترقی میں کوشاں ہو اور اس کی اچھی نئی کتابوں کا تعارف کراتا رہے۔ رسالہ بڑی لیاقت اور قابلیت سے مرتب ہوتا ہے کتابوں کا تعارف و تبصرہ بڑی جامعیت سے کیا جاتا ہے اکثر اچھے مختصر مضامین بھی ہوتے ہیں جناب مدیر کی وسعت معلومات اور دلکش اسلوب اس موضوع کے لحاظ سے ایک گونہ محدود رسالہ کو بھی بر تر بنا دیتا ہے۔ اردو داں حضرات کے لیے عموماً اور شائقین کتب و لائبریریوں کے لیے اچھا تحفہ ہے۔

رسالہ حیوانیات:۔ مرتبہ مرزا محمد اقبال مسعود صاحب، زیر نگرانی عنایت علی خاں صاحب شعبہ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۲۸، قیمت درج نہیں، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بھی۔

مسلم یونیورسٹی میں اکثر اچھے کام ہو جاتے ہیں چنانچہ زیر نظر رسالہ جو فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یقیناً ایک قابل دید رسالہ ہے اس میں سات مضامین ہیں جن کے عنوان یہ ہیں۔ ذیابیطس کے اسباب اور اس کا علاج، پرندوں میں گانے کے مقاصد، جانوروں میں جنس کی ابتدا، ارتقا اور عروج۔ جانوروں کے اخلاق و آداب، انسان اور حیوانات میں جذبات کا اظہار، رنگ حیوانات، حیاتین۔ تقریباً ہر مضمون قابل مطالعہ ہے رسالہ کا معیار بہت بلند ہے حیوانیات کی جدید دریافتوں کو عام فہم اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کاش سائنس کے موضوعات پر اردو میں اس قسم کے اور بھی رسالے نکلیں شعبہ حیوانیات لائق صد مبارکباد ہے کہ اس نے ایسا مستحسن اقدام کیا۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازراں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی، کراچی اور کلکتہ سے جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

گذشتہ موسم حج میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں
تفصیلات کے لئے خط و کتابت کیجئے

ٹرنر مارلسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

گذارشِ احوالِ واقعی

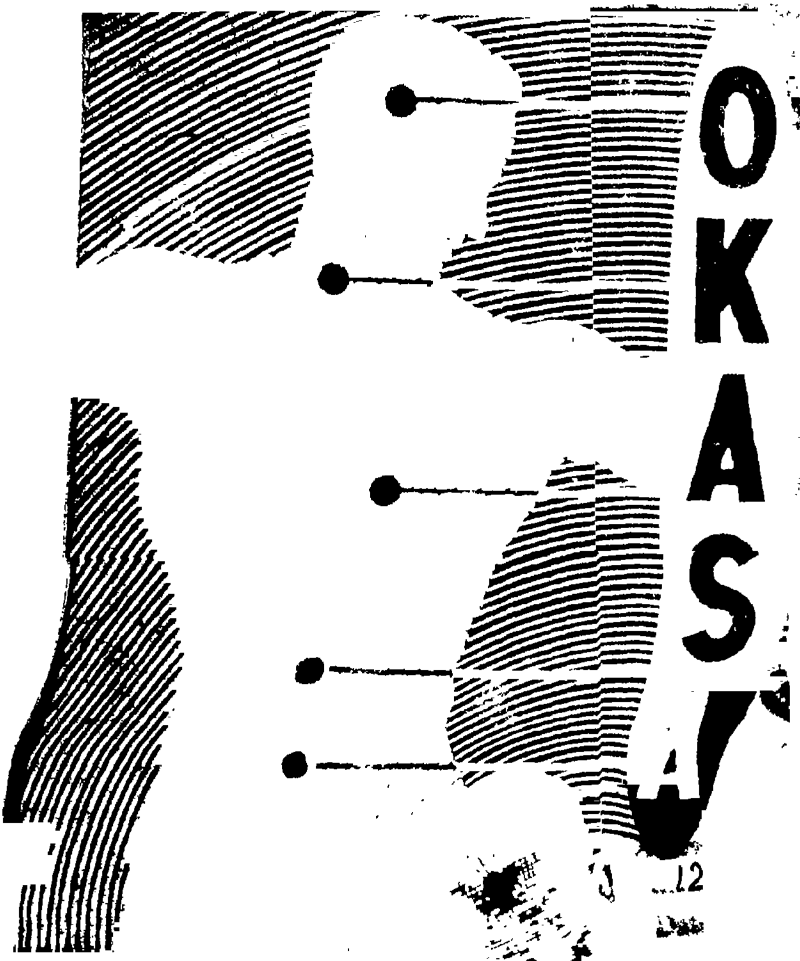
جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۶۲ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیزیں پیش کی ہے۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ بظاہر خوشبو میں ہمارے تیل سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل و عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر خانہ بلد ٹنگ لکھنؤ


OKASA